دارالعلوم دیوبند

احیاءِ اسلام کی عظیم تحریک

مولانا اسیر ادروی

دارالمؤلفین، دیوبند

دارالعلوم دیوبند

احیاءِ اسلام کی عظیم تحریک

تالیف

مولانا اسیر ادروی

استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس

دارالمؤلفین، دیوبند (یوپی، انڈیا)

© جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب کا نام	:	دار العلوم دیوبند احیاء اسلام کی عظیم تحریک
تالیف	:	مولانا اسیر ادروی
طبع چہارم	:	دسمبر ۱۹۹۹ء
تعداد	:	ایک ہزار
مطبع	:	سٹی پرنٹ دہلی
قیمت	:	ایک سو تیس روپے (Rs. 130/=)
ناشر	:	دار المولفین دیوبند 247554 یوپی

مبارک دن

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) پنجشنبہ کا دن ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں وہ مبارک و مسعود دن تھا جس میں دیوبند کی سرزمین میں علوم اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، جس سادہ اور معمولی طریقے سے یہ آغاز ہوا تھا اس کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ جس مکتب کا آغاز اس بے سروسامانی سے ہو رہا ہے چند ہی سال کے بعد وہ علوم اسلامیہ کا ایشیا میں سب سے بڑا مرکز بننے والا ہے چنانچہ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ برصغیر سے گذر کر افغانستان، ایران، سمرقند و بخارا، برما، انڈونیشیا، ملائیشیا، ترکی اور براعظم افریقہ کے دور دراز خطوں سے کتاب و سنت اور شریعت و طریقت کے طالبین یہاں جوق در جوق آنے شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے علم و دانش کی کرنوں نے براعظم ایشیا کے مسلمانوں کے دل و دماغ کو نورِ ایمانی اور تہذیبِ اسلامی سے منور کر دیا۔

کہاں سے کہاں

دارالعلوم دیوبند

آج عالمِ اسلام کا مشہور دینی و علمی مرکز ہے، برصغیر میں اسلام کی نشر و اشاعت کا یہ سب سے بڑا ادارہ اور دینی علوم کی تعلیم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے دارالعلوم دیوبند سے ہر دور میں ایسے باکمال فضلاء تیار ہو کر نکلے جنہوں نے وقت کی دینی ضرورت کے تقاضوں کے مطابق صحیح دینی عقائد اور علومِ دینیہ کی نشر و اشاعت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، یہ حضرات برصغیر کے علاوہ دوسرے مختلف ملکوں میں بھی علمی و دینی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں اور ہر جگہ انھیں ممتاز حیثیت سے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا مقام حاصل ہے، حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند تیرہویں صدی ہجری کی ایک عظیم دینی، تعلیمی اور اصلاحی تحریک تھی، یہ وقت کی ایسی ضرورت تھی جس سے بے اعتنائی اور چشم پوشی مستقبل میں مسلمانوں کو ان خطرات سے دوچار کر سکتی تھی جس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۵ محرم الحرام کو جو قافلہ صرف دو نفوس پر مشتمل تھا آج اس کے جلو میں ایشیا کے بہت سے ملکوں کے نفوس شامل ہیں۔

دیوبندی

نہ فرقہ ہے نہ مذہب

ہر معقول پسند، دین دار آدمی کا نام

دیوبندی ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبالؒ

ہدیۂ تشکّر

حمداً وصلوٰۃ

دارالعلوم دیوبند کسی تعارف کا محتاج نہیں، اس کی عظیم علمی اور اصلاحی خدمات برصغیر ہند و پاک ہی میں نہیں سارے عالم اسلام میں اس قدر نمایاں اور تابناک ہیں کہ کوئی خیرہ چشم ہی اس کی ضیا پاش شعاعوں کا منکر ہو سکتا ہے۔ ورنہ ملّتِ اسلامیہ کا ہر فردِ باشعور اور حقیقت شناس طبقہ اس کے عظیم تعمیری، اسلامی کردار کا ثناخواں اور اس سے فیض یافتگاں کے مجاہدانہ کارناموں کا ہمیشہ معترف رہا ہے اور رہے گا۔

دارالعلوم دیوبند نے سوا سو سال کے عرصہ میں زندگی کے ہر شعبہ اور ہر میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ملتِ بیضاء کا عظیم قیمتی اثاثہ ہیں جن کی اشاعت و فروغ سے بلاشبہ مؤمن کے ایمان میں تازگی و حرارت پیدا ہوگی اور عظمت و شوکتِ اسلام کے تحفّظ و استحکام کے لیے جاں سپاری کا نہ فرو ہونیوالا جذبہ بیدار ہوگا۔

لائقِ تشکّر ہیں ہمارے کرم فرما علم دوست عالم جناب مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی جنہوں نے دارالعلوم کی انقلابی تحریک کے اوراقِ زرّیں کو اپنی پیشِ نظر کتاب "دارالعلوم دیوبند احیاء اسلام کی عظیم تحریک" میں نہایت خوش اسلوبی اور سلیقہ کے ساتھ تاریخ کا حسین و پُربہار گلدستہ بنا کر پیش کیا ہے جس کی مہک ان شاء اللہ ہر نفسِ مومن کو ہمیشہ معطّر کرتی رہے گی۔

ادارۂ دارالمؤلفین دیوبند جس کا اہم اور بنیادی مقصد دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر علماء کے علمی اور دینی کارناموں کا تعارف و تحفظ ہے۔ مؤلف موصوف کی اس گراں قدر خدمت پر ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور دعاء گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کو اپنے خصوصی انعامات سے نواز کر ان کی اس علمی خدمت کو ایسی ہی مقبولیت عطا فرمائے جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کو حاصل ہوئی ہے۔

ناظرین سے بھی درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کی اشاعت اور اس کے حلقۂ استفادہ کے لیے کوشاں رہتے ہوئے ناشر اور مؤلف دونوں ہی کے لیے بارگاہِ ایزدی میں کامیابی و کامرانی کی دعاء فرمائیں۔ ادارہ ہمیشہ اپنے کرم فرما ناظرین کا ممنون رہے گا۔

مخلص :-

وحید الزمان الکیرانوی

سابق استاذ ادب عربی و معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند

حال معتمد دارالمؤلفین دیوبند

ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

دارالعلوم دیوبند چند بلند و بالا عمارتوں کا نام نہیں ہے، وہ ایک مکتبۂ فکر ہے جو ہندوستان میں اسلام کو اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ پیش کرنے کا عزم رکھتا ہے وہ ایک تحریکِ اصلاح ہے جو مسلم معاشرہ کو غیر دینی آلائشوں سے پاک صاف کرکے صحیح معنی میں اسلامی معاشرہ میں تبدیل کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، وہ احیاء اسلام کا نقیب و پیغامبر ہے جو عالمی پیمانے پر اسلام کو ایک زندہ و متحرک مذہب کی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے اور تجدید دین کی عظیم الشان خدمات کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے۔

دارالعلوم دیوبند ایک دمکتا ہوا سورج ہے جو ایک صدی پیشتر افق پر ابھرا اور چودھویں صدی کے آغاز میں نصف النہار پر آگیا، اس کی روشن و تاب ناک اور شب تاب کرنیں حدود افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش کی آخری سرحدوں تک یکساں پڑیں، جہاں جہاں بھی بدعت و ضلالت کی تاریکیوں میں اُجالا نظر آتا ہے، مشرکانہ عقائد کا کہرا چھٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ اس مرکز نور کی جستجو میں نکلیں گے جہاں سے یہ روشنی آئی ہے تو پتہ چلے گا کہ یہ اُسی آفتاب عالمتاب کی کرنیں ہیں جو کبھی دیوبند کی ایک گمنام بستی کے افق سے طلوع ہوا تھا۔

دارالعلوم دیوبند ایک اسلامی یونیورسٹی ہے جس کا فیض عالمگیر ہے، ہندوستان و پاکستان اور بنگلہ دیش میں سیکڑوں نہیں ہزاروں ہزار کی تعداد میں چھوٹے بڑے دینی مدارس ہیں، ان میں

بہت بڑی تعداد کی حیثیت مرکزی مدارس کی ہے جہاں سے فضلاء سندِ فضیلت لے کر نکلتے ہیں لیکن ان تمام فضلاء مدارس کا ایک ذہنی و فکری رشتہ دار العلوم دیوبند سے ہے، وہ اسی سرچشمۂ نور کی روشنی بانٹنے کے لیے ان شہروں اور ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں، ان ہزاروں مدرسوں اور دینی مرکزوں کا اپنا اپنا نظام ہے، طریقۂ تعلیم و تربیت ہے وہاں کے فضلاء کا میدانِ عمل بھی مختلف ہے لیکن بلا استثناء ہر ایک میں وہی روح، وہی جذبۂ اصلاح، وہی احیاء اسلام کا ولولہ موجود ہے جو دار العلوم دیوبند کا امتیازی وصف اور اس کی خصوصیت ہے، اس نے احیاء اسلام کے لیے اپنے دل کا درد، سوز و گداز، دین کی تڑپ، بے چینی اور اضطراب ہزاروں اور لاکھوں اہلِ علم کے سینوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

یہ کتاب اسی تحریکِ اصلاح و احیاء اسلام کی سو سالہ مذہبی و دینی خدمات کا ایک سرسری جائزہ ہے، میں نے جتنے عنوانات لکھے ہیں ہر ایک پر مستقل ایک ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ میرا اس کتاب سے مقصد اس مکتبۂ فکر کی سو سالہ مذہبی خدمات سے آپ کو مختصر طور پر روشناس کرانا ہے اس لیے معلومات کے بہت بڑے ذخیرے سے میں نے مختصر سا انتخاب کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس اجمال سے تفصیل کی ایک جھلک آپ کے سامنے آجائے۔

اگر آپ نے میری کتاب سے اپنے اسلاف اور اکابر کی عظمت کردار، ان کے اخلاص، ان کی للّٰہیت اور دین کی عظیم الشان خدمات کی قدر و قیمت کو پہچان لیا تو میں سمجھوں گا میری محنت ٹھکانے لگی، اور مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔

اسیر ادروی

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس

۷ جنوری ۱۹۸۹ء

عنوانات

مقدمہ	۲۰	عیسائی لٹریچر کی تفصیل	۳۷
غدر ۱۸۵۷ء	۲۱	کلیسا کی کامیابی	۳۸
اگست ۱۹۴۷ء	〃	مسلمانوں کی طرف سے مایوسی	۳۹
رحمت کے فرشتے	۲۲	عیسائیت کے فروغ پر مسرت	〃
دیستانِ دیوبند	〃	جائزے اور خوش فہمیاں	۴۰
وقت کا اہم ترین فریضہ	۲۳	پادری صفدر علی کا ذکر	۴۱
قیام دارالعلوم دیوبند	۲۴	میلوں ٹھیلوں میں مسیحی مبلغین	〃
داخلی و خارجی فتنے	۲۵	کچھ نئے عیسائی ہونے والوں کا ذکر	۴۲
خارجی فتنے	۲۶	قابلِ اطمینان کامیابی	۴۳
داخلی فتنے	〃	ترقی پذیر عیسائیت	۴۴
باب (۱)	۲۹	آخری جائزہ	۴۶
عیسائیت کی چیرہ دستیاں	۳۰	لیکچروں کی تاریخی اہمیت	۴۷
دل آزار طریقۂ کار	۳۱	باب (۲)	۴۹
پادری اور پولیس ساتھ ساتھ	۳۲	عیسائی مشنریوں کے خلاف محاذ آرائی	〃
موسیو گارسن دتاسی	۳۳	حکومت کی ہیبت اور رعب داب	۵۰
ایک شاہزادہ عیسائی ہوا	۳۴	مناظرہ اکبرآباد	۵۱
مسلمانوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے	〃	مناظرہ سے حکومت کو دلچسپی	۵۲
اشاعتی لٹریچر	۳۵	موضوعِ مناظرہ	۵۳
پورے ملک میں جال پھیلایا گیا	۳۶	مناظرہ کا اہم ترین موضوع	۵۴
دہلی جامع مسجد کو گرجا بنانے کا ارادہ	〃	مباحثہ کا آغاز	〃

تحریف کا ناقابلِ تردید ثبوت	۵۴	سوال وجواب کا سلسلہ جاری تھا	۷۳
ترکی بہ ترکی جواب	۵۵	قرآن کو دنیا سے ناپید کرنے کا خبط	۷۴
پادری فنڈر کی بدعہدی	۵۶	دیسی پادریوں کی شرانگیزیاں	۷۵
بہت بے آبرو ہوکر.....	//	دیسی عیسائی اور پادری	۷۷
رازِ درونِ خانہ	۵۷	تعاقب جاری ہوگیا	۷۸
مناظرہ کی رودادیں	//	جال نیا، شکاری پرانا	//
پہلی رودادِ مناظرہ	۵۸	مسلمان چوکنّا تھے	۷۹
دوسری رودادیں	//	ہندو طبقہ میں عیسائیت	۸۰
مناظرہ کا پس منظر	۵۹	میلہ خداشناسی شاہ جہانپور	۸۱
دلوں میں شکوک وشبہات	۶۰	دوسرا میلہ خداشناسی	//
حکومت کا منصوبہ فیل ہوگیا	۶۱	مباحثہ کا منظر	۸۲
حکومت کا انتقام	۶۲	داؤ پیچ شروع ہوگیا	//
پھر غدر ۱۸۵۷ء کا حادثہ ہوگیا	//	شرکاءِ مباحثہ	۸۳
ڈاکٹر وزیر خان	۶۴	موضوعِ مباحثہ	۸۴
باب (۳)	۶۶	حضرت نانوتوی رح کا معرکۃ الآرا بیان	//
عیسائیوں کے خلاف محاذ آرائی کا دوسرا دور	//	سوال وجواب	۸۵
پادریوں کی کارگذاری	۶۷	قرآن میں آپ کے بائبل کی تصدیق نہیں ہے	۸۷
پالیسی بدل دی گئی	۶۸	بے حیا باش ہرچہ خواہی کن	۸۸
غدر ۱۸۵۷ء کے بعد	//	پادری نولس کی گلفشانی	۸۹
عیسائیوں کا دائرۂ کار	۷۰	تنگ آمد بہ جنگ آمد	۹۰
مشنریوں کی جدوجہد رائیگاں نہیں تھی	۷۱	انجیل قطعاً ناقابلِ اعتماد ہے	۹۱
مشنری سرگرمیوں پر اہلِ علم کی نظر	۷۲	ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں	۹۲
سرسید کی تفسیر احمدیہ	//	مباحثہ کا دوسرا دن	۹۴

پادریوں نے کمک طلب کی	۹۴	آریہ سماج کی ہرزہ سرائیاں	۱۲۳
طعنوں سے کام نکالا	۹۵	باب (۵)	۱۲۸
موضوعِ مناظرہ میں تبدیلی	۹۶	فتنہ آریہ سماج کے خلاف مورچہ بندی	//
پادری اسکاٹ کی تقریر	۹۷	یہ ذہنی وفکری تبدیلی کیوں ہوئی؟	۱۲۹
پنڈت دیانند سرسوتی کی تقریر	۹۸	تبلیغ عیسائیت میں ناکامی اور پالیسی میں تبدیلی	۱۳۱
مولانا نانوتوی کی تقریر	۹۹		
حکومت پر تنقید	۱۰۲	گہری سازش	۱۳۲
مباحثہ کا آخری اجلاس	۱۰۳	تھیا سوفیکل سوسائٹی	۱۳۳
الخوافیہ لعلکم تغلبون	۱۰۴	کتاب میں کیا ہے	۱۳۴
بہت بے آبرو ہوکر.....	۱۰۵	غور طلب بات	//
کیسی رسوائی ہوئی؟	//	ہندو مذہب پر تنقید کیوں	۱۳۵
میدانِ جنگ خالی ہوگیا	۱۰۶	کتاب کی حیرت ناک اشاعت	۱۳۷
مسلمانوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے	۱۰۷	اسلام کا ایک دوسرا حریف	۱۳۸
دعوتِ پنجہ آزمائی	//	اتنی رازداری کیوں برتی گئی	//
مباحثہ شاہ جہانپور کے اثرات	۱۰۸	اتحاد کی روایت ٹوٹ گئی	۱۴۱
پادریوں کی مرعوبیت	۱۱۰	ہم جواب کے لیے مجبور تھے	۱۴۲
حوصلے پست ہوگئے	۱۱۱	عملی جدوجہد شروع کردی گئی	۱۴۳
عیسائیت کی پناہ گاہیں	۱۱۲	پانی سر سے اونچا ہوتا چلا گیا	//
عیسائیت کا فتنہ اپنی موت آپ مرگیا	۱۱۳	حضرت نانوتوی کو دعوت نامہ	۱۴۴
ردِّ عیسائیت میں کتابیں	۱۱۴	علماءِ حق کا گروہ رُڑکی میں	//
مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح کی کتابیں	۱۱۵	حضرت نانوتوی کا سفر رُڑکی	۱۴۶
مناظرانہ رنگ کی کتابیں	۱۱۶	حضرت نانوتوی کی آمد کا شہرہ	۱۴۷
باب (۴)	۱۲۲	..... یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟	۱۴۸

بالمشافہ گفتگو	۱۴۸
اتمام حجت	۱۴۹
کھلے اجلاس میں جواب دیا جائے	۱۵۰
پنڈت جی کو آخری دعوت نامہ	۱۵۳
بغیر اسلام کے نجات ممکن نہیں	۱۵۴
رڑکی کی روداد حضرت نانوتوی کی زبانی	//
پنڈت دیانند میرٹھ میں	۱۵۷
حضرت نانوتوی میرٹھ میں	۱۵۸
حضرت نانوتوی کے بعد	۱۵۹
تصانیف	۱۶۰
قبلہ نما	//
انتصار الاسلام	۱۶۲
باب (۶)	۱۶۴
آریہ سماج کا فتنہ مسلمانوں کے لیے چیلنج بن گیا	//
آریہ سماج نے ملک میں آگ لگادی	//
ہندو مذہب تبلیغی مذہب نہیں	۱۶۵
فتنہ نے کہاں کہاں زور پکڑا	۱۶۶
شدھی سنگھٹن کی سرگرمیاں	۱۶۷
آریہ سماج فتنہ کی آماجگاہ ہیں	//
گاؤں کا گاؤں شدھی ہونے والا ہے	۱۶۸
ضلع آگرہ میں آریہ سماجی فتنہ	//
رستم گڈھی میں شدھی	۱۶۹
مختلف مواضعات میں شدھی	//
ضلع ایٹہ میں آریہ سماجی فتنہ	۱۷۰
علی گنج ضلع علی گڈھ میں شورش	۱۷۱
خطرے کا الارم	//
شدھی کی تاریخ مقرر ہوگئی	۱۷۲
آریہ بنانے کے لیے دولت کا استعمال	//
متعدد ضلعوں میں آریوں کی سرگرمیاں	۱۷۳
ضلع متھرا کی ایک رپورٹ	//
حالات پر ایک طائرانہ نظر	۱۷۴
دین کی حفاظت ہمارا پہلا فرض	۱۷۷
سرکلر اور ہدایات	۱۷۸
خصوصی کارکن	//
آگرہ سے رپورٹ اور مرکز سے ہدایت	۱۷۹
دوسری رپورٹ	//
مسلسل نگرانی و ہدایات	۱۸۰
مخدوش علاقوں میں مساجد و مدارس	۱۸۱
دولت کا جادو	۱۸۳
تحقیقات کی پیچیدگیاں	۱۸۴
باز پرس، تنبیہ و تاکید	۱۸۵
مرکزی دفتر ہر دم باخبر رہتا تھا	//
فتنہ کا استیصال	۱۸۶
باب (۷)	۱۹۰
قادیانیت کا فتنہ	۱۹۱
دعوئ نبوت	۱۹۲

مرزا غلام احمد پر وحی آنے کی کیفیت	۱۹۳	ندوۃ العلماء لکھنؤ کا فتویٰ	۲۱۰
احمدیوں کے علاوہ تمام مسلمان کافر ہیں	//	علماء دارالعلوم دیوبند کو دعوتِ مباہلہ	۲۱۲
پنجاب میں مسیلمۂ کذاب	۱۹۴	فراستِ مؤمن	//
باب (۸)	۱۹۶	یاددہانی پر یاددہانی	۲۱۳
قادیانیت کے خلاف صف آرائی	//	قادیان شہرِ خموشاں بن گیا	۲۱۴
قادیانیت کے دو مرکزی دفاتر	//	ایک دلچسپ مقدمہ اور فیصلہ	۲۱۶
قادیانیوں کا دائرۂ کار	۱۹۷	تھانہ بھون کا ایک اور فتویٰ	۲۱۷
افریقہ میں سرگرمیاں	۱۹۸	مباہلہ کی شہرت اور فتووں کا اثر	۲۱۸
اسلام پر کاری ضرب	۱۹۹	بہار میں قادیانیت	۲۲۰
قرآن کے تراجم	//	قادیانیوں سے مناظرہ	۲۲۲
کانٹوں کا ایک جنگل	۲۰۰	بہار میں قادیانیت کے خلاف مہم	۲۲۳
قادیانیت کے خلاف محاذ آرائی	//	ردِّ قادیانیت میں موصوف کی کتابیں	۲۲۴
مسیح موعود ہونے کا دعویٰ	۲۰۱	حیدرآباد میں قادیانیت	۲۲۵
مرزا غلام احمد نبی ہو گئے	۲۰۲	بہار میں جدوجہد کا ثمرہ	۲۲۷
سب سے پہلا فتویٰ	//	یہ آواز دُور تک گئی	۲۲۸
دعوتِ مباہلہ	۲۰۴	قادیانیت کے نادان دوست	۲۳۰
مرزا کا انجام	۲۰۵	تحقیق الکفر والایمان	۲۳۱
مرزا کی موت کے بعد	۲۰۶	فیصلہ کن مرحلہ آرہا ہے	۲۳۲
شیخ الہند کا فتویٰ	۲۰۷	قادیان میں مسلمانوں کے جلسے	۲۳۳
دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ	//	مناظرہ اور قادیانیوں کا فرار	۲۳۵
خانقاہ تھانہ بھون کا فتویٰ	۲۰۸	قادیانیت کے خلاف جہادِ عام	۲۳۹
مظاہر علوم سہارن پور کا فتویٰ	۲۰۹	پنجاب میں قادیانیت سہم گئی	۲۴۱
خانقاہ رائے پور کا فتویٰ	۲۱۰	فیصلہ کن گھڑی آگئی	۱۴۲

مقدمہ بہاول پور	۲۴۲	قادیان سے ربوہ تک	۲۶۴
فریقین کی تیاریاں	۲۴۳	پاکستان میں قادیانیوں کی توقعات	۲۶۵
مدعیہ عائشہ خاتون کی بے چارگی	//	علماء حق کی فراست ایمانی	۲۶۶
بہاول پور کے غیرت مند مسلمان	۲۴۴	پاکستان میں قادیانیوں کی سرگرمیاں	۲۶۹
مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوری	//	علماء حق کی جدوجہد کا آغاز	//
اکابر علماء کی موجودگی	۲۴۶	ایک اور مجاہد جلیل	۲۷۰
علامہ کشمیری کی بے چینی	//	تحریک کن مراحل سے گذری	۲۷۱
بیانات کا سلسلہ شروع ہوگیا	۲۴۷	اندرون ملک بیداری پیدا کرنے کی جدوجہد	۲۷۲
عدالت کا فیصلہ شائع کر دیا گیا	//	بیرون ملک سرگرمیاں	۲۷۳
مدار بحث کیا تھا؟	۲۴۹	عالم اسلام کے سربراہوں کو توجہ دہانی	//
مرزا کے کفر پر دلائل	۲۵۰	کرنل قذافی کے نام خط	۲۷۶
رد قادیانیت پر لٹریچر	۲۵۲	رابطہ عالم اسلامی کی تجویز	۲۷۹
علامہ کشمیری کے تلامذہ کی تصانیف	۲۵۳	مجاہدین اسلام میدان کارزار میں	۲۸۱
مولانا بدر عالم صاحب کی تصنیف	۲۵۷	فوج مارچ کرتی ہے	۲۸۲
مولانا محمد ادریس صاحب کی تصانیف	۲۵۸	خاموش احتجاج	۲۸۳
مفتی محمد شفیع صاحب کی تصانیف	//	تحریک کے مقصد کی وضاحت	۲۸۴
مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی تصانیف	۲۵۹	راستے کے نشیب و فراز	۲۸۵
مولانا نور محمد صاحب ٹانڈوی کی تصانیف	//	پھر صور بیداری پھونکا جائے	۲۸۶
مولانا عبدالغنی صاحب کی کتاب	۲۶۰	ایک قدم اور آگے بڑھا	۲۸۷
باب (۹)	۲۶۲	قرارداد کا متن	۲۸۸
آئینی طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کی داستان	//	وزیر قانون کا مسودۂ قانون	۲۸۹
	//	ہنگامہ خیز لمحات	۲۹۰
قادیانیت جسم اسلام کا ناسور بنتی رہی	۲۶۳	ایک صدی کی داستان	۲۹۴

باب (۱۰)	۲۹۵
شیعیت ایک فتنۂ عظیم بن گئی	۲۹۶
انگریزوں سے سازباز	//
میر جعفر کا کارنامہ	۲۹۸
مغلیہ سلطنت کے زوال میں شیعوں کا ہاتھ	//
علماء حق پر شیعوں کے مظالم	۲۹۹
اَودھ کی شیعی حکومت	۳۰۰
واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں	۳۰۱
ہندوستان میں شیعیت کا فروغ	۳۰۳
جنوبی ہند میں شیعی اثرات	۳۰۴
اَودھ میں شیعی اثرات	۳۰۵
غیر شیعہ پر شیعی اثرات	۳۰۶
شیعیت کے جراثیم کا اثر	۳۰۷
روزمرہ کی زندگی میں شیعی جراثیم	۳۰۸
باب (۱۱)	۳۱۳
شیعیت کے خلاف علماء حق جدوجہد کے میدان میں	//
عملی جدوجہد کا آغاز	۳۱۹
راہ کی دشواریاں	۳۲۳
کمک فراہم کی جاتی رہی	۳۲۴
مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری	۳۲۵
معرفۃ الکرامۃ	۳۲۸
غور وفکر کی راہیں بدل رہی ہیں	۳۲۹
میر قاسم بیگ کے نام ایک خط	۳۳۰

مراسم تعزیہ داری شریعت کی نظر میں	۳۳۳
ردّ روافض کی لگن	۳۳۶
امام اہلِ سنت	۳۳۷
پھر بُرے دن آگئے	۳۳۸
امام اہلِ سنت کی خصوصیات	۳۳۹
امام اہلِ سنت کی تصانیف	۳۴۱
مناظرے	۳۴۲
مناظروں کی روداد	۳۴۴
تحریری سرمایہ	//
مدح صحابہ یا قدح صحابہ	۳۴۵
علماء کا مقصد اصلاح تھا	۳۴۶
اصلاحی مہم کی کامیابی	۳۴۷
باب (۱۲)	۳۵۰
بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسم ورواج	۳۵۱
ہندو تہذیب کے اثرات	//
قبر پرستی کا رجحان	۳۵۲
بدعات کا لامتناہی سلسلہ	۳۵۳
اصلاح کا کام کتنا خطرناک تھا	۳۵۴
بدعات کے کچھ مناظر	۳۵۵
حریص صوفیاء	۳۵۸
عرسوں کی دھوم دھام	۳۵۹
ایک سیاح نے کیا دیکھا	۳۶۱
اجمیر کے عرس کا ایک اور منظر	۳۶۲

ایک منظر اور دیکھئے	۳۶۳	وہابیت کا الزام لگایا گیا	۳۹۲
گھوڑے ہم سے آگے نکل گئے	//	چبایا ہوا لقمہ چبا رہے ہیں	۳۹۳
اصل مجرم، علماءِ سوء	۳۶۴	انگریزی پروپیگنڈے کی مہم	۳۹۴
علاج آسان نہیں	۳۶۵	علماء سوء، میدان میں	۳۹۵
قبروں کی تجارت	۳۶۶	بدعات وخرافات کی تائید میں پہلی آواز	۳۹۷
باب (۱۳)	۳۶۹	براہین قاطعہ	۳۹۸
اصلاح کی پہلی مہم	۳۷۱	مصنوعی پیر کی سازش	۳۹۹
اصلاحی مہم کا ایک سرسری جائزہ	//	مناظرہ بہاولپور	۴۰۰
بدعات کا ایک تجزیہ	۳۷۷	اصلاح کا سلسلہ جاری رہا	۴۰۲
اصلاح کا سلسلہ در سلسلہ	۳۷۸	دوبارہ مدرسہ قائم کیا گیا	۴۰۵
خانوادہ ولی اللّٰہی کے علمی جانشین	۳۷۹	بدعات کی حمایت میں ایک فرقہ وجود میں آگیا	//
منصوبہ بند علاج کی تدبیریں	۳۸۰		//
قدیم اسلامی مدارس	۳۸۱	تکفیر کی منصوبہ بند مہم	۴۰۶
تزکیۂ قلوب	۳۸۲	دیارِ رسول کے علماء کو فریب	۴۰۷
اصلاح کا دوسرا مرکز دارالافتاء	۳۸۳	مکہ ومدینہ میں ریشہ دوانیاں	۴۰۹
استفتاء اور فتویٰ کے چند نمونے	۳۸۴	تلوار ہاتھ میں آگئی	۴۱۰
مروّجہ میلاد	۳۸۶	اہلِ بدعت کا ایک فرقہ بن گیا	۴۱۱
اہلِ قبور سے استمداد	۳۸۷	تفریق اور اشتعال	//
عرسوں میں جانا	۳۸۸	اظہارِ حقیقت کا ہر طریقہ اختیار کیا گیا	۴۱۳
آخری چہار شنبہ	۳۸۹	ملک میں دو محاذ	۴۱۴
یا رسول اللہ پکارنا	//	حسام الحرمین کی اشاعت کے بعد	۴۱۵
شبخون شروع کر دیا گیا	۳۹۰	راز کھل جاتا ہے	۴۱۸
ردّ بدعت کی ابتدائی بنیادی کتابیں	۳۹۱	ایک محاذ بنتا چلا گیا	۴۲۰

علماء حق میدانِ عمل میں	۴۲۱	مولانا محمد الیاس کاندھلوی	۴۴۱
اہلِ بدعت کا مرکز بریلی	۴۲۲	میو قوم کی اصلاح	۴۴۲
مناظرے ہی مناظرے	״	اَوروں کے ہادی بن گئے	۴۴۵
مناظرہ ادری	۴۲۳	ذہنی و فکری انقلاب کی تحریک	۴۴۶
مولوی نعیم الدین صاحب کا فرار	۴۲۵	مثالی قوم	۴۴۷
حق و باطل کے درمیان حدِ فاصل	۴۲۶	تبلیغی جماعت کا دوسرا دور	۴۴۸
مناظرہ بریلی	۴۲۷	تقسیم ملک کے بعد	۴۵۰
مناظرہ کی راہ کیوں اختیار کی	۴۲۸	بیرونِ ملک جماعتوں کی روانگی	۴۵۲
جامعہ رضویہ بریلی میں مناظرہ	۴۲۹	عرب ممالک میں دعوت و تبلیغ	۴۵۳
موضوعِ مناظرہ	۴۳۰	ترقی یافتہ ملکوں میں تبلیغی جماعت	۴۵۵
مولانا نعمانی کا جواب باصواب	۴۳۱	یورپ و امریکہ میں تبلیغی مہم	۴۵۶
تنگ آمد بجنگ آمد	۴۳۲	برطانیہ میں تبلیغی جماعت	۴۵۷
بے نتیجہ داستان	۴۳۳	امریکہ میں دعوت و تبلیغ	۴۵۹
باب (۱۴)	۴۳۶	دائرہ بتدریج بڑھتا رہا	۴۶۰
دعوت و تبلیغ	۴۳۷	جاپان میں دعوت و تبلیغ	۴۶۱
اصلاح کی دوسری راہیں	۴۳۸	یہ عظیم الشان تحریک	۴۶۲
اصلاح کا دوسرا طریقہ	۴۳۹	آخری بات	۴۶۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد دوسروں کے مقابلہ میں ہمیشہ کم رہی، لیکن چونکہ وہ ایک زندہ مذہب کے ماننے والے ہیں اور اپنے مذہب کی عظمت و برتری پر ان کو بجا طور پر فخر و ناز بھی ہے کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ دین و دنیا دونوں کے لیے کوئی مرتب و مدون قانون رکھتا ہے، اس کے برخلاف اسلام میں دینی و مذہبی احکام و قوانین کے ساتھ وہ مستقل معاشرتی و عائلی قانون بھی رکھتا ہے اور اس کی داخلی و خارجی زندگی سے متعلق بہت سے ایسے احکام اور قوانین ہیں جن کے نفاذ کے بغیر کوئی مسلم معاشرہ صحیح معنی میں برقرار نہیں رہ سکتا اس لیے ان قوانین کے نفاذ کے لیے جد و جہد بھی وہ کرتا رہتا ہے، خود مذہب اسلام کلی طور پر اپنے نفاذ کے لیے حکومت و اختیار کا متقاضی ہے۔

ان اسباب کی وجہ سے ہر فاتح قوم سے اس کا تصادم ناگزیر ہے اور برسر اقتدار طاقت بھی مسلمانوں کو ہمیشہ خوف اور شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے اور کوشش کرتی رہی ہے کہ اس کے امتیازات و خصوصیات کو فنا کر دے، ان کے تشخص اور امتیازی صفات پر جبر و استبداد کے فولادی ہاتھوں سے سیاہی پھیر دے اور قدرتی طور پر ان میں جو حاکمانہ اقتدار کے جذبات پرورش پاتے ہیں ان کو پوری طاقت سے کچل دے اور پامال کر دے، لیکن مسلمان جب تک صحیح معنی میں مسلمان ہے اور اس میں تاب مقاومت ہے وہ حالات کے سانچہ میں نہیں ڈھلتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے اور یہ اس کے ذہن و مزاج اور

اس کی مذہبی تعلیم کے بھی خلاف ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ حوادث سے دوچار ہوتا ہے، اور کبھی کبھی تو حوادث کی تیز آندھی اس شدت سے چلتی ہے جیسے کاغذ کے ٹکڑے کی طرح اس کو فضا میں اڑا لے جائے گی، لیکن ہر بار حوادث اپنا سر پیٹ کر رہ گئے اور سیلابِ بلا چیختا اور شور مچاتا ہوا ناکام و نامراد واپس لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایسے دو حادثے ناقابلِ فراموش ہیں اور ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ ایک غدر ۱۸۵۷ء کا حادثہ ہے، یہ حادثہ جب وقوع پذیر ہوا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب اس سرزمین میں مسلمانوں کا وجود چراغِ سحری ہے، اسباب و علل کی اِس دنیا میں اس کی بقا کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے، کوئی بھی تیز جھونکا اس چراغ کو ہمیشہ کے لیے گل کر سکتا تھا، مگر ابھی اس سرزمین کو توحید کے لاہوتی نغموں سے محروم کرنا قدرت کو منظور نہیں تھا۔ اس لیے مسلمان آگ اور خون کے اس دریا سے پار ہو گیا اور اپنے وجود کو ہندوستان کی سرزمین میں برقرار رکھ سکا، اس کے ہاتھوں سے زمامِ اختیار ضرور چھین لی گئی اور اس کے آٹھ سو سالہ اقتدار کو کُلّی طور پر پامال کر دیا گیا مگر وہ اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی حالات کے طوفانی حوادث سے محفوظ نکال لے گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء دوسرا حادثہ ۱۸۵۷ء سے ٹھیک نوّے سال بعد ۱۹۴۷ء میں ظہور پذیر ہوا، وہ ایک قیامت تھی جو اپنی تمام ہولناکیوں، تباہیوں اور بربادیوں کے ساتھ آئی اور اس کے سروں سے گذر گئی،

جس طرح کچے مکانات کی چھوٹی سی آبادی ہو جس کو سیلاب کا ریلا چاروں طرف سے گھیرتا چلا آ رہا ہو اور اس کی دیواروں سے ٹکرانے لگا ہو، پوری آبادی سیلاب کے رحم و کرم پر منحصر ہو کر رہ گئی ہو، لوگ اپنے خام مکانوں کی لرزتی کانپتی چھتوں پر بیٹھے اپنی زندگی کے لمحات کو شمار کر رہے ہوں، دل دھڑک رہا ہو، روح کانپ رہی ہو کہ دیوار اب بیٹھی، چھت اب زمین بوس ہوئی، چاروں طرف سیلاب کا بھوت منھ کھولے ہوئے پوری آبادی کو نگل جانے کے لیے بے تاب ہو رہا ہو، کچھ ایسا ہی دل دہلا دینے والا منظر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا تھا، حالات کا شکنجہ کستا جا رہا تھا، حوادث کا فولادی ہاتھ مسلمانو

کی گردنوں کو پوری قوت سے دبوچ رہا تھا جیسے اس خوں آشام عفریت کی پیاس اس وقت تک نہیں بجھ سکتی جب تک مسلمانوں کی رگوں کے لہو کی ایک ایک بوند نہیں چوس لے گا۔

لیکن تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ایسا نہ ہو سکا، کچھ ہی دنوں بعد سیلاب کھسکنے اور سمٹنے لگا اور پھر آبادی سے دُور چلا گیا، حوادث کا آہنی ہاتھ بتدریج ڈھیلا ہونا شروع ہوا اور آخر میں بے جان ہو کر گر پڑا، مسلمان سولی پر سے اتار لیا گیا اور پھانسی کے پھندے سے اس کی گردن آزاد ہو گئی۔

رحمت کے فرشتے:- کیا یہ اتفاقات کی معجز نمائی تھی؟ یا کسی طاقتور ہاتھ کی کرشمہ سازی؟ کس نے آنے والی تباہیوں اور بربادیوں کی آندھی سے کہا کہ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے، کس نے سیلابِ حوادث کے آگے روک لگا دی اور کہا کہ تمہاری گذرگاہ دوسری ہے؟ آپ تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کریں گے تو آپ حیرت و استعجاب کے دریا میں ڈوب جائیں گے کہ مسلمانوں کو آگ اور خون کے اس دریا سے نکالنے والی نہ کوئی حکومت تھی، نہ کوئی طاقتور ریاست نہ کوئی مسلح جماعت تھی نہ طاقت و قوت کا کوئی عملی مظاہرہ۔ مظلوم مسلمانوں پر چلنے والی ہلاکتوں اور بربادیوں کی سرخ آندھی کے ملگجے اندھیرے سے چند بوسیدہ حال انسانوں کا ہیولیٰ اُبھرا، نہتے اور خالی ہاتھ اسلام کا نام لینے والی ایک چھوٹی سی جماعت میدان میں اُتری اور طوفان کے سامنے سدِّ سکندری بن کر کھڑی ہو گئی، چہرے پر عبادت کا نور، سراپا سے زہد و تقدس کی پاکیزگی نمایاں، زبان میں جادو کا اثر، الفاظ و بیان میں سچائی، دل و دماغ میں تدبّر و فراست کا انمول خزانہ، علم و فضل کا پیکرِ لطیف، عزم و ہمت کے لحاظ سے سیسہ پلائی ہوئی دیوار، آہنی عزم و ارادہ کی مالک اس جماعت نے مسلمانوں کو اپنے حصار میں لے لیا اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان و یقین کی پوری توانائیوں کے ساتھ جدوجہد کے میدان میں اُتر گئی اور پھر کایا پلٹ گئی۔

دبستانِ دیوبند:- یہ ہندوستان کے صاحبِ کردار علماء حق کی جماعت تھی جو مدرسوں میں بیٹھ کر لوگوں کو ایمانی زندگی کا سبق پڑھا رہے تھے، خانقاہوں کی چٹائیوں سے تختِ شاہی کا کام لیتے تھے، وہ اپنے لیے نہیں اسلام کے لیے جیتے تھے، وہ خود کو دنیاوی لحاظ سے تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھتے تھے لیکن ان کی غیرتِ ایمانی کو ایک لمحہ کے لیے یہ برداشت نہیں تھا کہ اسلام کی آبرو پر آنچ آئے، تختۂ دار پر ان کو چڑھنا منظور

مگر اسلام کے نام لیواؤں کی نکسیر ٹوٹنی بھی ان کو منظور نہیں تھی، یہی وہ جذبہ تھا جس سے کام لیکر انہوں نے ہندوستان کی سرزمین میں اسلام اور مسلمان دونوں کے وجود کو بچالیا اور اسلام کے پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیا، تاریخ انہیں بہت دنوں سے پہچانتی ہے، ان کو شاملی کے محاذِ جنگ پر بھی دیکھا تھا اور دینی تعلیم کی اشاعت کے جذبے سے اسلامی قلعوں کی تعمیر کرتے ہوئے بھی اس نے ان کو پایا تھا، خارجی دشمنوں سے مقابلہ رہا ہو یا داخلی مداخلت کاروں سے تصادم ہر موچہ پر یہی جماعت مصروفِ جہاد رہی، برطانوی جیلوں کے چبوتروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں کی چٹائیوں تک ہر جگہ انہوں نے اپنے خونِ جگر سے عزم و عمل کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ اسلام کے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو انہیں کے خونِ جگر سے تیز ہوئی۔ آج دین کی راہوں میں جو کچھ اُجالا نظر آرہا ہے انہیں کے خونِ جگر سے روشن کیے ہوئے چراغوں کی روشنی کا ثمرہ ہے، آج ہندوستان میں اسلام اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ جو نظر آرہا ہے وہ نتیجہ ہے انھیں علماء دیوبند کی مسلسل جدوجہد کا، اسی دبستانِ دیوبند کے جوشِ عمل اور عظمتِ کردار کی داستان ہماری اس کتاب کا موضوع ہے۔

وقت کا اہم ترین فریضہ قیمتی سے قیمتی ہیرے جواہرات پر جب مرورِ ایام کی گرد بیٹھ جاتی ہے تو ظاہر بین نگاہیں ان کو پہچاننے سے قاصر رہتی ہیں کیونکہ وہ اس کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہیں ہوتیں، اب جوہری کا فرض ہے کہ ان کو اصلی تب و تاب کے ساتھ دنیا کی نگاہوں کے سامنے پیش کرے تاکہ حقیقت شناس نگاہیں ان کی قدر و قیمت کو پہچانیں۔ ہندوستان میں اسلام بھی انہیں حالات سے گذر رہا تھا اسلامی افکار پر غیر اسلامی افکار اور مشرکانہ عقائد و خیالات کی تہ اتنی دبیز ہوگئی تھی کہ اسلام کی اصلی شناخت ختم ہوتی جارہی تھی، علماء کا فریضہ تھا کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کو اس کی صحیح شکل و صورت میں پیش کریں، علماء دیوبند نے یہی کیا، دعوت و تبلیغ اور اصلاح کی جاں گسل راہوں پر چل پڑے۔ انہوں نے ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ پیش کرکے وہ کارنامہ انجام دیا جو تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اسلامی معاشرہ مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے دباؤ کے تحت غیر محسوس طور پر بدلتا جارہا تھا اس کی شکل و صورت میں تبدیلی آتی جارہی تھی، اسلام جیسے خالص توحید پرست مذہب پر مشرکانہ

عقائد وخیالات اور غیر اسلامی رسم ورواج کی چھاپ گہری ہوتی جارہی تھی۔ اس سلسلہ میں اندر اور باہر دونوں طرح کی طاقتیں مصروفِ کار تھیں، اسلام کو ان دشمن طاقتوں سے بچانا علماء کا سب سے اہم فریضہ تھا دبستانِ دیوبند نے اپنے اس فرض کو کس طرح ادا کیا؟ اس راہ میں ان کو اپنا کتنا خونِ جگر جلانا پڑا۔ تاریخ ہمیں پوری تفصیل سے یہ داستان سناتی ہے میں وہی ایمان افروز داستان آج آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

قیامِ دارالعلوم دیوبند:- ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا گیا۔ یہ ننھا سا پودا جو ایک چھوٹی سی گمنام آبادی دیوبند میں اللہ کے چند مقدس اور برگزیدہ بندوں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، تیرہویں صدی پوری ہوتے ہوتے ایک تناور درخت بن گیا۔ اس کا آغاز ایک بہت معمولی مکتب کی شکل میں ہوا اور جب چودہویں صدی شروع ہوتی ہے تو وہ عالم اسلام کی ایک مشہور ومعروف مذہبی یونیورسٹی بن چکا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام درحقیقت تجدید دین کی ایک اجتماعی تحریک کا نقطۂ آغاز تھا۔ اصلاح اُمت اور تجدید دین کے ایک مستحکم مرکز کا قیام تھا، تعلیم وتدریس کی ذمہ داریوں کے ساتھ علماء دیوبند نے اس فریضہ کو ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی جو وارثِ انبیاء ہونے کی حیثیت سے ان پر آتی تھی، یہی وجہ ہے کہ قیام دارالعلوم کے ساتھ ساتھ اسلام دشمن طاقتوں سے پنجہ آزمائی بھی شروع کردی گئی اور مسلمانوں کا معاشرہ جو غیر اسلامی عناصر سے مرکب تھا اس کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لیے زندگی کے آخری لمحے تک وہ مصروفِ کار رہے، انہوں نے اپنے اس فرض کی ادائگی میں ذرا بھی دیر نہیں کی اور بہت جلد بدعات وخرافات، مشرکانہ عقائد وخیالات کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا اور کتاب وسنت کی شاہراہ سے تمام باطل خیالات اور مشرکانہ عقائد وجذبات اور غیر اسلامی رجحانات کے خس وخاشاک کو دور کرنے کی مہم کا آغاز کردیا اور تجدید دین کی ساری راہوں میں اس جماعت کے افراد کے نقوشِ قدم نظر آنے لگے، بحث ومناظرہ سے لے کر دینی تعلیم کی اشاعت اور مسلمانوں سے جہالت کو دور کرنے کی غرض سے سیکڑوں اور ہزاروں مدرسوں اور مکتبوں کا قیام تصنیف وتالیف کی راہ سے ہزارہا ہزار کتابوں کی نشر واشاعت، مسندِ

رُشد و ہدایت اور خانقاہوں سے تزکیۂ باطن اور اصلاح حال کی سرگرمیاں، عیسائیوں آریوں قادیانیوں، شیعوں، بدعتیوں اور خرافاتیوں کا تعاقب کرنا، وعظ و تبلیغ کی راہوں سے ساری دنیا میں عامۃ المسلمین کو دین کی راہوں پر لگانا، غرضیکہ تجدید دین کا کون سا پہلو ہے جس پر دبستانِ دیوبند نے عظیم الشان اور انقلاب آفریں کارنامے نہ انجام دیئے ہوں، ان حقائق کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ قدرت نے چودھویں صدی میں تجدید دین کی ذمہ داری دبستانِ دیوبند کو سپرد کی ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

داخلی و خارجی فتنے:- دارالعلوم دیوبند کے قیام کا زمانہ وہ ہے جب مسلمانوں پر ایک ہیبت ناک اور روح فرسا قیامت گذر چکی تھی، سلطنتِ مغلیہ کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون کے قید خانے میں بھیجا جا چکا تھا اس کام سے فارغ ہوتے ہی انگریزوں نے مسلمانوں کے دماغوں سے حکومت کی بو باس ختم کرنے کے لیے دہلی کے چوراہوں پر ان گنت سولیاں کھڑی کر دیں اور بے شمار ممتاز اور سربرآوردہ مسلمانوں کو گرفتار کر کے ہزاروں تماشائیوں کے ہجوم کے سامنے پھانسیاں دیدیں تمام مسلمانوں کو بزورِ شمشیر دہلی شہر سے نکال دیا گیا، اور اس وقت تک ان کو دہلی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی جب تک ان کی بے چارگی، بے کسی، مظلومیت اپنی انتہا کو نہیں پہونچ گئی، بے تحاشا گرفتاریاں اور وحشیانہ طور پر پھانسیاں دے کر مسلمانوں کو یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا گیا کہ ہندوستان میں اب ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔

انگریز قوم انتہائی جاہ و جلال، رعب داب، نادر شاہی، ہیبت اور ہٹلرانہ خونخواریوں کے ساتھ آمر مطلق بن کر دہلی پر قابض ہو چکی تھی، دہلی کے کسی مسلم محلہ میں تنہا ایک انگریز گذر جاتا تو مسلمانوں کا ہزاروں کا مجمع کائی کی طرح پھٹ جاتا اور گھروں میں چھپ جاتا، جیسے کوئی آدم خور درندہ انسانوں کی آبادی میں گھس آیا ہو، برسوں مسلمانوں کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کسی ناکردہ جرم میں گرفتار کر کے پھانسی پر نہ لٹکا دیا جائے، یہی ماحول اور یہی حالات تھے جب مسلمانوں کا مادی وجود انگریزوں کی چمچاتی ہوئی تلواروں کے سائے میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا کہ اس کے دینی، مذہبی اور تہذیبی وجود کو مٹا دینے کا لندن پارلیمنٹ نے فیصلہ کر دیا، اور طے کیا گیا کہ ہندوستان کو بہ جبر و

اکراہ عیسائی بنا دیا جائے۔

خارجی فتنے :۔ لندن پارلیمنٹ کے اس فیصلہ کے بعد مسلمانوں کے مذہبی و تہذیبی وجود کو فنا کر دینے کے لیے پادریوں کا ایک لشکر جرار ہندوستان بھیج دیا گیا اور ۱۳ نے سندھ اور ملتان سے لے کر آسام و بنگال کی سرحد تک مسلمانوں کو اپنے حصار میں لے لیا اور اس طرح کہ مسلمانوں کے لیے کوئی جائے فرار نہیں رہ گئی، چونکہ مسلمانوں کا نیر اقبال غروب ہو چکا تھا اور اس کے دوبارہ طلوع ہونے کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے، اس لیے برادران وطن کا ایک طبقہ آریہ سماج بھی مسلمانوں کے مُنہ آنے لگا، عیسائی مناظرین کی ہرزہ سرائی کے ساتھ آریہ سماجی اسلام اور مسلمانوں پر سخت ترین اور دل آزار اعتراضات والزامات عائد کر کے مسلمانوں کی مرعوبیت و بے چارگی کے احساس میں اضافہ کرنے کے لیے میدان میں آ گئے، اس طرح عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی دو طرفہ فوج نے مسلمانوں کے تہذیبی وجود کو اپنے نرغہ میں لے لیا۔

داخلی فتنے :۔ چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرنے والے ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں مسلمانوں کی مظلومیت اور انگریزی اقتدار کے چڑھتے ہوئے سورج کے ساتھ پنجاب میں ایک شخص پیدا ہوا جس نے انگریزوں کی اسلام دشمن حکومت کی حمایت اور مسلمانوں سے جذبۂ جہاد کو فنا کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی پھر برطانوی تلواروں کے سایہ میں اس نے مسیح موعود اور مہدی آخر الزماں اور آخر میں نبوت کا دعویٰ کر کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو اپنے حلقہ اطاعت میں لے کر ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا اور ان کو مرتد بنا دیا، اس شخص کا نام مرزا غلام احمد قادیانی تھا، تیرہویں صدی کے نصف آخر میں اس کا فتنہ شباب پر تھا۔

داخلی فتنوں میں دوسرا فتنہ شیعیت کا تھا جو قادیانیت سے بھی قدیم تھا، ہندوستان میں اس کی بنیاد جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں پڑی جس نے ایک ایرانی عورت نور جہاں پر فریفتہ ہو کر اس کو حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا اور خود شراب ارغوانی میں غرق ہو گیا، نور جہاں کی داخلی خود مختاری کا علم جب اہل ایران کو ہوا تو وہاں سے کھیپ کی کھیپ شیعوں کی آنے لگی اور

حکومت کے کلیدی عہدوں پر وہ قابض بنا دیئے گئے اور پھر ایک وقت آیا کہ بہت سے شیعوں کو جاگیردار بنا دیا گیا اور وہ اپنے اپنے علاقوں کے خود مختار حکمراں ہو گئے، اس بہتی گنگا میں میر سید محمد امین کو اودھ کی جاگیر مل گئی اور پھر بتدریج یہ نوابی شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی اور نوابانِ اُودھ کو بادشاہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

شیعیت نے اپنے دورِ عروج میں سیکڑوں مشرکانہ عقائد و خیالات مسلمانوں میں جاری کر دیئے اور پورے اسلامی معاشرہ میں شیعیت کے جراثیم پھیلا دیئے جو بتدریج اہل سنت والجماعت کے مسلمہ عقائد میں شامل ہو گئے۔

تیسرا فتنہ دنیادار مفاد پرست پیروں اور علماء سوء کا تھا، ان کی وجہ سے توحید و سنت کے بجائے بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد و خیالات اَن پڑھ مسلمانوں میں پھیل گئے، شیعوں نے حُبِّ اہل بیت کا ڈھونگ رچا کر اسلام کو تباہ و برباد کرنے کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا تھا، ان خرافاتیوں نے حُبِّ رسولؐ کا بلند بانگ دعویٰ کر کے رسول کو اور اولیاء کبار کو الوہیت کے مقام پر کھڑا کر دیا، پھر اس عقیدے کے اور بھی برگ و بار پیدا ہوئے، ہندوستان میں ہزاروں قبروں کو خانہ کعبہ سے بڑھ کر مقدس بنا ڈالا اور سارے خدائی اختیارات ان بزرگوں کے لیے مان کر لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو توحید و سنت سے منحرف کر دیا، اور خدائے واحد کے ایک آستانہ جاہ و جلال سے ہٹا کر ہزاروں آستانوں پر ان کی مقدس پیشانیوں کو سجدہ ریز کر دیا، عرس، قوالیاں، ہارمونیم اور ڈھول کا تال سُر تصوف و معرفت کے وسیلے اور ذریعے بن گئے، قبروں کے چڑھاوے اور نذرانے ذریعۂ معاش بن گئے اور ہر مزار پر مالِ تجارت کی طرح کسی خاندان کا قبضہ ہو گیا اور صاحبِ مزار کے کشف و کرامات کے فرضی قصوں کو شہرت دے کر ناخواندہ عوام کی نگاہوں میں ان کو سارے خدائی اختیارات کا مالک بنا دیا، اَن پڑھ مسلمانوں کا جمِّ غفیر ان مزاروں پر ٹوٹ پڑا۔

ہندوستان کا مسلمان تیرہویں صدی کے نصفِ آخر میں جن خارجی اور داخلی فتنوں میں گھرا ہوا تھا اور ایمان سوز ماحول کا شکار تھا یہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے، دین کی صحیح تعلیم عنقا تھی، ہر طرف بدعات کا دَور دَورہ تھا اسی ماحول اور انہیں حالات میں

اللہ کے چند مقدس بندوں نے دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارن پور، جامعہ قاسمیہ مرادآباد اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی بنیادیں ڈالیں۔

ہم اس اجمال کی تفصیل آئندہ اوراق میں پیش کریں گے تاکہ آپ کے سامنے ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی و مذہبی زندگی جن اسلام دشمن، توحید مخالف عقائد و خیالات کا شکار تھی اس کی واضح تصویر سامنے آجائے، اس کی روشنی میں آپ دبستانِ دیوبند کی عظیم الشان خدمات کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرسکیں گے۔

باب (۱)

عیسائیت

انیسویں صدی کا فتنۂ عظیم

عیسائیت کی چیرہ دستیاں

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے بڑے حصہ پر قابو پا چکی تھی اور انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اسی وقت سے یہ پالیسی بن چکی تھی کہ اس "سونے کی چڑیا" کو اگر قبضہ میں رکھنا ہے تو اس کی شرطِ اولین یہ ہے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ دیا جائے اور ہندوستانیوں کو ترغیب و تحریص اور ضرورت پڑے تو طاقت و جبر سے عیسائی بنا دیا جائے، اور اسی نقطۂ نگاہ سے عملی اقدامات کا آغاز بھی ہو چکا تھا، لندن میں باقاعدہ ایک مرکز علمی صرف اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ عیسائی مشنریوں کو اردو، فارسی اور عربی کی مکمل تعلیم دی جائے، اور وہ مرکز برسوں سے ایسے پادریوں کی ایک فوج تیار کرنے میں مصروف تھا جو علوم اسلامی اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے پوری طرح واقف ہوں اور مسلمانوں کے مجمع میں فراٹے سے اردو میں تقریریں کر سکیں۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے کچھ پہلے ان تربیت یافتہ پادریوں کی فوج آنا شروع ہو گئی تھی، اور انگریزی حکومت ان کو ہندوستان کے اہم اور مرکزی مقامات پر متعین کر چکی تھی اور ان کی سرگرمیاں زور شور سے جاری تھیں، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کو عیسائی بنا لیا گیا تو اس کی وجہ سے انگریزی سلطنت کے استحکام میں بہت بڑی مدد ملے گی، اور ملک کے بت پرستوں اور دوسرے باشندوں کو عیسائی بنا لینا بہت آسان ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں انگلستان کی پارلیمنٹ پر زور دیا گیا کہ وہ ہندوستان میں یہاں کے باشندوں کو عیسائی بنانے کی مہم میں مقیم انگریزی حکام کی مدد کرے اور اگر ہو سکے تو یہاں کے

باشندوں کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم شروع کر دے، مگر چونکہ جبراً و زبردستی عیسائی بنانے میں بہت سے خطرات تھے اس لیے اس کی کھلم کھلا تو حمایت نہیں کی گئی البتہ یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان میں ایسے گورنر، کلکٹر، وائسرائے، کمشنر اور دوسرے عہدیدار مقرر کیے جائیں جن کو مذہبی مناظروں اور مباحثوں سے دلچسپی ہو اور جو اپنے سیاسی فرائض انجام دیتے ہوئے مشنری فرائض بھی انجام دیتے رہیں، چنانچہ اس مقصد سے جو عہدیدار مقرر ہوئے ان کے ذمہ یہ فرض لگایا گیا کہ وہ اسلام کے خلاف کتابیں لکھیں اور اپنے ماتحت مسلمان ملازموں سے گفتگو کر کے ان کو عیسائی بنائیں۔

سر ولیم میور جو اعلیٰ درجہ کے پادری اور مشنری تھے انھیں اسی لیے ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا گورنر بنایا گیا اور انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران "لائف آف محمد"، "کتاب خلافت"، "شہادت قرآنی بر کتب ربانی" اور اسی طرز کی اور دوسری کتابیں لکھیں، اور اسلام کے خلاف پادریوں اور عیسائی منادوں کی ایک پوری فوج کھڑی کر دی۔

اسی کے ساتھ یورپ کی ایک انجمن "متحدہ مذہبی مجلس" نے اسلام پر شدید حملہ کرنے کے لیے مناظر پادریوں کا ایک زبردست جتھہ تیار کر کے ہندوستان بھیج دیا جس کے سرخیل P. FANDAR پی، فنڈر قرار پائے، پادری لیفرائے، پادری منسل اور دوسرے بڑے بڑے پادری جو عربی، فارسی اور اردو زبان پر عبور رکھتے تھے پادری فنڈر کے معاون بنائے گئے۔ خود فنڈر بھی عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور اردو زبان پر پوری طرح قادر تھا، پادری فنڈر نے ہندوستان آکر اسلام کے قلعہ پر پہلا گولہ اپنی کتاب "میزان الحق" کی شکل میں پھینکا اور پھر "طریق الحیات"، "حل الاشکال"، "طلوع آفتاب صداقت" اور دوسری کتابیں لکھ کر شائع کیں، خلاصہ یہ کہ اس زمانے میں اسلام کے خلاف یورپ کی یہ متحدہ یورش تھی جو مذہب کے رنگ میں کی گئی اور جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور لندن پارلیمنٹ دونوں کو کامیابی کی پوری پوری توقع تھی

دل آزار طریقہ کار:- چونکہ سلطنت مغلیہ اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی اور اس میں کوئی دم نہیں تھا اس لیے پادریوں کی دریدہ ذہنی حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ پادری فنڈر روزانہ دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ناواقف عوام کے سامنے

عیسائیت کے مناقب و فضائل پر تقریریں کرتا تھا اور اسلامی تعلیمات میں کیڑے نکالتا تھا، ایک طرف انگریزی حکومت کا رعب داب اور ہیبت تھی، دوسری طرف پادریوں کی یک طرفہ تقریریں تھیں اور کسی کو ان کے سامنے لب کھولنے کی ہمت نہیں تھی، اس لیے ان کی تقریروں کا عوام پر کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا تھا، کچھ لوگ اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر چکے تھے اور اس دور کے بہت سے اسلامی نام کے پادریوں کا تاریخوں میں جو ذکر آتا ہے جیسے پادری محی الدین، پادری صفدر علی وغیرہ یہ وہی ہیں جنہوں نے اس وقت اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی اور جن لوگوں نے ان پادریوں کی تقریریں مسلسل سنی تھیں ان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جن کا ایمان متزلزل ہو چکا تھا جیسا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح نے اپنی کتاب "ازالۃ الشکوک" کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

چونکہ تبلیغ عیسائیت کی مہم پورے زور شور سے جاری تھی، ہر مرکزی شہر میں ان کا پریس تھا اخبار تھے اور ہر سنٹر میں عیسائی مناظرین و مقررین کی پوری فوج رہتی تھی اور وہ شب و روز اسی مہم میں مصروف تھے اس لیے وہ کامیاب بھی ہو جاتے تھے اور کوئی نہ کوئی عیسائی ہوتا رہتا تھا پھر عیسائی ہو جانے والوں کا اعزاز و اکرام بھی ہوتا تھا، خوش حالی اور فارغ البالی ان کے قدم چومنے لگتی تھی اور انگریزی حکام سے رابطہ کی وجہ سے ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی، اس لیے ترغیب و ترہیب دونوں راہوں سے عیسائیوں کی کامیابی کے آثار واضح طور پر نظر آتے تھے۔

پادری اور پولیس ساتھ ساتھ:۔ مبلغین عیسائیت کا جواب دینے کی کسی میں ہمت نہیں تھی کیونکہ ابھی ابھی مسلمانوں پر ۱۸۵۷ء ایک قیامت بن کر نازل ہو چکا تھا، انگریزی حکومت ہر مسلمان کو اپنا دشمن تصور کرتی تھی، ان گنت معزز اور سربرآوردہ مسلمانوں کو دلی کے چوراہوں پر سولیوں پر لٹکتے ہوئے لوگوں نے دیکھا تھا اور ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ پادریوں کی زبان میں حکومت بول رہی ہے اور یوں بھی ہر پادری کے ساتھ پولیس کا ایک دستہ بھی رکھا جاتا تھا جو ہر ضلع کلکٹر کی ذمہ داری تھی کہ پادریوں کی ہر طرح مدد کی جائے، اس لیے فضا میں ہر طرف ایک مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا، اس ڈراونے سناٹے میں صرف پادریوں کی آواز اور زہریلی تقریریں ہی سنائی دیتی تھیں، اخبارات روزانہ عیسائی ہو جانے والے خاندانوں کی خبریں شائع کر رہے تھے۔

ان حالات کو دیکھ کر دین کا درد رکھنے والے مسلمان پیچ و تاب کھا رہے تھے لیکن بے بسی کا وہ عالم تھا کہ اس کے خلاف زبان کھولنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی اس لیے حکومت کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر ایسی زبردست چوٹ لگائی جائے جو اس کو یاس و نا اُمیدی کے گہرے غار میں گرا دے اور اس کا واحد طریقہ کار یہ طے کیا گیا کہ دہلی کی شاہ جہانی جامع مسجد جو مسلمانوں کے دورِ عروج کی اہم ترین نشانی کے طور پر قلبِ شہر میں کھڑی ہے اس کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال کر گرجا گھر کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔

موسیو گارسان دتاسی :- یہ ساری داستان جو حقائق پر مبنی ہے ہم کو فرانس کا مشہور مستشرق موسیو گارسان دتاسی سناتا ہے جو پیرس یونیورسٹی میں السنۂ شرقیہ کا استاذ تھا، اور وہ ہر سال اپنے طلبہ کے سامنے سال کے آخر میں ایک لیکچر دیتا تھا جس میں وہ اُردو زبان کے ارتقاء پر تبصرہ کرتا تھا اور ہندوستان میں اردو زبان کے نشو و اشاعت اور ادبی ترقی کا جائزہ پیش کرتا تھا۔

ساری معلومات وہ پیرس میں بیٹھ کر مختلف ذرائع سے حاصل کرتا تھا وہ ہندوستان میں متعین انگریز عہدے داروں سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھتا تھا اور ان سے اس سلسلہ میں ضروری معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا رہتا تھا، ان سے شعراء کے دیوان، اردو میں شائع ہونے والی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے نسخے اور شمارے بھی منگاتا تھا اور ان کا مطالعہ کر کے اپنے لیکچر میں ان تمام اخباروں، رسالوں اور شعراء کے دیوانوں کی قدر و قیمت، ادبی معیار، مصنفین اور مدیرانِ جرائد کے حالات ان کی مساعی کی قدر و قیمت بھی ظاہر کرتا تھا، اسی سلسلہ میں وہ بعض اوقات ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی ایک خاص انداز میں کر جاتا ہے، وہ پکا عیسائی ہے اور ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ سے اُسے بڑی دلچسپی ہے وہ عیسائی مبلغین کی کوششوں اور کامیابیوں اور حکومت کی سرگرمیوں کو بڑے شوق سے اور لذت لے لے کر بیان کرتا ہے۔

اس کے ان لیکچروں کا اردو ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد شائع ہو چکا ہے۔ میں اسی سے جستہ جستہ عیسائیت کی اشاعت کی تفصیل پیش کر رہا ہوں۔

یہ خطبات ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹ سال کے عرصہ میں دیئے گئے ہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جب عیسائیت کی تبلیغ پر انگریزی حکومت پورا زور صرف کر رہی تھی۔

ایک شاہزادہ عیسائی ہوا:۔ موسیو گارسان دتاسی ۵ دسمبر ۱۸۵۵ء کو اپنا لکچر دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

"رومن کیتھولک نقطۂ نظر سے سردھنہ ان صوبجات میں ایسا ہے جیسے صحرا میں نخلستان، یہاں رومن کیتھولک مشنریوں نے مطبع قائم کیا ہے جس میں حال ہی میں علاوہ اور چیزوں کے مذہبی عقائد کے سوال وجواب کی کتاب چھپی ہے، پروٹسٹنٹوں کی مذہبی مطبوعات کا میں آپ سے ذکر نہیں کروں گا وہ بلاشبہ بہت زیادہ ہیں اور ان کی اشاعت سے اہلِ ہند میں رفتہ رفتہ عیسائی خیالات کی اشاعت ہوتی رہتی ہے

گذشتہ سال میں نے آپ سے رام چندر کے نیگلیکن فرقہ کی عیسائیت قبول کرنے کا ذکر کیا ہے اور میں نے ابھی ابھی اس کے اخبار کا ذکر کیا ہے جس کے وہ ایڈیٹر ہیں، اسی سال ایک ہندوستانی شاہزادہ کا ذکر کرتا ہوں اور صرف یہی ایک ہندوستانی شہزادہ ہے جو ہمارے زمانہ میں عیسائی ہوا ہے، یہ مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شہزادہ ہے اور اس نے فتح گڑھ میں گذشتہ مارچ میں آٹھ مارچ کو عیسائی مذہب اختیار کیا ہے[1]"

مسلمانوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے:۔ اس نے اپنے پانچویں خطبہ میں بعض ان مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے عیسائیت قبول کرلی ہے وہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء کو لیکچر دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

"ہندوستان کے مصنفین میں بعض ایسے ہندو بھی پائے جاتے ہیں جو عیسائی ہوگئے ہیں، نیز بعض مسلمان بھی ہیں جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار

---

[1] خطبات گارسن دتاسی ج ۱ ص ۵۵ خطبہ ہفتم مورخہ ۲۹ نومبر ۱۸۵۳ء

کرلیا ہے۔

ایک اردو شاعر کی نسبت جس کا تخلص شوکت ہے اور جو نصرانی ہوگیا تھا شیفتہ اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ شوکت بنارس میں ایک یورپین کا بڑا دوست تھا، اور اس کی ترغیب سے اس نے اسلام ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کرلیا، چنانچہ اس نے اپنا نام بھی منیف علی سے بدل کر منیف مسیح رکھ لیا ہے۔ ایسی حالت میں نام کی تبدیلی اکثر و بیشتر صورتوں میں ضروری ہوتی ہے، ہندوستانی زبان کے ایک اور شاعر نے جو عیسائی ہوگیا ہے اپنا نام فیض محمد سے بدل کر فیض مسیح رکھ لیا ہے[1]۔

اشاعتی لٹریچر:- ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کے لیے باضابطہ حکومت کی طرف سے باتنخواہ پادری اور کارکن رکھے گئے تھے اور وہ اردو فارسی سے بخوبی واقف تھے ان کو پریس اور چھاپہ خانے کی تمام سہولتیں بھی فراہم کی گئی تھیں اور وہ بڑے پیمانے پر اخبارات، رسالے اور کتابیں شائع کرتے تھے، ان مطبوعات میں عیسائیت کے فروغ اور اس کی اشاعت کے پہلو کو اولیت دی جاتی تھی، اس سلسلہ میں گارسان دتاسی اپنے ساتویں لیکچر میں جو اس نے ۴ر دسمبر ۱۸۵۶ء کو دیا تھا اس میں کہتا ہے:-

حضرات! میں نے آپ کو ان مذہبی کتابوں کا حال نہیں سنایا جو سرگرم مبلغین عیسائیت دیسیوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے شائع کرتے رہتے ہیں، ایسی کتابوں میں "عہد نامہ قدیم" اور خصوصیت کے ساتھ "عہد نامہ جدید" کے ترجمے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، چاہے ان مقدس کتابوں کو پڑھ کر بہت کم ہندوستانیوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہو تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن لوگوں نے انھیں پڑھا ہے ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور زیادہ خوشی کی ضرور ہوئی ہوگی[2]۔

---

[1] خطبات گارسان دتاسی ج ۱ ص ۱۳۲ [2] خطبات گارسان دتاسی ج ۱ ص ۲۱۴۔

پورے ملک میں جال پھیلایا گیا:- یورپ میں دو فرقے عیسائیوں کے خصوصی شہرت رکھتے ہیں ایک رومن کیتھولک اور دوسرا پروٹسٹنٹ، حکمراں انگریز مؤخرالذکر فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن عیسائیت کے فروغ میں باہمی اختلافات کی جھلک نہیں آنے دیتے تھے بلکہ دوسرے فرقہ کو بھی حکومت کا پورا تعاون حاصل تھا، دونوں فرقے الگ الگ اپنے طور پر تبلیغ عیسائیت کے کام میں تن من دھن سے لگے ہوئے تھے جیسا کہ ہم کو گارسان دتاسی بتاتا ہے، وہ اپنے آٹھویں خطبے میں جو اس نے ۱۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کو دیا ہے، کہتا ہے:-

"بہرحال پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک مبلغین کے درمیان تو کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں سے یکساں برتاؤ کیا جاتا رہا ہے اور انگریزی حکومت نے پروٹسٹنٹ ہونے کے باوجود رومن کیتھولک کو پوری آزادی دے رکھی ہے، فوجی چھاؤنیوں میں رومن کیتھولک فرقے کے مذہبی پیشواؤں کو تنخواہ دی جاتی تھی اور خود اپنے مقبوضات کے قلب میں تین خانقاہیں آگرہ، سردھنہ، سیالکوٹ میں عورتوں کے لیے بنانے کی اجازت دے دی تھی۔ علاوہ ازیں رومن کیتھولک تعداد میں پروٹسٹنٹوں سے زیادہ تھے، اول الذکر کے دو اسقف یا عاقب احاطہ بنگال میں تھے بمبئی کے لیے، پھر مدراس، حیدرآباد، وزیرنگاپٹم، میسور، کوئمبتور، سردھنہ آگرہ، پٹنہ، ویرا پلی، کنٹرالین، منگلور، کرکولم اور آندھرا میں الگ الگ اسقف تھے مجموعی تعداد ان اسقفوں یا عاقبوں کی ۱۶ تھی، برخلاف اس کے خود انگریزوں کے چرچ یعنی اینگلیکن کلیسا کے ہندوستان بھر میں صرف تین اسقف تھے (بڑے پادری) ایک کلکتہ، ایک مدراس اور ایک بمبئی میں[1]"

دہلی جامع مسجد کو گرجا بنانے کا ارادہ:- انگریزی حکومت کے بے انتہا مظالم اور جور و استبداد کے خلاف [illegible] کارروائیوں کی وجہ

---

[1] خطبات گارسان دتاسی ج ۱ ص ۲۱۷-۲۱۸

سے سارے ملک میں ایک دہشت اور مرعوبیت کی فضا بن گئی تھی اور انگریزی حکومت یہ سمجھنے لگی تھی کہ ہندوستانیوں کے مذہب، ضمیر اور رائے کے خلاف کوئی بڑے سے بڑا کام بھی کیا جائے گا تو کسی ہندوستانی میں اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت و جرأت نہیں ہو سکتی، اس کا ان کو اتنا یقین تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے کلیجہ پر اپنے اقتدار و رعونت کا پرچم گاڑنے کا تہیہ کر لیا تاکہ مسلمان دیکھے اور تلملائے، خون کا گھونٹ پیے لیکن لب نہ کھول سکے، دل خون بن کر آنکھوں میں اتر آئے لیکن احتجاج کے لفظ سے اس کی زبان آشنا نہ ہو سکے جیسا کہ گارساں دتاسی ہم کو بتاتا ہے:-

"بلاشبہ دہلی میں عہدہ اسقفی قائم کرنے کا سوال درپیش ہے اور یہ بھی تجویز ہے کہ سرخ گار کے پتھروں کی شاہ جہانی مسجد جامع کو کیتھڈرل یعنی منبردار گرجا میں تبدیل کر دیا جائے، بشرطیکہ پایہ تخت دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں کے شدید حملے میں وہ محفوظ ہو،

علاوہ ازیں کنٹربری کا لاٹ پادری مطالبہ کر رہا ہے کہ تین بڑے پادریوں (اسقفوں) کا جدید تقرر عمل میں لایا جائے: ایک لاہور میں پنجاب کے لیے، دوسرا آگرہ میں صوبہائے شمال مغربی کے لیے، اور تیسرا تناولی میں جنوبی کرناٹک کے لیے، مزید برآں رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے سے تبلیغ کے باب میں سبقت لے جانے کی کوششوں میں سرگرم ہیں، رومن کیتھولک ہندوؤں کو عیسائی بناتے ہیں اور پروٹسٹنٹوں کی نظر صرف مسلمانوں پر ہے کیوں کہ مسلمانوں کو بتوں اور مجسموں سے جو کیتھلکوں کے یہاں ہوتے ہیں بہت نفرت ہے"[1]

عیسائی لٹریچر کی تفصیل:- حالات اور مواقع کے لحاظ سے مختلف انداز سے کتابیں لکھی جاتی تھیں، البتہ بنیادی کتابوں اور ان کو سہل بنانے اور اس کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا کام بھی زوروں پر جاری تھا ہمیں گارساں

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ج ۱ ص ۲۱۸

دتاسی اپنے گیارہویں لیکچر میں جو اس نے ۲ر دسمبر ۱۸۶۱ء کو دیا تھا، ہمیں کچھ تفصیل بتاتا ہے، وہ کہتا ہے:-

"انجیل کے اُردو ترجمہ کا تعارف کرانے کے بعد وہ کہتا ہے کہ میں ان مبلغین مسیحیت کی ساری کتابوں کے متعلق تفصیل سے ذکر نہیں کروں گا اس واسطے کہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا، یہ لوگ انجیل مقدس کی تعلیمات کی بڑے جوش و خروش سے نشر و اشاعت کر رہے ہیں، مذہبی قسم کی مطبوعات جو حال میں شائع ہوئی ہیں اور جن کا مجھے علم ہے ایک کتاب "سچے اوتار" یعنی خدا کے انسانوں میں حلول کرنے کے متعلق لکھی گئی ہے، ایک حقیقی تثلیث اور ہندوؤں کی "تری مورتی" کے متعلق ہے، ایک کتاب میں اسلام کی ابتداء اور عروج و زوال پر تبصرہ ہے، ان کتابوں کے علاوہ بہت ساری انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں جن میں سے متعدد فرانسیسی میں بھی موجود ہیں "حضرت سلیمان کی امثال" اور "پہاڑی وعظ" کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے، بمبئی کی "مسیحی انجمن کتب و رسائل" بھی اپنے کام میں مشغول ہے، اس انجمن نے ۲۳۰ چھوٹی بڑی کتابیں شائع کی ہیں جو ہندوستانی اور دوسری زبانوں میں بھی ہیں، اس قسم کی تبلیغی کتب کو تقسیم کرنے کے علاوہ مبلغین مسیحیت ملک کے طول و عرض میں کلیساؤں اور گرجاؤں کی بنیادیں ڈال رہے ہیں اور مدرسے قائم کر رہے ہیں[1]"

کلیسا کی کامیابی:- عیسائیت کی اشاعت کے سلسلہ میں سرگرمیوں کی کامیابی پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے گارسان دتاسی اپنے تیرہویں لیکچر میں جو اس نے ۷ر دسمبر ۱۸۶۲ء کو دیا تھا، وہ کہتا ہے:-

"انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انھیں خوب کامیابی

---

[1] خطبات گارسان دتاسی ج ۱ ص ۳۰۳ - ۳۰۴

ہو رہی ہے، ہر روز اینگلو انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں بنگال، صوبہائے شمالی و مغربی صوبہ بمبئی اور صوبہ مدراس میں دیسی عیسائیوں کی تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار آٹھ سو ترانوے (۱۱۸۸۹۳) تھی، مشنریوں کی تعداد جو تبلیغی کام کر رہے تھے ۱۴۸ تھی اور کل ۸۹۰ کلیسا اور گرجا تھے[1]"

مسلمانوں کی طرف سے مایوسی:- گارسن دتاسی نے اپنے کئی لیکچروں میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مبلغین عیسائیت کو مسلمانوں میں بہت کم کامیابی حاصل ہو رہی ہے پھر بھی وہ بالکل مایوس بھی نہیں ہے وہ اپنے چودھویں لیکچر میں جو اس نے ۵ دسمبر ۱۸۶۴ء کو دیا ہے، وہ کہتا ہے:-

"انگریزی مشنریوں کو ہندوستانی مسلمانوں میں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ ان کو ترکی میں حاصل ہوئی ہے، بہرحال ہندوستان اور ترکی ہر دو ملکوں کے مسلمانوں میں مذہبی بیداری پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ ایک جماعت جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاحی کام کرے، دراصل خود اس انجمن کا رجحان بہت کچھ مسیحی مذہب کی طرف ہے، عموماً مسلمان دراصل مسیحی تعلیم سے اس قدر دور نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے..... ہندوستانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسیحی مذہب کی خوبیوں کو اپنے مذہب میں سمو رہی ہے۔ اس جماعت کے اصل لیڈر سید احمد خاں ہیں جو غازی پور میں ہیں[2]"

عیسائیت کے فروغ پر مسرت:- گارسان دتاسی نے اپنے اس لیکچر میں جو اس نے ۷ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دیا ہے اس میں وہ مشنریوں کی کامیابیوں پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"ہندوستانیوں میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر

---

[1] خطبات گارسان دتاسی جلد ۱ ص ۳۷۹۔ [2] خطبات گارسان دتاسی ج ۱ ص ۴۱۷-۴۱۸

وہ ہماری تہذیب، ہمارے تمدن اور ہمارے مذہبی ماحول سے قریب ہوتے جاتے ہیں، یہ مذہبی اصول مسیحیت ہماری تہذیب و تمدن کا ماخذ ہیں ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی ہے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں اور اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہیئے"[1]

وہ ہندوستانی گرجاؤں میں گائے جانے والے گیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"مسلمانی گیت ہندو گیتوں سے مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے بعض شجاعت علی کے اپنے ہیں، موصوف پہلے مسلمان تھے اب دین مسیحی قبول کر لیا ہے، آج کل وہ کلکتہ کے دیسی گرجا میں پادری کی حیثیت سے کام کرتے ہیں"[2]

جائزے اور خوش فہمیاں:۔

گارسن دتاسی اپنے چودھویں لیکچر میں ایک موقع پر کہتا ہے کہ:۔

"مہاراجہ دلیپ سنگھ جب حال ہی میں بمبئی سے گذرے تو ڈاکٹر ولسن نے گرجا میں ہندی زبان میں دینی لیکچر دیا اس لیے کہ حاضرین میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جو انگریزی سمجھتے، مہاراجہ نے ۱۲ اپریل کو "دی جنریلزم انسٹی ٹیوشن" کے عظیم الشان ہال میں ان تمام ہندوستانیوں کو مدعو کیا جنہوں نے مسیحی مذہب قبول کیا ہے، اس دعوت میں ساڑھے چار سو آدمی شریک ہوئے، اس موقعہ پر متعدد تقریریں ہوئیں، ڈاکٹر ولسن نے مہاراجہ کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی اہمیت بتلائی اور کہا کہ اس کا دوسرے ہندوستانیوں پر بہت اچھا اثر پڑے گا، ایک مسیحی مشنری نے دکن میں مسیحی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق تفصیلات بیان کیں، اور کئی دیسیوں نے بھی تقریریں کیں..... آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مشنریوں کی جدوجہد ہندوستان میں بالکل رائیگاں نہیں گئی۔ گذشتہ سالوں میں ڈاکٹر ڈف کو خاص کامیابی حاصل ہوئی، موصوف پچھلے سال ہندوستان میں ۳۴ سال

---

[1] و [2] خطبات گارسن دتاسی ج ۱ ص ۳۷۸ - ۳۷۹

رہنے کے بعد انگلستان واپس آگئے ہیں، آپ کی مساعی کی بدولت کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مذہبی و معاشرتی زندگی میں انقلاب پیدا ہوگیا ہے آپ نے پورا وقت ہندوستان میں تبلیغ و اشاعت پر صرف کیا[1]"

پادری صفدر علی کا ذکر:- گارسن دتاسی صفدر علی کے عیسائی ہونے کا ذکر بڑی مسرت سے کرتا ہے، اس کی مسرت بجا بھی ہے کیونکہ وہ پڑھا لکھا اور ذہین و فطین آدمی تھا بعد میں علماء اسلام سے اس نے مناظرے کیے اور عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں اس نے بڑی سرگرمی دکھائی، گارسان دتاسی نے اپنے پندرہویں لیکچر میں جو اس نے پیرس یونی ورسٹی میں ۱۴ دسمبر ۱۸۶۵ء کو دیا اس میں اس داستان کو مزے لے لے کر سناتا ہے

"ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کو زیادہ کامیابی اب تک نہیں حاصل ہوئی لیکن بعض مسلمانوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے مسیحی مذہب کی تعلیم کو قبول کرلیا ہے۔ چنانچہ ناگ پور کے ایک تعلیم یافتہ اور ممتاز مسلمان نے جو جبل پور کے ناظر مدارس ہیں اور جن کا نام مولوی صفدر علی ناگ پوری ہے ابھی حال میں مسیحی مذہب قبول کیا ہے، موصوف نے مسیحی مذہب کی کتابوں کو پڑھ کر اور اس کی صداقت کا قائل ہوکر خود بخود مذہب تبدیل کرلیا، اُن کے اثر سے ایک اور مسلمان عیسائی ہوگیا جو ان کے ماتحت اسکول میں مدرس تھا

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس وقت ۵۱۵ مبلغین مسیحیت کام کررہے ہیں، ان میں اینگلیکن اور دوسرے غیر کیتھولک شامل ہیں، ہمارے خیال میں کیتھولک مبلغین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی، اس لئے کہ اس وقت ہندوستان میں دس لاکھ کیتھولک موجود ہیں[2]"

میلوں ٹھیلوں میں مسیحی مبلغین:- مسیحی مبلغین اور پادری ہندوستانیوں کے میلوں ٹھیلوں میں بھی عوام کو ورغلانے کا کام بڑی تندہی

---

[1] خطبات گارسن دتاسی ج ۱ ص ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ [2] خطبات گارسان دتاسی ج ۲ ص ۵۹ - ۶۰

اور مستعدی سے کرتے تھے۔ گارسن دتاسی اپنے خطبہ میں کہتا ہے:۔

"مسیحی مبلغین اپنا مذہبی جوش ظاہر کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں دیتے چنانچہ میلوں کے موقعوں پر جو مذہبی اور تجارتی دونوں اہمیت رکھتے ہیں ہندوستانیوں کے جم غفیر میں وہ اپنے خیمے لگا لیتے ہیں تقریریں اور وعظ کہتے ہیں اور رسالے تقسیم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ پچھلے دنوں ۲۸ جنوری کو گنگا جمنا کے سنگم الہ آباد میں میلے کے آخری دن کہتے ہیں کہ کوئی ستر ہزار نفوس موجود تھے، اس میلے میں ان مبلغوں نے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔

۱۲ دسمبر کو بمبئی کے بشپ نے نو کم عمر ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی رسم ادا کی ان میں سے دو مسلمان ہیں، ایک پارسی ہے ایک تامل ہے چار مرہٹے ہیں اور ایک اودھ کا ہندو ہے، ان کے علاوہ دس لڑکیاں بھی مسیحی دین کے حلقے میں داخل کی گئیں، ان میں سے دو مسلمان ہیں۔

اس سال ۹ اپریل کو کلکتہ کے بشپ نے امرتسر میں چالیس سے زیادہ ہندوستانیوں کو داخلِ مسیحیت کیا۔"[1]

کچھ نئے عیسائی ہونے والوں کا ذکر:۔ گارسن دتاسی نے اپنے سولہویں لیکچر میں جو اس نے ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو پیرس یونی ورسٹی میں دیا اس میں اس نے کچھ نئے عیسائی ہونے والوں کا ہمیں پتہ بتایا ہے وہ کہتا ہے:۔

"باوجود مسیحی کلیساؤں کے اختلاف کے کوئی نہ کوئی مشہور ہندوستانی مسیحی مذہب قبول کرتا رہتا ہے، بعض ایسے مسلمانوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے جو اپنی تعلیمی یا معاشرتی حیثیت سے ملک میں ممتاز سمجھے جاتے تھے چنانچہ مولوی کریم الدین جو ہندوستانی زبان کے مشہور انشا پرداز ہیں

---

[1] خطبات گارسان دتاسی جز دوم ص ۶۰۔۶۱

میں ہیں اور ان کے بھائی مولوی عماد الدین جو خود فاضل آدمی ہیں لیکن جن کو شہرت حاصل نہیں، یورپین لوگوں کے میل جول سے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مسیحی مذہب سچا اور اسلام باطل ہے، ان میں مولوی عماد الدین کا باقاعدہ بپتسمہ ہو چکا ہے اور مولوی کریم الدین بھی غالباً عنقریب مسیحی مذہب میں شامل ہو جائیں گے، بہرحال اب دونوں مل کر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس میں اسلامی اصولوں پر اعتراضات ہوں گے۔"[1]

قابلِ اطمینان کامیابی:- عیسائی مبلغین کی مسلسل جدوجہد کا ثمرہ ان کے حق میں اچھا نکلا انہوں نے عیسائیت کے فروغ میں اطمینان بخش حد تک کامیابی حاصل کرلی، اب یورپین مشنریوں اور پادریوں کے علاوہ خود ہندوستانی عیسائی بھی بڑی تعداد میں پادری کے عہدوں پر سرفراز ہو کر تبلیغ عیسائیت میں سرگرم حصہ لینے لگے، یہ داستان بھی ہم کو گارسن دتاسی کے ستر ہویں خطبے میں ملتی ہے جو اس نے ۲۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو دیا تھا وہ کہتا ہے:-

"بالعموم ہندوستانیوں میں جو لوگ عیسائیت قبول کرتے ہیں وہ جاہل طبقہ کے لوگ نہیں ہوتے، لکھے پڑھے لوگ ہوتے ہیں، چنانچہ ان میں بعض تو راہبانہ سلسلوں میں بھی داخل ہو گئے ہیں، مدراس کے بشپ نے پچھلی مرتبہ مذہبی نگرانی کے دورے میں پانچ ہزار دو سو باون (۵۲۵۲) دیسی لوگوں کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی تصدیق کی، انھیں دیسی لوگوں میں سے نو کو پادری مقرر کیا اور گیارہ کو ڈیکن (مددگار پادری)۔ ابھی حال میں متھرا میں ایک ہندو "جانو" نے عیسائی مذہب قبول کرلیا وہ ایک مدرسہ چلا رہا تھا چنانچہ بمبئی کے لاٹ پادری نے اس کو پادری کے عہدے پر باقاعدہ مامور کیا۔

آگرہ کے کلیسا میں ہر اتوار کو دو مرتبہ ہندوستانی زبان میں عبادت کی رسمیں

---

[1] خطبات گارسان دتاسی ج دوم ص ۱۲۴-۱۲۵

ادا کی جاتی ہیں، پچھلے سال اسی گرجا میں آٹھ آدمیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا، اضلاع میں بھی گرجے قائم ہوگئے ہیں جہاں عیسائی لوگ عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں، بہرحال عیسائی مبلغین کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ابھی حال میں ہاتھرس میں بعض مبلغین کی مار پیٹ کی گئی اور ان پر پتھر پھینکے گئے مسیحی مبلغین کو نسبتاً نیم وحشی اقوام میں بھی کامیابی ہو رہی ہے جو انگریزوں کے زیر حکومت اس وسیع سرزمین کے تحت بعض گوشوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں چنانچہ بنگال کی مغربی سرحد اور ناگپور کے جنوب کے علاقے کے درمیان ایک جرمن مشنری نے حال میں چودہ ہزار نفوس کو مسیحی حلقہ میں داخل کر لیا ہے[1]"

ترقی پذیر عیسائیت :- گارسن دتاسی نے ۷ دسمبر ۱۸۶۵ء کے خطبہ میں ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی کامیابی کا جائزہ لیا ہے، اس جائزہ میں امید و یاس کے دونوں پہلو ہیں پھر بھی یہ کامیابی کیا کم ہے کہ جس سرزمین میں ایک متنفس بھی عیسائی نہیں تھا مشنریوں کی ان تھک جد و جہد نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں لاکھوں عیسائی پیدا کر دیئے اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، مایوسی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حکومت کے جابرانہ طریقے پر پورا بھروسہ کر لیا تھا کہ بزور قوت چند سالوں میں پورے ملک کو یا کم از کم اس کی بڑی اکثریت کو دام عیسائیت میں ضرور گرفتار کر لیں گے، یہ توقع ان کی پوری نہیں ہوئی۔ گارسن دتاسی کہتا ہے :-

"اس سچے مذہب مسیحیت کی ترقی اس قدر تیزی کے ساتھ نہیں ہو رہی ہے جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کام کیا جا رہا ہے وہ نہایت ٹھوس ہے، 'سالنامہ تبلیغ و اشاعت' رسالے میں ہندوستان کے کل کیتھولک عیسائیوں کی تعداد آٹھ لاکھ بتائی گئی ہے، ان میں سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سیلون میں ہیں جیسا کہ وہاں کے نمائندہ پوپ نے واضح کیا ہے..... آج

---

[1] خطبات گارسن دتاسی جلد دوم ص ۱۴۸ — ۱۴۹

اس وقت ہمارے زمانہ میں بھی پرجوش مبلغین مسیحیت ہندوستان میں جوش اور خلوص کے ساتھ کام کر رہے ہیں، قدیم کفر و شرک کے ماننے والوں اور جدید فطرت پرستی کے علمبرداروں کے مقابلہ میں مبلغین کو ہر جگہ کامیابی ہو رہی ہے، مسز آرکلاک نے اپنے خط مورخہ ۱۳ر فروری ۱۸۶۸ء میں شہر امرت سر کے چرچ مشن کے متعلق مجھے بعض اطلاعات بہم پہونچائی ہیں اسکاٹستان کے آزاد کلیسا کی شاخ جو خود ناگ پور میں قائم کی گئی ہے مسیحی تہذیب و تبلیغ کا کام کمال خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے..... لاہور کا امریکی مشن بھی خوب پھل پھول رہا ہے..... شہر سیہور میں جو بیگم صاحبہ بھوپال کے حدود حکومت میں ہے تقریباً چالیس ہزار روپے کے خرچ سے ایک کلیسا تعمیر کیا گیا ہے، اس رقم کا بیشتر حصہ خود بیگم بھوپال اور ملکہ وال اندورنے اپنے پاس سے دیا ہے، دیسی اُمرا نے بھی چندے سے اس کام میں مدد دی۔

اس سال کے دوران میں بعض ممتاز مسلمان مسیحیت کے حلقے میں داخل ہوئے ہیں، چنانچہ دہلی کے شاہی خاندان کے کئی ایک شہزادیوں کے بپتسمہ کی رسم ابھی حال ہی میں منائی گئی ہے۔

اخبار عالم مورخہ ۲۱ر مئی ۱۸۶۸ء میں ایک عجیب و غریب واقعہ درج ہے دو مسیحی مبلغین اور مسلمان مولویوں نے ایک موقعہ پر باہم یہ طے کیا ہے کہ وہ آپس میں پرسکون طور پر مباحثہ کریں گے اگر مبلغین مسیحیت کے دلائل تسلی بخش ثابت ہوئے تو مولوی ان کا مذہب قبول کرلیں گے ورنہ وہ اسلام کے حلقے میں اپنے تئیں شامل کرلیں گے، مجھے اس کا علم نہیں کہ اس مباحثہ کا انجام کیا ہوا؟ لیکن بہر نوع مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ مسلمان کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ مباحثہ میں ہار گئے۔

پچھلے سال عماد الدین کے مسیحیت قبول کرنے اور اس کی تصنیف کے متعلق میں ذکر کر چکا ہوں جس میں اس نے اسلام کی تردید کی ہے اس کتاب کا نام "تحقیق الایمان"

ہے مجھے اس کا ایک نسخہ پہونچ چکا ہے[1]،،

گارسن دتاسی سرسید احمد خاں بانی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی ایک کتاب کا بھی ذکر بڑی مسرت سے کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کی کتابوں سے عیسائیت کے فروغ اور تبلیغ و اشاعت میں بڑی مدد ملے گی، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس نے ان کی کتاب کا تفصیلی تعارف اپنے لیکچر میں کرایا ہے جو اس نے ۱۰ دسمبر ۱۸۶۸ء کو دیا تھا، اس لیکچر میں وہ کہتا ہے:-

اُردو کی اور بعض دوسری کتابیں جنھیں ہم خالص مسیحی تو نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں، ان میں وہ کتاب شامل ہے جو ایک مسلمان عالم نے بائیبل کی تفسیر پر لکھی ہے، یہ کتاب اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہے اور فاضلانہ بھی ہے، میری مراد سید احمد خاں کی تفسیر بائیبل سے ہے[2]،،

آخری جائزہ:- موسیو گارسان دتاسی کا آخری خطبہ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء کو دیا گیا اس میں اس نے تبلیغ عیسائیت کا ایک بھرپور جائزہ لیا ہے اور انگریزی حکومت کے پھیلائے ہوئے جال سے اس کو توقع ہے کہ وہ بتدریج اس میں کامیاب ہوگی، اس نے ایک ایسا خواب دیکھا جو مستقبل میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، وہ اپنے اُنیس سالہ تجربات و مشاہدات کے بعد کچھ صاف صاف باتیں بھی اس نے کہی ہیں، وہ اپنے اس لیکچر میں کہتا ہے:-

،،اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں میں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں گے، مسلمانوں کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں اسلیئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے لیکن ہندو اس باب میں زیادہ سخت نہیں ہیں۔ چنانچہ انہیں کی

---

[1] خطبات گارسن دتاسی ج ۲ ص ۲۰۱ — ۲۰۲ [2] ایضاً ص ۲۰۲

جماعت کے افراد مسیحی مذہب زیادہ قبول کر رہے ہیں۔

ایک کتاب اُردو میں لکھی گئی ہے، مدراس کے محترم اسقف نے ازراہ کرم اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے، اس کتاب سے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی ہے.... ہر جگہ مولویوں نے جلسہ کر کے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دیا ہے..... جو لوگ ابھی حال میں مسیحی زمرے میں شامل ہوئے ہیں ان میں مولوی سراج الدین پانی پتی قابلِ ذکر ہیں، ان کی عمر اس وقت ننّو سال ہے اور وہ اس وقت انگریزی کلیسیا میں پادری ہیں، وہ عماد الدین کے والد ہیں، ان کے بھائی خیر الدین اور ان کی بیوی اور خود عماد الدین کی بیوی کے سوا اس خاندان کے سب افراد نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے، کریم الدین اس خاندان کے واحد شخص ہیں جو اب تک اسلام کے نام لیوا ہیں، ایک دن آنے والا ہے جب پورا ہندوستان مسیحی جھنڈے کے تلے ہوگا ہمیں پوری توقع ہے۔

براہِ راست حکومتِ برطانیہ کے تحت اس وقت ۵ اکروڑ ہندوستانی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان میں سے دس لاکھ ترانوے ہزار عیسائی ہیں، ان میں چھ لاکھ چالیس ہزار رومن کیتھولک اور چار لاکھ ترپن ہزار پروٹسٹنٹ وغیرہ ہیں، گیارہ کروڑ برہمنی مذہب کے ہندو ہیں، تیس لاکھ بدھ مت کے متبعین ہیں، دو کروڑ پچاس لاکھ مسلمان ہیں، ایک کروڑ بیس لاکھ قدیم باشندے ہیں جو نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں، ستر لاکھ پارسی اور یہودی وغیرہ ہیں[1]"

لیکچروں کی تاریخی اہمیّت:- عیسائیت کی تبلیغ اور حکومت کے رویہ کے سلسلہ میں ان لیکچروں کو خصوصیت سے اس لیے منتخب کیا گیا کہ یہ وہی زمانہ ہے جب یہ مہم پورے شباب پر تھی اور اس کے یہ لیکچر ہندوستان سے بہت دور پیرس میں طلبہ کے سامنے دیئے گئے ہیں، کسی پروپیگنڈہ کی غرض سے نہیں کہ بہت

---

[1] خطبات گارسن دتاسی جلد دوم ص ۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷

سے حقائق کے اظہار میں مصلحت مانع ہو، اس نے پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ یہ معلومات فراہم کی ہیں چونکہ اس کا ذریعہ معلومات ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ذمہ دار حکام تھے اس لیے اس کی معلومات مستند بھی ہیں اور ناقابلِ تردید بھی۔

ان لیکچروں کے علاوہ ہندوستان میں لکھی جانے والی بہت سی کتابوں سے بھی ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور عیسائیت کی اشاعت میں حکومت کی چیرہ دستیوں اور اس کے مستبدانہ رویہ کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ان کتابوں میں خاص طور سے سرسید احمد خاں کی "اسباب بغاوتِ ہند" قابلِ ذکر ہے جس میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ حکومت کے رویہ سے بلا امتیاز ہر شخص یہ یقین کیے ہوئے ہے کہ حکومت تمام ملازمینِ سرکار کو ایک دن بجبر و اکراہ عیسائی بنا کر رہے گی، اسی طرح عام ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے سلسلہ میں کلکتہ کے لاٹ پادری ایڈنبرا کی وہ گشتی چٹھی بھی نقل کی گئی ہے[1] جس میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو بہ جبر و اکراہ عیسائی بنانے کی کارروائی کا آغاز کر دیا جائے

---

[1] اسباب بغاوتِ ہند بحوالہ حیاتِ جاوید مصنفہ حالی ص ۸۱۹ - ۸۲۰

باب ۲

عیسائی مشنریوں کے خلاف محاذ آرائی

ہم نے کوشش کی ہے کہ انیسویں صدی میں جب ہندوستانی مسلمانوں کا نیّر اقبال مائل بہ زوال ہوتے ہوتے ایک غیر معین مدت تک کے لیے غروب ہوگیا، اس وقت اور اس کے متصلاً بعد مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے عوامل، ان کے ماحول اور گرد و پیش کے حالات، ذہنی و فکری ارتداد کے حوادث اور ان کی علمی شناخت کھود دینے پر ایک ہلکی روشنی ڈال دیں، ہم نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے انیسویں صدی کے فتنۂ عظیم عیسائیت کا ذکر کیا ہے۔

یہ فتنہ اگر صرف عیسائی مشنریوں کا پیدا کردہ ہوتا اور اس کی پشت پر کوئی دوسری مادی طاقت اور حکومت نہ ہوتی تو علماء اسلام اس کو کب کا دفن کر چکے ہوتے لیکن عیسائیت کا تبلیغی کارواں جب ہندوستان میں سرگرم سفر ہوا تو بانگِ جرس کے پس منظر میں جھنجھاتی ہوئی تلواروں کی جھنکار بھی صاف سنائی دے رہی تھی جو ہر دل کو خوف و ہراس کی آماجگاہ بنا رہی تھی، اس لیے یہ مشنری کارواں نہیں بلکہ عیسائیت کی مسلح فوج کا مارچ تھا، صرف صورت سوداگروں کی تھی، جذبات اور حوصلے غارت گرانہ تھے بالکل ایسے ہی جیسے یہ سفید فام قوم ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اوڑھے مچھلی، بھُس اور بانس کی تجارت کرتے ہوئے بنگال میں

میر جعفر کو لے کر سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو اپنے چند ہزار سپاہیوں کے تعاون سے چند گھنٹوں میں دھول چٹادی[1]۔ میسور میں میر صادق اور پورنیا کو استعمال کر کے سلطان ٹیپو جیسے بہادر فرماں روا کو ایسی جگہ مارا جہاں اس کو پانی نہ مل سکا[2]

اسی طرح عیسائیت کا ہندوستان میں سفر بھی دونوں رخ رکھتا تھا۔ ایک طرف پادری جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کو مناظرہ کے لیے للکارتے بھی رہے، دوسری طرف اگر عیسائی مشنریوں کی راہ میں کسی نے رکاوٹ ڈالنے کی غلطی کی تو حکومت کی مشینری اس کو پیس کر رکھ دیتی تھی، اس وقت تمام کلیدی عہدوں پر اور انتظامیہ میں مشنری ذہن و مزاج کے حکام رکھے جاتے تھے، پولیس کو حکم تھا کہ تبلیغ عیسائیت میں پادریوں کو بھرپور تعاون دے اس لیے جب مجمع عام میں پادری اسلام پر اعتراضات کے زہریلے تیر برساتے تھے اور مسلمانوں کے مذہب اور پیغمبرؐ کی ذاتِ مقدس پر تنقید کرتے اور لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دیتے تھے تو ہر شخص صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ پادریوں کی زبان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظالم و جابر حکمراں بول رہے ہیں

حکومت کی ہیبت اور رعب داب:۔ انگریز سوداگروں کی ہندوستان میں ابھی نئی نئی حکومت تھی ہندوستان کی سرزمین ہندوستانیوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی اور اس سے بڑے مظالم کے لیے حکومت پر تول رہی تھی، ایسے حالات میں کس کی جرأت و ہمت تھی کہ پادریوں کے ان چیلنجوں کا جواب دے اور ان کی دعوتِ مبارزت قبول کر کے میدانِ مناظرہ میں اترے، لیکن جب پانی سر سے اوپر ہو چکا تو "تنگ آمد بجنگ آمد" کے اصول کے مطابق اسلامی غیرت و حمایت نے ایک بار جوش مارا اور ایک مردِ مجاہد سر سے کفن باندھ کر میدان میں اترا اور اس مردِ مجاہد کا نام تھا "مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ"[3]۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت"۔ [2] دیکھیے "تاریخ سلطنت خداداد" از محمود بنگلوری۔

[3] مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح اپنے دور کے جید عالم تھے اور ایک رئیس کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہانِ مغلیہ کی طرف سے ان کے آبا و اجداد کو بہت بڑی جاگیر دی گئی تھی۔ آپ کی پیدائش محلہ دربار قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر (باقی برصفحہ آئندہ)

انہوں نے خطرات سے صرف نظر کیا مصلحت اندیشی کو ٹھوکر ماری اور عشق کی امتحان گاہ میں اُتر پڑے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مناظرہ اکبر آباد:- عیسائی پادریوں کا سرخیل پادری فنڈر تھا، اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز دارالسلطنت دہلی کو بنایا تھا، دہلی کی شاہ جہانی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اسلام پر اعتراضات اور علماء اسلام کو مناظرے کا چیلنج کرتا تھا لیکن حکومت کے زوال کی وجہ سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اس لیے پادری فنڈر کی دعوتِ مبارزت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں جمادی الاول ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں ہوئی۔ آپ عثمانی شیوخ میں سے ہیں ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور تکمیل دہلی کے مدرسہ مولانا حیات میں کی، مزید تعلیم کے لیے آپ نے لکھنو کا سفر کیا اور مفتی سعد اللہ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے معاصر ہیں، ایک ہی جذبہ جہاد ان سب کے سینوں میں تھا۔ کچھ دنوں آپ نے اپنے محلہ دربار میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور کئی مشہور علماء کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

۱۸۵۴ء میں دنیائے عیسائیت کے مشہور پادری پی فنڈر سے اکبرآباد میں معرکۃ الآراء مناظرہ کیا اور اس کو شکستِ فاش دی۔ اور زبانِ حال سے اس کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اسی شرم سے اس نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ اظہارِ حق کی یہ جرأت انگریزی حکومت کو شاق گذری۔ اتفاق سے دو ڈھائی سال بعد غدر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہوگیا۔ حکومت کو انتقام کا بہانہ ہاتھ آگیا اور چاہا کہ آپ کو گرفتار کرکے سزا دے۔ وارنٹ جاری ہوا گھوڑ سوار پولیس گرفتاری کے لیے نکلی مگر خدا نے حفاظت کی اور بچتے بچاتے خفیہ طور پر مکہ مکرمہ پہونچنے میں کامیاب ہوگئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔

سلطان ترکی کو جب اطلاع ملی کہ پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے والے عالم مکہ میں ہیں تو ان کو ترکی بلایا اور بڑا اعزاز کیا۔ ترکی سے واپسی کے بعد آپ نے مکہ میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا جو آج بھی علماء حق کا مرکز ہے۔ تقریباً پچاس سال مکہ مکرمہ میں آپ مہاجر بن کر رہے۔ مورخہ ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۶ھ کو انتقال فرمایا۔ اور ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے جوار میں آسودۂ خواب ہیں۔

کے جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی حالات کی ناسازگاری کے باوجود ابھی ہندوستان میں ایسے علماء موجود تھے جو فولادی عزم وارادہ کے مالک تھے وہ اسلام پر ان شدید حملوں کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکے، ایسے ہی لوگوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح بھی تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر پادری فنڈر کی دریدہ دہنی اور لاف زنی کا جواب دینے کا تہیہ کر لیا اور سر سے کفن باندھ کر میدان عمل میں اُتر پڑے اور اعلان کیا:۔

"میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علماء مسیحین میں ممتاز حیثیت کے مالک اور "میزان الحق" کا مصنف ہے اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ کرے تاکہ حق واضح ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ علماء اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لیے نہیں کی کہ وہ عاجز تھے بلکہ وہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے"

مولانا کیرانوی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے لیے کوشش کی کہ پادری فنڈر کو مجبور کر دیں کہ وہ میدان مناظرہ میں آئے، اور بالمشافہہ مجمع عام میں گفتگو کرے، آپ مہاراجہ بنارس کے میر مختار مولوی امیر اللہ صاحب کو لے کر پادری فنڈر کی قیامگاہ پر تشریف لے گئے تاکہ مناظرہ کے لیے گفتگو کریں، فنڈر اس وقت مکان پر نہیں تھا اس لیے آپ نے ۲۳ مارچ ۱۸۵۴ء سے پادری فنڈر سے خط وکتابت کا آغاز کیا اور اس سلسلہ کا آخری خط مولانا موصوف نے ۷ اپریل ۱۸۵۴ء کو لکھا ان خطوط میں عنوان مناظرہ، مقام اور تاریخ مناظرہ طے ہوئی اور طرفین کے اتفاق سے مناظرہ کے ابتدائی مراحل طے ہوئے اور مورخہ ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں بمقام کٹرہ عبدالمسیح مناظرہ ہونا طے پا گیا۔

مناظرہ سے حکومت کو دلچسپی:۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان یہ مناظرہ نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے دم خم، جرأت وہمت اور انگریزی حکومت کے رعب داب، طاقت وجبروت کے درمیان مقابلہ تھا، چونکہ پوری انگریزی قوم ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا عزم بالجزم کیے ہوئے تھی اور اس راہ کا سنگ گراں مسلمان بن رہا تھا اس لیے حکومت مسلمانوں کو اس موقعہ پر بھی مرعوب کرنا

ضروری سمجھتی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے معرکۃ الآرا مناظرہ میں شریک ہونے والے عوام وخواص کی تعداد تو ایک ہزار سے بھی کم تھی جبکہ اس کی کئی گنا تعداد ہونی چاہیئے تھی لیکن حکومت کی انتظامیہ کے بڑے عہدیدار اور فوج کے بہت سے اعلیٰ افسران اس مناظرہ میں شرکت کے لیے کٹرہ عبدالمسیح اکبرآباد میں موجود ہیں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچن سکنڈ صدر صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج مسٹر لیڈلی ترجمان حکومت، پادری ولیم گلبن اور ہندوستانی ملازمین حکومت میں منشی ریاض الدین، مولوی فیض احمد سرشتہ دار صدر بورڈ، مولوی حضور احمد، مولوی امیراللہ مختار راجہ بنارس اس مناظرہ میں شریک ہیں۔

مسلمانوں کی حمایت میں مولوی قمرالاسلام امام جامع مسجد آگرہ، منشی خادم علی مہتمم مطبع الاخبار منشی سراج الحق جیسے کچھ افراد بھی شریک مناظرہ تھے مسلمانوں کی طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر تھے اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں جو آگرہ میں رہتے تھے آپ کے معاون تھے، عیسائیوں کی طرف سے یورپ کا مایہ ناز خطیب پادری فنڈر مناظر تھا اور اس کو امداد وتعاون دینے کے لیے درجنوں اردو فارسی اور عربی کے ماہر پادریوں کی فوج تھی۔

موضوعِ مُناظرہ:۔ موضوعِ مناظرہ کے سلسلہ میں فریقین کے درمیان یہ بات طے تھی کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو پانچ بنیادی اختلافی مسائل ہیں انھیں پر مناظرہ ہوگا وہ پانچ مسئلے ہیں تحریف انجیل، نسخ انجیل، عقیدۂ تثلیث، حقیقتِ قرآن، نبوتِ محمدی، پہلے تین مسئلوں میں مسلمان مدعی ہوں گے اور عیسائی مناظرین اس کا جواب دیں گے حقیقتِ قرآن اور نبوتِ محمدی کے ثبوت و دلائل مسلمان مناظر کی طرف سے دیئے جائیں گے، لیکن پہلا ہی مسئلہ تحریف انجیل زیر بحث آیا تو یورپ کے مایہ ناز پادریوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور ان کو احساس ہوا کہ ہماری لن ترانیاں اسی وقت تک تھیں جب تک مسلمان تلوار کے خوف سے زبان بند کیے ہوئے تھا اور جب دلائل وشواہد، اعتراضات، سوالات وجوابات کی کسوٹی پر مسلمان مناظر پادریوں کی علمی صلاحیتوں کے کھوٹے سکوں کو پرکھنے لگے گا تو وہ سب سے ردّی مال ثابت ہوں گے اور سوائے ذلت وشرمساری کے ان کے مقدر میں اور کچھ نہیں ہوگا چنانچہ رُودادِ مناظرہ ہم کو یہ ساری تفصیل سناتی ہے۔

مناظرہ کا اہم ترین موضوع :- پادری فنڈر نے اپنی کتابوں میں جا بجا لکھا تھا اور اپنی تقریروں میں وہ اس بات کو بار بار بانگ دہل کہتا تھا کہ جب تک اہل اسلام عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو محرف ثابت نہ کریں انھیں دوسری باتوں پر بولنے کا کوئی حق نہیں ہے، مناظرہ میں بھی سب سے پہلے یہی مسئلہ زیر بحث آیا اور پادری فنڈر نے کھڑے ہوتے ہی مطالبہ کیا اور اصرار کے ساتھ کہا کہ مسلمان یا تو کتب مقدسہ کی تحریف کو ثابت کریں ورنہ قرآن کو چھوڑ کر عیسائیت قبول کریں دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

شرائط مناظرہ میں یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی فریق اپنے حریف کی باتوں کا جواب نہیں دے سکے گا تو وہ دوسرے فریق کا مذہب قبول کرے گا، اس لیے پادری فنڈر اسی مسئلہ تحریف ہی پر مسلمانوں کی زبان بند کر دینا چاہتا تھا۔

مباحثہ کا آغاز :- پہلے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اسٹیج پر آئے اور آپ نے انجیل کے محرف ہونے پر متعدد دلائل پیش کیے، لیکن جب پادری فنڈر کھڑا ہوا تو اس نے اپنی تقریر میں ان دلائل کو بے وزن اور ناقابل توجہ بتایا اور کہا کہ ان دلائل سے انجیل کا محرف ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے، انجیل میں تحریف اس وقت ثابت ہو سکتی ہے جب آپ لوگ ایسی عبارت پیش کریں جو اگلے نسخوں میں تو نہ ہو لیکن حال کے نسخوں میں وہ عبارت پائی جاتی ہو۔

تحریف کا ناقابل تردید ثبوت :- مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے دست راست وزیر خاں عبرانی زبان سے واقف تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور تحریف کے مسئلہ پر وہ پوری طرح تیار تھے، انہوں نے یوحنا کے پہلے خط باب ۵ آیت ۷۔۸ کا حوالہ دیا کہ سب مانتے ہیں کہ یہ آیات پرانے نسخوں میں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے نسخوں میں موجود ہیں، یہ ایسا ناقابل تردید ثبوت تھا کہ مجبوراً پادری فنڈر کو کھڑے ہو کر کہنا پڑا کہ ہاں یہاں اور ایک دو جگہ اور تحریف ہوئی ہے۔

پادری فنڈر کے منہ سے یہ بات سننی تھی کہ مسلمان مارے خوشی کے اچھل پڑے اور ہر طرف ایک شور سا مچ گیا ہسٹر اسمتھ صدر دیوانی نے جو پادری فرنچ کے برابر بیٹھے ہوئے تھے ان سے

انگریزی میں پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ مسلمان بے پناہ خوشی سے اُچھل کود رہے ہیں۔ پادری فرنچ نے ان کو بتایا کہ یہ مولوی صاحب مفسرین کی کتابوں سے چھ سات مقامات جن میں تحریف کا اقرار ہوا ہے نکال کر سند لائے ہیں۔

اس کے بعد پادری فرنچ نے کھڑے ہو کر کہا کہ فنڈر صاحب بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ انجیل مقدس میں سات آٹھ مقامات میں تحریف ہوئی ہے، اس بات پر مولوی قمرالاسلام صاحب امام جامع مسجد نے منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار سے کہا کہ آپ لکھ لیجئے کہ پادری صاحب نے آٹھ جگہ تحریف کا اقرار کیا ہے، پادری فنڈر نے یہ سن کر کہا کہ ہاں ضرور لکھ لیں میں کہتا ہوں کہ سات آٹھ جگہ تبدیلی اور تحریف ہوئی ہے۔

بس اس بات کا اعلان ہونا تھا کہ مسلمان مارے خوشی کے اُچھل پڑے اور یورپین پادریوں کے ہوش اُڑ گئے کہ یہ کیا ہوا؟ پادری فنڈر اب تک مسلمانوں کو چیلنج کرتا رہا تھا کہ وہ انجیل میں تحریف کا ثبوت دیں مگر اب مناظرہ کے پہلے ہی دن آٹھ جگہ تحریف کا اقرار کر گیا، ادھر مسلمانوں کے چہرے روشن تھے، دوسری طرف عیسائیوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

جب پادری فنڈر نے یہ صورتِ حال دیکھی اور یہ محسوس کیا کہ اس نے عیسائیت کا بیڑہ ہی غرق کر دیا تو وہ ذرا سنبھلا اور کہا کہ مانا کہ کہیں کہیں تحریف ہوئی مگر انجیل کی اصولی تعلیم میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑا، یہ کہتے ہوئے اس کو اتنا جوش آیا کہ مفتی ریاض الاسلام صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ آپ ہی بتایئے کہ ایسی تحریفوں سے انجیل مقدس کے مطالب میں کیا فرق واقع ہوتا ہے؟

ترکی بہ ترکی جواب:- جب پادری فنڈر نے مفتی صاحب کو مخاطب کیا تو مولانا کیرانوی کے بجائے خود مفتی صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ:-

"پادری صاحب! جب کسی دستاویز اور وثیقہ میں ایک جگہ جعل اور ملاوٹ ثابت ہو جائے تو پورا وثیقہ ناقابلِ اعتماد ہو جاتا ہے اگر بقول آپ کے آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے تو اس کا اعتماد جاتا رہا، کیا ثبوت کہ دوسری جگہ تحریف

نہیں ہوئی ہے؟ اور پھر یہ بھی بتائیے کہ جب عبارت کا اختلاف آپ کے نزدیک مسلم ہے تو جہاں کہیں دو عبارتیں مختلف ہوں تو آپ ان دونوں میں سے ایک کو جزاً خدا کا کلام ٹھہرا سکتے ہیں یا نہیں؟

اس پر پادری فنڈر نے کہا کہ نہیں، وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔ مفتی صاحب نے اس پر فرمایا کہ مسلمانوں کا تو یہی دعویٰ ہے کہ موجودہ بائبل کا مجموعہ سب کا سب جزءً خدا کا کلام نہیں ہے اور جب خدا کا کلام یقینی طور پر نہیں ہے تو پوری کتاب ناقابلِ اعتبار ہو گئی۔

اس کا جواب پادری فنڈر نہ دے سکا اور وقت کے ختم ہونے کا بہانہ بنا کر میدانِ مناظرہ سے نکل گیا۔[1]

پادری فنڈر کی بدعہدی:۔ شرائطِ مناظرہ میں یہ اہم ترین شرط بھی شامل تھی کہ اگر مولانا کیرانوی پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے تو وہ مذہب عیسوی قبول کر لیں گے اور اگر پادری فنڈر جواب سے عاجز رہ گیا تو وہ اسلام قبول کرے گا، مناظرہ کے حکم اونچے طبقے کے انگریز حکام، با اثر مقامی افراد، ذی علم ہندو اور مسلمان اشخاص کی پوری جماعت میدانِ مناظرہ میں موجود تھی، ہزاروں کے اس مجمع میں پادری فنڈر کی زبان پر تالا پڑ گیا۔ حسبِ شرائط اُسے اپنی شکست تسلیم کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنا چاہیئے تھا لیکن بے غیرتی کا بُرا ہو کہ وہ میدانِ مناظرہ سے نکل گیا اور چہرے پر سیاہی پھر گئی۔

ہزاروں کے مجمع میں عیسائیوں کو ایسی ذلّت آمیز شکست ہوئی کہ مسیحیوں کے اس بڑے باپ کو منہ چھپا کر بھاگنا پڑا، بھرا مجمع موجود، حکم موجود، سامعین منتظر، مگر پادری فنڈر غائب، وہ منہ چھپا کر بھاگا تو سیدھے لندن جا کر ٹھہرا۔

بہت بے آبرو ہو کر.....":۔ چونکہ اس مناظرہ میں پادری فنڈر کو شکستِ

---

[1] رسالہ "ندائے حرم" کراچی رجب شعبان ۱۳۷۰ھ ص ۶۲

فاش ہوئی تھی اور اس کا سارا رعب داب ہوا ہو چکا تھا حتیٰ کہ اس کے معاون پادریوں میں پادری فرنچ اور اس کے دوسرے ساتھی پادریوں میں بھی مایوسی پھیل گئی، اس لیے پادری فنڈر نے یہی مناسب سمجھا کہ آئندہ کوئی مناظرہ نہ ہو، حالانکہ ابتداءً یہ طے ہو چکا تھا کہ جب تک تحریف اور نسخ کا مسئلہ انجام کو نہ پہونچے بحث کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے معاون ڈاکٹر وزیر خان کئی ہفتے اکبر آباد میں مقیم رہے اور پادری فنڈر سے مطالبہ کرتے رہے کہ مناظرہ کی دوسری مجلس منعقد کیجئے مگر وہ راضی نہیں ہوا اور یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ آئندہ خط و کتابت کے ذریعہ گفتگو ہو سکتی ہے، مولانا کیرانوی نے یہ دیکھ کر کہ پہلے ہی مباحثہ میں خدا کے فضل سے عیسائیت کو کھلی شکست ہوئی، علماء اسلام اور عوام و خواص پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑا، اس لیے پادری فنڈر کو بیک بینی و دو گوش نکل بھاگنے کا موقعہ دے دیا۔

رازِ درونِ خانہ:۔ اس مناظرہ کے بعد یہ حال ہوا کہ حضرت مولانا کیرانوی جس طرف نکل جاتے ہندو مسلمان خوش ہو کر مبارک باد دیتے اور عام طور سے لوگ کہتے تھے کہ اس مناظرہ نے ہزاروں انسانوں کے ایمان کو بچا لیا اور پادریوں کو ایسی شکست ہوئی کہ اب وہ کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔

ایک مسلمان باورچی جو پادری فرنچ کے یہاں ملازم تھا مولانا کیرانوی کے پاس آکر وہ تمام باتیں سناجاتا تھا جو پادریوں کی خفیہ مجلسوں میں مناظرہ کے دوران ہوتی رہتی تھیں، اس کا بیان ہے کہ تمام پادری سر جوڑ کر رات کے دو دو بجے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مولوی رحمت اللہ کا مطالعہ بہت وسیع ہے کوئی کہتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر خان انگریزی اور عبرانی زبان سے واقف ہے، کسی کا مشورہ یہ ہوتا کہ مناظرہ صرف چند گھنٹے ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اس کا اثر اچھا نہیں پڑے گا۔ غرض یہ مناظرہ کیا ہوا کہ کہاں وہ لن ترانیاں اور کہاں یہ حال کہ ایک ہی دن کے مباحثہ میں پادری فنڈر اور اس کے ساتھیوں کی کمریں ٹوٹ گئیں اور سمجھ گئے کہ علماء اسلام سے بازی لے جانا ممکن نہیں۔

مناظرہ کی رُوداد میں:۔ چونکہ پورا ملک عیسائیت کی یلغار سے سہما ہوا تھا حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں اور پادریوں کی پشت پناہی اور

تعاون کی وجہ پادریوں کی آواز سے حاکمانہ غرور جھلکتا تھا اور طاقت و قوت کا احساس دلا رہا تھا، اس کے بالمقابل مسلمان انگریزوں کا حریف بنا ہوا تھا، اس لیے عیسائیت کے خلاف لب کھولنے کے لیے فولاد کا جگر اور پتھر کا کلیجہ چاہیے تھا اس لیے ملک میں ہر طرف سناٹا تھا، مخالفت کی ایک آواز بھی کہیں سے سنائی نہیں دیتی تھی، اس لیے جب مولانا کیرانوی نے اکبرآباد میں عیسائیت کے سب سے بڑے اژدھے پر بھرپور اور کاری وار کیا اور اس کی زہریلی پھنکار اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تو پورے ملک میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور بڑی بیتابی سے مناظرہ کی کارروائیوں کو لوگوں نے جاننا چاہا، شرکاء مناظرہ بھی اس کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرتے تھے اس لیے مناظرہ کے دونوں دنوں کی کارروائی ضبط کی جاتی رہی اور فوراً اس کو شائع بھی کر دیا گیا۔

پہلی روداد مناظرہ:- یوں تو مناظرہ کی مفصل کارروائی اس وقت کے بیشتر اخبارات میں شائع ہوتی رہی، لیکن اخباری خبروں سے کہیں زیادہ بات لوگ جاننا چاہتے تھے اس لیے مفصل روداد ہی ان کی تشنگی بجھا سکتی تھی۔

اس کی پہلی روداد فارسی زبان میں مطبع منعمیہ اکبرآباد سے منشی محمد امیر خاں نے "مباحثہ مذہبی" حصہ اول کے نام سے شائع کی جس کے ٹائٹل پیج پر نام کے نیچے یہ عبارت درج تھی:-

"فیما بین جناب مولوی رحمت اللہ صاحب و پادری فنڈر صاحب در شہر اکبرآباد واقع شدہ، آں را سید عبداللہ اکبرآبادی ترجمہ نمودہ"

یہ روداد ایک سو ستاسی صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۲۷۱ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی، خود پادری فنڈر نے اپنی شکست پر مہر لگانے کے لیے اس مناظرہ کی روداد سکندر آرفن پریس آگرہ سے ۱۸۵۵ء میں "اختتام دینی مباحثہ" کے نام سے چھپوائی جو ۵۲ صفحات پر مشتمل تھی۔

دوسری رودادیں:- اس مناظرہ کی اور دوسری کئی ایک رودادیں اسی سال شائع ہوئیں، یہ رودادیں خود پادری فنڈر کی نگاہوں سے بھی گذریں وہ خود اپنی شائع کردہ روداد میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

"اوپر کا خط روانہ کرنے کے بعد مباحثہ کا وہ بیان میری نظر میں آیا جو دہلی

سے فارسی زبان میں شائع ہوا جس کو وزیر الدین ابن شرف الدین نے "البحث الشریف" کے نام سے طبع کرایا"

اس کے علاوہ ایک اور روداد کا تذکرہ بھی اس نے کیا ہے، پادری فنڈر اپنی روداد میں لکھتا ہے:-

"اُن باتوں کے چھپنے کے بعد وہ رسالہ بھی میری نظر میں آیا جو منشی سید عبداللہ نے مباحثہ کے بیان میں زبانِ اُردو میں چھپوایا"

اس طرح مناظرہ کی روداد کو اُردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں کثرت سے شائع کیا گیا اور اس قدر یہ رسالے مقبول ہوئے کہ ان سے گھبرا کر خود پادری فنڈر کو بھی اپنی طرف سے مجبوراً روداد شائع کرنی پڑی، مگر سچ یہ ہے کہ اس نے اس مناظرہ میں مولانا کیرانوی کے ہاتھوں ایسی ذلت آمیز اور رسوا کن شکست کھائی تھی کہ وہ اپنی روداد میں بھی اس کو نہ چھپا سکا۔

مناظرہ کا پس منظر:- اکبر آباد کے مناظرہ کی روداد جاننے کے لیے پورا ملک کیوں مضطرب تھا؟ اور کیوں بڑی بے چینی کے ساتھ مناظرہ کی ایک ایک کیفیت کو جاننا چاہتا تھا؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اگر مناظرہ کا پس منظر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے تو آپ ان بے چینیوں کا کچھ اندازہ کر سکیں گے جو لوگوں کو مناظرہ کی کیفیت اور سرگذشت جاننے کے لیے دلوں میں موج زن تھیں۔

بات یہ تھی کہ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کی حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا، بادِ صرصر کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی اس کے بجھانے کے لیے کافی تھا، دوسری طرف انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں اور عملی طور پر مسلمانوں کی حکومت بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، اس کا دائرۂ اختیار صرف دہلی شہر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اس زمانہ میں کہا جانے لگا تھا:-

"حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم"

انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا، دل میں اُمنگیں تھیں اور جذبات لمبی سے لمبی چھلانگ لگانے کے لیے مہمیز کر رہے تھے، اس لیے انگلستان میں اسکیم بنائی گئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت کو عیسائی بنا لیا گیا تو اس کی وجہ سے انگریزی حکومت کے استحکام میں بہت

بڑی مدد ملے گی اور ملک کے بُت پرستوں کو عیسائی بنا لینا بہت آسان ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں انگلستان کی پارلیمنٹ پر زور دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کو عیسائی بنانے میں ہندوستان میں مقیم انگریزی حکام کی مدد کرے اگر ہو سکے تو انہیں زبردستی عیسائی بنالے مگر چونکہ زبردستی کرنے میں بہت سے خطرات تھے اس لیے کھلم کھلا تو اس کی حمایت نہیں کی گئی لیکن ہندوستان میں تمام حکام کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ پادریوں کو مکمل تعاون دیں۔

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت اس ذہن و مزاج کے ساتھ تھی کہ اس سونے کی چڑیا پر ہمارا مکمل اختیار ہے۔ ان کا دماغ آسمان پر تھا جو پادری ہندوستان بھیجے گئے وہ بھی اسی حاکمانہ اور مغرورانہ مزاج کے ساتھ آئے وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ زبان و قلم کے اسلحہ سے لیس ہو کر اسلامی ہند پر حملہ آور ہو گئے اور پاپائے مسیحیت کی اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف دریدہ دہنی حد سے متجاوز ہو گئی اور مسلمان خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا مگر لب کشائی کی ہمت نہیں تھی۔

پادریوں کی یک طرفہ تقریروں کی وجہ سے عام خیال یہ ہو گیا تھا کہ پادریوں کے دلائل کا جواب مسلمانوں کے لیے ناممکن ہے خصوصاً پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کا جواب کسی مسلمان عالم سے نہیں ہو سکتا اور تو اور خود مسلمان ان کتابوں سے بہت مرعوب تھے اور بعض نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ معاذ اللہ اسلام جھوٹا ہے اور پادری جو کچھ کہتے ہیں وہی حق ہے۔

دلوں میں شکوک و شبہات :- مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے اس مناظرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو ماحول کا نقشہ کھینچا ہے اس سے بھی مستفاد ہوتا ہے کہ دلوں میں اسلام کی حقانیت کی طرف سے شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے تھے چنانچہ وہ اپنی کتاب "ازالۃ الشکوک" میں تحریر فرماتے ہیں :-

> "اب میں ان وجوہ کا بیان کرتا ہوں جس کے سبب یہ مباحثہ ہوا۔ اول یہ کہ روز بروز شور و غل پادریوں کا بڑھتا چلا جاتا تھا اور زبانی فریاد کرتے تھے کہ مسلمانوں سے ہماری باتوں کا جواب نہیں بن پڑتا ہے اور اپنے رسالوں کے اخیر میں ایسی ایسی باتیں چھاپنے لگے تھے، اس پر میں نے چاہا کہ اپنے مقدور کے

مطابق میں بھی ہاتھ ہلاؤں شاید اللہ تعالیٰ کچھ ثمرہ نیک دیوے۔

دوم یہ کہ جس عیسائی سے ملاقات ہوئی اور اس سے جو کچھ تذکرہ آیا اس کی تقریر سے ہی معلوم ہوا کہ "میزان الحق" ان کے گمان میں ایسی ہے کہ گویا الہام سے لکھی گئی ہے اور مسلمان اس کے جواب سے عاجز ہیں اگر ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ بات غلط ہے، "میزان الحق"، کا کیا ذکر اس کے مصنف سے بھی مسلمانوں کو کچھ خوف نہیں تو وہ کہتے تھے کہ صاحب جب تم کو اس سے پالا پڑے تب جانو۔

سوم یہ کہ جب میں ایک تقریب سے اکبر آباد کا عازم ہوا تو چلتے وقت ماسٹر رام چندر نے کہ مجھ سے محبت رکھتے تھے اور کچھ عرصہ سے عیسائیت کا دم بھرتے تھے اور پادریوں سے بھی زائد تعصب میں قدم بڑھا بڑھا کر رکھتے تھے اور میزان الحق کے بڑے معتقد تھے کہا کہ اگر اتفاق ہو تو پادری فنڈر سے ملیئے گا۔

چہارم یہ کہ جب اکبر آباد پہونچا تو بعض بعض کو تذبذب میں پایا اگر ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے یہی کہا کہ اگر تمہارے پاس آتے ہیں تو تم ہم کو قائل کر دیتے ہو، اور اگر کسی اچھے پادری کے پاس جاتے ہیں تو وہ بھی ہم کو لاجواب کر دیتا ہے، تو ہم کس کو سمجھیں کہ تم ہی حق پر ہو اور وہ باطل پر یا بالعکس، بلکہ ہم تو حیرت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہاں اگر مقابلہ منہ در منہ ہو جائے تو ہماری حیرانی کچھ دفع ہو جائے[1]"

حکومت کا منصوبہ فیل ہو گیا:۔ اکبر آباد کے مناظرہ نے درحقیقت اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کا رول ادا کیا جو عیسائیت کی شکل میں یورپ سے بڑی روانی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آرہا تھا اور پورا پورا خطرہ تھا کہ ہمارے ملک کو بہالے جائے گا، مولانا کیرانوی کی جرأت ایمانی نے مورخ کے ہاتھ

---

[1] ازالۃ الشکوک۔ مولفہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی جلد دوم صفحہ ۴۷۴

سے قلم چھین لیا جو ہندوستان میں اندلس کی تاریخ دُہرائے جانے کی کہانی لکھنے کی تیاری کر رہا تھا، پورا یورپ منصوبہ بند طریقہ سے ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی مہم چلانے کے لیے میدان میں اتر چکا تھا اور ایک نحیف الخلقت انسان نے اتنی بڑی اور طاقتور حکومت کے سارے پروگرام اور منصوبہ کو چشم زدن میں خاک میں ملا دیا ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ حکومت اس کو کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتی تھی اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس کینہ پرور انگریز قوم نے مولانا کیرانوی کی اس جرأت ایمانی کو معاف نہیں کیا۔

حکومت کا انتقام:۔ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے انگریز قوم نے ایک مستقل پلان بنایا کہ منصوبہ بند طریقے سے پورے ملک کو اندلس کی طرح عیسائی بنا دیا جائے تو یہ ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے قبضہ میں رہ جائے گا، اگر ہندوستان میں اسلام زندہ رہے گا تو ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا محل ریت کی دیواروں پر قائم ہوگا اور کبھی بھی زمین بوس ہو سکتا ہے، اسی جذبے اور خیال کے تحت ایک مکمل نقشۂ عمل مرتب کیا گیا اور اس کے مطابق کام کا آغاز بھی کر دیا گیا اور اس میں ان کو توقع کے مطابق کامیابی بھی مسلسل ملتی جا رہی تھی، دسوں لاکھ ہندوستانی عیسائی ہو چکے تھے جبکہ یہاں ایک فرد بھی عیسائی نہیں تھا، لیکن شیر کو مردہ سمجھ کر اس کو زیر زمین دفن کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی فطری زلزلہ افگن ڈکار لی تو پادریوں کی فوج پر سکتہ طاری ہو گیا اور خوف و دہشت سے وہ کونوں اور کھدروں میں چھپنے لگے پادری فنڈر بھاگا بھاگا پھرتا رہا یہاں تک کہ ہندوستان سے مایوس ہو کر یورپ چلا گیا اور ہندوستان میں ناکامی کی وجہ سے وہاں بھی اس کو عہدے سے برطرف کر دیا گیا تو بھاگ کر ترکی چلا گیا اور جب مولانا رحمت اللہ ترکی پہونچے اور اس کو خبر لگی تو وہاں سے بھی راتوں رات نکل گیا اس کے بعد پھر کبھی بھی یورپ کی کسی کھڑکی سے ہندوستان کی طرف جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی اور گمنامی کی زندگی گذار کر کہیں مر کھپ گیا۔

پھر غدر ۱۸۵۷ء کا حادثہ ہو گیا:۔ پادری فنڈر کے علاوہ ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں حشرات الارض کی طرح پادریوں

کی جو فوج رینگ رہی تھی وہ خود سمٹ کر ہندوستان کے ساحلی اور جنگلی علاقوں کی طرف چلی گئی اور جرائم پیشہ اور وحشی اقوام میں عیسائیت کی تبلیغ میں لگ گئی اور ہندوستان کے شہری علاقوں اور متمدن تعلیم یافتہ صوبوں میں ان کی سرگرمیاں محدود ہونے لگیں عام مسلمانوں کے مجمع میں کچھ کہنے اور کرنے کی ان میں ہمت نہیں رہ گئی تھی،

یہ انگریزی حکومت کی بہت بڑی ناکامی تھی اس کا بنا بنایا سارا منصوبہ تہس نہس ہو کر رہ گیا جس کی وجہ سے برطانوی حکومت جھنجلائی ہوئی تھی اور مسلمانوں پر دانت پیس رہی تھی مگر انتقام کی کوئی شکل نظر نہیں آرہی تھی، مسلمانوں کی یا ہندوستانیوں کی بدقسمتی سے دو ڈھائی سال بعد ۱۸۵۷ء کا حادثہ پیش آگیا، ہندوستان کی غیرت ایک بار اور بیدار ہوئی اور میرٹھ چھاؤنی سے بغاوت کا بگل بجا دیا گیا اور دہلی پر قبضہ کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ایک آخری کوشش کی گئی، لیکن ہندوستان کا ستارہ گردش میں تھا اور یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی، انگریزوں نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں سے جو بھرپور انتقام لیا ہے اس درندگی اور وحشت و بربریت کے نظاروں کو دیکھ کر پوری دنیائے انسانیت چیخ پڑی، مکھی مچھر کی طرح مسلمانوں کو عذاب کی چکی میں پیس دیا گیا، مسلمانوں کو پھانسی دینے کے لیے میلے لگائے جاتے، تماشائیوں کی بھیڑ اکٹھا کی جاتی اور مسلمانوں کو توپ کی نال سے باندھ کر توپ چلا دی جاتی اس سے اس بے گناہ مسلمان کے جسم کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کاغذ کے پرزوں کی طرح فضا میں اڑنے لگتا، اور زمین پر خون کی بارش ہو جاتی۔

یہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کفن بردوش شریک ہوئے اور انگریزوں سے دست بدست جنگ کی، اس موقعہ پر انگریزوں نے اپنے دشمنوں کو فراموش نہیں کیا جنہوں نے ان کے فروغ عیسائیت کے منصوبہ کو ڈائنامیٹ کیا تھا۔ اس لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی ڈاکٹر وزیر خان کیسے بچ سکتے تھے؟ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے وارنٹوں کے ساتھ ساتھ اکبر آباد مناظرہ میں پیش پیش رہنے والے ان دونوں بزرگوں کو بھی گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھانے کے ارادہ سے فوج کے سپاہیوں کو ان کی گرفتاری پر لگایا۔

پولیس کیرانہ کے محلہ دربار میں پہونچی جہاں مولانا کیرانوی کا مکان تھا، پولیس کو مخبر نے بتایا کہ

مولانا موصوف مسجد میں نماز پڑھنے آئے ہیں، پولیس نے مسجد کا محاصرہ کرلیا، لیکن مولانا کو موقعہ مل گیا اور مسجد کے ایک حجرے سے نکل کر جس کا دروازہ محلہ کے ایک مکان میں تھا اور ادھر سے جنگل ملا ہوا تھا پنجیٹھ گاؤں میں چلے گئے جو کیرانہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر ہے جس میں کیرانہ کے عثمانی خاندان اور انصاری شیوخ کی زمینداری تھی، مولانا اپنے ایک کاشتکار کے یہاں ٹھہر گئے۔

پولیس کے مخبر نے پھر پولیس کو خبر کردی، گھوڑ سوار پولیس پنجیٹھ پہونچی اور کاشتکار کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور گھر کی تلاشی لی۔ وہ کاشتکار گاؤں کا مکھیا تھا اس کو جب فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے مولانا سے کہا کہ آپ گھر پالے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ گورا فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری، مولانا بیان کرتے تھے کہ میں کھیت میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو مٹی اور کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگتی تھیں، میں ان کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

آخر مولانا بچتے بچاتے سورت کی بندرگاہ تک پہونچے اور ایک بادبانی جہاز میں کسی نہ کسی طرح سوار ہوگئے۔ مگر ایک پولیس افسر نے پہچان لیا اور فوٹو سے چہرے کی مطابقت کرکے فوٹو اور وارنٹ دکھایا اور کہا کہ مجھے آپ کی گرفتاری کا حکم ہے مگر میں مسلمان ہوں، یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل ہی رہے تھے کہ جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور جدہ کی طرف روانہ ہوگیا، مولانا بخیریت مکہ مکرمہ پہونچ گئے اور ساری زندگی وہیں گذاری۔ مکہ میں مدرسہ صولتیہ آپ کی مقدس یادگار ہے۔ ۲۲ رمضان ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

ڈاکٹر وزیر خان:- اکبر آباد میں عیسائی مناظرین کو ذلت آمیز شکست دینے میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان بھی تھے، اس مناظرہ میں ان کا رول بہت نمایاں تھا اس لیے حکومت نے ڈاکٹر صاحب کو بھی باغیوں اور دشمنوں کی فہرست میں شامل کرلیا، غدر ۱۸۵۷ء میں ان کے نام بھی وارنٹ جاری کردیا گیا۔ گرفتاری کا مطلب تختہ دار تھا، ڈاکٹر صاحب بھی اس سے بے خبر نہیں تھے وہ خفیہ طور پر حدودِ ہند سے نکل گئے، کچھ دنوں بعد حکومت کو پتہ چلا کہ ڈاکٹر وزیر خاں مکہ معظمہ میں ہیں اس وقت

حجاز پر ترکوں کی حکومت تھی اس لیے انگریزی حکومت نے سلطانِ ترکی کو لکھا کہ ہمارا مجرم آپ کے حدودِ سلطنت میں ہے اس لیے آپ اُسے گرفتار کر کے ہمارے حوالہ کر دیں۔

سلطانِ ترکی نے مکہ کے گورنر کو لکھا کہ ڈاکٹر وزیر خاں کو گرفتار کر لیا جائے چنانچہ گورنر نے ڈاکٹر وزیر خاں کو بلایا اور بابِ خلافت سے آئے ہوئے حکم سے ان کو باخبر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اللہ اور رسول کی پناہ میں آگیا ہوں مجھے یہاں سے گرفتار کر کے دشمنانِ دین کے حوالہ کرنا کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں اور اگر مجھے گرفتار کرنا ہی ہے تو میری گرفتاری سے پہلے فلاں قبیلہ کے سردار سے گفتگو کر لیجئے کیونکہ میں اسی قبیلہ کے ساتھ زندگی گذار رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کا سردارِ قبیلہ سے تعارف اس کی قریب مرگ بیوی کے کامیاب علاج کے ذریعہ ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا اس قبیلہ میں بڑا اعزاز و احترام تھا، گورنر نے سردارِ قبیلہ کو بلایا اور اپنا عندیہ ظاہر کیا تو سردار نے گورنر سے کہا کہ آپ بے شک ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کر سکتے ہیں مگر یہ گرفتاری اس وقت ہوگی جب میرے قبیلے کے بیس ہزار جوانوں میں سے ایک ایک کٹ کر مر نہ جائے، اس وقت تک آپ ڈاکٹر صاحب کو گرفتار نہیں کر سکتے۔

گورنر نے ڈاکٹر صاحب کا جواب اور سردارِ قبیلہ کی بات لکھ کر دربارِ خلافت کو بھیج دیا، خلیفہ نے انگریزوں کو جواب لکھ دیا کہ کسی مسلمان کو حرمِ محترم سے گرفتار کر کے کافروں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح ڈاکٹر وزیر خاں انگریزوں کے شکنجۂ عذاب سے محفوظ رہے۔ آپ پوری زندگی حرمِ محترم کے جوار میں گذار کر اسی مقدس سرزمین میں آسودۂ خواب ہوئے

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

باب ۳

عیسائی مشنریوں کے خلاف محاذ آرائی کا دوسرا دور

ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی جدوجہد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جدوجہد ہے جو غدر ۱۸۵۷ء سے قبل شروع کی گئی اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی اور انگریزوں کا پنجۂ استبداد مسلمانوں کی حکومت کے گلے پر سختی کے ساتھ جم چکا تھا، حکومتِ مغلیہ زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی اور چراغ کی لَو آخری سنبھالا لے رہی تھی، دہلی دربار میں انگریز ریزیڈنٹ رہنے لگا تھا، اس کی مرضی کے بغیر بہادر شاہ ظفر اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کرسکتا تھا، عملاً انگریز ہندوستان کا بے تاج کا بادشاہ بن چکا تھا۔

یورپ میں جب یہ سنا گیا کہ انگلستان کے چور، اُچکّے، بدمعاش اور بدکردار افراد بھاگ کر ہندوستان چلے گئے تھے اور بانس، مچھلی، بھس اور نیل کی تجارت کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے وہ ہندوستان جیسے وسیع و زرخیز ملک پر قابض ہوگئے اور وہاں کے بادشاہ کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے تو انگلستان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اب یہی بداطوار افراد جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی تھی یورپ میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے کیوں کہ کمپنی کے ارکان جب لندن جاتے تھے تو ہندوستان میں بے انتہا کمائی کی وجہ سے وہاں شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے تو عام انگریزوں کو ان کی قسمت پر رشک ہونے لگتا تھا اس لیے فطری طور پر ہندوستان میں کاروبار کرنے والے انگریزوں کا یورپ میں وقار و اعزاز بہت

بڑھ گیا اس لیے وہاں کی حکومت نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون و امداد کا فیصلہ کرلیا کہ ہندوستان پر انگریز قوم کا قبضہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے، اس کی تدبیر وہاں کے دانش وروں کے ذہن میں یہ آئی کہ ہندوستان میں ایک مہم کے طور پر منصوبہ بند طریقے سے عیسائیت کو پھیلایا جائے کیونکہ جب ہندوستان میں عیسائیت پھیل جائے گی اور وہاں کی اکثریت عیسائیت قبول کرلے گی تو ان کو ہم مذہب ہونے کی وجہ سے انگریز قوم سے ہمدردی ہو جائے گی اس سے انگریزی حکومت کو استحکام حاصل ہوگا، اس کا ایک کامیاب تجربہ وہ اندلس میں کرچکے تھے، یہ تو طے تھا کہ ہندوستان میں حکومت ہندوستانیوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں اور نظام حکومت چلانے کے لیے یورپ سے اتنی بڑی تعداد ہندوستان منتقل نہیں ہوسکتی کہ حکومت کے تمام شعبوں میں یورپین رکھے جائیں اس لیے کہ انگریزوں نے دین عیسائیت کی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ حکومت کی حرص سے بطور سیاست عیسائیت کے فروغ کا یہ لمبا چوڑا پلان بنایا، پادریوں کی ٹریننگ کے لیے تربیت گاہیں قائم کیگئیں، ان کو عربی، فارسی اور اردو زبانیں سکھائی گئیں، اسلامی علوم و فنون پڑھائے گئے، تصنیف و تالیف کا سلیقہ سکھایا گیا اور مسلمانوں سے مناظرہ کرنے کی ان کو تربیت دی گئی اور جب آٹھ دس سال کی شبانہ روز جدوجہد کے بعد پادریوں کا یہ جتھہ تیار ہوگیا تو ان کو ایک ساتھ جہاز سے لاکر ہندوستان کے ساحل پر اتار دیا گیا اور ملتان سے لے کر چاٹگام اور برما تک ان کو پھیلا دیا گیا اور پھر یہ ہزاروں کی تعداد میں یورپین پادری اپنے لمبے چوڑے بجٹ کے ساتھ ہندوستان میں سرگرم کار ہوگئے۔

پادریوں کی کارگذاری :- چونکہ ان پادریوں کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے وہ بلا جھجک جہاں چاہتے کھڑے ہوکر اسلام کے خلاف زہر چکانی کرتے رہتے تھے، خالص مسلمانوں کے مجمع میں وہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو نشانہ بناتے مگر کسی مسلمان میں اتنی ہمت و جرأت نہیں تھی کہ انھیں ٹوک سکے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں پر کتنا خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔

پادریوں کی جدوجہد کا مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوتا تھا، کچھ ممتاز قسم کے ہندوؤں نے عیسائیت قبول کرلی، مسلمانوں میں بھی بعض خاندان عیسائی ہوگئے، ان عیسائیت قبول کرنے والوں کا خوب پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا تاکہ دوسرے لوگ اس سے متاثر ہوں۔ اسی دوران کلکتہ کے لاٹ پادری ایڈمنڈ کی گشتی چٹھی نے ہندوستانیوں کے بالخصوص مسلمانوں کے دل و دماغ کو ہلاکر رکھدیا۔ اس نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ اگر ہندوستانی بخوشی عیسائیت قبول نہیں کرتے تو ان کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم شروع کردی جائے۔

اسی دوران ایک واقعہ اور ہوا، ۱۸۳۷ء میں ایک بار زبردست قحط پڑا اور بیشمار بچے یتیم ہوگئے، حکومت نے ان بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اور بعد میں سب کو عیسائی بنالیا چاہے وہ مسلمانوں کی اولاد رہی ہو یا غیر مسلموں کی، ان واقعات کی وجہ سے پورا ہندوستان اپنی جگہ سہما ہوا تھا کہ انگریز افہام و تفہیم کے ذریعہ عیسائیت کی ابھی تبلیغ کررہی ہے عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ پورے ملک کو تلوار کی نوک پر عیسائی بننے کے لیے مجبور کردیا جائے گا۔ ادھر پادریوں کے پروپیگنڈہ اور یک طرفہ بیان کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کا ایمان بھی ڈگمگانے لگا تھا یا کم از کم عیسائیت کے لیے ان کے دلوں میں ایک نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا اور اگر کچھ دنوں تک اور یہ پادری بے لگام رہتے تو نہیں معلوم اس کا انجام کیا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو میدانِ عمل میں کھڑا کردیا اور انہوں نے ہوا کا رخ بدل دیا۔

پالیسی بدل دی گئی:- مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے مناظرہ کے بعد اتفاق سے چند سالوں بعد ہی غدر ۱۸۵۷ء کا سانحہ ظہور پذیر ہوگیا جس نے انگریزوں کی ہندوستان میں بنیاد ہلادی اور ان کو ہندوستان میں اپنا مستقبل تاریک ہی نہیں نظر آنے لگا بلکہ اپنا وجود بھی خطرہ میں نظر آنے لگا، اس لیے سب سے پہلا مسئلہ ان کو اپنی حکومت کی بقا کا درپیش ہوگیا اس لیے قدرتی طور پر تبلیغ عیسائیت کا جوش سرد پڑگیا اور اپنی پالیسی بدلنے پر ان کو مجبور ہونا پڑا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد:- مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی یہ مہم ختم ہوگئی یا اس

مہم کی طرف سے سرد مہری برتی جانے لگی، بس اتنا ہوا کہ وہ گرمی اور زبان و بیان کی تلخی باقی نہیں رہی، اب وہ محتاط طریقے پر اپنی مہم چلانے پر مجبور ہو گئے اور ایک دوسرے منصوبے کے مطابق کام کا آغاز کر دیا، نئی پلاننگ اور نئے نقشے کے مطابق اب ان کی ساری کارروائیاں ہونے لگیں۔

یورپ اور امریکہ میں چرچ کی آمدنی بے حساب تھی ان کا بجٹ ایک چھوٹی سی حکومت کے بجٹ کے برابر ہوتا ہے دوسرے یہ کہ ہندوستان جو اس زمانہ میں سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا اس سونے کی چڑیا پر انگریزوں کا اب مکمل قبضہ ہو چکا تھا، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد برطانیہ نے زمام اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں براہ راست لے لی اس لیے ساری آمدنی چاہے حسب معمول طریقے سے ہو یا نئے نئے ٹیکس لگا کر ہو سب کی مالک حکومت برطانیہ تھی، اور حکومت ہی تبلیغ عیسائیت کی ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے تھی اس لیے عیسائیت کے فروغ پر بے تحاشا دولت پھونکی جا رہی تھی، ہر بڑے شہر میں عیسائی مشن قائم کیے جانے لگے یہ مشن درحقیقت بڑا ادارہ ہوتا تھا جس سے متعلق بہت سے افراد ہوتے تھے، اسی کے تحت مشن ہسپتال کھولے جاتے جو اعلیٰ پیمانے پر علاج معالجہ کا کام کرتے، یورپ کے مایہ ناز ڈاکٹر جو مشنری ذہن و مزاج کے ہوتے ان ہسپتالوں میں خدمات انجام دیتے، ان ہسپتالوں کا بجٹ لاکھوں میں ہوتا تھا ہسپتالوں کے علاوہ ہر جگہ مشن اسکول کھولے جاتے اس میں بچوں کو اس نقطۂ نگاہ سے تعلیم دی جاتی کہ وہ انگریزی حکومت کی مشنری کے بہترین پرزے ثابت ہوں اور عیسائیت کے لیے ان کے دلوں میں نرم گوشہ بھی پیدا ہو جائے، انجیل کی تعلیم ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے دی جاتی تھی، ہر مشن میں چرچ کا ہونا ضروری تھا اس میں ہسپتال کے مریضوں اور اسکول کے اساتذہ اور طلبہ کو ہفتہ کے دن حاضری ضروری ہوتی۔ حضرت مریم کی تصویر کے سامنے دعائیں کرائی جاتیں مریضوں کے لیے شفا کی دعائیں ہوتیں۔

غرضیکہ ہسپتال، اسکول اور چرچ وغیرہ پر لاکھوں لاکھ روپے خرچ ہوتے مشن سے وابستہ ہر ہر فرد مشنری دماغ کا ہوتا ہر فرد کے اندر فروغ عیسائیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا تھا، ہسپتال میں کام کرنے والے ڈاکٹر، نرسیں، کمپاؤنڈر، اسکول کے

ٹیچرس تبلیغ عیسائیت کے جذبے سے سرشار ہوتے تھے اس لیے جو مسلمان یا ہندو ان اداروں میں کام کرتا وہ بھی بالعموم عیسائی ہو جاتا تھا، پھر اس کی خوب آؤ بھگت ہونے لگتی، اس کا اعزاز بڑھ جاتا، بسا اوقات اس کے پورے خاندان کے اخراجات کو یہ مشن پورا کرتا تھا ان لوگوں کی سفارش پر لوگوں کو نوکریاں دی جاتیں۔

عیسائی مشنریوں کا دائرۂ کار:- عیسائی مشنریوں نے کتنے وسیع پیمانے پر تبلیغ عیسائیت کو شروع کیا اس کا اندازہ ان رپورٹوں سے ہوتا ہے جو اپنی کارگذاری کے سلسلے میں کبھی کبھی شائع کی جاتی تھی۔

عیسائیوں میں متعدد فرقے ہیں، ہر فرقہ اپنے وسائل و ذرائع کے مطابق فروغ عیسائیت میں بھرپور حصہ لیتا تھا، ان فرقوں نے آپس کی رضامندی سے اپنے اپنے مقدور اور بجٹ کے موافق کل ہندوستان اور برما کو اپنے دین کی اشاعت کے لیے تقسیم کر لیا تھا اور اپنے اپنے گروہ کے حدود اور وسعت کو پہلے سے تجویز کر لیا تھا مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا پریزی ٹیرین چرچ اور راجپوتانہ اور ہندو ریاستوں میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک اور ممالک مغربی و شمالی میں زیادہ تر امریکہ کا میتھوڈیسٹ چرچ وغیرہ کام کرتے تھے[1]

اب ان الگ الگ ملکوں کے عیسائی مشنریوں کے کتنے آدمی اور ادارے اس مہم میں لگے ہوئے تھے اس کی وسعت اور حدود کار کو سمجھنے کے لیے صرف ایک شاخ میتھوڈیسٹ ایپسکوپل آف امریکہ کی کارروائیوں کا مختصر حال یہ ہے کہ اس کے پادری تبت کے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے لے کر ہند کی جنوبی منتہا راس کماری تک اور بلوچستان کے صدر شہر کوئٹہ کے لیے جو انگریزی عملداری کی مغربی سرحد ہے جزیرہ نما ملایا کی انتہا سنگاپور تک ۲۰ لاکھ مربع میل کی وسعت میں پھیلے ہوئے تھے اور کوئی قصبہ اور قریہ ہندوستان کا باقی نہیں رہا جہاں اس فرقہ کا مشن نہ پایا جاتا ہو اور ہر مشن سے متعلق اتنے گرجے، شفاخانے، چھاپہ خانے اور زمینداریاں و گرانٹ صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کے کارخانے اور مذہبی تعلیم کے مدارس ہیں جن کے شمار

---

[1] مقالہ مولانا شفقت اللہ بدایونی اجلاس بریلی ص ۳۹ بحوالہ سیرت مولانا محمد علی ص ۳۸ و ۳۹ و ۴۰

سے عقل عاجز ہے۔[1]

تحقیق کرنے والوں نے شمار کر کے بتایا ہے کہ اس فرقہ کے دو سو پچاس مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ان شہروں کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ کس شہر میں کتنے مشن سرگرم عمل ہیں۔[2]

اسی سے آپ عیسائیوں کے دوسرے فرقوں کے وسیع نظام عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں یہ مشن تعلیم و ترقی کے نام پر اور مالی امداد کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے پوری قوت سے کوشاں تھے۔ جو لوگ عیسائیت کا شکار ہو جاتے تھے ان کی برابر خبر گیری اور مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ گورنمنٹ ان مشنریوں کی پوری امداد کرتی تھی اور ان کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتی تھی۔

مشنریوں کی جد و جہد رائیگاں نہیں تھی: مختلف طبقات کے کچھ نہ کچھ لوگ عیسائیت کے جال میں گرفتار ہو جاتے تھے، کچھ اہل علم ہندوستانیوں نے بھی عیسائیت قبول کر لی تھی اور انہوں نے بھی اپنی صلاحیتوں کو فروغ عیسائیت میں صرف کرنا شروع کر دیا، یورپین عیسائیوں کے علاوہ دیسی عیسائیوں نے قریہ قریہ جا کر لوگوں کے ذہن و مزاج میں اسلامی عقیدہ کی بنیادوں کو کمزور کرنا شروع کر دیا جن مسلمانوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی وہ یورپین عیسائیوں سے زیادہ عیسائیت کے فروغ میں مفید ثابت ہو رہے تھے کیونکہ وہ اسلامی روایات سے واقف تھے اور جو زیادہ پڑھے لکھے تھے وہ قرآن کی تفسیروں میں اسرائیلی روایتوں کی خرافات کو اسلامی تعلیمات کہہ کر مسلمانوں کے دین و ایمان کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر رہے تھے، مزید ستم یہ کہ ہندو گھرانوں سے جو تعلیمیافتہ افراد عیسائی ہو گئے تھے ان کا بھی نشانہ اسلام ہی تھا۔ ان میں سب سے مشہور نام ماسٹر رام چندر اور ٹھاکر داس کے تھے، اول الذکر ایک اسکول میں ٹیچر تھے مگر وہ جب عیسائی ہو گئے تو ان کا اعزاز بہت بڑھا دیا گیا، انہوں نے کئی کتابیں اسلام

---

[1] و [2] مقالہ مولانا شفقت اللہ بدایونی اجلاس بریلی ص ۹۳ بحوالہ سیرت مولانا محمد علی ص ۳۸ و ۳۹ و ۴۰

پر اعتراضات کے سلسلہ میں لکھیں۔

مشنری سرگرمیوں پر اہل علم کی نظر:۔ انیسویں صدی کے آخر تک عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں زور شور کے ساتھ جاری رہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا عبدالحق حقانی انھیں دنوں اپنی تفسیر لکھ رہے تھے جو ۱۲۹۴ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی اس کا طویل ترین مقدمہ انھیں یورپین اور ہندوستانی پادریوں کے ہفوات کے جوابات سے بھرا ہوا ہے، کسی تصنیف کا مقدمہ زمانۂ تصنیف کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ مصنف کا قلم اس کے ماحول کی گرفت میں ہوتا ہے اس لیے کتاب کی ترتیب کے وقت جو حالات، جذبات، خیالات اور تحریکات معاشرہ کو متاثر کرتی ہیں ان کا تذکرہ کتاب کے مقدمہ میں اکثر آجاتا ہے، کیونکہ تصنیف سے مقصد اصلاح ہوتی ہے۔

چونکہ تفسیر میں مناظرانہ رنگ کی بحثوں کی گنجائش ذرا کم ہی ہے اس لیے مولانا عبدالحق حقانی نے اصل تفسیر سے پہلے اپنے گرد و پیش اور ماحول پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور اس دور میں پیدا ہونے والے فتنہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور اسلام کی ترجمانی کی ہے۔

سرسید کی تفسیر احمدیہ:۔ یہی زمانہ ہے جب سرسید نے اپنی تفسیر لکھی اور اسلام کے بہت سے مسلمہ حقائق سے انکار کیا اور ان کا

لہ مولانا عبدالحق حقانی گتھلہ ضلع انبالہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں سکونت حاصل کرلی تھی۔ آپ کی ولادت رجب ۱۲۶۷ھ میں ہوئی۔ زیادہ تعلیم کانپور میں مولانا عبدالحق حسینی کانپوری اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے حاصل کی، حدیث کی کتابیں مراد آباد میں مولانا عالم علی نگینوی سے پڑھیں۔ فراغت کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس ہوگئے۔ اردو میں ان کی تفسیر "تفسیر حقانی" کے نام سے مشہور و مقبول ہے۔ دوسری کتابوں میں برہان فی علوم القرآن، التعلیق النامی علی الحسامی، عقائد الاسلام کے نام ہیں۔ حیدرآباد سے جب وظیفہ مقرر ہوگیا تو آپ نے فتحپوری سے استعفیٰ دے دیا اور صرف تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ آپ کا انتقال ۱۲ جمادی الاول ۱۳۳۵ھ میں ہوا اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔

مذاق اڑایا اور ان کی مہمل اور خلافِ حقیقت تاویلیں کیں اور اسلام کے بہت سے عقیدوں کے بارے میں اپنے ذہن و فکر سے گھڑ کر ان کو مسخ کیا، یہ سب انہوں نے صرف اس لیے کیا کہ وہ یورپ کی تہذیبِ جدید سے مرعوب تھے، اور پادریوں کے اعتراضات سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے جن باتوں پر وہ اعتراضات کرتے تھے ان کی ایسی خلافِ واقعہ تاویل کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے اعتراضات سے بچا جا سکے اور مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیت سے ٹکرانے کا جذبہ پیدا ہونے کے بجائے نرم گوشہ پیدا ہو جائے چاہے اس کی وجہ سے اسلامی تعلیمات کا حلیہ ہی کیوں نہ بگڑ جائے اس کوشش میں انہوں نے چودہ سو برسوں کی متفقہ روایات کو ہفوات اور خرافات قرار دیا۔ اس سے آپ یورپین پادریوں کے اثرات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

مشہور مستشرق گارسن دتاسی کے لیکچروں کے حوالے سے میں لکھ چکا ہوں کہ سرسید احمد کی کتابوں سے اور اس طرح کے خیال سے دینِ عیسوی کی نشر و اشاعت میں ان کو مدد ملنے کی بڑی توقعات تھیں اور اس نے سرسید کی منہ بھر کر تعریف کی ہے۔

انھیں اسباب کی وجہ سے مولانا عبدالحق حقانی نے اپنے مقدمہ میں ان تمام اعتراضات کو نقل کر کے ان کے جواب دیئے ہیں، میں جستہ جستہ اس مقدمہ کے اقتباسات دیتا ہوں تاکہ آپ کو ان اعتراضات اور دل آزار بکواس سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جائے جو انیسویں صدی کے آخر تک عیسائیوں کی طرف سے جاری تھیں۔

سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا:۔

مولانا عبدالحق اپنے مقدمہ تفسیر میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اسلام کے وہ مخالف لوگ کہ جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور انہوں نے حق و ناحق اسلام کی توہین کا بیڑا اٹھا رکھا ہے بلکہ اس کی تنخواہ پاتے ہیں اور خدا ترسی کو عمل میں نہیں لاتے ہیں ایسی ایسی بے سند باتوں سے اسلام پر بڑا اعتراض کرتے ہیں چنانچہ پادری فنڈر، پادری عماد الدین پانی پتی اور پادری صفدر علی صاحب اکبر آبادی اور ماسٹر رام چندر صاحب دہلوی نے تو کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اپنے ہم مذہبوں کو خوش کرنے کو بڑے بڑے ضخیم رسالے

بنا کر مشہور کر دیئے کہ جن کا جواب ناچار اہلِ اسلام کو دینا پڑا۔ ماسٹر رام چندر صاحب نے "تحریفِ قرآن" کے نام سے پندرہ سولہ جزوں کا رسالہ اسی بیان میں لکھا ہے، فقیر نے اس کے جواب میں "تعریف القرآن" لکھ کر پادری صاحبوں کی ناحق زبان درازی بتلائی ہے[1]۔"

قرآن کو دنیا سے ناپید کرنے کا خبط:۔ پادریوں کی ریشہ دوانیوں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بھی آپ نے لکھا ہے اگرچہ اس کی سند بہت قوی نہیں ہے لیکن عیسائی مشنریوں کی حرکات دیکھ کر دل یہ کہتا ہے کہ اگر ایسا انہوں نے سوچا اور اس پر عمل کیا ہو تو کوئی بعید بات نہیں، آپ پہلے واقعہ سن لیجئے۔ مولانا عبدالحق ہمیں بتاتے ہیں کہ:۔

"ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب ابتدائے عملداری انگریزی میں یہاں پادری لوگ آئے تو انہوں نے بخیالِ خام اس بات کے کہ یہاں مطابع تو ہیں نہیں، قلمی نسخوں پر مدار ہے، مسلمانوں سے قرآن مجید کو گراں گراں قیمت پر خریدنے شروع کیے اور سالہا یہ معاملہ رہا چناں چہ میرٹھ اور دہلی کے بہت لوگ معمر اس کی شہادت دیتے ہیں، وہ بزرگ کہتے ہیں کہ ایک پادری میرے دوست تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ سچ کہو، یہ اس قدر نسخے تم کیوں خریدتے ہو، بالآخر بڑے اصرار سے اس نے یہ راز بتلایا کہ یہاں کے مشن کی رائے ہے کہ ان لوگوں سے نسخے خرید لیے جاویں اور پھر جب قرآن بہت نایاب ہوں تو لندن سے مختلف نسخے قرآن مجید کے طبع کرا کے یہاں کے مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کیے جاویں بس مسلمانوں میں بڑا اختلاف قرآن میں پڑ جائے گا اور دینِ مسیحی کا خوب ظہور ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ یہ خبط ہے اس سے کچھ بھی نہ ہوگا، ناحق روپے صرف کرتے ہو، چنانچہ اس کی سمجھ میں بات آگئی اور خریدنا موقوف کیا۔"

---

[1] مقدمہ تفسیر فتح المنان فی تفسیر القرآن جلد ۱ ص ۶۱

[2] " " " " " ۶۳

دیسی پادریوں کی شر انگیزیاں :- اسلامی نام رکھنے والے پادریوں نے کیسی کیسی شر انگیزیاں کیں اور دل آزار باتیں لکھیں اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگی، مولانا عبدالحق اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

"پادری عمادالدین نے اپنی کتاب ہدایت المسلمین" کے باب ہفتم اور فصل اول صفحہ ۲۵۱ سے لے کر صفحہ ۲۶۱ تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حال لکھا، اس کے الفاظ ہیں :-

"عرب میں ایک شہر مکہ ہے جس میں ایک مندر یعنی بُت خانہ ہے جس کا نام کعبہ ہے وہاں ہر سال میلہ لگا کرتا تھا۔ محمد صاحب کے باپ دادا وہاں کے پجاری تھے، جب محمد صاحب پیدا ہوئے اور جوان ہو گئے، جب روزگار اور کمائی کی فکر میں کئی جگہ کا سفر اختیار کیا آخر کار خدیجہ کے نوکر ہو گئے اور شام میں گماشتہ کے طور پر تجارت کے لیے گئے چونکہ محمد صاحب نے کئی جگہ کے عیسائیوں کی گفتگو سنی تھی اور بت پرستی کے عیوب ان پر ظاہر ہوئے تھے کیونکہ ذرا غور سے بت پرستی کے عیوب ظاہر ہو سکتے ہیں، بس محمد صاحب نے کار تجارت اختیار کیا اور یہودیوں اور رومن کیتھولک عیسائیوں اور پارسیوں سے اور شہریوں اور بریوں اور بحریوں سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ معاملہ کیا اس لیے طبیعت کی وہ تاریکی جو بُت پرستی کا سبب ہے دور ہو گئی اس لیے محمد صاحب دین حق کے متلاشی ہوئے چنانچہ سورۂ والضحیٰ میں لکھا ہے :- ووجدك ضالا فهدیٰ "اے محمد تو گمراہ تھا پس تجھے ہدایت دی"[1]

لب و لہجہ اور انداز بیان کی تلخی ملاحظہ فرمائیے، پادریوں کی انھیں بدزبانیوں سے مجبور ہو کر کبھی کبھی علماء اسلام کی زبان سے بھی تیز و تند باتیں پادریوں کے بارے میں نکل جاتی تھیں لیکن پھر بھی حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے تھے مولانا عبدالحق پادریوں کی کچھ

---

[1] مقدمہ تفسیر حقانی ص ۶۷

بکواس کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ :۔

"آپ کی قوم کی حکومت بھی ترقی پر ہے اور اُولوالعزمی بھی ہے جس کی وجہ سے کروڑہا روپیہ بطور چندہ کے جمع ہو کر پادری لوگوں کو مشنوں میں تقسیم ہوتا ہے جس پر پادری صاحب گھوڑوں اور بگھیوں پر چڑھے پھرتے ہیں اور جس کا روح القدس سن کر عماد الدین کو ایسی ایسی ناپاک اور گندی باتیں انبیاء علیہم السلام کی نسبت کہلاتا ہے اس پر بھی کوئی سچا عیسائی نہیں دکھائی دیتا اور جھوٹے اور نئے عیسائی بھی باوجود کوشش کے دس بیس چار یا حلال خور یا بعض مسلمان و ہنود ہیں جو دنیا کی تنگی سے عاجز آ کر منافقانہ عیسائیوں میں جا ملتے ہیں، عماد الدین کو دو مہینے تنخواہ نہ ملے تو پھر دیکھئے کیا کرتے ہیں"[1]

پادری عماد الدین ضمیر فروش ہونے کے ساتھ ساتھ بدزبان و بدلگام بھی تھا منہ میں جو آتا تھا بک دیتا تھا۔ اپنی کتاب "ہدایت المسلمین" میں ایک جگہ لکھتا ہے جیسا کہ مولانا عبدالحق ہم کو بتاتے ہیں، اس کے الفاظ ہیں :۔

"محمد صاحب نے خاص و عام سب لوگوں کو یہ لالچ دیا کہ اگر میرے ساتھ جاؤ گے، عورتیں مفت لوٹ میں ہاتھ آئیں گی تم ان سے صحبت کرنا، خدا کا بھی اس میں کوئی گناہ نہیں"[2]

اس طرح کی دل آزار تحریریں دیکھ کر علماء اسلام کا خون کھولنے لگتا تھا لیکن ان مرتد ہونے والے دیسی پادریوں کا دن رات کا یہی مشغلہ تھا، وہ اسی کی تنخواہ پاتے تھے، ان کی پشت پر یورپین پادریوں کا ہاتھ تھا، اس لیے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں اور ہر مہینہ دو مہینہ پر کوئی رسالہ اس طرح کی تحریروں سے لبریز چھاپ کر عام طور پر مفت تقسیم کیا کرتے تھے جنہیں پڑھ کر مسلمانوں کے بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور اب اس کا ردِ عمل کچھ کچھ مسلمانوں کی طرف سے بھی ہونے لگا تھا،

---

[1] مقدمہ تفسیر حقانی ج ۱ ص ۷۔ [2] حوالہ مذکور ص ۱۷

یہ تمام رسالے اور کتابیں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہیں اگرچہ غدر کے بعد سال دو سال انگریزوں کی دار وگیر کی وجہ سے مسلمان سہما ہوا تھا لیکن اس کے بعد حالات بدل گئے، فضا میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہوا اور مسلمانوں میں روندی اور کچلی ہوئی غیرت وحمیت میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے تو مسلمانوں نے مصلحت اور احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا، احساس کمتری ومظلومیت سے نجات حاصل کرلی، اس لیے اب مسلمان ہر ہر قدم پر ان پادریوں کا پیچھا کرتے تھے، اگر مجمع عام میں زہر چکانی کرتے تو وہیں منہ در منہ ان کا جواب دیتے اور تریاق مہیا کر دیتے، اگر وہ ایک رسالہ لکھتے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کے جواب میں متعدد رسالے شائع کیے جانے لگے۔

دیسی عیسائی اور پادری:- ہندوستان کے ہر قابل ذکر شہر میں قائم ہونے والے ان مشنوں کا آزادی سے قبل تک بڑا وقار تھا، ان مشنوں کے اسکول میں پسماندہ ذات کے بچوں کو رکھ کر ان کی خوراک، پوشاک اور رہائش کا بطور خود بندوبست کرتے اور ان کو مفت تعلیم دیتے، ان لڑکوں کی تعداد ہر مشن میں سیکڑوں سے متجاوز ہوتی تھی، یہ سب کے سب لڑکے بعد میں عیسائی بنا لیے جاتے، ان کے ماں باپ کو مشن کی طرف سے مالی امداد دی جاتی تھی اس لیے ان کے بچوں کے عیسائی ہوجانے پر کوئی شکایت بھی نہیں ہوتی تھی۔

بڑے درجہ کے پادریوں کی وجہ سے کچھ اچھے گھرانوں کے لوگ بھی عیسائی ہوچکے تھے جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اگر یہ عیسائی ہونے والا مسلمان اسلامی علوم سے واقف ہے تو عیسائی ہونے کے بعد اس کو پادری کا عہدہ دے دیا جاتا تھا، اس کا وقار بڑھا دیا جاتا اس کی بیش قرار تنخواہ مقرر کردی جاتی اور وہ آرام وآسائش کی زندگی بسر کرنے لگتا تھا۔ ایسے عیسائی ہونے والوں کو علماء اسلام سے مناظرہ ومباحثہ کی ذمہ داری سپرد کی جاتی اور اسلام کے خلاف ان سے کتابیں اور رسالے لکھوائے جاتے اور ان کو متعدد زبانوں میں شائع کیا جاتا۔

پادری صفدر علی سی پی کے شہر جبل پور میں ۱۸۶۵ء میں عیسائی ہوا اور اس کو پادری بنا دیا گیا، امرت سر کے عماد الدین نے ۱۸۶۶ء میں عیسائیت قبول کی، ایک کو کلکتہ میں اور

دوسرے کو لاہور میں پادری کے عہدے پر فائز کر دیا گیا، کنٹربری کے لاٹ پادری نے ڈاکٹر آف ڈیوی نٹی (علامہ الٰہیات) کی ان کو ڈگری دے کر ان کا اعزاز اور بھی بڑھا دیا تھا، ان لوگوں کی سرگرمیاں انیسویں صدی کے آخر تک برابر جاری رہیں، پادری صفدر علی نے "نیا زمانہ" لکھ کر مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کی مہم شروع کی، پادری عماد الدین نے مشن کی طرف سے شائع کی جانے والی کتابوں پر حاشیہ لکھ کر اور اسلام پر گندے اور ناپاک اعتراضات کر کے ہندوستان کے عیسائیوں میں مشہور ہوا۔

تعاقب جاری ہو گیا:۔ ۱۸۵۷ء کے حادثہ کے بعد ساری قیامتوں سے گذرنے کے باوجود مسلمانوں کا دینی جذبہ سرد نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے علماء اسلام کی جد و جہد میں اضافہ ہی کیا تھا، ہر قابل ذکر شہر میں علماء اسلام ان پادریوں کا تعاقب کرتے، ان سے مباحثے کرتے ان کے جلسوں اور دعاؤں میں جا کر برملا اُن پر اعتراض کرتے اور پادریوں کو بحثوں میں اُلجھاتے، حتیٰ کہ مدارس اسلامیہ کے ذہین طلباء بڑی کامیابی سے ان سے مباحثے کرتے جمعرات یا جمعہ کو ان کے چرچوں میں جاتے اور پادری تقریریں کرتے تو یہ اعتراضات کرتے اور کبھی کبھی یہ بحث طویل ہو جاتی تو ان طلبہ کے اساتذہ بھی ان کے شریک ہو جاتے، دیسی پادری یورپین پادریوں کے ساتھ اس طرح رہتے جیسے مردہ خور گدھوں اور چیلوں کے ساتھ کوّے رہتے ہیں اور کائیں کائیں کرتے ہیں، پادری صفدر علی، پادری عماد الدین اور پادری محی الدین وغیرہ اور دوسرے کئی مسلم نام رکھنے والے پادریوں کا یہی طریقہ تھا۔

جال نیا شکاری پرانا:۔ تحریک ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت نے ایک سبق سیکھا کہ اگر عیسائیت کی تبلیغ میں ذرا بھی بے احتیاطی یا سختی یا حکومت کا تعاون ہندوستان کو نظر آگیا تو دوسری بار اس سے بھی بڑی بغاوت رونما ہو سکتی ہے چونکہ انگریزوں کی تعداد ہندوستان میں بہت زیادہ نہیں تھی اس لیے کہ انگریزی حکومت کی فوج ہندو سکھ اور مسلمانوں پر مشتمل تھی، اور غدر ۱۸۵۷ء کا باعث یہی مذہبی جذبات ہی تھے، سور اور گائے کی چربی لگے کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کو

فوجیوں نے یہی سمجھا کہ ہمارے مذہب کو تباہ اور ہمارے دھرم کو حکومت بھرشٹ کرنا چاہتی ہے پھر پوری فوج باغی ہوگئی۔

اب تبلیغ عیسائیت ضرور جاری تھی لیکن انداز بدل گیا، اب پہلی جیسی سختی نہیں رہی اور پولیس پادریوں کے ساتھ نہیں رہتی تھی، پورے ملک میں مشن اسکول پھیلے ہوئے تھے، ان اسکولوں میں بالعموم یورپین پادریوں کو رکھا جاتا تھا وہ اپنے اسکول کے طلبہ کے دل و دماغ میں عیسائیت کی تخم ریزی کرتے تھے اور کبھی کبھی کسی گاؤں میں کسی میلے میں یہ پادری تبلیغ کے لیے بھی جاتے تھے اور لوگوں کے سامنے عیسائی مذہب کے فضائل اس کی برکات اور دنیا میں عیسائیوں کے عروج کی کہانیاں زور شور سے بیان کرتے تھے، کبھی کبھی کچھ لوگ ان کی باتوں سے اثر بھی لیتے تھے اور عیسائیوں سے قریب ہو جاتے تھے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کچھ ممتاز اور سربرآوردہ افراد کو یورپین پادری اپنی مجلسوں میں بہت اعزاز دیتے تھے ان کے ساتھ برابر کے دوستوں جیسا برتاؤ کرتے تھے ان لوگوں کی سفارشوں پر حکومت میں ملازمتیں دلواتے تھے اور سرکاری تقریبات میں ان کو مدعو کر کے ان کا اعزاز کیا جاتا اس طرح ان کے دلوں میں عیسائیت کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جاتا تھا۔

مسلمان چوکنا تھے:۔ اب پادریوں کا پہلا سا رعب داب باقی نہیں تھا اور نہ ان کے دائیں بائیں پولیس اور تھانے دار چلتے تھے اس لیے جہاں بھی چھوٹے بڑے عالم تھے ان کا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، اس کی وجہ سے پادریوں کی جدوجہد کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، دولت کی حرص بھی ان کو اسلام پر عیسائیت کو ترجیح دینے میں ناکام تھی۔ غریب سے غریب مسلمان بھی کسی لالچ میں آکر عیسائیت اب نہیں قبول کرتا تھا۔ البتہ کچھ ضمیر فروش اور دولت کے حریص افراد عیسائیوں کے ضرور ہاتھ لگ گئے تھے اور انہوں نے چاندی کے چند سکوں کے عوض اپنا ایمان پادریوں کے ہاتھ ضرور بیچ دیا تھا، ان کی تنخواہیں مقرر تھیں اور عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے، یہی ان کی معراج کمال تھی۔

جس طرح خطرناک علاقوں میں چلنے والا مسافر اپنے پالتو کتوں کو اپنی حفاظت

کے لیے ساتھ رکھ لیتا ہے اسی طرح یورپین پادریوں کے یہ پالتو کتے ان کے ساتھ رہتے اور جب علماء اسلام پادریوں کو بحثوں میں گھیرتے اور ان کی زبان بند کر دیتے تو یہ کتوں کی طرح زور زور سے بھونکنے لگتے تھے اور اپنے آقاؤں کی حفاظت کا فرض انجام دیتے تھے شاہ جہاں پور (اتر پردیش) کے میلہ خداشناسی میں بھی ان کتوں کے بھونکنے کی آواز لوگوں نے سنی تھی۔

ہندو طبقہ میں عیسائیت :- ہندو طبقہ پر عیسائیت کے اثرات مسلمانوں سے زیادہ تھے ان کا خوش حال طبقہ زیادہ متاثر تھا، ماسٹر رام چندر اور شاہ جہاں پور کے رئیس اور جاگیردار منشی پیارے لال اور منشی مکتا پرشاد بہت سے ناموں میں سے چند نام ہیں، آریہ سماج جو ہندو دھرم کی ایک شاخ ہے اس کا جنم بھی غدر کے بعد ہی ہوا ہے اور پادریوں کے اثرات کا نتیجہ ہے کہ یہ فرقہ مورتیوں کی پوجا کا منکر ہے، یہ فرقہ اس زمانے میں پادریوں سے بہت قریب تھا کیونکہ شاہ جہانپور کے میلہ خداشناسی میں ہم آریوں کو پادریوں کے شانہ بہ شانہ دیکھتے ہیں اور مباحثہ میں وہ علماء اسلام کے مقابلہ میں پادریوں کی ہم نوائی کرتے تھے۔

منشی پیارے لال چاندا پور ضلع شاہ جہاں پور کے جاگیردار تھے شہر شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے ماسٹر یورپین پادری مسٹر نولس نے ان کو اپنے حلقۂ اثر میں لے رکھا تھا اور اپنی تبلیغی جد وجہد میں ان کو استعمال کر رہے تھے۔

پادری نولس نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ اپنی مملوکہ زمین اور باغ واقع موضع سرہانگور ملحق سوانہ چاندا پور ضلع شاہ جہاں پور میں ایک میلہ "میلہ خداشناسی" کے نام سے ہندو اور مسلمانوں کو جمع کرو اور سب کو دعوت دو اور کوشش کرو کہ عوام کی بھیڑ بھی اس میلہ میں شریک ہو، مقصد یہ تھا کہ مشہور پادریوں کو اس میلہ میں بلا کر عوام اور بالخصوص مسلمانوں کو متاثر کیا جائے کہ اگر پادریوں نے علماء اسلام کی زبان بند کر دی تو پورے ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی کامیابی کا راستہ کھل جائے گا اور عیسائیت کا بول بالا ہو جائے گا۔ اور در پردہ یہ سازش تھی کہ سناتن دھرم کے پنڈتوں کے ساتھ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی

کو بھی شریکِ مباحثہ کیا جائے، ایک طرف سے پادریوں کا حملہ اسلام پر ہو دوسری طرف سناتن دھرم والے اور آریہ سماجی اسلام کو نشانہ بنائیں، اس دو طرفہ حملہ کی مسلمان تاب نہیں لائیں گے۔ اس طرح ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔

میلہ خدا شناسی شاہجہاں پور:- منشی پیارے لال نے پادری نولس کے حکم سے پہلی بار ۱۸۷۶ء میں بین المذاہب مباحثہ کا آغاز کیا اور اس کا نام "میلہ خدا شناسی" رکھا۔ اس اجتماع کے لیے باقاعدہ شاہ جہاں پور کے انگریز کلکٹر مسٹر رابرٹ جارج گری سے اجازت لے کر پوسٹر چھپوائے گئے اور تقسیم کیے گئے۔ اخبارات میں اعلان ہوا، اس مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے یورپین پادریوں کے ساتھ دیسی پادریوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ آریہ سماج کے نمائندوں اور سناتن دھرم کے پنڈتوں اور علماء اسلام میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور بعض دوسرے علماء کو دعوت نامے بھیجے گئے، پہلے سال کے اس اجتماع میں حضرت نانوتوی کی متکلمانہ تقریر نے ہوا کا رُخ بدل دیا، کسی میں ہمت و جرأت نہیں تھی کہ اس تقریر کے بعد اسلام پر اعتراضات کرے، اسی کے ساتھ دوسرے باطل مذاہب کے ناقابلِ عمل یا منسوخ ہونے پر جو دلائل دیئے گئے اس کا جواب بھی دوسرے مذہب کے نمائندوں سے نہ ہو سکا، مباحثہ کی کئی نشستیں ہوئیں اور بہت سے مسائل زیرِ بحث آئے اور ہر ایک میں حضرت نانوتوی نے مرعوب کن اثرات ڈالے اور عام طور پر عوام میں مسلمانوں کی فتحمندی کا شہرہ ہوا، اس مباحثہ کے دُور رس اثرات ہوئے۔

دوسرا میلہ خدا شناسی:- دوسرے سال ۱۸۷۷ء میں پھر یہ میلہ منعقد کیا گیا۔ اب کی اس کی شہرت اور زیادہ ہوئی، اس لیے دور دراز سے بڑی تعداد میں لوگ آئے اس لیے یہ مباحثہ ہندوستان گیر اثرات کا حامل ہو گیا، اس لیے میں اس مذہبی مباحثہ کی تھوڑی سی تفصیل آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ علماء حق نے کس طرح کے ماحول اور حالات میں اسلام کی ترجمانی اور حفاظت و بقا کے فرائض انجام دیئے اور کس طرح اپنی خداداد ذہانت سے کام لے کر اسلام کا نام سربلند کیا؟ اور غلبۂ اسلام کا دل کش نظارہ دنیا نے دیکھا کہ ایک طرف مسلمانوں کی فتح و نصرت اور اسلام کا

پرچم فضا میں پوری شان سے لہراتا رہا اور عیسائی پادری اپنی روسیاہی چھپانے کے لیے طرح طرح کی قلابازیاں کھاتے رہے اور ان کے حوصلے پست ہو گئے اور سارے وسائل کے باوجود ان کے جذبات اور ان کے ولولوں پر اوس پڑ گئی۔

مُباحثہ کا منظر:۔ ایک پر فضا گھنے باغ میں خیمے اور راوٹیاں نصب کر دی گئیں جن میں ہر مذہب کے اہلِ علم اور نمائندے اپنے اپنے مخصوص خیموں میں قیام پذیر ہیں، ان خیموں سے کچھ دُور ایک بڑا شامیانہ تنا ہوا ہے جس میں فرش بچھا ہوا ہے یہی مباحثہ کی جگہ ہے، لیکن جب لوگوں کی آمد شروع ہوئی اور مباحثہ کا وقت قریب آیا تو عوام کی بھیڑ اکھٹی ہو گئی کہ شامیانہ ناکافی ہو گیا اس لیے کھلے میدان میں یہ بزم مباحثہ منعقد ہوئی، بیچ میں ایک بڑی میز رکھی گئی اور اس سے متصل تخت بچھا دیا گیا تاکہ اس تخت پر کھڑے ہو کر ہر مذہب کا نمائندہ اپنی بات کہے، اس تخت کے پیچھے اور دائیں بائیں کرسیوں کی قطار رکھی گئی جن پر علماء اسلام، آریہ سماجی پنڈت، سناتن دھرم کے نمائندے، دیسی اور یورپین پادریوں کی جماعت بیٹھ گئی، اس سے اور آگے منتظمین میلہ، اخباری رپورٹر، آنریری مجسٹریٹ، اور ضلع انتظامیہ کے افسران اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، ہندوؤں، مسلمانوں اور دیسی عیسائیوں کا جمِ غفیر زمینی فرش پر بیٹھ گیا اور جب فرش بھی ناکافی ہو گیا تو چاروں طرف تماشائیوں کا ہجوم ٹھٹ کا ٹھٹ کھڑا آغازِ مباحثہ کا انتظار کر رہا ہے۔

داؤ پیچ شروع ہو گیا:۔ یہ میلہ ۱۹ اور ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو منعقد ہو رہا ہے، مباحثہ کا پروگرام، طریقہ مباحثہ، موضوعِ مباحثہ، سوال و جواب کے لیے وقت کی تعیین پر گھنٹوں صلاح و مشورہ اور رد و کد ہوتا رہا، ہر معاملہ میں پادریوں کی رائے کو فوقیت حاصل تھی، اور جو ان کی رائے ہوتی تھی اور وہ جو چاہتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے اسی طرح پروگرام بناتے اور نقشہ عمل مرتب کرتے آریہ سماجی اور سناتن دھرمی دونوں مذہبوں کے نمائندے ہر معاملہ میں پادریوں کے ہم نوا ہو جاتے، علماء اسلام جو رائے پیش کرتے اس کو دونوں حریف بہ لطائف الحیل ٹال دیتے، اس لیے مباحثہ کی ساری کارروائی پادریوں کی صواب دید کے مطابق آریہ سماجیوں کی حمایت سے چلتی رہی مسلمانوں کی رائے سے بالقصد اختلاف

کیا جاتا رہا، اسی کشمکش کے ماحول میں مباحثہ کی کارروائی ہوئی۔

شرکاء مباحثہ:۔ مباحثہ میں حصہ لینے والوں کی جو باضابطہ فہرست بنائی گئی اس کو میلہ کی مجلس انتظامیہ نے مرتب کیا تھا اس میں مسلمانوں کے نمائندے حضرت مولانا[1] محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ بانی دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالمجید صاحب بنائے گئے دوسرے علماء میں جو اس مباحثہ کے وقت اسٹیج پر تھے مولانا ابوالمنصور دہلوی جو حضرت نانوتوی کے ساتھ آئے تھے، مرادآباد سے مولانا محمد علی صاحب تھے جو آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں سے مناظرہ میں یکتا تھے ان کے علاوہ اور کئی علماء کرام کرسیوں پر رونق افروز تھے۔

آریہ سماجیوں میں پنڈت دیانند سرسوتی بانی مذہب آریہ سماج اور سناتن دھرم کے وکیل منشی اندرمل مرادآبادی کا نام لکھا گیا، یورپین پادریوں میں پادری نولس جو مشن اسکول شاہ جہاں پور میں کام کرتے تھے دوسرے پادری واکر تھے، پادری اسکاٹ جو مفسر انجیل کہے جاتے تھے وہ دوسرے دن کے مباحثہ میں شریک ہوئے، دیسی پادریوں میں پادری محی الدین پشاوری شریک مباحثہ تھے۔

مباحثہ کا نظم قائم رکھنے اور پروگرام چلانے کی ذمہ داری مذکورہ بالا چھ آدمیوں کو دی گئی لیکن عملاً صرف پادریوں کی رائے پر عمل ہوتا رہا کیوں کہ ان کی حمایت آریہ سماجی اور

---

[1] مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اسلامی ہند کی ایک ناقابل فراموش شخصیت ہے۔ نانوتہ میں ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ سہارن پور اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ حدیث شیخ عبدالغنی محدث دہلویؒ سے پڑھی اور حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکیؒ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ علوم اسلامی میں مجتہدانہ بصیرت کے مالک تھے، دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں۔ آج ہزاروں علماء انھیں کے نام کی طرف نسبت کرکے اپنے کو قاسمی لکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اسلام کی ترجمانی میں مؤید من اللہ تھے، عیسائیوں، آریوں اور شیعوں کے خلوت خانوں میں ان کے نام سے زلزلہ پڑجاتا تھا۔ علم وفضل خداداد تھا اور زہد وتقویٰ شعار، اسلام کی فلاسفی پر ان کی متعدد کتابیں ہیں اور اردو میں ہونے کے باوجود علماء کو پڑھائی جاتی ہیں۔ عام طلبہ کے ذہن سے بہت بلند مضامین پر مشتمل ہے۔ ساری زندگی اسلام کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے گذاری ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا

سناتنی کر رہے تھے اس طرح وہ مل کر چار ہو جاتے تھے اور مسلمان صرف دو تھے اس لیے انھیں کی صواب دید کے مطابق مباحثہ کی کارروائی ہوئی۔

موضوعِ مباحثہ :- مباحثہ کا موضوع بھی کمیٹی نے طے نہیں کیا بلکہ میلہ کے منتظم منشی پیارے لال نے درونِ خانہ مشورے کے بعد ایک اردو تحریر پیش کی کہ مندرجہ ذیل سوالات پر مباحثہ ہوگا اور ہر فریق ترتیب وار انھیں مسئلوں کے جواب میں تقریر کرے گا، سوالات یہ ہیں :-

۱۔ خدا نے دنیا کو کس چیز سے بنایا؟ کس وقت؟ اور کیوں بنایا؟
۲۔ خدا کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟
۳۔ خدا عادل بھی ہے اور رحیم بھی، دونوں کس طرح؟
۴۔ وید، بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟
۵۔ نجات کیا چیز ہے؟ اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ سب سے پہلے ان سوالات کے جوابات کون دے؟ کوئی فریق پہلے تقریر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا، حضرت نانوتوی کا عذر یہ تھا کہ ہمارا دین سب کے بعد کا ہے اس لیے ہم سب کے بعد ان سوالات کے جوابات دیں گے، اسی بحث وتمحیص میں شام کے چار بج گئے تو یادریوں اور ان کے ساتھ دوسروں نے حضرت نانوتوی پر زور ڈالا کہ آپ ہی اس مباحثہ کا آغاز کریں اور سب سے پہلی تقریر آپ کی ہو جائے تو سلسلہ چل پڑے گا۔

حضرت نانوتوی کا معرکۃ الآرا بیان :- حضرت نانوتوی نے جب دیکھا کہ ہر مذہب کا وکیل اپنی مصلحتوں کا شکار ہے اور اعتراضات سے بچنا چاہتا ہے تو آپ نے حامی بھر لی اور آپ اسٹیج پر تشریف لائے اور ایک گھنٹہ تقریر فرمائی، آپ نے اپنی اس تقریر میں وجودِ باری، ذاتِ باری، صفاتِ باری، خدا کی ذات کا سارے عالم کو محیط ہونا، وحدانیت کا ثبوت، تثلیث کا رد، خدائے واحد کا واجب الاطاعت ہونا، انبیاء ورُسل کی ضرورت، ان کا عام انسانوں سے بلند وبالا ہونا، اور جامع صفات کمالیہ ہونا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا، دوسرے تمام ادیان وملل کا منسوخ ہونا

شریعتِ اسلامیہ کا ساری دنیا کے لیے واجب الاطاعت ہونا، شریعتِ محمدیہ کا سابقہ شریعتوں کا ناسخ ہونا، معجزاتِ نبوی کی حقیقت اور دوسرے انبیاء کے معجزات کا موازنہ، حضورؐ کے معجزات کی اہمیت و برتری، ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا خدا کی خدائی میں شرکت کا خلافِ عقل ہونا وید کا کلامِ الٰہی نہ ہونا، انجیل کا محرف اور ناقابلِ اعتبار ہونا، دوسرے مذاہب کے رشیوں منیوں اور اپنے گذشتہ لوگوں کے معجزات و کرامات کا ناقابلِ اعتماد ہونا اور ان کے بیان کرنے والوں کا سلسلۂ سند نہ ہونے کی وجہ سے افسانوی کہانی ہونا۔ ان تمام مسائل پر عقلی و نقلی مسلمات و دلائل اور روزمرّہ کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اس طرح مدلل و مبرہن کیا کہ سارے موافق و مخالف اور دوسرے مذاہب کے وکلاء اور نمائندے دم بخود اور حیرت زدہ ہو کر رہ گئے، ان مذہبی جذبات، امنگوں اور حوصلوں کو نکلنے کی راہیں مسدود نظر آنے لگیں وہ اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ ان حقائق اور مسلمات کا انکار کیوں کر ممکن ہوگا جن کی روشنی میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا گیا ہے، ساری تقریر اسلامی علمِ کلام کی شاہکار تھی، دوسرے مذاہب کو جس کی ہوا تک نہیں لگی تھی، یورپین پادری تو صرف خوف زدہ بندروں کی طرح مضحکہ خیز صورتیں بنائے بیٹھے رہے، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرم والوں کی مرعوبیت کا تو یہ عالم تھا کہ ایک لفظ ان کی زبانوں سے نکلنا دشوار تھا، چونکہ ساری تقریر جن مقدمات پر مشتمل تھی ان کے تسلیم شدہ ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کرنا اپنی عقل کا ماتم کرنا تھا بہت سی دقیق باتیں تو ان کی موٹی عقلوں میں آتی بھی نہیں تھیں لیکن زورِ بیان کا وہ عالم تھا کہ سب کی گردنیں خم تھیں، سوائے خاموشی کے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں نے تو یہاں تک کہا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی زبان سے علم کی دیوی بول رہی ہے، پتھر کی مورتی کو پوجنے والے اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتے تھے اور کیا کہہ سکتے تھے، حضرت نانوتوی رح کا سلسلہ بیان پورے ایک گھنٹہ جاری رہا۔ پادری

سوال و جواب :- نوٹس نے مولانا نانوتوی سے کہا کہ گھنٹہ پورا ہو گیا، مولانا نے اپنی تقریر ختم کر دی۔ اب اعتراض کرنے والوں کو موقعہ دیا گیا کہ جس کو سوال کرنا ہے اور حضرت نانوتوی کے دعووں پر جس کو اعتراض کرنا ہے وہ مولانا موصوف سے سوال کرے۔

اور کسی کو تو سوال کی جرأت نہیں ہوئی البتہ پادری محی الدین پشاوری اُٹھے اور انہوں نے تقریر سے غیر متعلق چار باتیں کہیں جن کا مولانا موصوف کی تقریر میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ ان کے جواب کا انہوں نے مطالبہ کیا جبکہ تقریر میں مندرجہ ذیل باتوں کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کیا گیا تھا

(۱) خدا تعالیٰ کا ثبوت (۲) وحدانیت (۳) ذاتِ خداوندی کا واجب الاطاعت ہونا (۴) نبوت کی ضرورت (۵) نبوت کی علامات و صفات (۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت (۷) آپ کا خاتم الانبیاء ہونا (۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد انھیں کی اتباع میں نجات کا منحصر ہونا۔

مذکورہ بالا مسائل سے چونکہ ان کے سوالات کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے موافق و مخالف سبھی ان کے بیان پر مسکرا پڑے۔ ان کا پہلا سوال انبیاء کے معصوم ہونے سے متعلق تھا جبکہ وہ خود بھی حضرت عیسیٰ کو نبی مانتے تھے، انہوں نے حضرت آدمؑ کے واقعہ کو نبی کے غیر معصوم ہونے کی دلیل میں پیش کیا، دوسری مثال حضرت داؤد علیہ السلام کی دی کہ نعوذ باللہ انہوں نے اُوریّا کی بیوی سے زنا کیا، تیسری مثال میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بت پرستی کا ذکر کیا،

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قرآن میں ہے کہ ہر اُمت میں "نذیر" آیا ہے آپ کے نبی سے پہلے عرب میں کون نبی آیا؟

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے اپنے رسول کے معجزات کو قرآن سے ثابت نہیں کیا۔

چوتھا اعتراض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت پر تھا کہ آپ لوگ درود پڑھتے ہیں تو اس میں اپنے نبی سے ابراہیمؑ کو افضل مانتے ہیں۔

یہ سوالات اگرچہ موضوعِ مباحثہ سے غیر متعلق تھے لیکن حضرت نانوتوی نے کھڑے ہو کر اس کے جواب میں فرمایا کہ "آپ نے اب تک گناہ کا معنی ہی نہیں سمجھا اور اعتراض کرنے کھڑے ہو گئے" پھر آپ نے حضرت آدمؑ کے واقعہ کو لغزش ثابت کیا جو گناہ سے علیحدہ چیز ہے۔ اسی طرح تینوں سوالات کے جوابات جامع اور مختصر لفظوں میں دیئے چونکہ جواب کے لیے صرف دس منٹ مقرر تھے اس لیے چوتھے سوال کا جواب زیرِ بحث ہی تھا کہ وقت ختم ہو گیا۔

قرآن میں آپ کے بائیبل کی تصدیق نہیں ہے:-

پادری محی الدین نے دوبارہ کھڑے ہوکر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی ذات پر وہی ناپاک اتہامات عائد کیے اور کہا کہ مانا کہ آپ کے قرآن میں ان واقعات کا ذکر نہیں لیکن بائیبل میں یہ واقعات بالتفصیل موجود ہیں اور قرآن میں بائبل کی تصدیق موجود ہے اس لیے آپ کو بائبل میں بیان کردہ واقعات کو تسلیم کرنا ہوگا۔

حضرت نانوتوی اسٹیج پر آئے اور پادری محی الدین کے جواب میں فرمایا کہ بے شک قرآن میں انجیل کی تصدیق موجود ہے لیکن اُس انجیل کی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھی، اِس انجیل کی نہیں جو آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، اِس کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ اس میں تحریف اور تغیر و تبدل ہو چکا ہے۔

اس سخت جواب پر پادری محی الدین جھلا اُٹھے اور غصہ میں کہا کہ اگر آپ انجیل میں تحریف ثابت کردیں تو ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے، حضرت نانوتوی نے فرمایا ابھی سہی۔

پھر آپ نے مولانا ابوالمنصور صاحب دہلوی سے فرمایا کہ آج صبح آپ نے جو درس مجھ کو دکھایا تھا وہ اسٹیج پر آکر ان کو سنا دیجیے اور اس پر جو حاشیہ ہے اس کو بھی بتا دیجیے۔ حضرت نانوتوی کے حکم پر مولانا ابوالمنصور صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ:-

I John 5:7 For there are three that bear record in heaven, the Father, the Word, and the Holy Ghost: and these three are one.

"تحریفات تو بہت ہیں، میں صرف ایک ایسی تحریف پیش کر رہا ہوں جو پوری انجیل کو ناقابل اعتبار بنا دیتی ہے، آپ نے کہا درس سات، پانچواں باب یوحنا کے خط میں یہ عبارت ہے:

تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں"۔[1]

پھر آپ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ جب یہ کتاب مرزا پور میں اکابر پادریوں کی زیر نگرانی بڑے ہی اہتمام سے عبرانی اور یونانی زبان سے اُردو میں ترجمہ ہوکر ۱۸۷۰ء میں چھپی

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن گنگوہی ص ۳۹

تو درس مذکور کے بارے میں حاشیہ پر ان پادریوں نے جو اس اشاعت کے ذمہ دار تھے یہ تحریر کیا ہے :-

"یہ الفاظ کسی قدیم نسخے میں نہیں پائے جاتے"

جب مولانا موصوف نے یہ تفصیل سنائی تو تمام پادریوں نے بیک زبان اس کی تردید کی اور کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، مشن کی طرف سے شائع کردہ انجیل کے کسی نسخے میں یہ عبارت ہو ہی نہیں سکتی، یہ جھوٹ ہے، یہ بیان ناقابل اعتبار ہے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

پادریوں کا شور و ہنگامہ جب بہت بڑھ گیا تو حضرت نانوتوی نے مولانا ابوالمنصور صاحب سے فرمایا کہ آپ خیمہ سے کتاب منگا لیجئے، فوراً ایک خادم دوڑا ہوا گیا اور خیمہ سے وہ کتاب اٹھا لیا، مولانا ابوالمنصور نے کتاب لے کر وہ مقام نکالا اور پادریوں کے سامنے رکھ دیا۔ کتاب کے صفحہ پر نظر پڑتے ہی پادریوں کا چہرہ فق ہو گیا، سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور سب پر ایک سکتہ کی کیفیت چھا گئی، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، ذلت و ندامت کے شدید احساس کے ساتھ ہر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا۔

پادریوں کی اس شرمناک شکست پر پورا مجمع اچھل پڑا، ہر طرف زور و شور سے اظہار خیال کیا جانے لگا، ہر سمت سے آوازیں کسی جانے لگیں اور جواب کا مطالبہ کیا جانے لگا، پادریوں کے لیے نہ اقرار کی ہمت، نہ انکار کی گنجائش، مارے غصہ کے یورپین پادریوں نے پادری محی الدین کی طرف دیکھا کہ نہ تم نے اس طرح کا چیلنج کیا ہوتا اور نہ اس ذلت کا سامنا کرنا پڑتا، مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور سوائے ذلت و رسوائی کے اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہ گیا تھا۔

بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن :- پادری محی الدین نے جب اپنی ذلت و رسوائی کا یہ عبرت ناک منظر دیکھا تو بے شرمی پر اتر آئے مگر پھر حماقت کر گئے، انہوں نے کہا کہ یہ تحریف نہیں یہ تو کمی بیشی ہے۔ مولانا نے فرمایا یہ کمی بیشی تو اور بھی انجیل کے ناقابل اعتبار ہونے کی دلیل ہے، کیا معلوم کہاں کہاں سے مضامین اڑا دیئے ہیں، اور کس کس جگہ اپنی صواب دید سے یا بدنیتی سے مضامین بڑھا دیئے ہیں۔ اہل اسلام بھی تو یہی کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ خود انجیل کو اپنی زبان سے

ناقابلِ اعتماد کہہ رہے ہیں۔

یورپین پادریوں نے دیکھا کہ "ایک نہ شد دو شد" ان کو یہ رسوائی ناقابلِ برداشت محسوس ہوئی تو غصہ بھری نگاہوں سے پادری محی الدین کی طرف دیکھا، منشا یہ تھی کہ تم خاموش کیوں نہیں رہتے، ساری ذلت و رسوائی تمہاری وجہ سے ہم کو اُٹھانی پڑ رہی ہے۔

پھر اس کے بعد پادری محی الدین کو بولنے کی ہمت نہیں ہوئی، کچھ دیر کے بعد جب دوسرے مسائل پر گفتگو چل رہی تھی ایک بار پادری محی الدین پھر کھڑے ہونے کا ارادہ کر رہے تھے کہ یورپین پادریوں کی نگاہ ان کی طرف پھر گئی اور آنکھوں کے اشارے سے ان کو کھڑے ہونے سے منع کیا۔ یہ منظر مولانا ابو المنصور صاحب دیکھ رہے تھے، آپ نے پادریوں سے مخاطب ہو کر ذرا بلند آواز سے کہا۔ ہاں ہاں ان کو پھر مت کھڑے ہونے دینا ورنہ پھر فضیحت کرائیں گے، مولانا موصوف کے اس برمحل جملے پر تماشائیوں کا پورا مجمع ہنس پڑا پادری محی الدین پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

پادری نولس کی گل فشانی:- پادری محی الدین کی زبان بندی کے بعد ایک یورپین پادری جو اس میلہ خدا شناسی کے در پردہ داعی تھے ان کا نام پادری نولس تھا وہ اسٹیج پر آئے اور اپنی سمجھ کے مطابق بڑی معرکۃ الآرا بات کہی:-

> "بے شک یہ فقرہ زائد ہے اور جو کچھ پادریان مرزا پور نے حاشیہ پر لکھا ہے وہ صحیح اور درست ہے، مگر یہ چھاپ دینا اور اس کے الحاق کا اقرار کر لینا ہماری دیانت کی دلیل اور ہماری راستبازی کی علامت ہے کہ جو بات غلط تھی اس کو غلط کہتے ہیں، صحیح نہیں کہتے[1]

مولانا منصور صاحب نے برجستہ جواب دیا اور بہترین جواب دیا جو جواب لاجواب ثابت ہوا۔ آپ نے پادری صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:-

"ہم کب کہتے ہیں کہ آپ جھوٹے ہیں، آپ سچے سہی، ہمارا مطلب ہے کہ

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور ص ۴۱

آپ کا دین جھوٹا ہے اور اس کا جھوٹا ہونا آپ کے اقرار سے خود ثابت ہو گیا[1]

تنگ آمد بہ جنگ آمد:- پادریوں کو پے در پے ذلتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، حضرت نانوتوی نے روئے سخن بدلنا چاہا اور فرمایا کہ:-

"اگر یہ فقرہ الحاقی ہے تو اس کو انجیل سے نکال کیوں نہیں دیتے؟ اور عقیدۂ تثلیث سے توبہ کر لیجئے۔"[2]

اس کے جواب میں پادری نوبس نے جو کہا وہ عذر گناہ بدتر از گناہ ثابت ہوا انہوں نے کہا کہ "اس کی تعلیم ہم کو دوسرے ذریعہ سے ہوئی ہے۔"[3]

پادری نوبس کی مثال اس نوگرفتار چڑیا کی تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے جو پوری قوت سے پروں کو پھڑپھڑا رہی ہے کہ تیلیوں کو توڑ کر نکل جائے، لیکن پر باندھنے والے ماہر فن تھے اور انہوں نے ..... اس طرح اس کے پر باندھ دیئے کہ سوائے پنجرے کی تیلیوں سے سر ٹکرانے کے اور کچھ حاصل نہیں تھا، حضرت نانوتوی نے یہ صورت حال دیکھی تو ذرا گرم انداز بیان اختیار فرمایا اور کہا پادری صاحب! سنیئے

"اگر ایک پیالہ پانی میں ایک قطرہ پیشاب کا گر جائے تو وہ قطرہ سارے پانی کو ناپاک کر دیتا ہے، وہ پانی باوجودیکہ ایک قطرہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے اس کے باوجود پانی اس قطرہ کو پاک نہیں بناتا ہے"

اس مثال پر پادریوں نے ہنگامہ مچا دیا اور شور کرنے لگے، وہ بڑی دیر سے بہانے ڈھونڈ رہے تھے وہ چیخنے چلانے لگے کہ انجیل خدا کا کلام ہے، اس قابل نہیں کہ اس کو ناپاک پانی سے تشبیہ دی جائے ہم یہ بات سننے کے لیے تیار نہیں۔

حضرت نانوتوی رحمہ نے فرمایا کہ میں نے انجیل کو پاک پانی اور الحاقی عبارت کو ناپاک کہا ہے آپ کہاں تک ایسی باتیں کریں گے، آپ ایک مثال میں گفتگو کریں گے اس کے بجائے دس مثالیں بیان کر دوں گا، یہ بات تو آپ اس سے کہیے جس کو اور مثالیں نہ آتی ہوں آپ اس مثال سے ناراض

---

[1] و [2] و [3] و [4] "مباحثہ شاہجہاں پور" ص ۱۴۱ و ۱۴۲

ہیں تو دوسری مثال لیجیے:۔

"اگر کوئی شخص حسن میں لاثانی ہو، جمال میں یوسفِ ثانی ہو مگر اس کی ایک آنکھ کانی ہو، یہ عیب ساری خوبیوں کو خراب کر دے گا، باقی اعضاء کا حسن اور ان کی خوبی اس آنکھ کے عیب کو خوبی نہیں بنا دے گا۔"

انجیل قطعاً ناقابلِ اعتماد ہے:۔ حضرت نانوتوی نے بات کو اور واضح کرنے اور پادریوں کی شکست کو علیٰ رؤس الاشہاد ظاہر کرنے کے لیے بات آگے بڑھائی تاکہ انجیل کے ناقابلِ اعتماد اور ناقابلِ اعتبار ہونے کو عوام و خواص سب کے سامنے آفتاب کی طرح روشن کر دیں۔ آپ نے سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"اگر کسی وثیقہ میں یا دستاویز میں ایک جگہ مخدوش ہو تو باقی دستاویز اور وثیقہ کی درستی اس ایک مقام مخدوش کو درست نہ بنا دے گی، اس ایک جگہ کا مخدوش ہونا تمام دستاویز اور تمام وثیقہ کو مخدوش بنا دے گا۔ پھر تماشا ہے کہ مقدمات دنیوی میں تو ایسی دستاویز قابلِ اعتماد نہ رہے حالانکہ اہلِ عقل کے نزدیک متاعِ دنیا چنداں قابلِ اہتمام نہیں اور مقدمۂ دینی میں ایسی دستاویز مخدوش قابلِ اعتماد ہو جائے۔"

حضرت نانوتوی یہ بات فرما ہی رہے تھے کہ اسی دوران شاہ جہاں پور کے منصف صاحب آگئے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے تو حضرت نانوتوی نے پادری نولس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ پادری صاحب اس مقدمہ میں ہمارے اور آپ کے حکم منصف صاحب ہی رہے اور ان کے مقدمات اور جھگڑے بھی یہی فیصل کرتے ہیں ہماری ڈگری بھی یہی کریں گے۔ پھر آپ نے منصف صاحب کی طرف رُخ کر کے کہا کہ:۔

"کیوں منصف صاحب! آپ ہی فرمائیں اگر کوئی دستاویز جعلی آپ کے پاس آئے اور اس کا جعل کھل جائے اور خود مدعی جعل کا اقرار کر لے یا اور کسی طرح سے جعل ہونا ثابت ہو جائے تو قانونِ سرکار اس کی نسبت

کیا ہے؟ آپ اس مقدمہ میں کیا فیصلہ فرمائیں گے؟[1]

حضرت نانوتوی کا یہ سوال اگرچہ منصف صاحب سے تھا مگر اس کا جواب سب جانتے تھے اور سب سے زیادہ پادری صاحبان جانتے تھے کہ اس کا جواب کیا ہے؟

"دعویٰ ڈسمس، دستاویز مسترد، مدعی اور گواہوں کو چودہ چودہ برس قید"

بھرے مجمع میں حضرت نانوتوی نے پادریوں کو اس مقام پر کھڑا کر دیا جو مقام چار سو بیسی کرنے والے مجرموں کا ہوتا ہے، ان کے لیے صفائی کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑا، منصف صاحب نے جلسہ کے بعد اپنے حلقۂ احباب کی مجلس میں کہا کہ:-

"مولانا قاسم نے پادری صاحب کو ایسا ذلیل و رسوا کیا کہ غیرت ہو تو منہ نہ دکھائیں"

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں:- یہ چاندا پور ضلع شاہ جہاں پور کے میلہ خدا شناسی میں مباحثہ کا پہلا دن تھا جو ۱۹ مارچ ۱۸۷۷ء کو ہوا، علماء اسلام نے عیسائی مبلغین کی دعوت و تبلیغ کے بنیادی پتھر کو اکھیڑ دیا جس پر وہ غلبہ عیسائیت کا محل تعمیر کرنا چاہتے تھے، ہزاروں ہزار کے مجمع نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ علماء اسلام نے دین عیسوی کے بطلان پر جو دلائل و براہین دیئے پادریوں کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں تھا بلکہ زبان حال سے انہوں نے تسلیم کر لیا کہ مسلمان جو کہہ رہے ہیں وہ حق ہے اور ہمارے پاس اس کی کوئی تاویل و توجیہہ نہیں ہے۔

یہ مباحثہ دو دنوں کے لیے منعقد کیا گیا تھا اور دونوں دن مباحثہ کی دو نشستیں ہونی تھیں لیکن پہلے دن صرف ایک نشست ہو سکی، ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو دو اجلاس اور ہونے تھے، پہلے دن کی کارروائی سے یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ یورپین پادریوں اور دیسی پادریوں کی مشترکہ کوشش یہ تھی کہ اسلام کے نمائندوں کو مباحثہ میں الجھا کر ان کو رسوا کیا جائے، سناتن دھرم اور آریہ سماج کے نمائندے کھلے بندوں پادریوں کی حمایت کرتے تھے، ان

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن گنگوہی ص ۴۲

کا بھی ہدف اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات تھی حضرت نانوتوی کی تقریر کے بعد اگرچہ ان کی ہمت جوابی تقریر کی نہیں تھی مگر بانی فرقہ آریہ سماج پنڈت دیانند سرسوتی دوبارہ اسٹیج پر آئے اور ہر باران کا نشانہ اسلام اور مسلمان تھے ان دونوں فرقوں کی جواب دہی بھی مسلمانوں کے ذمہ تھی، اس طرح اُدیانِ باطلہ کا متحدہ محاذ مسلمانوں کے خلاف بن گیا تھا اور مسلمانوں کی جنگ سہ رخی ہوگئی تھی، اس لیے ایسی صورتِ حال میں اسلامی نمائندوں کے لیے عیسائیت سناتن دھرم اور آریہ سماج تینوں سے واقفیت ضروری تھی۔

حضرت نانوتوی کا علم خداداد تھا، علم کلام تو جیسے ان کا خانہ زاد تھا، اس لیے حضرت نانوتوی کی ہر جوابی تقریر اگرچہ دقیق علمی اصطلاحات پر مشتمل ہوتی تھی لیکن مثالوں سے اپنا نقطۂ نگاہ اتنا واضح فرمادیتے تھے کہ اہلِ علم کے علاوہ عوام وخواص بھی جوابات کی اہمیت اور اس کے وزن کو سمجھ جاتے تھے، چونکہ تمام تمثیلات روزمرّہ کی زندگی کے حالات وکوائف سے پیش کی جاتی تھیں اس لیے ہر شخص کو اسے تسلیم کیے بغیر چارۂ کار نہیں تھا مثلاً آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو خاتم النبیین ثابت کیا اور دلائل سے اس کو مبرہن کرچکے تو آپ نے حاصلِ بحث کے طور پر فرمایا کہ اب تمام انبیاء سابقین کی شریعتیں منسوخ ہوگئیں اب کسی بھی قدیم شریعت پر یا کسی پہلے نبی کے دین پر عمل کرنا جائز نہیں رہا۔ تمام ہندو آریہ سماجی، سناتن دھرمی عیسائیوں اور یہودیوں کو شریعتِ محمدیہ پر عمل کرنا ضروری ہوگیا۔ اب اگر کوئی غیر شریعتِ محمدیہ پر عمل نہیں کرتا تو احکم الحاکمین کا وہ مجرم سمجھا جائے گا اور اس کو آخرت میں ضرور سزا ملے گی، حضرت نانوتوی کے الفاظ ہیں :-

"ایسے ہی دینِ موسوی اور دینِ عیسوی اپنے اپنے زمانے میں مناسب تھے اور اس زمانہ میں یہی مناسب ہے کہ اتباعِ دینِ محمدی کیا جاوے کیونکہ اور دینوں کی میعادیں ختم ہوگئیں۔ اب اسی دینِ محمدی کا وقت ہے، عذابِ آخرت اور غضبِ خداوندی سے نجات اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع میں منحصر ہے، جیسے اس زمانے میں زمانہ سابق کے گورنر لارڈ ناتھ بروک کے احکام کی تعمیل کافی نہیں بلکہ زمانہ حال کے گورنر لارڈ لٹن کے احکام

کی تعمیل کی ضرورت ہے، ایسے ہی اس زمانہ میں اتباع ادیان سابقہ کافی نہیں بلکہ دین محمدی کا اتباع ضروری ہے، سزائے سرکاری سے نجات اور رستگاری جب ہی متصور ہے جبکہ زمانہ حال کے گورنر کی اتباع کی جائے اگر کوئی احمق یہ کہے کہ گورنر سابق بھی تو ملکہ وکٹوریہ ہی کا نائب تھا تو اس عذر کو کوئی نہیں سنتا، ایسے ہی یہ عذر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو رسول خدا تھے اس وقت قابل استماع نہیں، بلکہ جیسے اس وقت اگر گورنر سابق بھی موجود ہوں تو لارڈ لٹن ہی کی اتباع کرے۔ جو گورنر زمانہ حال ہے ایسے ہی اس زمانہ میں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی موجود ہوتے تو ان کو بھی چار و ناچار رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع کرنی پڑتی[1]

مباحثہ کا دوسرا دن:- ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو مباحثہ کا دوسرا دن تھا۔ چونکہ اس مباحثہ کی بڑی شہرت تھی اور پہلے دن کے مباحثہ و مناظرہ اور مسلمانوں کی فتح مبین نے اس کی شہرت میں مزید اضافہ کر دیا تھا اس لیے دوسرے دن شہر شاہ جہاں پور اور مضافات شاہ جہاں پور کے عوام و خواص کے علاوہ دیوبند، میرٹھ، دہلی خورجہ سنبھل، مراد آباد، رام پور، بریلی اور تلہر تک کے لوگ اس میلہ میں پہونچ آئے تھے، علماء اسلام میں ممتاز اور مشہور لوگوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا منصور علی دہلوی، مولانا محمد علی مراد آبادی، مولانا عبد الغفور، مولانا عبد المجید، مولانا محمد طاہر اور مولانا عبد الحیٔ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور اور غیر مشہور علماء بڑی تعداد میں شریک مناظرہ تھے۔

پادریوں نے کمک طلب کی:- پادریوں نے دیکھا کہ علماء اسلام نے اتنا واضح غلبہ حاصل کر لیا ہے کہ اب دین عیسائیت کو دین حق ثابت کرنا مشکل ہو گیا اور سوائے ذلت و رسوائی کے اور کوئی چیز ہمارے ہاتھ

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن گنگوہی ص ۴۳

نہیں آئی، حضرت نانوتوی رح کی عالمانہ تقریر، متکلمانہ انداز بیان اتنا مرعوب کن اور ان کے دماغ، ان کے فکر ان کے ذہن سے کہیں بلند تھا، ان کے دلائل و براہین کی قوت، ان کا طرز استدلال اتنا طاقتور تھا کہ عیسائیوں کے اندر تاب مقاومت باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے انہوں نے اپنے چہرے کی سیاہی دھونے کے لیے ایک ایسے پادری کو بلایا جو پادریوں میں ایک بلند علمی مقام رکھتا تھا اور مفسر انجیل کے نام سے مشہور تھا اور منطق و فلسفہ کا بھی ماہر تصور کیا جاتا تھا اس نے فن منطق میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس پر انگریزی گورنمنٹ نے ایک خطیر رقم اس کو انعام بھی دی تھی، اس کا نام پادری اسکاٹ تھا اور گورکھپور میں رہتا تھا، مگر ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ پہلے پہل پادریوں نے مباحثہ میں حصہ لینے والوں کا جو انتخاب کیا تھا اس میں عیسائیوں کی طرف سے پادری نولس اور پادری واکر کا نام رکھا تھا اور ہندوؤں میں سے پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمل کا نام اور علماء اسلام میں حضرت نانوتوی اور مولانا عبدالمجید کے نام طے کر دیئے تھے اور یہ بھی پابندی عائد کر دی تھی کہ اب کسی دوسرے شخص کو مباحثہ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ تقریر کرنے کا موقعہ دیا جائیگا اور جب حالات نے پادریوں کو پادری اسکاٹ کو مناظرین میں شامل کرنے پر مجبور کر دیا تو اس کے لیے انہوں نے ایک سازش کی، میلہ کے بانیوں منشی پیارے لال اور منشی مکتا پرشاد کو جو ان کے زیر اثر تھے بلا کر پادری اسکاٹ کو شامل کرنے کے لیے مشورہ کیا اور پھر انہیں دونوں کو علماء اسلام کے پاس بھیجا تاکہ ان سے منظوری حاصل کر لیں۔

حضرت نانوتوی نے ان دونوں کے جواب میں فرمایا کہ شرائط مناظرہ طے کرنے میں ہماری ایک بات کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا سب کچھ انہیں کی صوابدید، مرضی اور مصلحت کے مطابق ہوا اور ہم نے دل پر جبر کر کے تمام شرائط کو تسلیم کر لیا تو اب پادریوں کے کہنے سے ان شرائط میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوگا اب نہ وقت میں اضافہ کیا جائے گا اور نہ کسی دوسرے شخص کو مباحثہ میں حصہ لینے کا موقعہ دیا جائے گا۔

طعنوں سے کام نکالا:۔ دونوں نمائندوں کے جانے کے بعد اب پادری نولس آئے اور پادری اسکاٹ کو شریک مناظرہ کرنے کی

درخواست کی تو حضرت نانوتوی نے ان کی سابقہ ہٹ دھرمیوں اور بے جا ضد کے جواب میں ان کی شرکت سے شدت کے ساتھ انکار کیا۔ اس پر پادری نولس نے طنز کا ایک زہریلا تیر چلایا اور کہا کہ شاید آپ پادری اسکاٹ صاحب سے ڈرتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت نانوتوی نے پادری نولس سے کہا کہ :-

"میں تو خدا کی عنایت سے پادری اسکاٹ صاحب کے استاد ہوں تو ان سے بھی نہ ڈروں بلکہ ان شاء اللہ تعالیٰ تمام پادری بھی اکٹھا ہو جائیں تو نہیں ڈرتا مجھ کو تو یہ جتلانا تھا کہ بات مقرر کرکے کون قائم رہتا ہے اور کون بات سے پھر جاتا ہے، ہمارا تو یہ قول ہے کہ گھنٹہ دو گھنٹہ جس قدر چاہیں آپ درس کے لیے مقرر کریں جس کو چاہیں درس کے لیے تجویز کریں ہم ہر طرح سے موجود ہیں"[1]

موضوع مناظرہ میں تبدیلی :- پہلے دن جب شرائط مناظرہ طے کی جا رہی تھیں اس وقت مباحثہ کے لیے پانچ سوالات طے کیے گئے تھے، ترتیب وار انہیں پر گفتگو کرنی تھی اسی لیے حضرت نانوتوی کی تقریر اسی مقررہ عنوان پر ہوئی لیکن حضرت نانوتوی کی متکلمانہ تقریر مباحثہ میں حصہ لینے والے دوسرے مذاہب کے نمائندوں کے طائر فکر کی پرواز سے کہیں بلند و بالا ثابت ہوئی اور اس بلندی سے بات کرنا ان میں سے کسی کے بس کی بات نہیں، اس لیے انہوں نے چاہا کہ صرف آخری سوال پر مباحثہ ہو کیونکہ وہ اس موضوع پر اپنے جلسوں میں برابر تقریر کرتے آئے تھے اور اس مسئلہ پر بولنا ان کے لیے آسان تھا، وہ آخری سوال تھا "نجات کیا ہے ؟" اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے ؟" پادریوں اور پنڈتوں دونوں کے لیے فرار کا صرف یہی ایک راستہ تھا اس لیے دونوں ایک دوسرے کے ہم نوا ہو گئے اس لیے علماء اسلام کو بھی منظور کرنا پڑا۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں چوتھے سوال پر مباحثہ کے دوران پادری اسکاٹ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ علماء اسلام سے مباحثہ کرنا لوہے کے چنے چبانے ہیں، پادری اسکاٹ کی

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور ص ۴۹

تقریر کے بعد حضرت نانوتوی جب کھڑے ہوئے تو آپ نے ایک ہی جملہ میں پادری اسکاٹ کی ہوا اکھاڑ دی، آپ نے فرمایا کہ:-

"جو شخص سوال ہی نہ سمجھے وہ جواب کیا دے سکتا ہے۔ پادری صاحب نے سوال سمجھا نہیں اور تقریر کے لیے کھڑے ہو گئے، بات وہی ہوئی "سوال از ریسماں جواب از آسماں" [1]

پادری اسکاٹ کی تقریر:- پادری اسکاٹ کی تقریر کا انداز وہی تھا جو وہ ناخواندہ غیر تعلیمیافتہ اور پسماندہ طبقات کے عوام کے سامنے تقریر کرنے کا انداز تھا، اپنی آدھے گھنٹے کی تقریر میں انہوں نے اپنے مذہب کے حق ہونے کو دلائل و براہین سے ثابت نہیں کیا عوامی سطح کی بات کرتے رہے نہ انہوں نے موقعہ و محل کی اہمیت کو محسوس کیا اور نہ یہ دیکھا کہ یہاں اہل علم کا مجمع ہے، یہاں علمی سند لال کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور ان کی سطح سے نیچے اتر کر بات کرنا اپنی جہالت کا ثبوت دیتا ہے، اس لیے ان کی تقریر دلائل و براہین، دعویٰ، اثبات دعوی اور دوسرے مذاہب پر ان کے دین عیسوی کی ترجیح کو مدلل ثابت کرنے میں کوئی مؤثر کردار نہ ادا کر سکی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

"نجات گناہوں سے بچنے کو کہتے ہیں مگر جب خداوند تعالیٰ نے یہ دیکھا کہ تمام عالم گناہوں میں ڈوبا ہوا ہے تو خود مجسم بن کر آیا اور عیسیٰ مسیح کہلایا اور سب خلائق کا کفارہ بنا، یعنی تمام انسانوں کے گناہوں کو اپنے سر پر رکھ کر اس کی سزا میں مصلوب ہوا اور پھر (نعوذ باللہ) ملعون ہو کر تین دن جہنم میں رہا، اس لیے سب کو لازم ہے کہ عیسیٰ مسیح کی الوہیت پر ایمان لائیں اور عیسائی دین اختیار کریں، بدون اس کے نجات نہیں اور گناہوں سے بچاؤ نہیں ہو سکتا" [2]

اس کے بعد پادری اسکاٹ نے دو تین قصے سنائے جن سے انہوں نے یہ تاثر دینے کی

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور ص ۵۳ [2] حوالہ مذکور

کوشش کی کہ دینِ عیسوی میں بڑی تاثیر ہے آدمیوں کو اس سے سکون حاصل ہوتا ہے اور لوگ گناہوں سے ازخود بچ جاتے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت کی برکات کا بھی ذکرِ خیر کیا اور فرمایا کہ :۔

"ادھر دیکھو جب تک عیسائیوں کی عملداری ہندوستان میں نہیں تھی یہاں ہندوستان میں کیسی کیسی غارت گری، فتنہ و فساد اور رہزنی ہوا کرتی تھی جب سے عیسائیوں کی عملداری ہوئی کس قدر امن و امان ہوگیا، سونا اُچھالتے چلے جاؤ کوئی نہیں پوچھتا..... دیکھو گناہ میں کتنی کمی آگئی، یہ ایک بڑی دلیل ہے عیسائیوں کے مذہب کی سچائی کی"[1]

پنڈت دیانند سرسوتی کی تقریر :۔

پادری اسکاٹ کے بعد آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی اسٹیج پر آئے اور انہوں نے ناقابلِ فہم سنسکرت زبان میں اپنا پورا بھاشن دیا جس کو نہ مسلمانوں نے سمجھا اور نہ عیسائیوں نے، نہ عوام نے نہ خواص نے، ممکن ہے سنسکرت سے واقف چند افراد نے سمجھا ہو جن لوگوں کو پنڈت جی کے بیان کی قدر و قیمت معلوم کرنی ضروری تھی انہوں نے واقف کاروں سے پوچھ کر معلوم کیا، بعض مسلمان عالم جو سنسکرت کچھ سمجھتے تھے ان کے بیان کے مطابق پنڈت جی کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ :۔

"نجات اس میں ہے کہ آدمی گناہوں سے بچے اور نیک کام کرے پادری صاحب نے جو کہا کہ خدا تعالیٰ مجسم ہو کر آیا، خلائق کے گناہوں کا کفارہ بنا سراسر غلط ہے یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ وہ ذاتِ پاک جس کی کوئی حد و نہایت نہیں وہ ایک مٹھی میں آئے، پادری صاحب جو اپنے مذہب کو گناہوں سے نجات کا سبب سمجھتے ہیں تو بالکل بے اصل بات ہے، حضرت موسیٰ کو صاف حکم ہوا کہ مکانِ مقدس میں جوتا اُتار کر آؤ، ہمارے پادری صاحب برعکس اس کے جوتے

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن صاحب ص ۷۰

کی جگہ ٹوپی اُتارتے ہیں، اور بہت باتیں حکمِ خدا کے خلاف کرتے ہیں۔ اور ان کو روا سمجھتے ہیں پس ایسے مذہب میں نجات کیسے ہو سکتی ہے[1]

مولانا نانوتوی کی تقریر:۔ پادری اسکاٹ مفسرِ انجیل اور پنڈت دیانند سرسوتی نے موضوعِ مناظرہ نجات کیا ہے؟ اور کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟" پر اپنے اپنے مذہب کے نقطہ ہائے نگاہ پیش کیے۔ آخر میں حضرت نانوتویؒ اسٹیج پر آئے اور انہوں نے دونوں کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:۔

"نجات قہرِ الٰہی اور عذابِ آخرت سے بچ جانے کو کہتے ہیں، عذابِ الٰہی سے اس وقت بچا جا سکتا ہے جب گناہوں سے بچا جائے اور گناہوں سے احتراز اسی وقت ممکن ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ گناہ کیا ہے؟ پادری صاحب اور پنڈت جی نے یہ تو فرمایا کہ نجات گناہوں سے بچنے کو کہتے ہیں، یا نجات گناہوں سے بچنے میں ہے مگر یہ نہیں بتلایا کہ گناہ کس کو کہتے ہیں"۔

آپ نے اپنی تقریر میں پہلے یہ بتایا کہ گناہ مرضیِ الٰہی کے خلاف کام کرنے کو کہتے ہیں، مگر مرضیِ الٰہی کیسے معلوم ہو؟ اس کے لیے آپ نے سلسلہ نبوت کو ضروری قرار دیا تاکہ ان کے ذریعہ انسانوں کو مرضیِ الٰہی معلوم ہو، آپ نے مثال دے کر سمجھایا کہ بادشاہوں کے احکام وکیل یا نمائندوں اور اس کے وزیروں کے ذریعہ عوام کو بتائے جاتے ہیں، بادشاہ از خود تمام باشندگانِ ملک سے اپنی مرضی بتلانے نہیں جاتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے منتخب رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ دنیا والوں کو اپنی مرضی سے آگاہ کرتا ہے اور وہ نبی و رسول لوگوں کو مرضیاتِ الٰہی سے باخبر کرتا ہے، اسی لیے ہر زمانہ میں اس دور کے نبی کی اطاعت فرض ہوتی ہے جو ان کی خلاف ورزی کرے گا وہ مرضیِ الٰہی کے خلاف کام کرے گا اسی کو گناہ کہتے ہیں اور گناہ کے ارتکاب کے بعد اس کی سزا ملنی ضروری ہے، سب سے آخر میں ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں خدا کی مرضی بتلانے کے لیے آئے اس لیے ہمارے رسول کی اطاعت

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن صاحب ص ۱۷

عین اطاعتِ خداوندی ہے، اب آپ ہی کی اقتدار میں نجات منحصر ہے جو ہمارے رسول کی اطاعت سے انحراف کرے گا وہ مستحق عذابِ خداوندی ہوگا۔

پھر آپ نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جیسے ہر زمانہ میں ایک جدا حاکم ہوتا ہے پہلے زمانہ میں اگر لارڈ ناتھ بروک گورنر تھے تو آج لارڈ لٹن گورنر ہیں پہلے اور کلکٹر تھا اب اور کلکٹر ہے ایسے ہر زمانے میں مناسب وقت ایک جدا ہی نبی تھا جیسے آج لارڈ لٹن کے احکام کی تعمیل ضروری ہے اور لارڈ ناتھ بروک کے احکام کی تعمیل سے کام نہیں چلتا ایسے ہی ہر زمانہ میں اس زمانہ کے نبی کے احکام کی تعمیل ضروری ہے۔ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ کی بزرگی اور نبوت تسلیم، ان کی نبوت کا منکر ہمارے نزدیک ویسا ہی کافر ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر ہمارے نزدیک کافر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس شری رام چندر اور شری کرشن کو بھی ہم کچھ نہیں کہتے، مگر آج نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کیے بغیر نجات ناممکن ہے۔

اس کے بعد آپ نے پادری اسکاٹ کی ہفوات کی طرف روئے سخن پھیرا اور گرم لب ولہجہ میں تمثیل کے ذریعہ اصل مسئلہ کو سمجھایا اور پادری صاحب کی توہین آمیز بکواس کا پوری قوتِ ایمانی سے جواب دیا، آپ نے کہا:-

"انگریز اپنے کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں لیکن مذہبی امور میں ایسا احمقانہ عقیدہ رکھتے ہیں جس کو معمولی عقل کا انسان بھی قبول نہیں کرسکتا۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا ان کو نظر آتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر ان کو نظر نہیں آتا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ خداوند کریم جو ہر طرح مقدس اور بے نیاز ہے تمام عیوب و نقائص سے پاک صاف ہے اس کو تو اس پیرایہ میں کہ عیسیٰ مسیح بن کر مجسم ہوا اور زمین پر آیا اور کھانے پینے، بول و براز بھوک پیاس خوشی و غم وغیرہ حوائجِ انسانی میں مبتلا ہوا، کہیں سولی پر چڑھا، کہیں یہودیوں کے ہاتھوں میں مقید ہوکر "ایلی ایلی" پکارا کہیں معذب و ملعون ہوکر اوروں کے لیے کفارہ بنا، کیا کیا برا بھلا کہدیتے ہیں! اگر کوئی شخص پادری صاحب کو چمار کہدے تو ابھی مارنے اور مرنے پر تیار ہوجائیں

یہ کیسا ظلم صریح ہے کہ اپنے آپ کو ذرا بھی کوئی برا کہدے تو پھر خیر نہیں اور خداوند قدوس کو جو جی میں آئے کہدیں، چمار اور پادری صاحب میں کیا فرق ہے وہ مخلوق اور خدا کا محتاج ہے تو پادری صاحب بھی مخلوقِ خدا اور خدا کے محتاج پادری صاحب انسان تو چمار بھی انسان۔ پادری صاحب کی دو آنکھیں تو چمار کی بھی دو آنکھیں۔ پادری صاحب کی ایک ناک اور دو کان تو چمار کے بھی ایک ناک اور دو کان۔ ان کے دو ہاتھ تو چمار کے بھی دو ہاتھ، چمار کو بھی بھوک پیاس لگتی ہے تو پادری صاحب بھی اس میں مبتلا ہیں، چمار کو بول و براز کی حاجت ہے تو پادری صاحب کو بھی یہ حاجت ستاتی ہے۔ غرض ذاتی باتوں میں کچھ فرق نہیں، دونوں یکساں ہیں، اگر فرق ہے تو دولت و حشمت وغیرہ خارجی باتوں میں فرق ہے۔ اس اتحاد پر تو پادری صاحب کو یہ نخوت کہ چمار کہدیں تو تھامے نہ تھمیں اور خدا تعالیٰ کو بشر کے ساتھ کچھ اتحاد نہیں بشر کو خدا کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں، کچھ نسبت نہیں، اس کا وجود خانہ زاد بشر کا وجود اس سے مستعار، وہ خدا یہ بندہ۔ اس پر بھی خدا کو بشر کہے جائیں اور ہرگز نہ شرمائیں، افسوس کیا ظلم صریح کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے۔

عاقلانِ فرنگ کو کیا ہو گیا اجتماع النقیضین اور اجتماع الضدین کا بطلان ایسا نہیں جو کوئی نہ مانے پھر اس پر انسانیت اور الوہیت کے اجتماع کو تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہیں[1]۔

حضرت نانوتوی کے اس اظہار حقیقت اور گرم لب و لہجہ سے مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا، پادری اسکاٹ کے بھدے، ناشائستہ، جاہلانہ اور ایمان سوز انداز بیان اور گندے لب و لہجہ نے غیرتِ ایمانی کو مشتعل کر دیا، مولانا موصوف کا اندازِ بیان اور لب و لہجہ اسی بنا پر خلافِ معمول سخت ہو گیا اور بار بار یورپین پادری کو جسے اپنی حکومت کا غرور بھی تھا اس کی مشابہت چمار سے دیتے تھے

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن صاحب ص ۵۷

عوام بھی اس کو محسوس کر رہے تھے کہ مولانا نانوتوی قصداً پادری اسکاٹ کو سخت سُست کہہ رہے ہیں کیونکہ خدا کی شان میں گستاخی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، پادری محی الدین نے اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے کھڑے ہو کر اظہارِ برہمی بھی کیا اور سخت الفاظ بھی استعمال کیے مگر حضرت نانوتوی مداہنت اور مصلحت اندیشی کے پابند نہیں تھے، احکم الحاکمین کی شان میں گستاخی و بدتمیزی کرنے والے کو برداشت کر لینا ان کے جوشِ ایمانی کو کسی قیمت پر منظور نہیں تھا، اور انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ایک غیرت مند مسلمان کہہ سکتا ہے۔

حکومت پر تنقید:۔ پادری اسکاٹ نے دینِ عیسوی کی حقانیت و صداقت کی دلیل میں انگریزوں کی ہندوستان میں حکومت اور اس کی برکات و فضائل کا ذکر کیا تھا اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا:۔

"گناہ چوری اور قزاقی ہی میں منحصر نہیں جو یہ خیال ہو کہ برکتِ دینِ عیسوی سے گناہوں سے نجات میسّر ہو گئی، انجیل اور تورات میں خنزیر کی حرمت موجود ہے ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اہلِ اسلام میں سے کوئی شخص سور کا گوشت نہیں کھاتا، اور نصرانیوں میں شاید کوئی ہو جو اس گناہ سے بچا ہوا ہو، تورات و انجیل میں شراب کی ممانعت موجود ہے اور ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اہلِ اسلام میں بہت کم آدمی اس بلا میں مبتلا ہوں گے اور نصرانیوں میں بہت کم آدمی اس بلا سے بچے ہوئے ہوں گے، علیٰ ہذا القیاس سرکار کی عملداری میں زنا کی جس قدر کثرت ہوئی ہے اس قدر کبھی نہیں ہوئی ہو گی جس پر خاص لندن اور انگلستان کا حال تو پوچھیے نہیں کیا پادری صاحبوں کو لندن کے اخباروں کی اب تک خبر نہیں کہ وہ کیا لکھتے ہیں کہ ہر روز کئی سو بچے ولد الزنا پیدا ہوتے ہیں اور صبح کو راستوں میں پڑے ہوئے ملتے ہیں، یہ باتیں گناہ نہیں تو کیا ہیں؟ علیٰ ہذا القیاس اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جو از روئے تورات و انجیل ممنوع ہیں اور نصرانیوں میں مروّج ہیں، پھر کیونکر کہیے کہ بہ برکت دینِ عیسوی ہندوستان سے چوری قزاقی اس لیے موقوف ہو گئی کہ اس دین کا اثر ہی یہی ہے کہ آدمی گناہوں سے محترز ہو جائے۔" [1]

---

[1] حاشیہ آئندہ صفحہ پر

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزی سامراج پر غالباً سب سے پہلی کڑی تنقید ہے جو یوربین افراد کی موجودگی میں مجمع عام میں کی گئی، ورنہ انگریزوں کی متشددانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں اب تک پورے ہندوستان کی زبان بند ہو چکی تھی، پادری اسکاٹ کی مہمل تقریر کا یہی صحیح اور برمحل جواب تھا۔

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کو رحمتِ خداوندی ثابت کرنے کے جوش میں وہ بھول گئے کہ کتنے بے قصور ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا خونِ ناحق اس حکومت کی بنیاد میں دیا گیا اور ان لوگوں کی تو ابھی بہت بڑی تعداد زندہ موجود تھی جنہوں نے اپنے بھائی اپنے باپ دادا اور اپنے بیٹوں کو ظالم انگریزوں کی سولیوں پر جھولتے ہوئے دیکھا ہے اور انگریز قوم کے افراد پھانسی پانے والوں پر کھڑے قہقہے لگا رہے تھے[1]

مباحثہ کا آخری اجلاس:- ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کی سہ پہر کو مباحثہ کا تیسرا اور آخری اجلاس ہوا، اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ایک یوربین پادری نے کہا کہ حضرت عیسیٰ مجمع الجہتین ہیں یعنی انسانِ کامل بھی ہیں اور معبودِ کامل بھی۔ حضرت عیسیٰ کی اُلوہیت کی صورت ایسی ہے جیسے لوہے کو آگ میں ڈالے رکھتے ہیں تو وہ لوہا بھی آگ بن جاتا ہے۔

حضرت نانوتوی نے پادری کی تقریر میں دخل اندازی کرتے ہوئے فرمایا عیسائیو! دیکھو پادری صاحب تثلیث سے انکار کر رہے ہیں، لیکن پادریوں کے پاس ایسی فہم رسا کہاں تھی کہ حضرت نانوتوی کے اس لطیف ریمارک کو سمجھ سکیں اس لیے جب آپ اپنی باری پر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے پادریوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پادری صاحب خود تثلیث کے عقیدہ سے انکار کر گئے۔ سچ ہے بے وقوف وکیل تو صحیح کیس بھی ہار جاتا ہے۔ یہاں تو باطل عقیدہ کو صحیح عقیدہ کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے لیکن اس کو بھی ثابت کرنے کے بجائے خود ہی اپنے عقیدہ کی تردید کر گئے

(حاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ) [1] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن گنگوہی ص ۷۶ و ۷۷

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے غدر ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رُخ مصنفہ سر ایڈورڈ ٹامسن ترجمہ شیخ حسام الدین۔

آپ نے فرمایا کہ پادری صاحب کی مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ایک ہے متعدد نہیں، اور حضرت عیسیٰ بندہ ہیں خدا نہیں آپ نے اپنے دعویٰ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"لوہا دیکھنے میں ظاہر پرستوں کو ہمرنگِ آتش نظر آتا ہے، پر حقیقت میں اس وقت بھی وہ لوہا ہی رہتا ہے آگ نہیں ہو جاتا ہے فقط پرتوِ آتش سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آگ سے علٰحدہ کر لیجئے تو پھر وہ لوہا اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے، اگر واقعی لوہا آگ ہو جایا کرتا اور انگاروں کی طرح ساتھ رہتا یا علٰحدہ ہوتا تو دونوں حالتوں میں یکساں رہتا۔"

اِلْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ:- حضرت نانوتوی کا جواب ایسا برمحل اور گرفت اتنی بھرپور تھی کہ پادریوں کے ہوش اُڑ گئے اور یہ اتنی موٹی بات تھی کہ ناخواندہ عوام بھی خوب سمجھ گئے اور مجمع پر خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی، پادریوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے ان پر خفت و ذلت کی جھنجلاہٹ سوار ہو گئی اور خفیف الحرکاتی پر اُتر آئے۔ حضرت نانوتوی کی بات ختم ہونے کے بعد کسی پادری میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ اسٹیج پر آکر حضرت نانوتوی کا جواب دیتا، فرار کی بھی ان کے پاس کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ ابھی مباحثہ کا معینہ وقت ختم نہیں ہوا تھا، علماء اسلام اپنی اپنی کرسیوں پر جمے ہوئے بیٹھے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ دیکھئے کون بے غیرت پادری سامنے آتا ہے لیکن اسٹیج پر کسی کو آنے کی جرأت نہیں ہوئی البتہ اس میلہ خدا شناسی کے در پردہ اصلی داعی پادری نولس جہاں بیٹھے تھے وہیں پر کھڑے ہو کر چلّا چلّا کر اپنے مذہب کے فضائل بیان کرنے لگے اور اپنی جھینپ مٹانے کی ناکام کوشش کرتے رہے، دوسری طرف شور و شغب میں اضافہ کرنے کے لیے پنڈت دیانند سرسوتی کھڑے ہوئے اور اپنا بھاشن شروع کر دیا کہ مسلمانوں کا خدا کیسا ہے کہ اس نے اپنی حکومت میں شیطان کو چھوڑ رکھا ہے۔ انصاف پرور حکومتیں تو چور، قزاق اور ڈاکوؤں کو سزا دیتی ہیں گرفتار کرتی ہیں اور انسانوں کو ان کی زیادتیوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں، یہاں شیطان کو پوری آزادی ہے۔ اسی طرح انہوں نے جنت و دوزخ کا مذاق اڑایا اور چیلنج کرنے لگے کہ کسی میں ہمت ہے تو ثابت کر دے کہ جنت کہاں ہے؟

غرضیکہ پادریوں اور آریہ سماجیوں کے منہ میں جو کچھ آیا اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوکر بکتے رہے کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا، ایک شور برپا تھا، بیک وقت کئی آوازوں کے شور میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے، اسی طوفانِ شور شر میں مباحثہ کا آخری وقت آگیا اور صرف چند منٹ باقی رہ گئے۔

پادری نولس اور پنڈت دیانند سرسوتی آخر تھک کر خاموش ہوئے تو حضرت نانوتوی فوراً تخت پر آگئے اور اعلان کیا کہ ہر ایک کی بکواس کا جواب سن لیجئے، آپ لوگ سکون و اطمینان سے بیٹھ جائیں، مگر پادری سب کے سب آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کرکے ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ وقت ختم ہوگیا ہم اب کچھ سننے کے لیے تیار نہیں۔

"بہت بے آبرو ہوکر....":- یہ مباحثہ کا آخری اجلاس تھا۔ اس اجلاس کے لیے موضوع مباحثہ طے کرنے میں کافی تاخیر ہوگئی تھی اس لیے شروع میں پادریوں نے پنڈت جی سے مل کر طے کرلیا تھا کہ یہ آخری اجلاس اپنے مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ زائد جاری رہے گا، اور چار بجے کے بجائے ساڑھے چار بجے جلسہ ختم ہوگا حضرت نانوتوی جب تقریر کے لیے اسٹیج پر آئے تو چار بجنے میں بھی ابھی چند منٹ باقی تھے اور یہ طے تھا کہ مزید آدھا گھنٹہ جلسہ چلے گا لیکن سارے پادری اُٹھ کھڑے ہوئے کہ جلسہ کا وقت ختم ہوگیا مسلمانوں نے بہت روکا اور سمجھایا، جب کسی طرح رکنے پر وہ تیار نہیں ہوئے تو حضرت نانوتوی نے کہا کہ ابھی چار بجنے میں چند منٹ باقی ہیں اتنی ہی دیر ٹھہر جائیں تاکہ ہماری باتیں سُن لیں مگر پھر بھی وہ آمادہ نہیں ہوئے اور جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ ایک طرف روکنے والوں کا اصرار کا سلسلہ جاری ہے دوسری طرف وہ جلد سے جلد جلسہ گاہ سے باہر نکل جانے کی گھبراہٹ میں ہیں، عوام کی بھیڑ بھی پادریوں کی بدحواسی کے دلچسپ منظر کو دیکھ رہی تھی اور لذت لے رہی تھی، مسلمانوں کے روکنے کے باوجود وہ دامن جھٹک کر عجلت میں وہ جلسہ گاہ سے نکل گئے ان کے فرار کے بعد دیکھا گیا کہ بدحواسی میں پادری صاحبان اپنی کئی کتابیں اسٹیج پر چھوڑ گئے ہیں۔

کیسی رسوائی ہوئی؟:- حضرت نانوتوی نمازِ عصر سے فراغت کے بعد

اسٹیج پر آئے، افراتفری کا عالم ختم ہوا، آپ کے آتے ہی عوام کی بھیڑ اکھٹی ہوگئی تو آپ نے لوگوں سے صورتِ حال بیان فرمائی کہ ہم نے بہت چاہا کہ پادری صاحبان ہماری دو چار باتیں سن لیں لیکن مسلمانوں کے سوال وجواب سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت ان کو نظر نہیں آئی تو انہوں نے یہ حرکت کی، مزید ذلت برداشت کرنے کی اب ان میں ہمت نہیں رہ گئی، ہمارے سوالوں میں سے ایک سوال کا بھی جواب ان سے نہ ہوسکا اور ہم نے ان کے ایک ایک سوال کا مسکت اور دندان شکن جواب دیا، اگر غیرت ہوگی تو وہ کبھی اہلِ اسلام کے مُنہ نہیں لگیں گے، اب بروئے انصاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہوگئی اور کسی شخص کو بروئے انصاف کوئی عذر باقی نہیں رہا۔

حضرت نانوتوی کا عوام سے خطاب جاری تھا کہ اسی دوران پادری جان ٹامس گھبرائے ہوئے آئے اور کہا کہ ہماری کچھ کتابیں یہاں رہ گئی ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کا جو مجمع تھا اس میں ہر مزاج کے لوگ تھے ان میں سے بعض لوگوں نے پادری صاحب کو چھیڑنا شروع کردیا اور کہا کہ پادری صاحب آپ اتنا گھبرا کیوں گئے کہ کتابیں بھی چھوڑ گئے؟ وہ کیا جواب دیتے، گردن جھکائے ہوئے کتابیں لے کر چپکے سے نکل گئے اور زبانِ حال سے کہتے جارہے تھے ع

"اس بھری محفل میں کیسی ہائے رسوائی ہوئی"

میدانِ جنگ خالی ہوگیا:- جلسہ گاہ سے سب سے آخر میں حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء عوام کی بھیڑ کے ساتھ چلے، ان کے ہمراہ سارا مجمع میدانِ مباحثہ سے چلا آیا اور میدان خالی ہوگیا، آخری اجلاس میں پادریوں نے اعلان کیا تھا کہ چار بجے کے بعد ہمارا وعظ ہوگا لیکن جب علماء اسلام اپنی قیامگاہ پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ پادری صاحبان رختِ سفر باندھ رہے ہیں اور جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں کو بھی بہانہ ہاتھ آگیا وہ بھی پادریوں کے پیچھے چل پڑے، پھر بعد میں خبر آئی کہ پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمل یہاں سے چاندپور چلے گئے جب دونوں حریف میدانِ جنگ خالی کرگئے تو آخر میں مسلمانوں کا قافلہ بھی سربانگ پور

سے چل پڑا اور مولانا محمد طاہر صاحب کے مکان پر فروکش ہوا۔

مسلمانوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے:۔ یورپین پادریوں سے مقابلہ جن کی پشت پر حکومتِ وقت کی طاقت تھی اور پھر انہیں کے بلائے ہوئے مجمع میں اعلان حق کرنا اور ان کے دین کو باطل ثابت کرنا اور مباحثہ میں ان کو ذلت آمیز شکست دینا، عوام اور ناخواندہ لوگوں تک کا عیسائیوں کا استہزاء کرنا اور پادریوں کا مذاق اڑانا، پادریوں کی لن ترانیوں کا ایسا بھرپور جواب تھا جس نے ان کے عزم و ہمت اور ولولوں کی کمر توڑ دی،

۱۸۵۴ء میں ہونے والے اکبرآباد کے مناظرہ کے ۲۴ برس بعد دوبارہ تبلیغ عیسائیت پر ایسی کاری ضرب لگائی گئی کہ اب ان کو ڈھونڈے سے پناہ نہیں مل رہی تھی، اکبرآباد کے مناظرہ میں شکست کھانے اور ذلت اٹھانے کے بعد غدر ۱۸۵۷ء کے بہانے مسلمان مناظرین کو شکنجہ عذاب میں کسا گیا اور ان کو تختۂ دار پر چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی مگر اب حالات پہلے جیسے نہیں رہ گئے تھے۔ اب مسلمان مناظرین کو گرفت میں لینا آسان نہیں تھا، اس لیے علماء اسلام فتح کا پرچم نہایت جاہ و جلال کے ساتھ لہراتے ہوئے شاداں و فرحاں اپنی فرودگاہ پر آئے، ان کے حوصلے بلند تھے، اور ان کی اُمنگیں جوش پر، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اسلام کی وکالت کا فریضہ اور آگے بڑھ کر ادا کیا جائے اور اصل حریف کے ساتھ بعض دوسری اسلام دشمن طاقتیں جو ان کی ہم نوائی کر رہی ہیں اور اسلام پر حملہ کرنے میں ان کا ہاتھ بٹا رہی ہیں ان سے بھی براہِ راست مناظرہ و مباحثہ ہو جائے تو بیک کرشمہ دو کار ہو جائے اور آریہ سماج اور سناتن دھرم والوں کی زبان درازیوں کو لگام دیدی جائے۔

دعوتِ پنجہ آزمائی:۔ میلہ خدا شناسی میں ابتدا سے آخر تک مسلمانوں نے دیکھا کہ پادریوں کی پشت پناہی کچھ ایسے لوگ کر رہے ہیں جو عیسائیت سے پوری طرح متاثر ہیں جیسے منشی پیارے لال اور لالہ مکتا پرشاد وغیرہ یا ہندو سماج میں ایک نئے مذہب کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی دوسرے منشی اندرمل جو سناتن دھرم کے نمائندے تھے، ظاہر و باطن میں یہ سبھی لوگ پادریوں کو کمک پہونچا رہے تھے، اور

مسلمان دونوں کی کمانوں سے نکلے ہوئے تیروں کا نشانہ بن رہا تھا اس لیے پادریوں کو شکست دینے کے بعد یہ افسوس رہ گیا تھا کہ ان فرقوں سے بھی براہ راست سوال وجواب نہ ہو سکا، اس لیے ایسا موقعہ نکالنا چاہیئے کہ اسی سفر میں ان سے بھی مجمع عام میں ایک مجلس مباحثہ منعقد ہو جائے۔

مراد آباد سے مولانا محمد علی صاحب میلہ خدا شناسی میں شریک تھے، آپ کا ہندو مذہب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کے تمام عقائد ان کی روایات اور ان کے دیومالائی قصوں سے خوب واقف تھے اس لیے وہ آریہ سماج والوں اور سناتن دھرم کے نمائندوں کے سامنے اسلام کی وکالت اور ان کے باطل عقائد کی تردید میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ حضرت نانوتوی کے رفیق سفر تھے۔ چاندپور سے واپسی میں یہ حضرات شاہ جہاں پور میں قیام پذیر تھے حضرت نانوتوی نے مولانا محمد علی سے فرمایا کہ کسی طرح منشی اندرمل اور پنڈت دیانند سرسوتی کو دعوت دے کر شاہ جہاں پور میں مدعو کیا جائے تاکہ ان دونوں سے مباحثہ ہو جائے اور ان کی ہرزہ سرائیوں کا سلسلہ بند ہو، صلاح ومشورہ کے بعد مولانا محمد طاہر نے دونوں کے نام خط لکھ کر اپنے آدمی کے ہاتھ ان کے پاس بھیجا ان خطوط میں ان کو دعوت دی گئی کہ آپ مراد آباد جانے والے ہیں مہربانی فرما کر آپ شاہ جہاں پور سے ہو کر جائیں، اور یہاں قیام کے لیے ایک دو دن کا وقت نکال لیجیے تاکہ اس موقعہ پر آپ کے اور مولانا محمد علی صاحب کے درمیان ایک مجلس مباحثہ ہو جائے لیکن جواب خط میں انہوں نے شاہ جہاں پور آنے سے انکار کر دیا۔

مباحثہ شاہ جہاں پور کے اثرات :۔ یہ مباحثہ اگرچہ ضلع شاہ جہاں پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ہوا لیکن مغربی اتر پردیش اور دہلی تک کے لوگ اس مباحثہ میں بڑی تعداد میں شریک تھے، پوسٹروں کے علاوہ اخباروں میں بھی اس مباحثہ کی خبریں شائع ہوتی رہیں اس لیے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی، اس مباحثہ میں اسلام کا غلبہ اتنا واضح اور نمایاں تھا کہ وہ کسی تاویل کی چادر سے چھپایا نہیں جا سکتا تھا، ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ مسلمان بازی جیت گئے۔ یہ پادریوں کی ایسی شکست تھی کہ وہ پورے ملک میں ذلیل اور رسوا ہو گئے اس لیے پادریوں کے حوصلوں اور امنگوں

پراوس پڑگئی، پادری محی الدین پشاوری جو اس مباحثہ میں پیش پیش تھے اور یورپین پادریوں سے کہیں زیادہ سخت لب و لہجہ میں اسلام پر اعتراضات کرتے تھے لیکن یہی مباحثہ ان کی زندگی کا آخری مباحثہ ثابت ہوا کیونکہ اس کے کچھ مہینوں بعد ہی انہوں نے عیسائیت سے توبہ کرلی اور پھر خالص مسلمان ہوکر پوری زندگی گذاری اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہوا۔

مباحثہ شاہ جہاں پور کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء اسلام کی جرأت بڑھی، جو لوگ اب تک حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے پادریوں سے مقابلہ کرنے اور مباحثہ و مناظرہ کی ہمت نہیں کرتے تھے اب ملک کے کونے کونے میں پادریوں کو گھیرنے لگے جیسا کہ کئی مشنوں کے پادریوں کی رپورٹوں میں اس کا ذکر ملتا ہے کہ مسلمان علماء عیسائیت کی راہ میں سنگ گراں بن رہے ہیں اسی طرح کی ایک رپورٹ ملتان کے پادری کی ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ملتان کے ملّا اور سیّد اور مخدوم سب اس بات کے لیے کوشش کررہے ہیں کہ خدا کی روشنی کو داخل نہ ہونے دیں۔ یہ دو مشہور شخصیتوں یعنی مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان کہ جنہوں نے اسلام کا طرفدار ہوکر ڈاکٹر فنڈر سے مباحثہ کیا تھا، کے دوست تھے۔"

یہ ضلع ملتان کے انچارج پادری فرنچ کی رپورٹ کے الفاظ ہیں، یہ علماء بلا کسی معاوضہ اور پشت پناہی کے محض اپنے جوش ایمانی کے زیر اثر ردّ نصاریٰ میں اپنا وقت صرف کررہے تھے، ہر صوبہ اور ہر ضلع میں مناظرین اسلام کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد ردّ نصاریٰ کا فرض ادا کررہے تھے۔ اگر کوئی خاص اور اہم مقابلہ یا مناظرہ ہوتا تھا تو مرکز سے علماء کرام مقابلہ کے لیے جاتے تھے جس سے پادریوں میں کھلبلی مچ جاتی اور عوام پر اس کا بہتر نتیجہ مرتب ہوتا تھا۔ یہ بات عیسائی مشنریوں کی رپورٹوں میں موجود ہے اگرچہ وہ مخالفانہ و معاندانہ انداز میں ہے، لیکن واقعات و تجربات کی تفصیل سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ علماء کرام ہر ضلع میں ان کے مدّمقابل تھے اور پادریوں کو چین سے کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑتے تھے۔

پادریوں کی مرعوبیت :- حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ چاندپور ضلع شاہ جہاں پور کے میلہ خدا شناسی میں دو سال شریک ہوئے قدرت کو مولانا موصوف کے ہاتھوں عیسائیت کو ہندوستان میں ناکام و نامراد بنانا تھا اس لیے دونوں سال حضرت نانوتوی کی تقریریں اتنی پُراثر ثابت ہوئیں کہ موافق و مخالف ہر ایک پر اس نے گہرا اثر ڈالا، اسلام کی مدافعت کے لیے یہ بیانات جیسے الہامی ہوں جو براہِ راست دل و دماغ پر حاوی ہوگئے ان تجربات و مشاہدات کی وجہ سے ہندوؤں نے تو انتہائی مرعوبیت کی وجہ سے یہاں تک کہدیا کہ مولانا قاسم کی زبان میں علم کی دیوی بول رہی ہے اسی طرح ہندوستان کی عیسائی مشنریوں میں آپ کا نام انتہائی مرعوبیت کے ساتھ لیا جانے لگا جیسا کہ متعدد ثقہ راویوں نے پادریوں کی خفیہ مجلسوں کی باتیں نقل کیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ میں پادریوں کو مسلمانوں سے مناظرہ و مباحثہ کی جو ٹریننگ دی جاتی تھی اس میں دو تین مسئلوں پر پادریوں کو تیار کیا جاتا تھا۔ ایک تو یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے عیسائیوں سے علم حاصل کیا اور اس کو ایک مذہب کی شکل دے دی۔ دوسری بات یہ کہ قرآن آسمانی کتاب نہیں، پیغمبر کے زمانہ میں قرآن مرتب نہیں ہوا، اگر بالفرض قرآن آسمانی کتاب ہے تب بھی ہمارا دین غالب ہے کیوں کہ مسلمانوں کے قرآن میں انجیل کی تصدیق موجود ہے۔

یہ وہ مسائل ہیں کہ علماء اسلام نے ان مسائل پر ہزاروں ہزار صفحات لکھ ڈالے ہیں اور خوب خوب دادِ تحقیق دے چکے ہیں اور ایسی ایسی دقیق اور عالمانہ بحثیں اس سلسلہ میں کی ہیں کہ پادریوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، علم کلام تو مسلمانوں کا اپنے گھر کا فن ہے۔ مولانا نانوتوی کا متکلمانہ اندازِ بیان جب پادری سنتے تھے تو بہت سی باتیں تو ان کے طائرِ فکر کی پرواز سے بھی بلند معلوم ہوتی تھیں پھر ان کلامی بحثوں کو روزمرہ کے مشاہدات و تجربات سے اس طرح ثابت کر دیتے تھے کہ کسی کے لیے مجالِ انکار نہیں رہ جاتی تھی۔

یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے مباحثہ شاہ جہاں پور کے بعد یورپین مناظرہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے، اور اب صرف دولت کے بل بوتے پر پسماندہ طبقات میں عیسائیت

کی نشر و اشاعت میں لگ گئے، البتہ چند مرتد مسلمان جو عیسائی ہو گئے جیسے پادری عماد الدین پادری صفدر علی وغیرہ، ہندوؤں میں ماسٹر رام چندر اور پادری ٹھاکر داس جیسے لوگ چھوٹے چھوٹے رسالے اسلام کے خلاف لکھتے رہے لیکن کہیں بھی مسلمانوں سے مناظرہ کرنے کی غلطی پھر نہیں دُہرائی۔

ان دیسی پادریوں کے رسالوں اور کتابوں کے جواب میں علماء اسلام کی طرف سے برابر کتابیں لکھی جاتی رہیں اور تحدی و چیلنج کے طور پر لکھی جاتی رہیں، بعض کتابوں کے جواب کے لیے عیسائیوں کو چیلنج کیا جاتا رہا کہ اگر انہوں نے اس کا جواب دیا تو ان کو انعام دیا جائے گا لیکن ان کا مبلغ علم چند موٹے موٹے جملوں سے آگے کام نہیں کرتا تھا اس لیے علماء اسلام کی کتابوں کے جواب میں پادریوں کی طرف سے اکثر خاموشی ہی رہتی تھی۔

حوصلے پست ہو گئے:۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پچاس پچپن سال تک کبھی حکومت کی پشت پناہی کے بل بوتے پر، کبھی اپنے بے پناہ سرمایہ کی بدولت تبلیغ عیسائیت کا یہ کاروبار چلتا رہا۔ ابتداءً تو انگریزوں کے حوصلے بلند تھے اور ہزاروں میل دور لندن میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کی کہ پورے ہندوستان کو چند سالوں میں ہم دامِ عیسائیت میں شکار کر لیں گے اور بڑے ہی جوش و خروش سے کام کا آغاز بھی کیا اور اس طرح کیا کہ جب پادری تقریریں کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آواز میں رعد و برق کی کڑک ہے دو چار حرف اسلامی کتابوں کے یورپ سے پڑھ کر آئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ جاہل ہندوستان میں کون ہمارے مبلغ علم کو پہونچ سکتا ہے، ایک مہمل سی کتاب "میزان الحق" لکھ کر یورپ کو یقین دلا دیا کہ یہ کتاب الہام ربانی سے لکھی گئی ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس کا جواب نہیں دے سکتے اور جب وہ اس الہامی کتاب کو لے کر ہندوستان آئے تو ایک معمولی سی سوئی اس غبارے میں چبھو دی گئی اور یک بیک ساری ہوا نکل گئی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان صرف دو نفر نے یورپ سے درآمد پادریوں کی پوری فوج کو چوبیس گھنٹے میں وہ ذلت آمیز شکست دی کہ دس سال کی منصوبہ بندی دو دِنوں میں مسلمانوں نے ملیا میٹ کر دی، اونٹ نے جب تک پہاڑ نہیں دیکھا تھا تبھی تک بلبلاتا رہا۔

لیکن پادریوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں جو چند تعلیمیافتہ ہندوستانیوں نے عیسائیت قبول کرلی تھی وہ مزید دس بارہ سال عیسائیت کی شکستہ کشتی کو کھیتے رہے لیکن ان کا بھی علم اور ان کے طائرِ فکر کی پرواز محدود تھی جب اکابر علمار نے ردعیسائیت کے میدان میں پوری قوت سے قدم رکھا تو ان کے بھی دل دہل گئے، چاروں طرف سے علمار اسلام نے جو یلغار کی تو ہندوستان میں عیسائیت دم توڑنے لگی اور انیسویں صدی پوری ہوتے ہوتے اس کی تجہیز و تکفین تیجہ چہلم سب سے فرصت ہو چکی تھی۔

عیسائیت کی پناہ گاہیں:- آج ہندوستان میں ۸۰،۷۰ لاکھ عیسائی مردم شماری کے مطابق ہیں، یہ کیسے عیسائی ہوئے، ان کے آبار و اجداد کس طرح اور کب عیسائی ہوئے اور وہ کون لوگ تھے۔ اب اس پر ایک نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہوگا۔

آپ صرف اُتر پردیش کے مرکزی شہروں میں جائیں تو آپ کو ہر شہر میں مشن اسکول، مشن اسپتال اور چرچ اس کے ساتھ کچھ بنگلے اور خام و پختہ مکانات نظر آئیں گے، یہی تبلیغ عیسائیت کے مرکزی مقامات تھے، یہیں سے ان کی سرگرمیاں جاری ہوتی تھیں، یہ انیسویں صدی کے آخر تک قائم کیے جاتے رہے اور آج بھی وہ رفاہی اداروں یا تعلیمی اداروں کی شکل میں زندہ ہیں، پہلے ان مقامات پر بڑی چہل پہل رہتی تھی، دیسی عیسائیوں کی اولاد یہاں پرورش پاتی تھی اور تعلیم حاصل کرتی تھی، بہترین تعلیمی کارکردگی کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کو مشن اسکولوں میں داخل کرنے کو ترجیح دیتے تھے اسکول کے ٹیچر بالعموم عیسائی ہوتے تھے معصوم بچوں کے ذہن میں مذہب عیسوی کی تخم ریزی ہوتی رہتی تھی، تمام بچوں کے لیے انجیل پڑھنا ضروری تھا، ان کو چرچ میں لے جا کر عبادت کرائی جاتی تھی، مشن اسپتال میں داخل مریضوں کو حضرت مریمؑ کی تصویر کے سامنے کھڑا کر کے دعائیں کرائی جاتی تھیں لیکن یہ ساری سرگرمیاں انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے عنقا ہو چکی تھیں، ان مشنوں کی رونق اور چہل پہل رخصت ہو چکی تھی۔ چرچ میں پچیس پچاس جرائم پیشہ اقوام ڈوم، بھنگی، مسہر، دوساتھ، اور چماروں کے افراد عیسائیوں کا

لباس پہن کر کارٹون بنے گھومتے پھرتے نظر آنے لگے، یہ تبلیغِ عیسائیت کی ناکامی کی انتہا تھی۔

اس لیے عیسائی مشنریوں نے شہری اور متمدن علاقوں کو ترک کر کے اپنی جدوجہد کا میدان ان علاقوں کو بنایا جہاں پست اقوام، نیم وحشی قومیں تہذیب و تمدن سے عاری نیم برہنہ رہنے والی قومیں بستی تھیں۔ مرزا پور کے پہاڑی علاقے، مدراس کا ساحلی علاقہ کیرالہ اور اس کے اطراف و جوانب، ناگالینڈ، میزورم، منی پور اور اڑیسہ کے جنگلی اور پہاڑی علاقے جہاں اب بھی نیم برہنہ وحشی قومیں تیر کمان سے مسلح رہتی ہیں، نیم وحشی انسان، نیم عریاں مرد اور عورتیں رہتی ہیں عیسائیوں کی جدوجہد کے مرکز بنے، یہی نیم وحشی قومیں اور یہی مقامات ان کی شکارگاہیں بنیں، ان جنگلی اقوام کی خوراک پوشاک کا نظم کیا، ان کو اپنے مشن اسکولوں میں پکڑ کر لائے، سارے اخراجات برداشت کیے اور ان کو لکھا پڑھا کر چھوٹی موٹی نوکریاں دلوا دیتے ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو دایہ گیری، زچہ گیری اور نرسنگ کی تربیت دیکر ان کی روٹی روزی کا بندوبست کرتے رہے، یہی وحشی اقوام آج عیسائیوں کی فہرست میں شامل ہیں اور آج ستر اسی لاکھ جو عیسائی ہیں ان کے آباء و اجداد یہی نیم وحشی قومیں تھیں، مسلمانوں کا کوئی غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل فرد بھی عیسائیوں کے دامِ تزویر میں گرفتار نہیں ہوا۔

عیسائیت کا فتنہ اپنی موت آپ مر گیا

میری اس تفصیلی گفتگو سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہندوستان میں عیسائیت کس جاہ و طمطراق کے ساتھ آئی تھی اس کی پشت پر کتنی زبردست طاقت تھی، اس کے وسائل و ذرائع کتنے بے پناہ تھے، اس کے پاس کتنا بڑا فنڈ اور سرمایہ تھا؟ اور کارکنوں کا کتنا بڑا جتھہ تھا۔ یہی عیسائیت اپنے تمام مادی وسائل اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور تھی، دوسری طرف مسلمانوں کا کیا حال تھا؟ اس کی حکومت چھینی جا چکی تھی، اس کے حساس اور بیدار مغز علماء اور رؤسا یا تو پھانسی پر چڑھا دیئے گئے تھے یا کالے پانی بھیجے جا چکے تھے، معاشی اعتبار سے یہ حال تھا کہ شاہی خاندان کی شہزادیوں

کو لوگوں نے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا جن کے دروازوں پر ہاتھی جھومتا تھا وہ لوگ نانِ شبینہ کے محتاج ہو چکے تھے، مزید ستم یہ کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے ہر طبقہ کو اور ہر قوم کو اپنا سکتی تھی لیکن مسلمانوں کو اپنا اتنا بڑا دشمن سمجھتی تھی کہ اس کے مادی وجود کو ختم کیے بغیر جیسے اس کو چین ہی نہیں مل سکتا، پھر ایسی بے بسی و مجبوری، مظلومیت و مقہوریت اور بے سروسامانی کے باوجود شاہانہ جاہ و جلال اور رعب داب کے ساتھ آنے والی عیسائیت سے ٹکر لی اور پادریوں کو ذلت آمیز شکست دی اور عیسائی حکومت کے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، ہندوستان میں علماء حق کا یہ بے مثال تاریخی کارنامہ ہے جسے ہندوستان کی مذہبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اس فتنہ کا سر کچلنے میں انہیں لوگوں کا مرکزی کردار تھا جو دارالعلوم دیوبند کے معمار اول تھے اور تعمیر دارالعلوم کے ابتدائی دور میں وہ خود بہ مقابل تھے اور دارالعلوم کی ترقی کے بعد ان بزرگوں کے شاگردوں نے عیسائیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اور ہندوستان میں عیسائیت کو ایک تنگ خول میں بند کر دیا، جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

ردّ عیسائیت میں کتابیں:۔

مسلمانوں کی مرعوبیت عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی اور حکومت کی سرپرستی کا مستبدانہ و جارحانہ رویہ پہلے جیسا نہیں رہا اس لیے اب ہر شہر میں گاؤں گاؤں میں مشہور و غیر مشہور اہل علم ردعیسائیت میں سرگرمی سے لگ گئے۔ ان میں مولانا محمد علی مونگیری کان پوری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (اعظم گڈھ) مولا بخش کان پوری مولانا رحم علی منگلوری جیسے مشاہیر کے نام خصوصیت سے لیے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ۱۸۷۷ء کے مباحثہ شاہ جہاں پور کے بعد بڑے پیمانے پر پادریوں سے مناظرہ کا سلسلہ بند ہو چکا تھا چھیڑ چھاڑ البتہ جاری تھی، اب صرف قلمی جنگ کا آغاز ہو گیا تھا وہ بھی صرف دیسی پادریوں کی طرف سے یہ نیش زنی تھی۔ یورپین پادری اس صلاحیت سے محروم تھے علماء کرام کی طرف سے اس کے مسکت اور ناقابل تردید جوابات دیدیئے جاتے تھے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتابیں :۔

ہندوستان میں عیسائیت سے سب سے پہلے جس نے ٹکر لی وہ

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور سب سے پہلے انہوں ہی نے رَدِّ عیسائیت میں معرکۃ الآراء کتابیں بھی تصنیف کیں اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا موصوف نے علم و تحقیق کا حق ادا کر دیا، مولانا نے جب مکہ مکرمہ ہجرت کی تو سلطانِ ٹرکی کی دعوت پر آپ وہاں گئے تھے سلطان ہی کے اشارہ پر مناظرہ کے واقعات اور پادریوں کے ان تمام اعتراضات کے جوابات جو وہ اسلام پر کرتے ہیں، اور عیسائیت کے منسوخ ہونے، انجیل کے محرف اور ناقابلِ اعتبار ہونے پر ایک مبسوط کتاب "اظہار الحق" کے نام سے عربی میں تصنیف کی جس میں تاریخی اور دستاویزی ثبوت سے انجیل کی تحریفات کا پردہ چاک کیا، عقلی و نقلی دلائل سے موجودہ عیسائیت کی دھجیاں بکھیر دیں اور اسلامی دنیا کو عیسائیوں اور پادریوں کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ و مطمئن کر دیا۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں قسطنطنیہ سے شائع کی گئی پھر حکومت ترکی کے صدرِ اعظم کے حکم سے بعض ترکی علماء نے اس کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا جو "ابراز الحق" کے نام سے وہاں شائع ہوا، نیز حکومتِ عثمانیہ ہی کی طرف سے یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے شائع کیے گئے جس کو پادریوں نے خاص اہتمام سے تلف کرنے کی کوشش کی مگر پھونکوں سے اس چراغ کو بجھانا ممکن نہ تھا اس لیے یہ کتاب یورپ میں پھیلی اور متعدد انصاف پسند منصف مزاج عیسائیوں اور انگریزوں نے اس کتاب کو پڑھ کر دامنِ اسلام میں پناہ لی، اور پاسباں مل گئے کعبے کو صنمخانے سے۔

ترکی اور یورپ سے یہ کتاب مصر پہونچی اور وہاں متعدد بار طبع ہوئی، عربی کا تازہ ایڈیشن خوب صورت ٹائپ میں دو سال ہوئے بیروت سے شائع ہوا ہے، ہندوستان میں مولوی غلام محمد بھانجا راندیری نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جو صوبہ گجرات میں شائع ہوا۔

"اظہار الحق" کا جب انگریزی ایڈیشن شائع ہوا تھا تو "ٹائمز آف لندن" نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی کے لیے میدان باقی نہیں رہے گا۔"

نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ نے "ٹائمز آف لندن" کا اس تبصرہ کا ترا شہ لے کر مکہ معظمہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی خدمت میں پیش کیا، مولانا موصوف اس وقت تک حیات تھے، دشمنوں کے اس اعتراف پر مولانا نے خدا کا شکر ادا کیا، خدا نے ان کی محنت کو رائیگاں نہ ہونے دیا، "اظہار الحق" کے علاوہ مولانا موصوف نے نو کتابیں اور تصنیف فرمائیں۔

۱۸۵۲ء (۱۲۶۹ھ) میں "ازالۃ الاوہام" فارسی میں ردّ عیسائیت کے موضوع پر آپ نے لکھی جس کا ایک نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے، اسی سال دوسری کتاب "ازالۃ الشکوک" اردو میں دو جلدوں میں تحریر فرمائی جس کی پہلی جلد مولانا مرحوم کے شاگرد رشید مولانا عبدالوہاب بانی مدرسہ الباقیات الصالحات مدراس نے شائع کی اور دوسری جلد جناب مہتمم صاحب مدرسہ مذکور نے طبع کروائی، تیسری کتاب "اعجاز عیسوی" تصنیف فرمائی جس میں بائبل کا مکمل طور پر محرف ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار آگرہ میں اور دوسری بار مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی ہے۔ چوتھی کتاب "اصح الاحادیث فی ابطال التثلیث" ہے جس میں دلائل قطعیہ سے تثلیث کو باطل محض ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی مطبع رضوی دہلی سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ پانچویں کتاب "بروق لامعہ" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے اثبات میں ہے، چھٹی کتاب "البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف" (۱۲۷۰ھ ۱۸۵۳ء) میں لکھی گئی جس میں تحریف انجیل پر محققانہ بحث کی گئی ہے، فخر المطابع دہلی سے شائع ہوئی، ساتویں کتاب "معدل اعوجاج المیزان" ہے جو پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کا محققانہ جواب ہے، آٹھویں کتاب "تقلیب المطاعن" ہے جو پادری لاسمند کی کتاب "تحقیق دین حق" کا جواب ہے۔ نویں کتاب "معیار التحقیق" ہے جو پادری صفدر علی کی کتاب کا جواب ہے۔

مناظرانہ رنگ کی کتابیں:۔ علماء اسلام نے دین عیسوی پر محققانہ کتابیں لکھ کر

اسلام کی مدافعت اور دینِ عیسوی کے منسوخ ہونے اور انجیل کے محرف ہونے کی بحث کو آخری حد تک پہونچا دیا تھا۔ بعد کے دور میں مناظرانہ رنگ کی کتابیں زیادہ لکھی گئیں اور اس کا آغاز اس وقت ہوا جب پادریوں نے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر اسٹیج چھوڑ دیا، اور صرف قلمی جنگ پر اکتفا کیا، یورپین پادریوں میں تو اس جنگ کی صلاحیت ہی نہیں تھی، البتہ ضمیر فروش چند افراد جو مسلم خاندانوں سے عیسائی ہو گئے تھے انہوں نے زیادہ سرگرمی دکھائی ان میں پادری عماد الدین، پادری صفدر علی، پادری رجب علی، پادری سلطان محمد خاں، پادری عبدالحق، مسٹر موسیٰ خان ایڈیٹر المائدہ، پادری محی الدین کے نام نمایاں ہیں۔ ہندو عیسائیوں میں دو تین نام ہیں جنہوں نے مسلمانوں پر اعتراض کے لیے اردو فارسی میں بہت سی کتابیں لکھیں ان میں ہر ایک کی متعدد کتابیں ہیں، کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو نشانہ بنایا اور آپ کی حیاتِ طیبہ کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی، کسی نے قرآن پاک پر اعتراضات کیے، بلا استثناء ہر ایک کا طرزِ تحریر توہین آمیز اور انتہائی دل آزار ہوتا تھا۔

یہ تمام کتابیں اور رسالے بڑی تعداد میں شائع کیے جاتے اور زیادہ تر مفت تقسیم کیے جاتے تھے، مسلمانوں کی طرف سے بھی اس کے جوابات ترکی بہ ترکی دیئے جاتے تھے اور پادریوں کو اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑتے تھے ان کے ہر رسالہ اور ہر کتاب کے جواب میں ایک سے زائد کتابیں لکھ کر شائع کی جاتی تھیں، پادری فنڈر کے فرار کے پندرہ برس بعد مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب "اعجازِ عیسوی" کے جواب میں پادری عماد الدین نے "ہدایت المسلمین" لکھی، لیکن چند سوالات کے لچر جواب کے بعد اس کا قلم خشک ہو گیا اور مولانا موصوف کے اعتراضات اس کے اٹھائے نہ اٹھ سکے، اس کے باوجود علماء حق نے پادری عماد الدین کی اس کتاب کا فوراً رد لکھا، مولانا سید محمد علی کان پوری نے اس کے جواب میں "مرآۃ الیقین" لکھی، اور سنین طباعت انجیل اور مکمل حوالوں کے دستاویزی ثبوت کو پیش کر کے یہ دعویٰ کیا کہ تمام اہلِ علم انجیل میں تحریف کے قائل ہیں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی کتاب "اعجازِ عیسوی" میں جو دلائل دیئے ہیں وہ سب کے سب صحیح اور ناقابلِ تردید ہیں، پادری صفدر علی نے عیسائیت کی حمایت میں "نیاز نامہ"

نام کی کتاب لکھی اور اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی گئی اور اس کو بڑی اہمیت دی گئی، اس کے جواب میں متعدد علماء نے کتابیں لکھیں، مولانا سید محمد علی کانپوری نے اس کے جواب میں "آئینۂ اسلام" (۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) میں لکھی جس میں خاص طور پر صفدر علی کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ قرآن و احادیث جس شریعت کی دعوت دیتی ہیں اس کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اب اس پر عمل کی ضرورت نہیں۔ پادری عماد الدین کا ایک شیعہ مجتہد سے ۱۸۷۱ء میں تحریری مباحثہ ہوا تھا اس مباحثہ کو ایک پادری نے "نغمۂ طنبوری" کے نام سے شائع کیا تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد اعتراضات کیے تھے۔ مولانا محمد علی کان پوری نے اس کتاب کے جواب میں "ترانۂ حجازی" لکھی جس میں دوسرے اعتراضات کے جوابات کے علاوہ آپ نے نبوت محمدی کا ثبوت عصمت انبیاء، قرآن کا توریت و انجیل سے ماخوذ نہ ہونا ہر ایک کے دلائل و براہین تحریر فرمائے جس کا جواب عیسائیوں کی طرف سے نہیں دیا جا سکا۔

پادری عماد الدین کی ایک کتاب "تقلیعات" کے جواب میں مولانا محمد علی نے کتاب "دفع التلبیسات" تحریر فرمائی جس میں خصوصیت کے ساتھ انجیل کے محرف ہونے پر دلائل کا انبار لگا دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔

مولانا سید محمد علی کانپوری کی دوسری تصنیفات میں "ساطع البرہان" اور "براہین قاطعہ" کا ذکر ناگزیر ہے اول الذکر کتاب میں قرآن مجید کو کلام الٰہی ہونا ثابت کیا گیا ہے اور اس کے ناقابل تردید عقلی و نقلی دلائل دیئے ہیں اور دوسری کتاب میں عیسائیوں کے عقائد کا ابطال کیا گیا ہے۔

پادری صفدر علی کی کتاب "نیاز نامہ" کا ذکر پہلے آچکا ہے، پادریوں میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اسی طرح پادری ٹھاکر داس نے ایک کتاب "عدم ضرورت قرآن" لکھی تھی ان دونوں کتابوں کے جواب میں مولانا محمد علی نے ایک معرکۃ الآراء اور ضخیم کتاب "پیغام محمدی" تحریر فرمائی جو زور بیان، استحکام دلائل اور براہین قاطعہ کا شاہکار ہے کتاب دو جلدوں میں ہے، اس کتاب میں مولانا موصوف نے ناقابل تردید

دلائل سے انجیل کے محرف ہونے کو ثابت کیا ہے اور خود عیسائیوں کی تحریریں اس کے ثبوت میں پیش کی ہیں، جس سے انکار کی عیسائیوں میں ہمت نہیں ہے۔ مولانا کی اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع کیا گیا اور مشنریوں کو خصوصیت سے بھیجا گیا۔ بعد میں اس کتاب کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اس کو شائع کر کے بنگال میں پھیلایا گیا۔

کان پور میں ایک بزرگ شیخ مولا بخش تھے، بڑے ذہین و فطین تھے انہوں نے ایک یورپین پادری آئزک فیلڈ بریو سے تحریری مناظرہ کیا تھا، بعد میں شیخ صاحب نے ان تمام خطوط کو جو پادری آئزک کے اعتراضات کے جواب میں لکھے گئے تھے ایک کتاب میں جمع کر دیا اور اس کو "المراسلات المذہبیہ" کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اس کتاب میں انجیل کے محرف ہونے پر سولہ ایسی دلیلیں دی گئی ہیں جن کا جواب اُس دَور کا بڑے سے بڑا پادری بھی نہیں دے سکا تھا اس کے علاوہ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے اور تا ہنوز اس کے صحیح اور غیر محرف ہونے کو ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ دوسرے مباحث میں "اثبات نبوتِ محمدی"، "ابطالِ تثلیث خصوصیت سے مطالعہ کی چیزیں ہیں، سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں اب تک شائع ہونیوالی پونے دو سو کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جو علماءِ اسلام نے ردِّ عیسائیت میں لکھی ہیں اور شائع کی ہیں، ان میں سے کسی کتاب کا کوئی قابلِ ذکر جواب پوری دنیائے عیسائیت کی طرف سے نہیں دیا گیا ہے، کتاب "المراسلات المذہبیہ" میں عیسائیوں اور پادریوں کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے مذہب کو حق سمجھتے ہیں اور اپنے دین کو برحق ثابت کرنا چاہتے ہیں تو علماء اسلام کے ان اعتراضات کا جواب دینا ان کا سب سے پہلا فرض ہے جو ان کتابوں میں کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔

مولانا ابوالمنصور دہلوی عیسائیوں سے مناظرہ کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے، اس کے لیے انہوں نے خاص طور پر تیاری کی تھی، اسی مقصد سے انہوں نے انگریزی زبان سیکھی توریت و انجیل خود پادریوں سے پڑھی تب آپ نے عیسائیت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا، مناظرے کیے اور ان کے رَد میں بہت سی معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کیں، ان کی

تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

"نوید جاوید"، "دولتِ فاروقی"، "عماد الدین پادری کی کتاب "ہدایت المسلمین" کے جواب میں "عقوبۃ الضالین" لکھی، ماسٹر رام چندر عیسائی دہلوی کی کتاب "المسیح الدجال" کی تردید میں "الاستیصال" تحریر فرمائی، پادری صفدر علی کی کتاب "نیاز نامہ" کی تردید میں ..... "رقیمۃ الوداد" اور پادری عماد الدین کی دوسری کتاب "نغمۂ طنبوری" کے جواب میں "لحن داؤدی" اور پادری رجب علی کی کتاب "آئینۂ اسلام" کے رد میں "الانعام العام"۔ پادری راجرس کی کتاب "تفتیش الاسلام" کے جواب میں "افہام الخصام"، پادری عماد الدین کی ایک اور کتاب "تفسیر المکاشفات" کے رد میں "تصحیح التاویل" تصنیف کی اور شائع کی۔

رام چندر عیسائی نے اسلام کے خلاف کئی کتابیں لکھیں انھیں میں ایک کتاب "اعجاز القرآن" ہے، اس کا جواب مولانا ابو المنصور صاحب نے "اعزاز القرآن" لکھ کر دیا ہے، پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" جس کی بڑی شہرت تھی اور پادری اس کو الہامی کتاب کہتے تھے۔ اس کے رد میں علماء اسلام نے متعدد کتابیں لکھیں، مولانا ابو المنصور صاحب نے بھی اس کے جواب میں "میزان المیزان" تحریر فرمائی۔ عیسائیوں سے بحث و مناظرہ کے سلسلہ میں مولوی چراغ علی حیدر آبادی کا بھی نام آتا ہے۔ پادری عماد الدین کی کتاب "تاریخ محمدی" پر تنقیدی حواشی کے علاوہ "الحجۃ الزاہرہ"۔ "برکات الاسلام الدنیویہ" لکھی، مولانا ابو المنصور کی رد عیسائیت میں اور دوسری کتابیں بھی ہیں، "سبیل النجاۃ"، "حرز جان"، "تشویش القسیس" کے نام ملتے ہیں۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند کا نام عیسائی دنیا میں زلزلہ ڈال دیتا تھا۔ ان کا نام سنتے ہی پادریوں کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، معرکۃ الآرا مناظرے کے علاوہ آپ نے دو کتابیں بھی بڑی عالمانہ تحریر فرمائیں۔ ایک "الابحاث الضروریہ" دوسری "حجۃ الاسلام"، دونوں کتابیں اپنے زور استدلال کی بنا پر بے مثال شاہ کار ہیں۔

مولوی سلیم اللہ صاحب نے ردِ عیسائیت میں "صداقت قرآنی بر کتب ربانی" و

"الانصاف لدفع الاختلاف" اور "اظہار الاسلام" لکھیں۔ مولانا محمد علی مراد آبادی جو مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ساتھ عیسائیوں سے مباحثہ میں شریک تھے اور چاند پور ضلع شاہ جہاں پور میں آپ کے ہم رکاب تھے انہوں نے ردّ عیسائیت میں کئی کتابیں لکھی ہیں "تائید القرآن"، "کشف الاوہام"، "شہادۃ النبیین برسالۃ سید المرسلین" کا نام ردّ عیسائیت کی فہرست میں ملتے ہیں۔

مولانا عبدالحق حقانی مصنف تفسیر حقانی نے رام چندر عیسائی کی کتاب "اعجاز القرآن" کے جواب میں "تعریف القرآن" تحریر فرمائی اور اپنی تفسیر کے مقدمہ میں عیسائیوں کے تمام اعتراضات کو نقل کر کے ان کے جوابات دیئے ہیں اور اسی کے ساتھ دین عیسوی کے منسوخ ہونے اور بائبل کے محرف ہونے پر دلائل فراہم کیے ہیں۔ ایک مولوی عبداللہ صاحب کلکتے کے رہنے والے تھے ان کو بھی ردّ عیسائیت سے دلچسپی تھی انہوں نے بھی ردّ عیسائیت میں ایک کتاب "السیف الہندی علیٰ معذرات الکندی" تحریر کی ہے۔ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی اعظم گڈھی نے کتاب "البشریٰ" لکھی جو دو جلدوں میں ہے جس میں نبوت پر بحث کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات کے ساتھ حضور اکرم کی شریعت کو تمام ادیان و شرائع کے لیے ناسخ ثابت کیا ہے اور اس کے بالمقابل عیسائیت کو از کار رفتہ اور اس کے منسوخ اور ناقابل عمل ہونے پر دلائل دیئے ہیں، "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کے مصنف نے لکھا ہے کہ اپنے موضوع پر یہ ایک بے نظیر کتاب ہے اور انتہائی مفید و بے مثال ہے، کسی عیسائی کو اس کے ردّ کی جرأت نہیں ہو سکتی، مولانا رحم علی منگلوری جو ردّ عیسائیت میں سرگرم تھے انہوں نے بھی ردّ عیسائیت میں کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ ان کی کتاب "بشارات محمدی" قابل ذکر ہے۔

باب ۴

فتنۂ آریہ سماج

آریہ سماج کی ہرزہ سرائیاں

آریہ سماج انیسویں صدی کے نصف آخر میں وجود پذیر ہوا۔ ہندو دھرم میں وقتاً فوقتاً ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنے دھرم کی تعلیمات و روایات میں اور اعتقادات میں تبدیلیوں کی دعوت دی، بعد میں یہی دعوت ہندو دھرم میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ کر دیتی ہے۔ بودھ دھرم درحقیقت ہندو دھرم ہی کی ایک شاخ ہے لیکن اس کی تعلیمات اور عبادات اور طور طریق میں عام ہندو دھرم سے بہت کچھ مختلف بھی ہے، سکھ دھرم بھی ہندو دھرم ہی کی ایک شاخ ہے جو بقول خود وہ دیوی دیوتاؤں اور مورتی پوجا سے ہٹ کر توحید کے قائل ہیں۔

اسی طرح انیسویں صدی کے نصف آخر میں پنڈت دیانند سرسوتی پیدا ہوئے اور انہوں نے ہندو دھرم میں اصلاح کا پیغام پہونچایا، انہوں نے اپنے اصول اور اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کے لیے سنسکرت زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "ستیارتھ پرکاش" ہے، یہ فرقہ مورتی پوجا کے خلاف ہے اور ہندوؤں کو بت پرست کہتا ہے لیکن عملاً عام ہندوؤں اور آریہ سماجیوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا ہے۔

پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی مذہبی اصلاح کی جو مہم چلائی اس کا کسی طرح سے مسلمانوں کے عقیدہ و مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "ستیارتھ پرکاش" کا ایک مقصد اسلام پر جارحانہ تنقید بھی ہے چنانچہ کتاب کا ایک طویل باب اسلام اور پیغمبر اسلام پر سخت جارحانہ تنقید پر مشتمل ہے اور خود پنڈت جی نے زندگی کے اخیر لمحہ تک اسلام

اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور ایک عرصہ تک علماء اسلام کو مدافعت کے سلسلہ میں اپنی توانائیاں صرف کرنی پڑیں۔

پنڈت جی کی تحریک اصلاح اور اس دھرم کے پرچار کا زمانہ وہ ہے جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو پوری طاقت سے کچل دینے کی مہم شروع کر رکھی تھی اور وہ اپنی مہم اس منزل تک لے جانا چاہتے تھے کہ مسلمان ہر طرف سے مجبور و مقہور ہو کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے اور اس کی غیرت و خودداری کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے، انگریزی حکومت نے اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے وہ وحشیانہ اور ظالمانہ طریقہ کار اختیار کیا کہ اب تک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اس وحشت و بربریت کے نمونے دیکھنے ہیں تو سر ایڈورڈ ٹامسن کی مشہور عالم کتاب "دی آور سائڈ آف دی ماڈل" پڑھیے جس کا اردو ترجمہ شیخ حسام الدین نے "غدر ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ" کر دیا ہے،

غدر کی قیامت کے دس بارہ سال ایسی بے چارگی، مایوسی، دل شکستگی اور مظلومیت کے گذرے، کہ آنے والی مصیبتوں کی مدافعت کی ان میں جرأت ختم ہوتی جا رہی تھی وہ خواب میں بھی انگریزی حکومت کی ننگی تلوار کو اپنے سروں پر چمکتی ہوئی دیکھ کر ڈر جاتے تھے، اپنی مجبوری و بے کسی کی انتہا یہ تھی کہ پادریوں کی لن ترانیاں، زبان درازیاں اللہ و رسول کی شان میں گستاخیاں اپنے کانوں سے سنتے تھے اور ان کے خون میں حرارت نہیں پیدا ہوتی تھی، دل خون ہو کر رہ جاتا تھا مگر زبان سی رکھی تھی۔ ایک سفید فام پادری، اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن کے خلاف جو منہ میں آتا تھا بک جاتا تھا لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اس کو ٹوک سکے، مسلمانوں کی پوری آبادی شہر خموشاں بنی ہوئی تھی،

یہی وہ زمانہ ہے جب آریہ سماج کا فتنہ اٹھا اور پوری جارحیت کے ساتھ اٹھا، چونکہ برادران وطن نے غدر کے ہنگامہ میں اپنی وفاداری کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ شہر بدری کے بعد سب سے پہلے انھیں کو دہلی میں آبادی کی اجازت ملی تھی، اور عیسائی مبلغین کا سب سے زیادہ اثر بھی برادران وطن قبول کر رہے تھے اس لیے انگریزی حکومت کا رویہ اور بھی ان کی طرف سے نرم تھا اور بزدل انسان کو جب کسی طاقتور کا سہارا مل جاتا ہے تو وہ چنگیز و ہلاکو سے زیادہ خونخوار اور ظالم بن جاتا

ہے کچھ یہی حال ان کا بھی تھا۔

اسی زمانہ میں شری دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی اور ہندوؤں میں ایک مصلح کی حیثیت اختیار کرلی، انہوں نے "ستیارتھ پرکاش" نامی کتاب لکھی اور اپنے کو موحد ثابت کیا اور مورتی کھنڈن کو اپنا پروگرام قرار دیا، اور وہ بہت جلد ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ہر قابل ذکر شہر میں اس فرقہ کی تنظیم "آریہ سماج" کے نام سے قائم ہوگئی، یہ مرکز شری دیانند سرسوتی کے خیالات وعقائد کے پرچار میں مصروف ہوگئے۔ "ستیارتھ پرکاش" کے چودھویں باب میں انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہر اگلا ہے وہ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے اور اسی کی بنیاد پر آریہ سماج کی توپوں کا رُخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف ہوگیا وہ ہر جگہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تقریر کرتے اور مناظرہ کا چیلنج کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس پر ناپاک الزامات واتہامات عائد کرتے اور مسلمانوں کو مشتعل کرتے رہتے تھے۔

ان کی ہمت اس لیے بڑھی ہوئی تھی کہ حکومت کی پشت پناہی ان کو حاصل تھی، عیسائیوں اور پادریوں کا تعاون ان کو ملتا تھا، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چاندپور ضلع شاہ جہاں پور کے میلہ خداشناسی کا آریہ سماج کے مناظرین کا اکھاڑا تھا اور وہ کوشش کرتے کہ ان مباحثوں کا حکم کسی انگریز پادری کو بنائیں، مباحثہ کی شرطیں، موضوع اور حدود مقرر کرنے میں یا تو آریہ سماجی پادریوں کی حمایت کرتے تھے یا اگر آریہ سماجیوں کی تجویز ہے تو پادریوں کی طرف سے اس کی تائید ہوتی تھی، چاندپور میں بانی آریہ سماج پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمل موجود تھے، اس مباحثہ میں آریہ سماجیوں اور پادریوں کی ملی بھگت کھل کر سارے حاضرین نے دیکھا، شرائط مباحثہ طے کرنے کے لیے آریہ سماجیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے دو دو نمائندے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے جو شرط پیش کی جاتی دونوں فرقوں والے متفقہ طور پر اس کو رد کردیتے اور مسلمانوں کو پابند کرنے کے لیے ان کا کوئی فریق تجویز پیش کرتا تو دوسرا فریق آنکھ بند کرکے اس کی تائید کردیتا اور کثرت رائے سے فیصلہ کرلیا جاتا تھا، اس طرح مسلمان ان دونوں فرقوں کی من مانی شرطوں پر مباحثہ میں شریک ہونے پر مجبور ہوگیا۔

اسی طرح آریہ سماج اور عیسائی مشنریوں کے درمیان جو خفیہ راز و نیاز چلتا تھا کبھی کبھی وہ طشت از بام ہو جاتا تھا اور دنیا دیکھ لیتی تھی کہ آریہ سماج درحقیقت انگریزی حکومت کی خفیہ تائید سے مسلمانوں کے مقابلہ میں شیر بنا ہوا ہے، حکام انتظامیہ جو مباحثوں کے امن و امان کے ذمہ دار تھے وہ آریہ سماج کی توجہ دہانی پر ان کی حسب منشاء کارروائی کر دیتے اور مسلمان فریاد کرتے تو ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی، عیسائی مشنریوں کا سیلاب جس طرح پورے ملک میں مسلمانوں کے لیے عذاب جان بنا ہوا تھا۔ اسی طرح ملک کے بہت سے حصوں میں آریہ سماجیوں کی ہرزہ سرائیاں بھی جاری تھیں، ملک کے بیشتر حصوں میں جو آریہ سماج کا وجود ہے یہ اسی زمانہ کی یادگار ہے، آریہ سماجی مقررین قرآنی آیات کو مسلمانوں کے لب و لہجہ میں اپنی تقریروں میں پڑھتے، ترجمہ کرتے اور اس پر تنقیدیں کرتے، ان کی سرگرمیاں بیسویں صدی کے شروع کی چوتھائی تک بہت زور شور سے جاری تھیں۔ ۱۹۰۳ء میں دیوریا (اتر پردیش) میں مسلمانوں اور آریوں سے بڑے پیمانے پر ایک مناظرہ کا حال ملتا ہے۔ اس مناظرہ کی روداد سے جو اسی زمانہ میں چھپ چکی ہے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ سماجیوں کے اصرار سے اس مناظرہ میں حکم اور ثالث پادری سی، سی ایچ صاحب کمشنری گورکھ پور کو بنایا گیا تھا اس مناظرہ میں آریوں کی ایک پوری ٹیم تھی جو ملک کے مختلف حصوں سے بلائے گئے تھے ان کے ممتاز اور نمایاں مقررین و مناظرین میں پنڈت ورشنا نند عرف کرپارام جگرانوی منشی گردھاری لال پنڈت للتا پرشاد واگنی ہوتری، بسنت لال جی آریہ اُپدیشک، پنڈت نند کشور جی آریہ اُپدیشک، پنڈت رودردت لال جی آریہ اُپدیشک، بابو دیبی پرشاد آریہ کے نام روداد مناظرہ میں ملتے ہیں[1]۔

ان تمام تگ و دو اور ہنگامہ آرائیوں کے باوجود کسی کو وہ اسلام سے منحرف کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے، اَن پڑھ عوام دین کے معاملہ میں یوں ہی خام رہتے ہیں، ان

---

[1] رُودادِ مناظرہ تحصیل دیوریا مرتبہ مولوی نور الحق مچھلی شہری ص ۱۰

تقریروں سے ان کی خامی کچھ اور بڑھ جاتی تھی، اس کے باوجود عیسائیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے لیے وہ ایک فتنہ ضرور بن چکے تھے اور مستقل طور پر علماء حق کی ایک جماعت اس کے لیے تیار ہوئی کہ وہ اس فتنہ کا مقابلہ کرے گی، ان کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان کے مسکت جوابات تیار کیے اور اسلام کی حقانیت کو ان کے مقابلہ میں ثابت کرنے کے لیے نئے عقلی دلائل فراہم کیے، آریہ سماجیوں کو اگر کامیابی حاصل ہوئی تو خود ہندوؤں میں ہوئی اور ان کا ایک طبقہ ہر جگہ آریہ سماج سے وابستہ ہوگیا، البتہ اس فرقہ کے تیروں کا ہدف صرف مسلمان بنا رہا، اور بیسویں صدی کی ابتداء تک ان کی سرگرمیاں جاری رہیں، ہندوستان کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد آریہ سماج نے جو جارحانہ اقدامات کیے ہم اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں پیش کریں گے۔

باب ۵

فتنہ آریہ سماج کے خلاف مورچہ بندی

یہ بڑی حیرت ناک بات ہے کہ ہندو اور مسلمان اس سرزمینِ ہند میں سات آٹھ سو برسوں سے ایک ساتھ رہتے رہے ہیں، آپس میں لڑائیاں بھی ہوئیں، معرکہ کارزار بھی گرم ہوا لیکن تاریخ کے اس پورے دور میں اسلام اور ہندو دھرم میں کبھی کوئی جنگ نہیں ہوئی نہ دونوں مذہبوں کے پرجوش وکیلوں میں مباحثہ ہوا نہ مناظرہ کا بازار گرم ہوا اور نہ کبھی قلمی جنگ چھڑی۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ مسلمان تختِ حکومت پر فائز رہا اور بغیر انقطاع سات آٹھ سو برسوں تک مطلق العنان حکمراں بن کر رہا مگر حکومت نے نہ کبھی ہندو مسلم کی تفریق کی اور نہ غیر مذہب والوں پر مذہبی بنیاد پر کوئی بے جا سختی کی یا ان کے ساتھ ناروا امتیازی سلوک کیا اور عوامی سطح پر نہ علماء اسلام نے ہندوؤں کے کسی بھی فرقہ سے بحث و مجادلہ چھیڑا اور نہ دل آزار تنقید کی۔ اس کے برعکس تاریخوں میں یہ واقعات ملتے ہیں کہ مسلمان اہلِ قلم اور مسلمان شاعروں اور ادیبوں نے ہندو دھرم کی روایتوں اور دیومالائی کہانیوں کو ان کے دل چسپ واقعات کو موضوعِ سخن بنایا، اور ان کو دل کش انداز میں پیش کیا۔ نہ ان پر تنقید کی اور نہ ان کا مذاق اڑایا بلکہ ایک گونہ ان کے جذبات کا پاس کرکے ہو بہو اسی طرح واقعات کو بیان کیا جو ہندو اپنی مذہبی روایات کی بنیاد پر بیان کرتے ہیں، بہت سے مسلمان شاعروں نے

ہندو مذہب کی بہت سی روایتوں کو شاعری کا خوب صورت لباس پہنا کر ان میں ایک طرح کی دل کشی پیدا کی، یہ کوششیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں قبولیت کے ہاتھوں لی گئیں اور دل چسپی کے ساتھ پڑھی گئیں۔

ان تاریخی حقائق کے ساتھ اس حقیقت کا بھی کھلے دل کے ساتھ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ تاریخ کے اس پورے دور میں ہندوؤں کے کسی فرقہ نے نہ کسی مذہبی رہنما نے نہ اسلام پر اعتراض کیا اور نہ اسلامی تعلیمات و روایات کو ہدف تنقید بنایا اور نہ تنگ نظری اور مذہبی منافرت پھیلا کر اسلامی اصولوں پر کوئی دل آزار تنقید و تنقیص کی، اندر اور باہر کہیں بھی اس طرح کی سرگرمیوں کا ہمیں کوئی سُراغ نہیں ملتا ہے، اس لیے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دونوں فرقوں نے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کیا اور اس سلسلہ میں انتہائی رواداری کا اصول اختیار کر رکھا تھا اور اپنی زبان یا قلم سے دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کو کوئی ذہنی اذیت پہونچانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

لیکن جب بنگال کی سرزمین سے انگریزوں کے اقبال کا سورج طلوع ہوا اور بلند ہوا اس کی روشنی دور دور تک پہونچنی شروع ہوئی تو یہی دونوں فرقے ایک دوسرے کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آنے کے لیے تیار ہو گئے اور تقریباً پون صدی تک دونوں کے درمیان معرکۂ کارزار گرم رہا۔

یہ ذہنی و فکری تبدیلی کیوں ہوئی؟:- وہی سرزمین ہے، وہی ہندو مسلمان قومیں ہیں جن میں ۱۸۵۷ء کے بعد دل آزار اور اشتعال انگیز تحریروں اور تقریروں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا، جبکہ یہاں اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے بجائے انگریز قوم کی حکمرانی ہو چکی تھی جو خود ایک مذہب کی داعی تھی اور اپنے مذہب عیسائیت کے فروغ کو حکومت کا ایک ضروری عنصر تصور کرتی تھی، اب ہندو دھرم کے نمائندوں کی دل آزار تقریر و تحریر کے تیر ستم کا ہدف اسلام اور مسلمان تھا اب اسی صلح پسند ہندو قوم کی طرف سے باقاعدہ اکھاڑے کھلنے لگے اور دنگل ہونے لگے، اسلام پر خون کھولا دینے

والے اعتراضات بھی ہوتے تھے اور مغرورانہ انداز میں مناظرہ کا چیلنج بھی، آخر ایسا کیوں ہوگیا؟ ذہنیتوں میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے پیدا ہوگئی؟

بظاہر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اندر اندر کوئی مخفی ہاتھ کام کر رہا تھا جس نے ہندو دھرم کے نمائندوں کے غور و فکر کا سانچہ ہی بدل ڈالا، صلح و آشتی کے عنصر کو غیظ و غضب اور بغض و عداوت کے قالب میں ڈھال دیا، اس راز سے پردہ اٹھانے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تاریخ کے ان دو عظیم واقعات کو پیش نظر رکھیے تو شاید آپ اس راز سے پردہ اٹھا سکیں اور حقیقت تک رسائی حاصل کر سکیں۔

پہلا حادثہ یہ ہے کہ ہندو مذہب میں ایک ایسا مصلح پیدا ہوا جس نے خود سناتن دھرم کی بنیاد پر کلہاڑی چلائی جو اس وقت تک عام ہندوؤں کا مذہب تھا اس مصلح کا نام پنڈت دیانند سرسوتی تھا جو آریہ سماج مذہب کے بانی ہیں، اس فرقہ کی مذہبی بنیادی کتاب جو پنڈت جی کی تصنیف کردہ ہے اس کا نام "ستیارتھ پرکاش" ہے جس میں اسلام اور پیغمبر اسلام ؐ اور قرآن پاک پر دل آزار لب و لہجہ میں تنقید ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ ناشائستہ اور رکیک الفاظ میں اعتراضات کیے گئے ہیں۔

دوسرا عظیم واقعہ مسلمان حلقہ میں رونما ہوا اور ٹھیک یہی زمانہ ہے جب مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنا پرچم نبوت بلند کیا اور اس پر وحی آنے لگی اور اس نے مسلمانوں میں اپنے عقائد کا زہریلا بیج بونا شروع کر دیا، یہ بھی تاریخ کا ایک حیرت ناک انکشاف ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں طبقوں میں پیدا ہونے والے یہ دونوں مصلح و پیغمبر ایک دوسرے کے مقابلہ میں سب سے پہلے اکھاڑے میں اترے، مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم نور محمد بھیروی خلیفہ مرزا اور دوسرے قادیانیوں کی بہت سی کتابیں پنڈت دیانند سرسوتی کے رد میں آپ پائیں گے، عام مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ اسلام کی طرف سے مدافعت کا حق ادا کیا جا رہا ہے لیکن وہ مدافعت اسلام کی طرف سے مخلصانہ مدافعت نہیں تھی بلکہ قادیان کو مرکز نبوت اور مہبط وحی بنانے کے لیے زمین ہموار کی جا رہی تھی مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے خلفاء نے پنڈت دیانند سرسوتی کو اولاً اپنا حریف بنایا اور اسی لب و

لہجہ میں بات کی جس لب و لہجہ میں پنڈت جی نے بات کی تھی، دنیا سمجھ رہی تھی کہ ہندو مذہب اور اسلام میں جنگ شروع ہوگئی ہے، انگریز حکومت دور کھڑی مسکراتی رہی کیوں کہ یہ کٹھ پتلیوں کا تماشا تھا اس کی ڈور خود حکومت کے ہاتھوں میں تھی جس طرح کا کرتب وہ دکھانا چاہتی تھی اس کے ہاتھ کے کرشمے سے وہ تماشا ملک کے سامنے ہونے لگتا تھا۔ یہ دونوں پودے حکومت کے خود کاشت تھے، اس کی آبیاری کے فرائض حکومت کے مخفی ہاتھوں سے انجام دیئے جارہے تھے۔ واقعات کی یہ منطقی ترتیب ہمیں ان حقائق کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے، اس لیے آیئے اور تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ پہلے چلیے کیوں کہ ان دونوں خود کاشت پودوں کی جڑیں ماضی میں ہیں برگ و بار بعد میں پیدا ہوئے۔

تبلیغ عیسائیت میں ناکامی اور پالیسی میں تبدیلی :-

انگریز ہندوستان پر قابض ہوکر مارے خوشی کے پاگل ہوگئے، اسی جوش جنوں میں انہوں نے اپنے قبضہ کو مستحکم کرنے کے لیے ہندوستان کو اُندلس کی طرح عیسائی بنانے کا منصوبہ بناڈالا اور اس پر عمل بھی شروع کردیا جس طرح حکومت کی انتظامیہ کے دفاتر ہر قابل ذکر آبادی میں ضروری تھے اسی طرح تبلیغ عیسائیت کے مرکز بھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں قائم کرکے ہزاروں ہزار تربیت یافتہ پادریوں کو اس مہم میں لگادیا لیکن وہ ہندوستانی علماء کی ذہانت و ذکاوت اور ایمانی فراست سے واقف نہیں تھے اس لیے پادریوں نے اپنی اوقات سے زیادہ لمبی لمبی باتیں شروع کردیں اور انہوں نے پہلے ہی مرحلہ پر ایک بڑا آپریشن شروع کردیا مسلمانوں کے دارالحکومت دہلی میں مسلمانوں کی عظمت کی نشانی اور جاہ و جلال کی علامت شاہ جہانی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر خالص مسلمانوں کے مجمع کو اس لب و لہجہ میں خطاب کرنا شروع کردیا، جس لب و لہجہ کو مسلمان ہندوستان میں سات آٹھ سو سال سے سننے کا روادار نہیں رہا پادریوں کی ان لن ترانیوں کو مسلمان کیسے برداشت کرتا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبرآباد میں پادریوں کی جہالت و بے علمی کا دو مسلمانوں نے پردہ فاش کردیا، مجمع عام میں ان کے سارے بلند بانگ

دعووں کے پرخچے اڑا کران کی کم علمی وجہالت کو علی رؤس الاشہاد واضح کرکے ان کے چہروں پر ناکامی وذلت کی سیاہی مل دی، اس طرح حکومت کی منصوبہ بندیوں کا تاج محل اتنے دھماکے سے گرا کہ یورپ تک اس کی آواز گئی، صرف دو مسلمانوں کے ہاتھوں انگریزی حکومت کا ہندوستان میں عیسائیت کا خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا اور وہ چمن ہی لٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی۔

اس واقعہ کے دو ڈھائی سال بعد میرٹھ میں فوجیوں کو سور اور گائے کی چربی والے کارتوس دیئے گئے جنھیں دانت سے کاٹ کر بندوق میں لگانا تھا، راز کھل گیا، ہندو مسلمان دونوں نے سمجھ لیا کہ انگریزوں کا چہرہ جتنا سفید ہے اتنا ہی ان کے سینوں میں دل سیاہ ہے وہ ہمارے مذہب کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے، یہ احساس شعلۂ جوالہ بن کر رہ گیا اور وہ بغاوت پھوٹی کہ انگریز اپنے وجود و عدم کے پل صراط پر کھڑے کر دیئے گئے لیکن ابھی قسمت اچھی تھی اور وہ یہ پل صراط پار کر گئے۔

گہری سازش :- غدر ۱۸۵۷ء ناکام ضرور ہو گیا لیکن اس نے انگریزوں کو ایک سبق دے دیا، انہوں نے یقین کر لیا کہ ہندوستان میں فروغ عیسائیت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا اور ہو سکتا ہے کہ اگر فروغ عیسائیت کی مہم کو اور آگے بڑھایا گیا تو ممکن ہے انھیں ہندوستان چھوڑ کر یورپ جانا پڑ جائے، تب انہوں نے اپنی پالیسی بدلی اور اپنا اصول بنایا "ڈیوائڈ اینڈ رول" یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو۔

انہوں نے اپنے خفیہ کارخانے میں دو ٹائم بم بنائے، ایک متھرا میں سوامی ورجانند کے گھر یلو مکتب میں اور ایک پنجاب کے شہر قادیان میں۔ ایک کا نام پنڈت دیانند سرسوتی تھا اور دوسرے کا نام مرزا غلام احمد قادیانی، یہ دونوں بم اپنے وقت پر پھوٹے۔ ہندو مسلم اتحاد کے محل میں آگ لگ گئی اور پوری فضا باہمی منافرت کے کثیف دھوئیں سے بھر گئی، دونوں حریف ہندو مسلمان اب آمنے سامنے تھے، تیسرا فریق انگریز گہرے دھوئیں میں چھپ گیا اس کے صدقے میں ایک صدی ہندوستان میں ان کی حکومت پورے جاہ و

جلال کے ساتھ چلتی رہی اور ہندوستان غلامی کی اذیت ناک بھٹی میں سلگتا رہا اور جلتا بھنتا رہا

تھیاسوفیکل سوسائٹی :- میں جس تاریخی حقیقت کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اسی سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے تو صحیح صورتِ حال واضح ہوجائے گی، انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت کی تاریخ میں ہم کو ایک ایسی نیم مذہبی تحریک کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں جس میں مذہب کا رنگ ہلکا اور سیاسی رنگ غالب نظر آتا ہے، اس نیم مذہبی تحریک کا نام "تھیاسوفیکل سوسائٹی" ہے اس کے بانی کرنل اسکاٹ ہیں جو کبھی فوج میں رہے ہوں گے اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد انہوں نے اس تحریک کی بنیاد ڈالی اور ایک مستقل تنظیم قائم کی، اس کی شاخیں یورپ اور امریکہ میں قائم ہوئیں، ہندوستان میں تو کرنل اسکاٹ بہت بعد میں ۱۸۸۰ء میں آئے جب ان کی سب سے سرگرم نمائندہ مسز اینی بسنٹ نے ہندوستان کے مختلف مرکزی شہروں میں اپنی جدوجہد اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے تھیاسوفیکل سوسائٹی کے مراکز قائم کر دیئے جس میں بنارس اور مدراس کی تھیاسوفیکل سوسائٹی سب سے مستحکم اور وسیع بنیادوں پر تھی اس تنظیم کا کوئی واضح مقصد سمجھ میں نہیں آتا، یہ بظاہر اکبر کے دین الٰہی کی طرح مختلف مذاہب کی تعلیمات کا معجون مرکب نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں تھی یہ تو اس کا ظاہری روپ تھا۔ اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اس وقت اٹھا جب بانی تحریک کرنل اسکاٹ نے یہ اعلان کیا کہ تھیاسوفیکل سوسائٹی کے عالمی سربراہ پنڈت دیانند سرسوتی مہاراج ہیں، جبکہ پنڈت جی سے اس وقت تک ہندوستان کے بہت کم لوگ واقف تھے وہ گجرات کے کسی گاؤں میں پیدا ہوئے، انہوں نے کبھی یورپ کا منہ تک نہیں دیکھا اور نہ انگریزی زبان سے واقف تھے ان کی تعلیم بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے وہ متھرا کے ایک نابینا پنڈت ورجانند کے گھریلو مکتب میں پہونچے اور ان سے سنسکرت زبان سیکھی اور پڑھی، ایسا شخص ایک عالمی مذہبی تحریک کا صدر بن جائے اور وہ لوگ سربراہ بنائیں جن کو اپنے علم، اپنی ذہانت و فراست و دانشوری پر فخر و ناز ہی نہیں غرور بھی تھا اور وہ ہندوستان کی جہالت کا مذاق اڑاتے تھے، یہ اعزاز و اکرام بلا وجہ نہیں تھا، آریہ سماج کا وجود اسی سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی ہے۔

تھیا سوفیکل سوسائٹی کی سربراہی قبول کرنے کے کچھ برسوں بعد ۱۸۷۵ء میں انہوں نے اپنی مذہبی اصولوں کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" لکھ کر اپنی اس مہم کا آغاز کیا جو بالآخر ایک مذہب کی شکل اختیار کر گئی اور وہ عام ہندو مذہب سے ہٹ کر بلکہ اس کی بنیادی تعلیم کی مخالفت پر اس مذہب کی بنیاد رکھی گئی اسی کو بعد کے دور میں آریہ سماج کا نام دیا گیا۔

کتاب میں کیا ہے؟:- "ستیارتھ پرکاش" ۱۸۷۵ء میں پہلے پہل بنارس سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ہندو مذہب پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ یہ تو ان کے اپنے گھر کا معاملہ تھا لیکن اس کتاب کا ایک باب تیر و نشتر بن کر مسلمانوں کے سینوں میں پیوست ہو گیا، کیوں کہ اس باب میں اسلام پر اس لب و لہجہ میں تنقید کی گئی ہے جو ہندوستان کی پوری تاریخ میں کبھی اختیار نہیں کیا گیا تھا، عیسائی مذہب پر بھی تنقید کی گئی ہے جو انگریزی حکومت کا مذہب تھا، جو بظاہر اس کتاب میں نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ تھیا سوفیکل سوسائٹی جس کے سربراہ پنڈت جی بنائے گئے تھے وہ انگریزوں کی قائم کردہ تنظیم تھی، کتاب کا یہ حصہ بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی انگریزی حکومت کے ساختہ پرداختہ نہیں تھے ورنہ حکومت کے مذہب پر وہ اتنی کڑی تنقید کیسے کر سکتے تھے آخر یہ کیا بات تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریز قوم ڈپلومیسی کی امام ہے وہ بساطِ سیاست پر اس طرح مہرے بٹھاتی ہے کہ کسی بھی چال پر وہ مات نہ کھائیں اگر پنڈت جی سارے مذاہب کی گردن پر اپنی چھری کی دھار کی تیزی آزماتے اور عیسوی مذہب کو نظر انداز کر جاتے جو اس وقت سب سے زیادہ موضوعِ بحث بنا ہوا تھا اور پورا ملک عیسائیت کے جبر و تشدد کی شدت سے کراہ رہا تھا تو دنیا کیا کہتی؟ اس لیے استاد نے سمجھا کہ عیسائی مذہب سے صرف نظر کر لیا گیا تو ہندوستان کا ذہین طبقہ سمجھ جائیگا کہ:-

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

غور طلب بات:- ایک بات اور غور طلب ہے کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ہندی زبان میں تھا وہ بنارس سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا تھا، اس کے

ٹائٹل پیج پر جو عبارت تھی اس میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ یہ کتاب انگریزی حکومت کی ایک قابلِ اعتماد اور خطاب یافتہ ہستی شری راجہ کرشن داس بہادر سی، ایس، آئی کے خرچ پر تصنیف کی گئی یعنی انہوں نے پیسے دے کر یہ کتاب پنڈت جی سے لکھوائی اور راجہ صاحب ہی کے سرمایہ سے اس کو شائع بھی کیا گیا، سند کے لیے راجہ صاحب بہادر کی مہر بھی کتاب پر ثبت کر دی گئی تھی۔

یہ حقیقت کتاب کی تصنیف میں کام کرنے والے جذبے سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ یہ کتاب کسی نیک مذہبی جذبے کے زیرِ اثر وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کی تہہ میں صرف یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ عیسائیت کے فروغ میں جو مسلمانوں کی طرف سے رکاوٹ ڈالی جا رہی ہے اور علماء اسلام عیسائی مشنریوں سے مباحثہ و مناظرہ کر کے مجمع عام میں ان کے وقار کو مجروح کر رہے ہیں اس کی وجہ سے پادریوں کی مہم کمزور پڑتی جا رہی ہے، مشنریوں کی ذلت و رسوائی پر جب مسلمان عوام اظہارِ مسرت کرتے ہیں تو ہندو بھی عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح پر اظہارِ مسرت کرتے ہیں جیسا کہ مباحثہ شاہ جہاں پور کے بعد کئی معزز ہندوؤں ہی نے نہیں بلکہ عام طبقہ کے ہندوؤں نے بھی مولانا قاسم نانوتوی کی کامیابی پر ان کو مبارکباد دی اور مولانا موصوف سے مل کر اظہارِ مسرت کیا، حکومت کو یہ بات پسند نہیں تھی، حکومت ہندو اور مسلمانوں کی اس جذباتی ہم آہنگی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتی تھی وہ سمجھتی تھی کہ ان دونوں بڑی قوموں میں اتنا جذباتی اتحاد خطرے سے خالی نہیں اس لیے حکومت دونوں قوموں کو اس جذباتی ہم آہنگی کی دیوار میں دراڑ پیدا کرنے کے لیے پنڈت جی کو میدان میں کھڑا کر کے "ستیارتھ پرکاش" جیسی زہر میں بجھی ہوئی تلوار تیار کرائی اور در پردہ اپنی ایک منظورِ نظر اور قابلِ اعتماد ہستی کو اس کی سرپرستی کے لیے سامنے رکھا تاکہ پوری ہندو قوم کی حمایت و تائید پنڈت جی کو اس مذہبی منافرت پھیلانے میں حاصل ہو جائے۔

ہندو مذہب پر تنقید کیوں؟

ہندو مذہب پر تنقید بھی ایک معنی رکھتی ہے بات یہ تھی کہ ہندوؤں کا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اپنے قدیم مذہب اور روایات سے باغی ہوتا جا رہا تھا بہت سے انگریزوں کی رپورٹوں میں اس کا ذکر ہے کہ ہندو

تعلیم حاصل کرکے اپنے مذہب سے بیزار ہوجاتا ہے اب یا تو وہ اسلام قبول کرلیتا ہے یا ملحد ہوجاتا ہے، ایک مدت کے بعد ہندوستان میں کوئی بھی ہندو اپنے مذہب پر قائم نہیں رہ سکتا، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اگر تعلیم یافتہ طبقہ اپنے دقیانوسی افکار وخیالات سے باغی ہوکر اگر عیسائیت قبول کرتا تو کوئی تشویش کی بات نہیں تھی اس کا رجحان اسلام کی طرف ہوجانا زیادہ خطرناک تھا اور بعد میں چل کر برطانوی حکومت کے لیے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کی دوری ومنافرت ختم ہوکر ایک دوسرے سے قریب اور یک جہتی زبردست خطرہ بن سکتی ہے اس لیے پنڈت جی کے ذریعہ ہندوؤں کی قدیم روایات کی تردید کرادی گئی اور ویدوں کے حوالے سے ثابت کیا گیا کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا کے سارے مسائل کا حل ہماری مذہبی تعلیم میں موجود ہے اور ہماری قدیم روایات ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتی ہیں اس طرح نئی نسل کے ذہن ودماغ سے احساس کمتری کو دور کرکے ہندو مذہب کی گرتی ہوئی دیوار کو تھام لینے اور انگریزی تعلیم یافتہ ہندوؤں میں اپنے مذہب پر اعتماد بحال کرنے کے لیے یہ جدوجہد یقیناً کامیاب ہوئی، اگر ہندوؤں کے بہت سے بنیادی عقیدوں کی عمارت ڈھادی گئی لیکن ہندو تو ہر حال میں ہندو رہتا ہے چاہے وہ مورتی کو پوجے چاہے مندروں کو مسمار ہی کیوں نہ کردے اس لیے قدیم ہندو دھرم سے بغاوت کے باوجود نئے مذہب آریہ سماج کے لوگ بھی ہندو ہی کہے جاتے رہے جبکہ اصولی طور پر وہ ہندو کہے جانے کے مستحق نہیں تھے کیونکہ آریہ سماج اپنے کو موحد کہتا ہے اور بت پرست کے بجائے اپنے کو بت شکن سمجھتا ہے۔

اس لیے ستیارتھ پرکاش میں ہندو روایات پر تنقید ایک مفید نتیجہ کی حامل ہوگئی جس کی افادیت بعد میں معلوم ہوئی، اسی طرح دین عیسوی اور سناتن دھرم کی تنقید براہ راست مقصد نہیں تھی بلکہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھی وہ مقصد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں میں جو جذبات وخیالات اور انگریز دشمنی اور دین عیسوی سے نفرت ودوری اور اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے میں جو اتحاد اور یک جہتی ہے اس کو ڈانامیٹ کیا جائے، پنڈت جی کی یہ کتاب "ستیارتھ پرکاش" اپنے اس مقصد میں یقینی طور پر کامیاب کتاب ثابت ہوئی جس کا انکار تاریخی حقائق کی بنیاد پر ممکن نہیں ہے۔

کتاب کی حیرتناک اشاعت :- "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت نفع ونقصان کی بنیاد پر نہیں تھی، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۷۵ء میں اور اس کے آس پاس عیسائیوں اور مسلمانوں سے اہم ترین مناظرے ہوئے جن کی شہرت پورے ملک میں ہوئی لیکن کتابت وطباعت کے اخراجات فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی مفصل رپورٹیں بھی بروقت مسلمانوں کی طرف سے شائع نہیں کی جاسکیں کیونکہ ہندوستان میں پریس ابھی اتنا عام اور سستا نہیں تھا، نہ اتنے ناشر تھے اور نہ کوئی تنظیم تھی جو ان اخراجات کو برداشت کرتی جو رپورٹوں کی طباعت پر آنے والے تھے لیکن انھیں حالات اور ماحول میں ستیارتھ پرکاش کی مسلسل اشاعت ہوتی رہی اور اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتے رہے، مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے اور فوراً شائع کیے گئے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز تک اس کتاب کی خوب اشاعت کی گئی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۱۶ء تک ایک لاکھ پینتالیس ہزار نسخے مختلف زبانوں میں اس کتاب کے شائع ہو چکے تھے، اس کی تفصیل دیتے ہوئے بتایا کہ ہندی ایڈیشن گیارہ مرتبہ، اردو ایڈیشن دس مرتبہ انگریزی ایڈیشن چار مرتبہ گورمکھی ایڈیشن چار مرتبہ اس وقت تک چھپ چکے ہیں،

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس وقت کتابوں کے سلسلہ میں قوت خرید بہت کم تھی، وہ بھی ایک مذہبی کتاب کی اتنی بڑی مانگ تصور سے باہر تھی ایک ایک ایڈیشن کتابوں کا برسوں میں ختم ہوتا تھا، اسی دور میں یہ کتاب لاکھوں کی تعداد میں عوام وخواص تک پہونچی۔ یہ حیرت ناک بات ہے جب کہ کتاب کی قیمت بھی اس کی ضخامت کے لحاظ سے زیادہ رہی ہوگی اس کے باوجود اس کے نسخے اتنی بڑی تعداد میں نکل گئے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے؟

اگر ہم یہ سوچیں کہ برطانوی حکومت کے ایک خطاب یافتہ مہاراجہ نے تصنیف کا سارا بار اٹھایا اور اس کی طباعت کے سارے اخراجات برداشت کیے اور اپنے پاس سے دیئے تو کیا یہ کسی خفیہ منصوبہ کے تحت تو ایسا نہیں ہوا؟ برطانوی حکومت ہندوستان میں اپنے انہیں مُہروں سے اپنے پورے دورِ حکومت میں کام لیتی رہی اور حکومت نواز افراد حکومت کے منصوبوں میں تعاون کرکے خوشی محسوس کرتے تھے، کیا تعجب کہ اس کتاب کے سلسلہ میں بھی اس نے

یہی طریقہ کار اختیار کیا ہو اس لیے اس کے جتنے ایڈیشن شائع ہوتے رہے اس کی اشاعت میں خرچ ہونے والی رقم دستِ غیب سے حاصل ہوتی رہی ہو۔ اور کتاب ہدیہ میں اور بلا قیمت لوگوں تک پہونچائی گئی ہو تو کیا اس میں کوئی حیرت کی بات ہے؟

اسلام کا ایک دوسرا ایڈیشن:۔ پنڈت دیانند سرسوتی تو خیر ایک نئے مذہب کے بانی تھے اس لیے انہوں نے سارے مذاہب کی گردن پر اپنے قلم کی تلوار رکھدی، سناتن دھرم تو یہاں کا قدیم مذہب تھا ان لوگوں میں جذبات کی یہ شدت و شورش کبھی نہیں رہی، دوسروں پر تنقید و تبصرہ تو وہ جانتے ہی نہیں تھے، لیکن اسی زمانے میں ایک پنڈت منشی اندرمن جو مرادآباد کے رہنے والے تھے انہوں نے بھی اسلام پر اعتراضات کے زہریلے تیر چلانے شروع کر دیئے اور کئی کتابیں اسلام کے خلاف مناظرانہ رنگ میں تصنیف کیں اور مسلمانوں کے مذہب کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالا اور بات اس حد تک دل آزار اور ناقابلِ برداشت ہوگئی کہ اخبارات نے اس کے خلاف احتجاج کیے، اداریہ لکھے، انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ یہ کتابیں ضبط کی جائیں اور پھر یہ احتجاج اتنا بڑھا کہ حکومت کو اس کی طرف توجہ کرنی پڑی، عدالت میں کیس پہونچا، مجسٹریٹ نے ان کتابوں کو انتہائی دل آزار پایا اس لیے اس نے ان کتابوں کو ضبط کرکے ضائع کرنے کا فیصلہ سنا دیا، ان کا بیچنا اور چھاپنا اور خریدنا جرم قرار دیا اور مصنف پر پانچ سو روپیہ جرمانہ بھی عائد کیا، اس لیے یہ آگ ملک میں کچھ زیادہ نہیں پھیلی، اس میدان میں صرف آریہ سماج کے لوگ ہی رہ گئے۔

اگرچہ منشی اندرمن آخر تک اسلام کے خلاف نکتہ چینی اور اعتراضات کرنے میں آریہ سماج کے لوگوں کے ساتھ ہی رہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۷۷ء میں چاندپور ضلع شاہ جہاں پور کے میلہ خدا شناسی میں وہ پنڈت دیانند سرسوتی کے پہلو بہ پہلو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ہیں اور مباحثہ کی پالیسی بنانے میں پادریوں کے ہم نوا ہیں۔

اتنی رازداری کیوں برتی گئی؟:۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کو اتنے خفیہ طریقہ پر منصوبہ بند اسکیم کے تحت ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت پھیلانے کی ضرورت کو اتنی شدت کے ساتھ کیوں محسوس کیا

کیا حکومت کو ان دونوں بڑی قوموں کے اتحاد سے کچھ اہم ترین خطرات پیدا ہو گئے تھے؟ یا حکومت کے منصوبوں کی راہ میں یہ اتحاد سنگ گراں بن رہا تھا؟ اس کے جواب کے لیے آپ کو تھوڑی دیر کے لیے مباحثہ شاہ جہاں پور کے مذہبی میلہ کی طرف چلنا ہوگا، اس راز سے پردہ وہیں اُٹھ سکتا ہے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ مباحثہ میں حصہ لینے والے عیسائی، مسلمان اور آریہ سماج کے نمائندے تھے لیکن دو دن کے اس مباحثہ میں یہ بات ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آگئی کہ یہ مباحثہ نہیں مناظرہ ہے جس میں درحقیقت دو فریق تھے۔ ایک طرف اہل اسلام تھے اور دوسری طرف مختلف مذہبی نمائندوں کا گروپ متحدہ محاذ بنا کر موجود تھا جس میں عیسائی، آریہ اور سناتن دھرم شامل تھے، اس کے باوجود ان دو دنوں کے مناظرہ میں علماء اسلام نے پادریوں کی زبان بند کر دی اور فرار کی کوئی راہ نہیں چھوڑی، مجمع عام نے ان کی شکست کو کھلے عام دیکھا اور وہ اسٹیج چھوڑ کر قبل از وقت جلسہ گاہ سے فرار ہو گئے اور مسلمان فتح کا پرچم لہراتے ہوئے میدان جنگ سے واپس ہوئے۔ قدرتی طور پر اس کامیابی پر تنہا مسلمانوں کی طرف سے اظہار مسرت ہونا چاہیئے تھا لیکن آپ جب اس مباحثہ کی روداد پڑھیں گے تو آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندوؤں نے اظہار مسرت کیا، عیسائیوں کی عبرت ناک شکست سے ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، میلہ خدا شناسی کی مطبوعہ رپورٹ میں ایک مقام پر ہے :-

"باہر آتے ہی مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا، ہندو اور مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے۔ مسلمانوں کی جو اس وقت کیفیت تھی سو تھی، مگر ہنود بھی بہت خوش تھے آپس میں کہتے تھے کہ نیلی لنگی والے مولوی نے پادریوں کو خوب مات دی"[1]

اسی روداد مباحثہ میں ایک جگہ عوام کی آپسی گفتگو کو نقل کرتے ہوئے یہ تحریر کیا گیا ہے

---

[1] مباحثہ شاہ جہاں پور ص ۱۴۱

"عوام بھی کہتے تھے کہ پادری صاحب ہم کو ہی دھکاتے تھے اب تو کچھ بولیئے"[1]

دوسرے مقام پر بھی رپورٹ مرتب کرنے والے نے لکھا ہے کہ جملہ ہنود خوش تھے، اور وہ اپنی خوشی کا اظہار پادریوں پر جملے کس کس کر کرتے تھے۔ مطبوعہ رپورٹ کے چند اقتباسات اور دیکھیے جن سے پادریوں کی شکست اور مسلمانوں کی فتح پر ہندوؤں کی مسرت کا اظہار ہوتا ہے، رپورٹ میں ایک جگہ ہے:۔

"مولوی محمد قاسم صاحب جب مجلس مباحثہ سے واپس ہو رہے تھے تو ہندو عوام مناظرین اسلام کی طرف اشارہ کر کے اوروں کو بتاتے تھے کہ یہ ہیں" یعنی وہ لوگ جنہوں نے پادریوں کو بھرے مجمع میں شکست فاش دی ہے[2]

جب مولانا نانوتوی اور ان کے رفقاء واپسی پر شہر شاہ جہاں پور میں آئے تو رپورٹ مرتب کرنے والے بزرگ ہمیں بتاتے ہیں کہ:۔

"بازاروں میں مولوی صاحب اور ان کے رفقاء کو نکلنے کا اتفاق ہوا تو بازار کے ہندو دوکانداروں کی بھی انگلیاں اٹھتی تھیں، عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح کی خبر دور دور تک پھیل گئی اور مسلمانوں سے زیادہ مزے لے لے کر بیان کرتے تھے"[3]

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات تھے ان سے ایک اچھے صاحب ذوق ہندو لیکھراج کی ملاقات ہوئی جو میلے کے بانی منشی پیارے لال کے خاص دوستوں میں سے تھے، میلے میں وہ بھی شریک ہوئے تھے انہیں شری لیکھراج نے مولانا ذوالفقار صاحب سے مباحثہ کی روداد بیان کرتے ہوئے بتایا کہ:۔

"ایک مولوی قاسم علی (حضرت نانوتوی) نام اسی طرف کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجئے، ان کے دل پر تو علم کی دیوی سرستی بول رہی تھی"[4]

---

[1] حوالہ مذکور ص ۱۴ [2] مباحثہ شاہ جہاں پور ص ۸۸ [3] و [4] مباحثہ شاہ جہاں پور مرتبہ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی ص ۸۸

غرضیکہ مباحثہ شاہ جہاں پور میں خلاف اُمید پادریوں کو اس روح فرسا منظر کا سامنا کرنا پڑا جو ان کے حاکمانہ غرور کے قطعاً خلاف تھا، وہ ہندوؤں کو اپنا ہم نوا اور ہم خیال سمجھتے تھے اور وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہندو مسلمانوں کی صفوں میں کھڑے ہو گئے اور ان کی شکست پر فتح کے شادیانے بجا رہے ہیں۔

یہی وہ تلخ تجربہ تھا جس نے حکومت کو اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور کیا اور مسلمانوں کو میدانِ مناظرہ میں شکست دینے کا خواب دیکھنا بند کیا اور ان دونوں بڑی قوموں کے جذباتی دھارے کو دو سمتوں میں موڑ دینے کا تہیہ کر لیا خود کرنل اسکاٹ نے تھیا سوفیکل سوسائٹی کا عالمی صدر پنڈت دیانند سرسوتی کو بنایا اور اپنے ایک قابلِ اعتماد مہاراجہ سے رقم دلوا کر ستیارتھ پرکاش لکھوائی اور انھیں مہاراجہ صاحب کے سرمایہ سے اس کتاب کو چھپوا کر ملک میں ہر طرف پھیلایا۔ اس کتاب سے جس طرح کی توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ ایک حد تک پوری ہو گئیں

اتحاد کی روایت ٹوٹ گئی:- بہر حال جب گھر میں آگ لگا دی جائے گی تو گھر کو جلنا ہی ہے چاہے وہ آگ دوستی میں لگائی گئی ہو یا دشمنی میں، اپنی خوشی و مرضی سے لگائی گئی ہو یا کسی جبر اور لالچ سے آگ کا کام جلانا ہے وہ اپنا کام کرے گی، ہندو مسلم اتحاد و رواداری کا تاج محل دھواں دینے لگا، ملک میں ہر طرف آریہ سماجیوں کے محاذ بننے لگے، سناتن دھرم والے جو اس طرح کے ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہے۔ اب ان میں بھی نئی زندگی آئی اور ہر طرف سے اسلام پر وار ہونے لگا حالانکہ ہندوؤں کے یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن اسلام دشمنی میں دونوں ایک محاذ پر تھے منشی اندرمن جو مراد آباد کے رہنے والے تھے انہوں نے اسلام پر اعتراضات کرنے کے لیے کئی کتابیں اور رسالے لکھے اور شائع کیے۔ ہر فرعونے را موسیٰ، قدرت نے اسی ضلع مراد آباد کے ایک قصبہ بچھراؤں میں مولانا محمد علی صاحب کو پیدا کر دیا جو حضرت نانوتوی کے ساتھ میلہ خدا شناسی میں شریک تھے انہوں نے منشی اندرمن کی زبان بند کر دی اور پھر عدالت نے ان کی دل آزار تحریر کو فرقہ ورانہ منافرت پھیلانے کے جرم میں ضبط کر لیا اور منشی جی نے جرمانہ عائد کر کے ان کے حوصلے پست کر دیئے اس طرح یہ

فتنہ اپنے منبع و مخرج ہی میں گھٹ کر اپنی موت آپ مر گیا اور پھر یہ فتنہ عام مسلمانوں کے لیے اتنا صبر آزما بھی نہیں تھا کیوں کہ ہندو مذہب تبلیغی مذہب نہیں ہے بلکہ نسلی مذہب ہے کوئی بھی غیر ہندو اپنا مذہب بدل کر ہندو نہیں ہو سکتا، بخلاف آریوں کے، وہ غیر ہندوؤں کو ہندو بنانے پر یقین رکھتے تھے اور بعد کے دور میں بڑے بڑے فتنے اس کی وجہ سے کھڑے ہوئے اور ہندوستان میں شدھی سنگھٹن تحریک ایک زلزلہ افگن تحریک ثابت ہوئی، تفصیل آگے آرہی ہے۔

آریہ سماج کا فتنہ درحقیقت اس کی بنیاد اسلام دشمنی پر تھی اس لیے اس کی ضرر رسانی کا دائرہ بہت وسیع تھا، بدقسمتی سے آریہ سماج کی پشت پر حکومت کا ہاتھ تھا جس کی وجہ سے ملک کے رؤسا اور جاگیرداروں کا ان کو تعاون حاصل تھا اس لیے اس کی زندگی دراز ہو گئی اور ملک کی آزادی سے پہلے اور بعد میں اس نے بڑی تباہیاں مچائیں۔

ہم جواب کے لیے مجبور تھے:۔ پنڈت دیانند سرسوتی کی مذہبی سرگرمیوں اور ان کے ناروا رویہ سے مسلمان چشم پوشی کر جاتے جیسا کہ اب تک اپنے پورے دورِ حکومت میں کبھی بھی یہاں کے باشندوں سے ان کے مذہب کے خلاف گفتگو نہیں کی، ان کو ہمیشہ اپنے تمام مذہبی و تہذیبی مراسم و امور کی ادائیگی میں آزادی حاصل تھی اور کبھی ان سے اس سلسلہ میں کوئی تعرض نہیں کیا گیا مسلمان اس روایت کو برقرار رکھتے اور اپنی طرف سے دل آزاری کا جواب نہیں دیتے لیکن پنڈت جی نے جب ستیارتھ پرکاش میں اسلام اور پیغمبر اسلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں ناشائستہ الفاظ استعمال کیے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انتہائی گندی باتیں کہیں اور سب و شتم سے کام لیا، قرآن پاک پر ناپاک حملے کیے یہاں تک کہ مسلمانوں کو دنیا کا سب سے بڑا بت پرست کہا اور لکھا کہ:۔

"خدا اور مسلمان بڑے بت پرست اور پورانی اور جینی ہندو چھوٹے بت پرست ہیں"

تب مسلمانوں کے لیے یہ رویہ ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس فتنہ کے استیصال کی طرف

توجہ کی اور ان کا ہمیشہ سے جو تاریخی کردار رہا کہ وہ اسلام کی طرف سے مدافعت میں ہر مساعد و نامساعد حالات میں سینہ سپر رہے اور اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ اس سرزمین میں باقی رکھا اس موقعہ پر بھی انہوں نے اپنے اس فرض کی ادائگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب یہاں کے غیر مسلموں نے اپنی قدیم روش ترک کردی اور انگریزی حکومت کے اشارے سے بدزبانیوں پر اُتر آئے تو مسلمانوں کو بھی اس کا جواب ترکی بہ ترکی دینا فرض ہو گیا

عملی جدوجہد شروع کردی گئی:- اتفاق سے "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت ۱۸۷۵ء کے دو سال بعد پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن دونوں حریف بن کر مباحثہ شاہ جہاں پور میں مسلمانوں کے مخالف کیمپ میں کھڑے ہو گئے تو حضرت نانوتوی نے اپنے دوسرے رفقاء کو آمادہ کیا کہ اسی سفر میں ان دونوں مذہبوں کے نمائندوں سے فیصلہ کن مباحثہ ہو جائے۔

جب یہ حضرات سربانگ پور دریائے گرا کے ساحل سے جہاں پادریوں سے مباحثہ ہوا تھا چل کر چاند پور آئے تو یہیں سے سلسلہ جنبانی شروع کردی گئی ان کو مناظرہ کی دعوت دی گئی، بعد میں خط لکھا گیا ان کو تمام سہولتیں فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی مگر اصرار کے باوجود ان دونوں میں کوئی شاہ جہاں پور میں ٹھہرنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور طرح طرح کے بہانے کیے اور کسی قیمت پر مناظرہ کے لیے تیار نہیں ہوئے

پانی سر سے اونچا ہوتا چلا گیا:- ستیارتھ پرکاش کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد علماء کو اس کے مندرجات سے کوئی واقفیت نہیں ہو سکی کیونکہ وہ ٹھیٹ ہندی میں تھی لیکن جب پنڈت جی شاہ جہاں پور سے لوٹے اور انہوں نے میرٹھ اور ضلع سہارن پور کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور سال کا بیشتر حصہ وہ انھیں ضلعوں میں رہے، وہ اپنے حلقے میں زہر آلود تقریریں کرتے رہے اور اسلام پر اشتعال انگیز الزامات لگاتے رہے اور اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرتے رہے۔ قرآن پاک اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر رکیک اور ناپاک حملے کرتے رہے، یہی وہ زمانہ ہے جب کرنل اسکاٹ جو تھیاسوفیکل سوسائٹی کے بانی تھے یورپ سے چل کر ہندوستان آئے تھے اور انہوں

نے پنڈت جی سے میرٹھ میں ملاقات کی تھی۔

مسلمانوں میں پنڈت جی کی تقریروں سے اشتعال پیدا ہوتا رہا۔ یہ اشتعال اس وقت اور بڑھ گیا جب رڑکی ضلع سہارنپور میں اپنا اڈا بنایا، جتنے گندے اور بازاری الفاظ تیز و تند باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہی تھیں جتنی دل آزار باتیں خود ہندوؤں کے دوسرے فرقوں کے سلسلہ میں تحریر کی تھیں وہی باتیں اسی لب و لہجہ میں وہ رڑکی کے بازاروں اور عام جلسوں میں بیان کرتے تھے اور جب کوئی مقامی عالم ان کو ٹوکتا تھا تو پوری رعونت کے ساتھ فرماتے تھے کہ میں تمہارے جیسے لوگوں سے بات کرنے میں اپنی توہین سمجھتا ہوں، اپنے کسی بڑے عالم کو بلاؤ تو میں اس سے باتیں کرسکتا ہوں۔

حضرت نانوتوی کو دعوت نامہ:۔ مباحثہ شاہ جہاں پور کے بعد حضرت نانوتوی سفر حج میں تشریف لے گئے، واپسی میں علیل ہوگئے اور صورت حال تشویش ناک ہوگئی، لوگ زندگی سے مایوس ہوگئے لیکن قدرت کو ابھی ان سے اپنے دین کا اور کام لینا تھا اس لیے بتدریج صحت لوٹنے لگی لیکن ابھی کلی طور پر صحت یاب نہیں ہوئے تھے کہ پنڈت دیانند سرسوتی کی اشتعال انگیزیوں کی خبریں رڑکی ضلع سہارنپور سے مسلسل آنے لگیں، اور رڑکی کے مسلمانوں کی طرف سے مسلسل خطوط موصول ہونے لگے، تب آپ نے پنڈت جی کی ہفوات کو روکنے اور ان کی زبان بند کرنے کے لیے ضروری سمجھا کہ اپنے کچھ شاگردوں کو رڑکی بھیج دیں اور ان سے بالمشافہہ مل کر ان کے اعتراضات سن کر وہیں جوابات دے دیں، ورنہ مجمع عام میں ان کے سارے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات دے دیں اور ہو سکے تو پنڈت جی کو چیلنج دے دیں کہ اگر اسلام پر اعتراض کرنا ہے تو وہ عوامی اسٹیج پر آئیں۔

علماء حق کا گروہ رڑکی میں:۔ رڑکی میں انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی اور آج تک اس کی یہ خصوصیت باقی ہے، ۱۸۵۷ء میں تو رڑکی کے فوجی حدود میں گذرنا بھی مشکل تھا۔ انگریزی حکومت کا رعب داب اور جاہ و جلال شباب پر تھا چھاؤنیوں کے قوانین اور پابندیاں عام سول آبادی سے علٰحدہ تھیں،

شہر کی آبادی علٰحدہ تھی اور کینٹ کا علاقہ شہر سے ڈیڑھ میل دُور تھا، پنڈت جی اپنے بھاشن تو شہری علاقے میں کرتے تھے اور قیام کرتے تھے فوجی ایریا میں، اس میں کیا راز تھا؟ اس راز سے کون پردہ اٹھائے؟ رڑکی میں اہلِ علم ضرور تھے اور انہوں نے پنڈت جی کو ٹوکا بھی، ان کے جلسوں میں اعتراضات بھی کیے تھے بالمشافہہ مل کر گفتگو بھی کرنی چاہی اور ان کو اعتراضات بھی لکھ کر دیئے لیکن ان سب کو نہایت شانِ بے اعتنائی سے ٹال گئے جیسا کہ روداد کے مرتب ہم کو بتاتے ہیں:۔

"اہلِ اسلام رڑکی نے پنڈت جی کی زبان درازی کی اطلاع حضرت نانوتوی کو دی، اور یہ بھی لکھا کہ پنڈت جی فلسفیانہ اعتراضات ہر روز سرِ بازار کرتے ہیں اول تو یہاں کوئی اہلِ علم ایسا نہیں جو فلسفیانہ گفتگو کر سکے اور اگر کبھی کوئی طالب علم یا کوئی فارسی خواں پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب میں کچھ جرأت کرتا ہے تو پنڈت جی اور ان کے معتقد اس کو خاطر میں نہیں لاتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم جاہلوں اور بازاریوں سے گفتگو نہیں کرتے، اپنے مذہب کے کسی بڑے عالم کو بلاؤ، ہم اس سے گفتگو کرینگے"[1]

یہ بات ان خطوط کی بنیاد پر لکھی گئی ہے جو رڑکی سے حضرت نانوتوی کے نام مسلسل آرہے تھے حضرت نانوتوی نے اپنی خرابی صحت کے پیشِ نظر یہ طے کیا کہ اپنے شاگردوں میں سے یا دارالعلوم کے اساتذہ میں سے چند کو رڑکی بھیج دیں لیکن بعد کے خطوط میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ نام لے کر کہتے ہیں کہ وہ صرف مولانا محمد قاسم صاحب ہی سے گفتگو کر سکتے ہیں اور کسی سے نہیں۔ اِدھر حضرت نانوتوی کی صحت سفر کی قطعاً اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس لیے اہلِ رڑکی کے اصرار پر آپ نے دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی اور مولانا حافظ عبدالعدل صاحب کو رڑکی کے لیے طے کیا۔

---

[1] انتصار الاسلام از حضرت نانوتوی ص ۶

حسب الحکم یہ حضرات رُڑکی کے لیے روانہ ہوگئے اور راستہ میں جوالاپور سے مولانا منظور احمد صاحب کو ساتھ لے لیا جو حضرت نانوتوی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، یہ حضرات دیوبند سے پاپیادہ رڑکی کے لیے روانہ ہوئے اور تمام شب چل کر صبح سویرے رڑکی پہونچ گئے، ان حضرات نے رڑکی کے چند معزز مسلمانوں کو ہمراہ لیا اور کینٹ کے علاقے میں پنڈت جی کی قیامگاہ پر پہونچ گئے جہاں وہ ہفتوں سے قیام پذیر تھے، رڑکی کے مقامی حضرات نے پنڈت جی سے کہا کہ یہ چاروں علماء کرام آپ کے پاس آگئے ہیں۔ آپ کے جتنے اعتراضات ہیں ان کو پیش کیجئے یہ لوگ آپ کے تمام اعتراضات کے جوابات دینے کے لیے تیار ہیں، اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ ہٹ دھرمی اور بے جا ضد کے سوا اور کچھ نہیں تھا انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کی باتیں نہیں سُن سکتا نہ مجھے سننے کی فرصت ہے اور نہ میں گفتگو کا آرزومند ہوں اور نہ میں نے اشتہار میں مباحثہ کا چیلنج کیا ہے، کسی نے میری مرضی کے بغیر اگر کوئی اشتہار کر دیا ہو تو میں اس کا ذمہ دار نہیں، ان حضرات نے پھر اصرار کیا کہ آپ اپنے اعتراضات ہی دُہرادیں تاکہ ہم ان کا جواب آپ کے سامنے پیش کردیں مگر پنڈت جی کی طرف سے سوائے انکار کے اور کوئی لفظ زبان سے نہیں نکلا، عاجز ہوکر ان حضرات نے ان سے دریافت کیا کہ آپ مولانا محمد قاسم صاحب کو مباحثہ کا چیلنج کرتے ہیں تو کیا آپ ان سے مباحثہ کے لیے تیار ہیں؟ یا اُن سے بھی..... انکار کردیں گے؟ اس کے جواب میں پنڈت جی نے کہا کہ میں اُن سے بھی مناظرہ کرنے کا متقاضی نہیں ہوں لیکن مولانا ممدوح آجائیں گے تو میں اُن سے مباحثہ کے لیے آمادہ ہوں، باقی اور کسی سے بھی میں ہرگز مباحثہ نہیں کروں گا۔

حضرت نانوتوی کا سفر رُڑکی:۔ یہ حضرات اتمامِ حجت کرکے دیوبند واپس آگئے، اس کے بعد اہل رڑکی کے پھر مسلسل خطوط آنے لگے کہ پنڈت جی کی شہر میں پھر وہی لن ترانیاں شروع ہوگئی ہیں، وہی دل آزار تقریریں، پیغمبر اسلام اور قرآن پاک سے متعلق اہانت آمیز بیانات کا سلسلہ جاری کردیا ہے اور جب ہم ان سے وقت اور تاریخ کی تعیین کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ اس کے جواب

میں کہتے ہیں کہ مولانا نانوتوی جب آئیں گے تو وہی تاریخ مقرر کریں گے، میں آپ لوگوں سے اس سلسلہ میں کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہیں۔

جب صورتِ حال یہ بن گئی تو حضرت نانوتوی نے مجبوراً باوجود علالت کے عزمِ سفر کرلیا اپنے احباب اور تلامذہ میں سے مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی، مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند)، مولانا حافظ عبدالعدل صاحب اور مولانا منظور احمد صاحب جوالاپوری، حاجی محمد عابد صاحب، حکیم مشتاق احمد صاحب کو ہمراہ لے کر شب میں سفر کرکے علی الصباح رڑکی پہونچے۔

حضرت نانوتویؒ کی آمد کا شہرہ:- مباحثہ شاہ جہاں پور میں دو سال شرکت اور معرکۃ الآراء تقریروں نے آپ کی شہرت کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچا دیا تھا، فرقِ باطلہ کے مقابلہ، مباحثہ ومناظرہ کے سلسلہ میں پورے ملک میں صرف ایک ہی نام اس دور میں گونج رہا تھا اور وہ نام تھا حضرت نانوتوی کا، عیسائی پادری آپ کے نام سے کانپتے تھے۔ آریہ سماجی ان کا سامنا کرتے ہوئے تھراتے تھے اور اس کے برعکس مسلمانوں کے چہروں پر آپ کی آمد سے سرخی دوڑ جاتی تھی، بحرِ جذبات میں تموّج پیدا ہوجاتا تھا، حوصلے بلند ہوجاتے تھے اور ولولے پیش قدمی کرنے کے لیے مہمیز کرنے لگتے تھے اور اعلان کرتے کہ جس کو ذلت ورسوائی برداشت کرنے کا حوصلہ ہو سامنے آئے۔

حضرت نانوتوی کے رڑکی پہونچتے ہی پورے شہر کے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور لوگ ہر سمت سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے اس طرح آپ کے پاس ایک جمِ غفیر جمع ہوگیا، آپ شہری علاقے میں قیام پذیر تھے اور پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج ومصنف "ستیارتھ پرکاش" وہاں سے ڈیڑھ میل دور فوجی حدود میں براجمان تھے، آپ (حضرت نانوتوی) نے فوراً ایک تحریر لکھی کہ میں آگیا ہوں، وقت متعین کرکے فوراً اطلاع دیجئے، اور جو بھی شرائط ہوں اور جس موضوع پر بھی مناظرہ منظور ہو وہ سب ہم کو تسلیم ہے، ہماری طرف سے کوئی شرط اور پابندی

نہیں، میں یہاں انتظار کر رہا ہوں

.....یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟:۔ پنڈت جی فضول اور لایعنی باتوں پر ضدیں کرتے رہے اور میدانِ مناظرہ میں نہ آنے کے لیے بہانے تراشتے رہے۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ حضرت نانوتوی پنڈت جی کے نام تقاضے کی تحریریں بھیجتے رہے اور ان کو تمام سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ کرتے رہے اور ان کو ہر طرح کی آزادی دینے کا بھی اظہار کرتے رہے، کبھی کبھی دن میں کئی بار حضرت نانوتوی کے آدمی تحریریں لے کر پنڈت جی کے پاس جاتے اور ناکام واپس آتے، وہ کسی بات پر راضی نہیں ہوتے، آخر میں وہ ان تحریروں سے گھبرا گئے اور مسلمان قاصد سے کہا کہ اب ہمارے پاس کوئی تحریر نہ آئے، ہم لوگ دن بھر پڑھتے پڑھتے اور سمجھتے سمجھتے تھک جاتے ہیں۔ اور ہمارے سارے کام ان تحریروں کی وجہ سے رُک گئے ہیں۔

بالمشافہہ گفتگو:۔ حضرت نانوتوی کی علمی شہرت سن کر چھاؤنی کے ایک انگریز کرنل نے آپ سے ملنا چاہا اور اپنے پیش کار کو بھیج کر اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دی حضرت نانوتوی بلا تکلف اس لیے چلے گئے کہ شاید اسی ذریعے سے پنڈت جی سے مباحثہ کا موقعہ نکل آئے۔ اس نے چند مسائل پوچھے۔ آپ کے عالمانہ جواب سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے آپ سے رڑکی تشریف آوری کی وجہ پوچھی تو آپ نے تمام صورتِ حال بیان کی۔ اس نے اپنا آدمی بھیج کر پنڈت جی کو بلوایا۔ جب وہ آئے تو کرنل نے دریافت کیا کہ آپ مولوی صاحب سے گفتگو کیوں نہیں کر لیتے؟ مجمع عام میں جب آپ تقریریں کر لیتے ہیں تو مجمع عام میں گفتگو اور مباحثہ بھی ہو سکتا ہے، پنڈت جی نے کہا کہ مجمع عام میں فساد کا اندیشہ ہے۔ اس وقت شہری علاقہ کا کپتان کرنل کے بنگلے پر اسی مجلس میں موجود تھا، اس نے کہا کہ ہم ذمہ داری لیتے ہیں۔ کوئی فساد نہ ہونے دیں گے، لیکن اس کے باوجود پنڈت جی بضد رہے کہ ہم اپنی قیام گاہ کے علاوہ اور کہیں گفتگو نہیں کر سکتے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہاں کوئی مجمع نہ ہو۔

حضرت نانوتوی نے دیکھا کہ پنڈت جی بہانے بنا کر نکل جانا چاہتے ہیں تو آپ نے براہ راست

پنڈت جی سے فرمایا کہ یہاں تو صرف بارہ افراد ہیں، یہیں ہماری اور آپ کی گفتگو ہو جائے، آپ اعتراض پیش کریں ہم ان کے جوابات دیں گے، پھر ہم آپ کے مذہب پر اعتراضات پیش کرینگے آپ ان کے جوابات دیں گے، نہ تاریخ مقرر کرنے کی ضرورت نہ وقت متعین کرنے کی حاجت، نہ اعلانِ عام ہے نہ مجمع عوام بات شروع کر دیجئے لیکن جس طرح کسی جانور کو پانی پینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ پنڈت جی کے حلق سے نیچے بات اتاری نہیں جا سکی، پنڈت جی کسی بات پر راضی نہیں ہوئے اور کہا کہ میں مباحثہ کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ ارادہ تو فعلِ اختیاری ہے آپ اب ارادہ کر لیجئے۔ لیکن پنڈت جی کی طرف سے ہر بات پر نہیں نہیں کا سلسلہ جاری رہا اور دامن چھڑا کر اپنی قیام گاہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

اتمامِ حجّت :۔ حضرت نانوتوی کی منشاء یہ تھی کہ مجمع عام میں پنڈت جی کے سوالات کے جوابات کے ساتھ ان کے ایجاد کردہ مذہب کے تار و پود بکھیر دیئے جائیں تاکہ اسلام کے خلاف ان کی زبان پر مہرِ خموشی لگا دی جائے اور اسی کے ساتھ مجمع عام میں ان کے مبلغ علم کا راز فاش کر دیا جائے اور ان کی لن ترانیوں کے کھوکھلے پن کو عوام کے سامنے روزِ روشن کی طرح ظاہر کر دیا جائے تاکہ آئندہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخانہ انداز بیان اختیار کرنا بند کر دیں اور جب تک عوام پنڈت جی کی کم علمی اور جاہلانہ تعلّی اور خود نمائی کو نہیں سمجھیں گے تب تک ان کی زبان درازیاں جاری رہیں گی، اگر ان کی جہالت کا پردہ مجمع عام میں چاک کر دیا جائے تو پھر مسلمانوں کے درمیان ان کو لفاظی اور طلاقت لسانی کے مظاہرہ کی ہمت نہیں ہوگی۔ لیکن پنڈت جی کسی قیمت پر کھلے میدان میں بحث و مباحثہ کے لیے تیار نہیں ہوئے، کرنل کے بنگلے سے بھی جب وہ دامن جھٹک کر نکل گئے تو اب ان کا ہاتھ آنا مشکل ہو گیا اس لیے حضرت نانوتوی نے اتمامِ حجّت کے لیے دوسرے دن پھر چند آدمیوں کو ان کی قیامگاہ پر یہ تحریر دے کر بھیجا:۔

"آپ مجھ سے کسی جگہ مباحثہ کر لیں، برسرِ بازار کر لیں، عوام میں کر لیں، خواص میں کر لیں، تنہائی میں کر لیں مگر مباحثہ کر لیں۔

اس تحریر کے جواب میں پنڈت جی نے اپنی قیام گاہ پر دو سو کے مجمع میں جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہوں گے مباحثہ کے لیے آمادگی کا اظہار کیا۔ مسلمان نمائندے مطمئن ہوکر واپس آئے اور حضرت نانوتوی کو خوش خبری دی کہ مباحثہ طے ہوگیا اور دو سو معین کی موجودگی پر پنڈت جی رضامند ہیں۔

حضرت نانوتوی اپنے کچھ رفقاء کو لے کر پنڈت جی کی قیام گاہ کی طرف چلے تو بذریعہ پولیس یہ حکم پہونچا کہ فوجی حدود میں کوئی مذہبی گفتگو یا بحث و مباحثہ یا مناظرہ نہیں ہوسکتا، اس لیے آپ لوگ فوجی حدود میں قدم نہ رکھیں۔

یہ حکم کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ چند گھنٹوں میں ایک غیر متوقع حکم کس ریشہ دوانی کا نتیجہ ہے؟ جبکہ کرنل کی کوٹھی پر بہت سے افراد کی موجودگی میں کرنل نے خود پنڈت جی سے حضرت نانوتوی سے گفتگو کرنے کے لیے کہا اور وہیں پولیس کا ایک بڑا افسر بھی موجود تھا مگر کسی کی زبان سے یہ نہیں نکلا کہ فوجی حدود میں مذہبی گفتگو یا مباحثہ ممنوع ہے۔ یہ راز راز ہی رہ گیا، اس سے پردہ اٹھانے والا کوئی ہاتھ نظر نہیں آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت نانوتوی نے رختِ سفر کھول دیا اور پنڈت جی کے داؤ پیچ کے قائل ہوگئے، وعدہ کرلو اور ایفاء وعدہ کے درمیان قانون کی آہنی دیوار کھڑی کردو۔ آپ نے پنڈت جی کے پاس چند آدمیوں کو بھیجا کہ وہ پنڈت جی کو مطلع کردیں کہ حکام مسلمانوں کو فوجی حدود میں آنے سے مانع ہیں اس لیے شہر میں، جنگل میں، میدان میں جہاں کہیں بھی آپ چاہیں گفتگو کرلیں، نہر کے کنارے والے میدان میں یا عیدگاہ کے قریب کھلی جگہ پر یا اور جہاں جی چاہے فوجی حدود سے نکل کر آجائیے امن و امان کی ذمہ داری ہماری ہے، مگر ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

پنڈت جی نے دیکھا کہ یہ مصیبت میرے سر سے کسی قیمت پر ٹلنے والی نظر نہیں آتی لاکھ بہانے بناؤ مگر کسی طرح دامن چھوڑنے پر راضی نہیں تو انہوں نے نجات کی دوسری صورتیں سوچنی شروع کردیں اور فرار کی راہیں تلاش کرنے لگے۔

کھلے اجلاس میں جواب دیا جائے :- پنڈت جی نے مسلسل کئی دنوں تک بازاروں میں عام جلسوں میں اسلام

پر اعتراضات کیے تھے اور اہانت آمیز طریقے سے کیے تھے، لوگوں کے دل زخمی تھے اس لیے حضرت نانوتوی نے یہ ضروری سمجھا کہ اگر مجمع عام میں مباحثہ نہ ہو سکا تو کم از کم عوام کے سامنے ان تمام لغو اعتراضات اور جھوٹے اتہامات کی حقیقت کھول دی جائے اور ان کے مسکت جوابات بیان کر دیئے جائیں اور اسی کے ساتھ اس نو ایجاد مذہب کی قلعی بھی کھول دی جائے جسے آریہ سماج کہا جاتا ہے اور پنڈت جی کے علم و تحقیق اور ان کی قابلیت کا صحیح اندازہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے اس لیے آپ نے اپنے تلامذہ سے جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے فرمایا کہ آپ حضرات جلسۂ عام کریں اور شاہراہِ عام پر اجتماعات کریں اور ایک ایک اعتراض کا جواب مفصل بیان کریں اور آریہ سماج کے تمام عقائد کھول کھول کر بیان کریں، اس سفر میں حضرت نانوتوی کے ساتھ دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے[1] اور حضرت مولانا

---

[1] مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی علم و فضل میں بے مثال تھے اور زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ آپ کو سیاسی بصیرت اور تدبر و فراست میں درجۂ کمال تھا۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں اپنے دور کے محدث اور استاذ العلماء اور اسلامی ہند کی سیاسی تاریخ میں قائد ملک و ملت اور زعیم وطن کے بلند منصب پر فائز، ملک نے جہاد آزادی میں آپ کی عظیم خدمات کے پیش نظر آپ کے سر پر "شیخ الہند" کے لقب کا سہرا تاج رکھ دیا تھا۔ آپ کی ولادت دیوبند میں ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ والد محترم کا نام مولانا ذوالفقار علی ہے جو تعلیمات کے ڈپٹی انسپکٹر تھے۔ تعلیم مولانا سید احمد دہلوی اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ابن مولانا مملوک علی اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور بعض دوسرے علماء سے حاصل کی۔ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں دار العلوم دیوبند میں استاد مقرر ہوئے مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ مجاز تھے، سفر حج کے دوران حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی سے بھی استفاضہ کیا، عیسائیوں سے مشہور مناظرہ کرنے والے مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مشہور محدث شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی سے اوائل حدیث سنا کر سند اجازت حاصل کی۔ مولانا یعقوب نانوتویؒ کے انتقال اور مولانا سید احمد صاحب کے بھوپال چلے جانے کے بعد آپ دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بنا دیئے گئے اور زندگی کے اخیر لمحہ تک اس منصب عظیم پر فائز رہے۔ آپ کے تلامذہ میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (باقی بر صفحہ آئندہ)

فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا حافظ عبد العدل صاحب اور مولانا منظور احمد صاحب جوالاپوری تھے، یہ تمام حضرات علم و فضل میں منتخب روزگار رکھتے اور اپنا اپنا ایک بلند مقام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری جیسے اساطینِ امت شامل ہیں، جہادِ آزادی کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کی ایک لمبی تاریخ ہے اور آپ کی تحریک پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں آپ اسلامی حکومتوں کے تعاون سے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے لیکن راز افشاء ہو جانے کی وجہ سے مکہ میں گرفتار ہو گئے اور انگریزوں نے جزیرۂ مالٹا میں قید کر دیا تین سال دو ماہ کے بعد رہائی ہوئی اور وطن تشریف لائے آپ کا ساحل بمبئی پر ہندوستان کے مشاہیر زعماء نے خیر مقدم کیا اور آپ کو "شیخ الہند" کا لقب دیا گیا اور بعد میں علی گڈھ میں "جامعہ ملیہ" کا سنگِ بنیاد رکھوایا گیا۔ ہندوستان واپسی کے بعد زندگی مستعار کے بہت کم دن رہ گئے تھے، ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) میں راہی ملکِ بقا ہو گئے۔ آپ کا ترجمۂ قرآن مشہور ہے (اسیر ادروی)

۱؎ مولانا فخر الحسن بن عبد الرحمٰن گنگوہی ہندوستان کے مشاہیر علماء میں سے تھے، علم و فضل میں درجۂ کمال حاصل تھا، حضرت نانوتوی کے مشہور تلامذہ میں آپ کا شمار ہے۔ عرصۂ دراز تک آپ کی خدمت میں رہ کر بے تکلف دوستوں کی حیثیت ہو گئی تھی حضرت نانوتوی کو بھی آپ کی علمیت اور ذہانت و فطانت پر بڑا اعتماد تھا، سفرِ حج میں ان کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، طب کی تعلیم دہلی کے مشہور طبیب حکیم محمود بن صادق شریفی سے حاصل کی تھی، آخر عمر میں آپ کانپور شہر میں مطب کرنے لگے تھے، حدیث آپ نے گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، بڑے ہی وجیہ و شکیل دُہرے بدن کے تھے بالطبیعت میں ظرافت تھی، زبان بہت شیریں، دوستوں کے بہترین دوست تھے، دینی معاملات میں انتہائی جری، خطرات سے بے نیاز ہو کر اعلانِ حق میں ان کو کوئی جھجک نہیں ہوتی تھی، عیسائیوں بالخصوص آریوں سے مناظرہ میں ان کو کمال حاصل تھا۔ تمام مناظروں میں حضرت نانوتوی رح کے ساتھ رہے تھے اس لیے فنِ مناظرہ سے خوب واقف تھے۔ حضرت نانوتوی کے انتقال کے بعد بھی آپ آریوں سے برابر مناظرے کرتے رہے، آپ کی علمی یادگاروں میں آپ کا ابو داؤد شریف کا حاشیہ ہے جو "التعلیق المحمود" کے نام سے علیحدہ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، ابن ماجہ پر بھی آپ کا (باقی بر صفحہ آئندہ)

رکھتے تھے، حضرت نانوتوی کے حکم پر مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے آگے بڑھ کر اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیا اور تن تنہا متعدد جلسوں میں کئی دنوں تک انہوں نے سارے اعتراضات کی دھجیاں اڑائیں اور ہر ہر اعتراض کا دنداں شکن جواب دیا اور ہر جلسہ میں پنڈت جی کو چیلنج کرتے رہے ان کو غیرت دلاتے رہے، مگر صدائے برنخاست، رڑکی کے اس واقعہ کی روداد مرتب کرنے والے نے ہمیں بتایا کہ:-

"اگرچہ مجمع عام میں پنڈت جی کے معتقد اور شاگرد بھی رہتے تھے لیکن کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ لب کشا ہو اور نہ اتنی غیرت آئی کہ پنڈت جی کو کشاں کشاں میدان میں لاتے یا بازاروں میں اسی مضمون کے اشتہارات چسپاں کرا دیتے۔[1]

پنڈت جی کو آخری دعوت نامہ:- کئی دنوں تک مولانا فخر الحسن صاحب کے بیانات کا سلسلہ جاری رہا اور پورے شہر میں ان جلسوں کی شہرت ہوئی، عوام بڑی دلچسپی کے ساتھ ان جلسوں میں شریک ہوتے رہے ہر ایک کی زبان پر ان جلسوں اور تقریروں کا ذکر تھا۔

یہ تمام حضرات دو ہفتے سے زائد رڑکی میں اس لیے رُکے رہے کہ کسی بھی قیمت پر پنڈت جی کو ان کے گھر سے نکال کر باہر لایا جائے لیکن ہر کوشش رائیگاں ہوتی رہی، آخر میں حضرت نانوتوی نے پنڈت جی کے پاس پیغام بھیجا کہ خیر آپ مباحثہ نہیں کرتے نہ کیجئے۔ کل سے ہم مجمع عام میں وعظ بیان کریں گے آپ مع شاگردوں اور معتقدوں کے وعظ میں ضرور تشریف لائیں اور وعظ تو سن لیں۔ اتمام حجت کا آخری مرحلہ بھی تمام ہو گیا، اپنی لاف زنی کی وجہ سے پورے شہر کی قوتِ سامعہ میں پنڈت جی نے تیزاب بھر دیا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بڑا عالمانہ و محققانہ حاشیہ ہے۔ معانی و بلاغت کی مشہور درسی کتاب "تلخیص المفتاح" پر بھی آپ نے حاشیہ لکھا ہے۔ آپ کا انتقال کانپور میں ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں ہوا جہاں آپ مطب کرتے تھے۔ (اسیر ادروی)۔

[1] انتصار الاسلام ص ۶

مگر جب قدرت کی طرف سے کچھ فولادی ہاتھ ان کی علمی نقاب نوچ کر پھینک دینے کے لیے آگے بڑھے تو ان پر اپنی حقیقت خود منکشف ہوگئی اور انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ رات ہی میں رڑکی سے نکل جائیں پھر ایسا ہی انہوں نے کیا، خس کم جہان پاک۔

بغیر اسلام کے نجات ممکن نہیں:- پورا شہر حضرت نانوتوی کی تقریروں کے لیے بے تاب تھا اس لیے مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کی کئی دنوں کی تقریروں کے بعد آپ نے اپنے وعظ کا اعلان کرایا اور مسلسل کئی دنوں تک مختلف مقامات میں تقریریں فرمائیں، آپ نے رڑکی کی موجودہ فضا کے پیش نظر اسلامی عقیدوں کو عقل و فطرتِ انسانی کے کڑے سے کڑے معیار اور سخت سے سخت ترکسوٹی پر پرکھ کر اس کو اپنی تقریروں میں زرِ خالص ثابت کیا اور فرمایا کہ یہ ایسا کھرا سونا ہے جسے مدبرین عالم ہمیشہ سے پرکھتے آئے ہیں اور مستقبل میں بھی دنیا کے مدبرین اپنی عقل کی میزان میں انہیں تولیں گے لیکن ان کو ہر بار یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلامی اصولوں کی برتری دوسرے اَدیان و مِلَل کے مقابلہ میں افضل و اعلیٰ ہیں بلکہ اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی اصول کسی ایسے غیر مرئی دستِ قدرت نے بنائے ہیں جس کی مٹھی میں فطرتِ انسانی کے تمام راز ہیں۔

حضرت نانوتوی نے تین دنوں تک مسلسل وعظ فرمایا، مسلمان، ہندو، عیسائی چھوٹے بڑے انگریز افسران فوج و سول جو رڑکی میں تھے، ان وعظوں میں شرکت کرتے رہے، مذہب اسلام کے حق ہونے پر ایسے ایسے دلائل و براہین آپ نے بیان فرمائے کہ غیر مسلم بھی حیرت زدہ رہ گئے، ہر شخص پر غور و فکر کے آثار صاف نظر آرہے تھے، پنڈت جی کے تمام اعتراضات کے جوابات ایسے دل نشین اور مسکت دیئے کہ مخالف کو بھی اس سے مجالِ انکار نہیں تھی توحید و رسالت کے بلند مضامین کا انداز بیان ایسا ایمان افروز تھا کہ بہت دنوں تک لوگوں کو یاد رہا غرضیکہ ان دنوں کی تقریروں میں حضرت نانوتوی نے تمام اہلِ مذہب پر ظاہر کر دیا کہ اب بغیر اسلام لائے عذابِ آخرت سے نجات ممکن نہیں ہے حجتِ الٰہی سب پر قائم کر دی۔

رڑکی کی رُوداد حضرت نانوتوی کی زبانی:- میں نے اب تک مختلف کتابوں اور رسالوں اور سوانح عمریوں میں

متفرق طور پر رڑکی کے اس معرکۃ الآرا ہنگامہ خیز بیانات کے متعلق جو پڑھا تھا آپ کے سامنے پیش کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ حضرت نانوتوی کی زبانی بھی کچھ روداد آپ کے سامنے پیش کردوں تو بہت سے ایسے گوشے بھی آپ کے سامنے آجائیں گے جو اب تک واضح طور پر آپ کے سامنے نہیں آئے ہیں چونکہ پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج سے مجمع عام میں مباحثہ نہیں ہو سکا تھا جس کا حضرت نانوتوی کو افسوس تھا اس لیے آپ نے ان تمام اعتراضات و اتہامات اور الزامات کا جو اُن کی طرف سے اسلام پر عائد کیے جا رہے تھے ان کو مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کر دینا ضروری تصور فرمایا تاکہ آئندہ یہ فتنہ اگر اور آگے بڑھا تو ان لوگوں کو جو اس فتنہ کے استیصال میں جد وجہد کریں تو ان کے سامنے ایک روشن اور واضح طریقۂ عمل موجود رہے اس لیے آپ نے فتنہ آریہ سماج سے متعلق دو اہم ترین رسالے تحریر فرمائے جن میں جملہ اہم اعتراضوں کے مفصل جوابات دیئے گئے ہیں۔

پنڈت جی کا مسلمانوں پر سب سے بڑا اتہام وہ تھا جو ابتداء اسلام سے لے کر اب تک بدترین سے بدترین دشمن اسلام نے لگانے کی غلطی نہیں کی تھی کیونکہ یہ اعتراض دانشمندی اور تدبر و فراست سے بعید تھا، یہ اعتراض کج فہمی، بلادت عقل اور غباوت دماغ کا نتیجہ تھا لیکن اس اعتراض کو بار بار اور بڑی بلند آہنگی سے انہوں نے رڑکی میں دُہرایا تھا اس لیے اس کے جواب کی ضرورت پیش آئی انہوں نے کہا کہ :-

"مسلمان دنیا کے تمام بت پرستوں میں سب سے بڑا بُت پرست ہے کیونکہ وہ خانہ کعبہ کی پرستش کرتا ہے اور اس کے رُخ پر سجدے کرتا ہے جو اینٹ اور پتھروں کا مجموعہ ہے۔ ہندو اس کے مقابلے میں چھوٹا بُت پرست ہے۔"

حضرت نانوتوی نے صرف اسی ایک الزام کے جواب میں ایک مستقل کتاب "قبلہ نما" تحریر فرمائی جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے مقدمہ میں آپ نے رڑکی میں جو گذرا اس کی مختصر روداد بھی تحریر فرمائی ہے آپ تحریر فرماتے ہیں :-

سنہ ۱۲۹۵ھ کے آخر رجب میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آکر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کیے، حسب الطلب

بعض احباب اور نیز بہ تقاضائے غیرتِ اسلام یہ ننگِ اہل اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں پہونچا اور آرزوئے مناظرہ میں سولہ سترہ روز وہاں ٹھہرا رہا۔"

رڑکی میں آپ کا یہ قیام ان حالات میں تھا کہ آپ علیل چل رہے تھے۔ سفرِ حج کے بعد جب آپ واپس آئے تو بیماری نے اتنا سخت حملہ کیا کہ تیمار دار تو ایک بار مایوس ہو گئے پھر صحت عود کر آئی لیکن کلی طور پر صحت ابھی نہیں ہوئی تھی اسی دوران رڑکی میں پنڈت دیانند کا فتنہ برپا ہوا اور غیرتِ اسلام سے مجبور ہو کر آپ رڑکی پہونچ گئے قبلہ نما میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہر چند چاہا کہ مجمعِ عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہہ بہ عنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں، مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے جو میدانِ مناظرہ میں آتے، جان چرانے کیلئے وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سوجھتے ہیں، اعتراض تو مجمع عام میں کیا کیئے، پر مناظرہ میں اپنی قلعی کھلنے کا وقت آیا تو پچاس آدمیوں سے زیادہ پر راضی نہیں ہوئے۔"

غرضیکہ بار بار تقاضوں اور مسلسل اصرار کے بعد پنڈت جی کسی طرح حضرت نانوتوی سے مناظرہ کے لیے تیار نہیں ہوئے، پچیس پچاس سے دو سو تک کی تعداد پہونچی اور اس پر وہ راضی ہوئے مگر یہ بھی سچائی اور نیک نیتی پر مبنی نہیں تھا بلکہ وقت گذاری اور ٹالنے کی باتیں تھیں کیونکہ جب ساری احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر حضرت نانوتوی نے پنڈت جی کی قیامگاہ پر جا کر مباحثہ کرنا چاہا تو چھاؤنی کی طرف سے حکمنامہ بھجوا دیا کہ حدودِ چھاؤنی میں مذہبی مناظرے کی اجازت نہیں، البتہ اس حکمنامہ میں یہ تصریح تھی کہ چھاؤنی کی حدود سے باہر یہ مناظرہ ہو سکتا ہے، اس کے بعد آپ لکھتے ہیں:۔

اس پر ہم نے میدانِ عیدگاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماسِ قدم رنجہ فرمائی کیا تو پنڈت جی کو اپنے دن نظر آئے اور سوائے انکار کے اور کچھ نظر نہ آیا، لاچار ہو کر ہم نے چاہا کہ اپنے اعتراض ہی بھیج دو تاکہ ہم ہی مجمع عام میں ان کے جواب سنا دیں اور مرضی ہو تو آؤ مناظرہ تحریری ہی سہی، مگر جواب

تو درکنار، پنڈت جی نے اپنی راہ لی، شکرم میں بیٹھ، یہ جا وہ جا۔"[1]

دو ہفتوں کی دوڑ دھوپ، منتوں، خوشامدوں اور پنڈت جی کی ضدوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عوام کی لاعلمی میں یک بیک رڑکی سے نکل گئے۔ دوسرے دن لوگوں کو علم ہوا اور عوام اس دلچسپ مباحثہ سے محروم رہ گئے جس کی انہوں نے توقع لگا رکھی تھی۔

پنڈت دیانند میرٹھ میں:۔ رڑکی سے باذلت وخواری خفیہ فرار کے کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ پنڈت جی میرٹھ شہر میں براجمان ہیں اور وہی طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے جو انہوں نے رڑکی میں اختیار کر رکھا تھا، وہی دل آزار لب ولہجہ میں اسلام پر اعتراضات اور اشتعال انگیز تنقیدیں، جب ان کی لن ترانیاں اور دل آزاریاں حد سے تجاوز کر گئیں تو دو غیرت مند مسلمان اُٹھ کھڑے ہوئے منشی احمد حسین صاحب اور منشی عبداللہ صاحب یہ دونوں حضرات پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہونچ گئے اور کہا کہ آپ جلسۂ عام میں اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں ہم اپنے علماء کو مدعو کرتے ہیں آپ اپنے اعتراضات ان کے سامنے پیش کیجئے تاکہ واضح ہو جائے کہ حق کس طرف ہے، لیکن رڑکی کی طرح یہاں بھی انہوں نے وہی رَٹ لگائی کہ میں تم سے بات نہیں کرتا اگر مولانا قاسم صاحب آئیں تو میں اُن سے بات کروں گا اور شرائط طے ہو جائیں گی تو مناظرہ بھی ہو جائیگا" دونوں نے کہا کہ آپ جو شرائط ہم سے طے کریں گے وہ شرطیں ہمارے علماء بھی تسلیم کرلیں گے اس کی ذمہ داری ہماری ہے آپ جو چاہیں شرطیں طے کرلیں جب ہم تسلیم کرلیں گے تو ہمارے علماء اس سے کبھی انحراف نہیں کریں گے اور نہ اس کو رد کریں گے آپ ہمارا چیلنج منظور کر لیجئے اس کے بعد کی ساری ذمہ داریاں ہم اپنے سر لیتے ہیں، مگر پنڈت جی نے حامی نہیں بھری اور کسی طرح شرائط مناظرہ پر گفتگو کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

یہ واقعہ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کا ہے، میرٹھ سے آریوں کا ایک ترجمان "آریہ سماچار" نکلتا تھا اس کے ایڈیٹر لالہ انند لعل آریہ تھے۔ انہوں نے دروغ بیانی اور جھوٹے پروپیگنڈے

---

[1] یہ تمام تفصیل حضرت نانوتوی کی کتاب "قبلہ نما" کے مقدمہ سے لی گئی۔

کی مہم شروع کردی کہ پنڈت جی تو مناظرہ کے لیے ہر طرح تیار ہیں مگر مسلمان مباحثہ و مناظرہ سے جان چراتے ہیں اور سامنے آنا نہیں چاہتے، پنڈت جی مولوی قاسم صاحب کا برابر تعاقب کر رہے ہیں اور وہ بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ یعنی اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے اسی کو کہتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک اخبار میرٹھ سے "نجم الاخبار" کے نام سے نکلتا تھا اس نے "آریہ سماچار" کے جھوٹ کا پردہ چاک کرنا شروع کردیا جس "پر آریہ سماج" والے بہت برہم ہوئے مگر سچائی کو کہاں تک چھپا سکتے تھے، آریوں کا یہ جھوٹا پروپیگنڈہ جاری تھا کہ حضرت نانوتوی یک بہ یک میرٹھ پہونچ گئے۔

حضرت نانوتوی میرٹھ میں:۔ میرٹھ سے برابر خبریں آرہی تھیں کہ پنڈت جی شہر میں زہر افشانی کر رہے ہیں، اس لیے آپ نے میرٹھ پہونچنے میں کوئی تاخیر نہیں کی اور ایک صبح کو میرٹھ میں یہ خبر عام ہوگئی کہ حضرت نانوتوی آگئے، آریوں کے جھوٹے پروپیگنڈے کی توپ یک بیک سرد ہوگئی۔ پنڈت جی کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ حضرت نانوتوی کو پنڈت جی سے گفتگو کرنے والوں نے بتایا تھا کہ وہ چاند مستری کے بنگلے پر گفتگو کریں گے آپ سیدھے چاند مستری کے بنگلے پر پہونچ گئے، پنڈت جی کو جب اس کا علم ہوا تو وعدہ کے باوجود بنگلے پر نہیں آئے، چاند مستری کے بنگلے کے بالمقابل سڑک کی دوسری پٹری پر پنڈت جی کی قیامگاہ تھی۔ حضرت نانوتوی ان کی قیامگاہ پر پہونچ گئے۔ پنڈت جی حضرت نانوتوی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ مجبوراً سامنے آنا پڑا اور جب شرائط مناظرہ پر گفتگو ہوئی تو سب سے پہلے یہ بہانہ کیا گیا کہ فساد کا اندیشہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ غلط خیال ہے جب آپ جلسہ عام میں زہر افشانی کرتے ہیں اور فساد نہیں ہوتا تو مباحثہ و مناظرہ میں کیوں فساد ہوگا؟ پھر کہا کہ مناظرہ میں دس آدمیوں سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں، اور فریقین کے بیان کا ایک ایک لفظ لکھا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ دونوں شرطیں مقصدِ مناظرہ کے بالکل خلاف ہیں۔ اعتراضات تو آپ نے مجمع عام میں کیے اور اس کے جوابات صرف دس آدمیوں کی موجودگی میں دیا جائے، اور تقریروں کے لکھنے کا کیا فائدہ، فریقین

کی تقریر سے سامعین خود فیصلہ کرلیں گے، لیکن یہ ساری گفتگو تضییع اوقات ثابت ہوئی کیونکہ دوسرے دن معلوم ہوا کہ پنڈت جی میرٹھ سے چلے گئے۔[1]

غرضیکہ میرٹھ میں بھی پنڈت جی کسی طرح سامنے نہیں آئے البتہ بعد میں ان کے چیلوں نے اپنے اخبار کے ذریعہ کچھ اعتراضات کیے جس کا جواب حضرت نانوتوی نے اپنے ایک رسالہ میں دیا ہے جس کو مولانا عبدالعلی صاحب تلمیذ رشید حضرت نانوتوی نے مرتب کرکے شائع کردیا ہے، میرٹھ میں پنڈت جی کے تعاقب کا واقعہ حضرت نانوتوی کی زندگی کے آخری سال کا واقعہ ہے کیوں کہ میرٹھ سے واپسی کے بعد آپ رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

حضرت نانوتوی کے بعد:- انیسویں صدی کا عیسائیت کے بعد یہ دوسرا بڑا فتنہ تھا جس سے مسلمانوں کا سابقہ پڑا یہ تو خدا کا فضل ہوا کہ اس فتنہ کے بانی کا واسطہ ایسی عظیم المرتبت شخصیت سے پڑا جو ہندوستان کی سرزمین پر حجۃ الاسلام بن کر رہی، جس کی خداداد ذہانت و فطانت اور علمی دقیقہ سنجیوں نے دشمنانِ اسلام کو گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے پر مجبور کردیا، بانی فرقہ آریہ سماج پنڈت دیانند پر حضرت نانوتوی کے علم و فضل کا ایسا زبردست رعب تھا کہ ان کا نام سن کر پتہ پانی ہوجاتا تھا، حضرت نانوتوی نے مسلسل جدوجہد کرکے اس سانپ کے زہریلے دانت تو ہمیشہ کے لیے توڑ دیئے کہ مستقبل میں اس کا یہ زہر باقی نہیں رہے گا اور ایسے چند رسالے تحریر فرمادیئے کہ کوئی بڑے سے بڑا دانشور آریہ سماجی اگر اسلام پر اعتراض کرے تو ان رسالوں کا مطالعہ کرنے والا اس کو خاموش کرسکتا ہے۔ انھیں کتابوں کی مدد سے حضرت نانوتوی کے تلامذہ نے بعد کے دور میں آریوں سے مقابلے کیے اور ان کی زبانیں بند کردیں یہ فتنہ شکل بدل بدل کر بیسویں صدی کے ربع اول تک رہا، بیچ کی مدت میں ہندوستان کے مختلف مقامات میں آریوں سے مقابلے اور مناظرے ہوتے رہے اور علماء حق ہر جگہ پہونچ کر ان کو شکستِ فاش دیتے رہے، ۱۹۲۳ء میں اس فتنہ نے جب دوسری شکل اختیار کی اور

---

[1] یہ تفصیل کتاب "ترکی بہ ترکی" سے لی گئی ہے جس کے مضامین حضرت نانوتوی کے ہیں اور ترتیب مولانا عبدالعلی صاحب کی ہے۔

مسلمانوں کے لیے چیلنج بن گیا تو پھر یہی دبستان دیوبند ہی میدانِ عمل میں آیا اور اس فتنہ سے بھرپور پنجہ آزمائی کر کے اس کو شکست دی، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ آئندہ اوراق میں اس داستان کے کچھ اجزا پیش کیے جائیں گے۔

تصانیف:۔ حضرت نانوتوی نے بانی مذہب آریہ سماج کی ہفوات، اسلام پر اعتراضات کی قرار واقعی تردید جب کر لی تو دو ہفتوں کے بعد رڑکی سے واپس تشریف لائے، آپ نے محسوس کیا کہ آج ہم نے سانپ کے زہریلے دانتوں کو ضرور توڑ دیا ہے لیکن جب اس نئے مذہب کی بنیاد ہی اسلام دشمنی پر رکھی گئی ہے تو اس مذہب کے پیرو مستقبل میں مسلمانوں سے الجھتے رہیں گے اور بعد کے تجربات و مشاہدات نے ثابت کر دیا کہ اسلام دشمنی کے ساتھ مسلم دشمنی بھی ان کے خمیر میں داخل ہے، یقین تھا کہ ان کی ذریات پھیلیں گی، یہی اعتراضات آئندہ دہرائے جائیں گے جو آج پنڈت جی اپنی تقریروں میں دہراتے رہتے ہیں اور اپنے مذہب کی بنیادی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں تحریر کر چکے ہیں۔ اہلِ اسلام ان کی مدافعت کے لیے میدان میں آنا ہی ہوگا۔ اس لیے ان کے بنیادی اعتراضات کو سامنے رکھ کر دو اہم رسالے تصنیف فرمائے اور ہر سوال کا مفصل جواب دیا ہے اور اس کی تائید میں ایسے دلائل و براہین دیئے گئے ہیں کہ اس آہنی دیوار کو توڑنا آریوں کے بس کی بات نہیں۔

قبلہ نما:۔ حضرت نانوتوی کی یہ کتاب ایک سو چار صفحات پر مشتمل ہے جو دیانند سرسوتی کے اس اعتراض کے جواب میں ہے کہ مسلمان دنیا کی سب سے بڑی بُت پرست قوم ہے کیوں کہ وہ پتھروں کے ایک گھر کو سجدہ کرتی ہے۔ مورتی پوجا کرنے والے ہندوان کے مقابلہ میں چھوٹے بت پرست ہیں۔ سوال انتہائی سفیہانہ تھا کیونکہ پنڈت جی خود بھی جانتے ہیں کہ آج دنیا میں تنہا مسلمان موحد اور خدا پرست ہے اور وحدانیت پر اس کے ایمان کا دار و مدار ہے، شرک سے اسے ازلی بَیر ہے، وہ کسی مادی چیز کے سامنے سر نہیں جھکاتے ہیں، وہ نہ خانہ کعبہ کے در و دیوار کو معبود سمجھتے ہیں اور نہ ان کو سجدہ کرتے ہیں بخلاف بُت پرستوں کے کہ وہ اپنے بتوں کو معبود سمجھ کر سجدہ

کرتے ہیں اور ان کی پرستش کرتے ہیں اور ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہیں، پنڈت جی کے اس اعتراض کا جواب آپ چند سطروں میں بھی دے سکتے تھے لیکن جب حضرت نانوتویؒ نے اس کے جواب کے لیے قلم اٹھایا تو ان کا رہوارِ قلم چل پڑتا ہے اور جب کتاب کے ایک سو چار صفحات تمام ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی منزل پر پہونچ کر رکتا ہے۔

آغازِ کتاب میں تو آپ نے اس اعتراض کو لغو اور اسلامی تعلیمات و روایات سے ناواقفیت پر مبنی بتایا ہے اور یہی حقیقت بھی ہے لیکن اس بحث میں بہت سے ایسے پہلو آ گئے کہ حضرت نانوتوی نے ان کو ذکر کر کے اہلِ ایمان کے لیے سامانِ بصیرت بھی مہیا کر دیا ہے آپ نے بات شروع کی:-

"پنڈت جی کا یہ حال ہے کہ آسمان کو خاک میں ملائے دیتے ہیں۔ استقبالِ قبلہ اور بت پرستی کو برابر کر دیا، اگر خود پنڈت جی کو ایسی باتوں میں فرق کرنا نہیں آیا تو یہ شہرۂ کمال کس خیال پر مبنی ہے؟ بغرض توضیح حقیقت الحال چند باتیں جن سے معلوم ہو جائے کہ استقبالِ قبلہ اور بت پرستی میں فرق زمین و آسمان کا ہے۔ ان اوراق میں عرض کرتا ہوں"۔[1]

اس کے بعد آپ نے سات دلیلیں تحریر فرمائی ہیں جن سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں خانہ کعبہ معبود نہیں، معبود ذاتِ خداوندی ہے بخلاف بت پرستوں کے کہ وہ بتوں کو اپنا معبود اور حاجت روا سمجھتے ہیں، پھر ایسے مستحکم دلائل فراہم فرمائے ہیں کہ ان کی تردید ممکن نہیں، نماز کی ایک ایک حرکت اور سکون اور دورانِ نماز جو کچھ بھی پڑھا جاتا ہے اور جو تسبیحات کہی جاتی ہیں اور ہر انتقال کے وقت جو الفاظ ادا کیے جاتے ہیں، پھر قرارت میں سورۂ فاتحہ لازمی طور پر پڑھی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں سے آپ نے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام باتیں یقینِ محکم فراہم کرتی ہیں کہ مسلمانوں کا معبود خود یہ پتھروں کا گھر نہیں بلکہ ذاتِ خداوندی ہے اور ذاتِ ربّ العالمین ہے۔

---

[1] "قبلہ نما" مصنفہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ص ۳

اس کے بعد دو تقریریں علمی اور کلامی اندازِ بیان اور اصطلاحات کی روشنی میں تحریر فرمائی ہیں، یہ دونوں تقریریں اسی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور حاصلِ بحث کے طور پر آخر میں آپ نے آفتاب کی طرح روشن کر دیا کہ مسلمانوں پر بُت پرستی کا الزام ایک احمقانہ الزام ہے، کسی معمولی سے معمولی عمل سے بھی غیر اللہ کی معبودیت کی کوئی جھلک نہیں دکھائی جا سکتی، اس لیے جاہلانہ شور و شغب کے ساتھ مسلمانوں پر یہ الزام عائد کرنا سوائے خبث باطنی، فریب خوردگی یا دوسروں کو مغالطہ اور دھوکہ دینے کے اور کچھ نہیں۔

اِنتصار الاسلام :- آریوں کے اور دوسرے اعتراضوں کے جواب آپ کی کتاب "انتصار الاسلام" سے۔ اس کتاب میں آریوں کے تمام مشہور اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اب تک پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی تقریروں یا اپنی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں مسلمانوں کے مذہب پر جتنے اعتراضات کیے ہیں، آریوں کے اعتراضات کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے:-

۱۔ قادرِ مطلق اپنے مارڈالنے اور چوری کرنے سے کیوں مقدس ہے؟

۲۔ شیطان کو کس نے بہکایا، مسلمان کہتے ہیں کہ شیطان بہکا کر انسانوں سے بُرے کام کراتا ہے، لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ شیطان کو کس نے بہکایا؟ حاصل یہ کہ مسئلہ غلط ہے، انسان خود بُرے کام کرتا ہے۔

۳۔ مسلمان کہتے ہیں کہ احکامِ خداوندی میں نسخ ہوتا ہے، یہ امر بالکل خلافِ عقل ہے، کیونکہ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ خدا نے بے سوچے سمجھے آج کچھ کہدیا کل جب کوئی خرابی دیکھی اور حکم بدل دیا، خدا کا حکم آدمیوں کے برابر نہیں، اس کا حکم ہمیشہ ایک ہوتا ہے اور تغیر و تبدل احکام کی نوبت اس کے یہاں نہیں آتی ہے۔

۴۔ مسلمان کہتے ہیں کہ ارواح خدا کے یہاں پہلے سے موجود نہیں کہ جب کسی کو حکم دیتا ہے تو وہ حکم کے مطابق دنیا میں آجاتی ہے، نہیں بلکہ خدا کو ہر وقت قدرت ہے کہ جب چاہے پیدا کر کے بھیج دیتا ہے، ارواح کل ساڑھے چار ارب ہیں، اور جزا و سزا انسانوں کی بطور تناسخ ہوتی ہے۔

۵۔ مسلمان کہتے ہیں کہ جو کوئی روزہ کسی کا افطار کرادے گا تو جنت میں اس کے انعام میں ستر حوریں ملیں گی، تو چاہیئے کہ جو عورت کسی کا روزہ افطار کرادے تو اس کو ستر مرد انعام میں ملیں۔

۶۔ مسلمان کہتے ہیں کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، یہ غلط ہے بلکہ ہر فعل کی سزا و جزا بطور تناسخ ضرور ملتی ہے، سزا معاف نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ عدل کے خلاف ہے۔

۷۔ مسلمان جو گوشت کھاتے ہیں تو وہ حلال کر کے کھاتے ہیں، سو اگر یہ جانور دعا پڑھنے سے حلال ہو جاتے ہیں تو سب جانور حلال ہو سکتے ہیں اور اگر دعا پڑھنے سے حلال نہیں ہوتے تو خود مرا ہوا کیوں حلال نہیں سمجھا جاتا؟

۸۔ مسلمان دنیا میں تو شراب کو حرام کہتے ہیں اور ان کی جنت میں شراب کی نہریں ہیں، تماشا ہے کہ جو چیز یہاں حرام ہے وہاں حلال ہو گئی، اگر وہ نہریں ہیں تو کتنا طول و عرض رکھتی ہیں؟ اور ان کا منبع کہاں ہے؟ اگر بہتی ہیں تو کدھر سے کدھر کو اور نہیں تو سڑتی کیوں نہیں؟

۹۔ مسلمان مُردوں کو دفن کرتے ہیں اور زمین کو ناپاک کرتے ہیں، اس لیے مُردوں کو جلانا بہتر ہے۔

۱۰۔ مسلمان کہتے ہیں کہ آدمی مر کر قیامت تک حوالات میں رہتا ہے اور قیامت میں حساب کتاب ہو کر جزا و سزا کو پہونچتا ہے، یہ بالکل غلط ہے کیوں کہ حوالات میں رکھنا خلافِ عدل ہے بلکہ جزا و سزا بطور تناسخ بعد انتقال فوراً مل جاتی ہے۔

مذکورہ بالا سوالات کے اطمینان بخش جوابات کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

باب ۶

آریہ سماج کا فتنہ مسلمانوں کے لیے چیلنج بن گیا

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے تلامذہ نے بعد کے دور میں آریہ سماج کی ہفوات کے مسکت جوابات دے کر ان کو لگام ضرور لگادی اور ان میں علمی مباحثہ و مناظرہ کی جرأت بتدریج ختم کردی اور پھر ایک عرصہ تک فضا میں خاموشی رہی اور یہ فتنۂ خوابیدہ کچھ برسوں بعد ایک نئی شکل و صورت میں پیدا ہوا۔ اور اس نے ملک کی پوری فضا کو زہر آلود کردیا۔

جب کوئی فرقہ وجود میں آجاتا ہے تو تاریخی عوامل اس کو زندگی جاوید دے دیتے ہیں آریہ سماج بھی اسی اصول کے مطابق آج تک کسی نہ کسی شکل میں زندہ ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ اس فرقہ نے ہندو مذہب کی جڑ بنیاد پر کلہاڑی چلائی، مورتی پوجا کی بھرپور مخالفت کی اور بقول خود خدا کے ایک ہونے کا قائل رہا لیکن ہندو مذہب کے سمندر میں یہ مذہب بھی ضم ہو کر اس کی ایک شاخ بن کر رہ گیا اور آج دونوں میں امتیاز کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے

آریہ سماج نے ملک میں آگ لگادی:- حضرت نانوتوی کے بعد ان کے تلامذہ نے خاموشی نہیں اختیار کی اور دبستانِ دیوبند کے اہلِ علم نے اپنی مذہبی ذمہ داریوں کو پورا کیا، جہاں بھی یہ فتنہ ابھرا، اسلام پر دل آزار تنقید

کرکے مسلمانوں کے جذبات کو زخمی کیا اور خلفشار پیدا کیا وہ پہونچے اور انہوں نے اگر موقعہ آیا تو مباحثہ و مناظرہ کیا اور اگر حریف آگ لگا کر فرار اختیار کر گیا تو انہوں نے اپنی باطل شکن تقریروں سے ان کے اعتراضات کے پرخچے اڑا دیئے، بعد میں دوسرے لوگ بھی اس فتنہ کے مقابلے میں آتے رہے اور ملک کے مختلف گوشوں میں ان سے مقابلہ و مناظرہ کرتے رہے، یہاں تک کہ بیسویں صدی آگئی اور جب اس کی دو دہائیاں گذر گئیں تو اس کے تنِ مردہ میں پھر جان آگئی اور یہ فتنہ شباب پر ہو گیا اور جب ملک میں خلافت تحریک ابھری اور اس نے جنگِ آزادی میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا ایک مثالی کردار انجام دیا اور یہ دونوں بڑی قومیں شیر و شکر ہو کر انگریزوں کے مقابلہ میں صف بستہ ہو گئیں تو انگریزوں نے آریہ سماج کے سوئے ہوئے فتنہ کو پھر خود جگایا اور اس فتنہ نے بیدار شدھی و سنگھٹن کے نام سے ملک میں ایک بار پھر قیامت برپا کر دی۔ اور ہندو مسلم اتحاد جو سیاسی اسباب کی بنا پر وقت کا اہم ترین فریضہ تھا پارہ پارہ ہو گیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دُور افتادہ گاؤں اور دیہاتوں میں آباد مسلمانوں کو طاقت کے بل پر مرتد کرنا شروع کر دیا اور ان کی شدھی کر کے ہندو بنانے کا خطرناک کھیل کھیلنا شروع کر دیا، انیسویں صدی کے نصف آخر میں آریہ سماج کا جنم بھی انگریزوں کی سیاسی محرکات کے تحت ہوا اور بیسویں صدی کے رُبع اول میں جب اس کا دوسرا جنم ہوا تو وہ برطانوی سیاست کی خفیہ ریشہ دوانیوں کے زیرِ اثر ہوا، ہندوستان کی سیاسی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

ہندو مذہب تبلیغی مذہب نہیں:۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ویدک دھرم ایک نسلی اور قومی مذہب ہے کسی بھی دوسری قوم اور مذہب کا آدمی اپنا مذہب تبدیل کر کے ہندو نہیں ہو سکتا کیونکہ اس دھرم کا تعلق ہی خون اور نسل سے ہے، اس کے برعکس اسلام میں خون اور نسل کا کوئی اعتبار نہیں چاہے وہ کسی قوم اور نسل کا انسان ہو، نسب اور نسل کے اعتبار سے شریف ہو یا سماجی اعتبار سے ذلیل ترین اقوام میں اس کا شمار ہو، جب وہ مسلمان ہو گیا، وہ سارے مسلمانوں کا بھائی اور ان کا ہم پلّہ ہو گیا، سماج اور معاشرہ میں اس کی وہی حیثیت ہو گی جو عام

مسلمانوں کی ہوگی۔ ویدک دھرم ایسا نہیں ہے، اسی ہندو دھرم کی ایک شاخ آریہ سماج ہے جس کے بانی دیانند سرسوتی ہیں انہوں نے اپنے اس نوایجاد مذہب کو تبلیغی بنانے کی جدوجہد کی، اگرچہ اس کی پچاس سالہ زندگی میں کوئی بھی مسلمان آریہ سماجی تو نہیں ہو سکا، سناتن دھرم میں وہ توڑ پھوڑ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور ہندو طبقہ میں سے کچھ لوگوں نے اپنا قدیم دھرم ترک کرکے آریہ سماج کا دھرم قبول کرلیا۔

اور جب آریہ سماج کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور سوامی شردھانند نے اپنی قوم میں صور بیداری پھونکا تو یہی آریہ سماج ایک خطرناک فتنہ کی شکل اختیار کرگیا، ساٹھ ستر سال کی تقریر و تحریر نے تو کوئی کرامت نہیں دکھائی تو اس نے طاقت کے استعمال کا منصوبہ بنایا اور مختلف علاقوں میں فتنہ و فساد کی آگ دہکا کر ایسی فضا بنادی کہ ان تمام علاقوں میں جہاں مسلمان پسماندہ اور رسم و رواج میں مشرکانہ طرز عمل اختیار کیے ہوئے تھے اور عملاً اسلامی معاشرہ سے کٹ کر غیر اسلامی شکل و صورت میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے ان کے بارے میں آریہ سماج کے آپدیشکوں نے اعلان کیا کہ فلاں فلاں قومیں اصلاً ہندو ہیں ان کو مسلمانوں نے زبردستی مسلمان بنالیا ہے۔ اب ان کی دوبارہ شدھی کرکے آریہ سماجی بنایا جائے گا، اس خطرناک مقصد کے لیے آریہ سماجیوں نے ایک تنظیم بنائی اور منصوبہ بند طریقے سے مختلف صوبوں اور ضلعوں میں اس تنظیم کے تحت بچھڑے مسلمانوں کو اپنے دھرم میں داخل کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ تاریخ میں اسی پروگرام کو شدھی اور سنگھٹن کی تحریک کہا جاتا ہے اس فتنہ نے ملک کے ایک بڑے حصہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

فتنہ نے کہاں کہاں زور پکڑا:- آریوں نے اپنی جارحانہ سرگرمیوں سے ملک کے بہت سے علاقوں میں آگ دہکادی، اور روزانہ اخبارات میں خبریں آنے لگیں کہ آج فلاں ضلع میں اتنے مسلمانوں کی شدھی کی گئی فلاں آبادی میں فلاں تاریخ کو بڑے پیمانے پر شدھی کی جائے گی، پھر اس کام کے لیے اس دیار کے طاقتور ہندو قوموں کی پنچایتیں بلاتے، ہندو زمینداروں ساہوکاروں، زمینداروں اور چودھریوں کو پنچایت میں بلاکر پسماندہ اور غریب مسلمانوں پر دباؤ ڈلواتے،

بصورتِ دیگر دھمکیاں دیتے تھے کہ اگر انہوں نے شدھی ہونا قبول نہیں کیا تو ان کی زمینیں چھین لی جائیں گی، آبادی سے نکال دیا جائے گا یا مقدمات میں پھنسا دیا جائے گا۔ غرضیکہ طرح طرح کی دھمکیوں سے ان کو اتنا ڈرایا اور دھمکا دیا جاتا تھا کہ آریہ سماجیوں نے ایسی پنچایتیں کر کے آبادی کی آبادی کو شدھی کر کے ہندو بنا لیتے تھے، مزید ستم یہ کہ ہندو اخبارات میں ان شدھی ہونے والوں کی خبروں کو شاہ سرخیوں میں شائع کرتے تھے مسلمان ان جبر و تشدد کے واقعات کو سنتا اور تلملا کر رہ جاتا۔

شدھی سنگھٹن کی سرگرمیاں :- میں بطورِ مثال ان چند مقامات کی جھلکیاں پیش کرتا ہوں جہاں اس فتنہ نے سب سے زیادہ زور پکڑا، میرے پاس ان واقعات کے دستاویزی ثبوت ہیں، یہ ثبوت مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی فعّال اور متحرک اور بیدار مغز تنظیم جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر نئی دہلی میں ملے، اتفاق سے مجھے مرکزی دفتر کے کاغذات کی جمع و ترتیب کی ذمہ داری سپرد کی گئی، ان دستاویزی کاغذات سے ایک بڑا کمرہ ریکارڈ روم بھرا ہوا تھا، میں نے ایک ایک کاغذ کو پڑھ کر ان کو مرتب کرنا شروع کیا تو مجھے قیام جمعیۃ علماء ہند کی پہلی دہائی کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں جو خطوط، رپورٹیں، حکمنامے، مراسلات، درخواستیں اور دوسرے ایسے کاغذات ملے جو اس زمانہ میں چلنے والی شدھی اور سنگھٹن تحریک کی تفصیلات پر مشتمل تھے، میں نے ان کاغذات کی بہت سی مرتب فائلیں بنائیں اور ان کاغذات پر نمبر دے کر ان کی ایک فہرست ترتیب دی، میں انہیں فائلوں سے صرف چند خطوط، رپورٹیں اور دفتر کی طرف سے ہدایات کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اصل کاغذات آج بھی مرکزی جمعیۃ علماء ہند نئی دہلی کے ریکارڈ روم کی الماریوں میں محفوظ ہیں جن کو ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

آریہ سماج فتنہ کی آماجگاہیں :- یوں تو جب یہ فتنہ تیس سال کی نیند کے بعد انگڑائی لے کر بیدار ہوا تو پورے ملک کی فضا میں آتش فشاں کی کیفیت پیدا ہو گئی لیکن بعض مقامات پر اس کی شدت کو زیادہ محسوس کیا گیا، کیونکہ ان مقامات پر عملی اقدامات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر طرح کے

ہتھکنڈے استعمال کرکے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا گیا، جو مقامات خاص طور پر متاثر تھے اُن میں گوڑگانوہ، رُہتک، کرنال، میرٹھ، حصار، بلند شہر، متھرا، آگرہ، بھرت پور، اٹاوہ، علی گڈھ، ایٹہ، مین پوری، فرخ آباد، یہ وہ مقامات ہیں جہاں شدھی کا فتنہ پورے شباب پر تھا، پسماندہ اور پچھڑے ہوئے مسلمانوں کو شدھی کرکے ان کو مرتد بنانے کا سلسلہ زور شور سے جاری تھا۔ ان اضلاع سے آئے ہوئے خطوط وغیرہ سے وہاں کے حالات پر روشنی پڑتی۔ چند خطوط ملاحظہ فرمائیں۔

گاؤں کا گاؤں شدّھی ہونے والا ہے :- جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر کے ریکارڈ روم میں جو کاغذات محفوظ ہیں ان میں ضلع بدایوں کا ایک خط ہے جو مندرجہ ذیل ہے :-

"موضع بہراوٹی تحصیل گنور تھانہ رجپورہ ضلع بدایوں میں مسلمانوں کو سخت پریشانی ہے، قیامت کا نمونہ ہے۔ مسجد کو منہدم کردیا، گھروں میں آگ لگادی۔ اس موضع میں پچاس گھر مسلمان ہیں مگر سب غریب و بے کس ہیں صرف چھ آدمی مستحکم ہیں باقی تمام عنقریب مرتد ہونے والے ہیں"[1]

ضلع آگرہ میں آریہ سماجی فتنہ :- آگرہ میں جمعیۃ علماء کی جانب سے حالات پر نظر رکھنے کے لیے ایک شخص کو مقرر کیا گیا تھا ان کی رپورٹ ریکارڈ میں محفوظ ہے جس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے :-

"موضع سورج پورہ ضلع آگرہ جس میں تقریباً سو گھر ملکانہ راجپوت آباد ہیں، ان کو ۵ ارجولائی ۱۹۲۳ء بروز اتوار بہ جبر شدھی کرنے کا اندیشہ ہے، کوئی عالم وہاں بغرض مباحثہ روانہ کیا جائے۔ ۱۲ ارجولائی کو دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے شعبۂ تبلیغ وحفاظت اسلام کے نمائندے پہونچے۔ اس موضع میں آریوں نے چالیس نفوس کو اپنی عیاریوں و سازشوں

---

[1] ریکارڈ روم مرکزی جمعیۃ علماء ہند دہلی فائل ۲ ریکارڈ ۷۶ بابت ۱۹۲۳ء۔

شکار بنالیا ہے، ان کا روح رواں بھورے خاں، مُنوا، لکھی، ٹکٹا، ملکھان اور بہرام تھے، آریہ اُپدیشکوں نے بھورے خاں کو جو سب سے با اثر تھا اپنے مجمع میں لے جاکر مسلمانوں کو وہاں پہونچنے سے روکا، اس کو اولاً برادری میں ملانے کا دھوکا دیا، اس کے بعد اسلام کی بُرائیاں بیان کرنی شروع کیں اور یہ بھی کہا کہ ہم تم کو دو سو پچاس روپیہ دیں گے، تم آریہ ہوجاؤ بھورے خاں نے کہا کہ ہم روپیہ پر دھرم نہیں بیچیں گے اور ان کے مجمع سے چلا آیا، آریوں نے دوسرے کچھ لوگوں کو شدھ کیا، اس طرح وہ چالیس آدمیوں کی شدھی کرسکے۔"[1]

رستم گڈھی میں شدھی:۔ تبلیغ وحفاظتِ اسلام جو جمعیۃ علماء ہند کا ایک شعبہ تھا اور ضلع آگرہ کے حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا اور حسب موقعہ کارروائیاں کرتا تھا اس کی ایک رپورٹ جو مرکزی دفتر کو موصول ہوئی۔ اس رپورٹ میں یہ ٹکڑا بھی ہے:۔

"رستم گڈھی ضلع آگرہ کے ملکانوں نے صاف صاف مجھ سے کہدیا تھا کہ ہمیں روپیوں کی ضرورت ہے، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو بہ ظاہر راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ کل تین خاندان مرتد ہوئے تھے جن میں سے ایک بفضلہٖ داخل اسلام ہوچکا ہے دوسرے دو بھی ان شاء اللہ واپسی کے لیے تیار وآمادہ ہوجائیں گے۔"[2]

مختلف مواضعات میں شدھی:۔ آریہ سماجی اخباروں میں شاہ سرخیوں سے متعدد مواضعات کے مسلمانوں کے آریہ ہونے کی خبر شائع ہوئی تو مرکزی دفتر سے علاقہ کے ذمہ دار اور تبلیغ وحفاظتِ

---

[1] فائل نمبر ۲ ریکارڈ نمبر ۳۹ بابت سنہ ۱۹۲۳ء، ریکارڈ روم مرکزی جمعیۃ علماء دہلی

[2] فائل نمبر ۲ ریکارڈ نمبر ۵ بابت سنہ ۱۹۲۳ء، ریکارڈ روم جمعیۃ علماء ہند دہلی۔

اسلام کے سربراہ سے رپورٹ طلب کی گئی جس میں دریافت کیا گیا کہ :۔
"ہار ہری کنڈ، ننگلہ امر سنگھ، تانگہ کا ننگلہ، سکندرہ وغیرہ میں شدھی کے متعلق جو مضامین ۱۴ جون کے "کیسری" اخبار میں آئے ہیں اور اخبار "تیج" نے علاوہ ان دیہاتوں کے اور بھی ضلع آگرہ کے دو ایک دیہات کی شدھی کا ذکر کیا ہے، اس کی کہاں تک اصلیت ہے۔ اگر پہلے سے آپ کا خط آجاتا تو فوری اس کی تردید شائع کردی جاتی، جہاں تک ہو سکے جلد تحقیقات کر کے مطلع فرمایئے"۔[1]

ضلع ایٹہ میں آریہ سماجی فتنہ :۔ ضلع ایٹہ کے دیہاتوں میں بھی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے مسلمان صورتاً اور سیرتاً غیر مسلم معلوم ہوتے تھے اس لیے آریہ سماجیوں نے ان کو شدھی کرنے کی مہم چلائی، جمعیۃ علماء ہند کی طرف شعبۂ تبلیغ و حفاظتِ اسلام کی ایک شاخ وہاں قائم کر کے ضلع کی ذمہ داری اس کو سپرد کی گئی، اس شاخ کی طرف سے رپورٹ موصول ہوئی کہ :۔

"اس سے پہلے ایک رپورٹ بھیج چکا ہوں، مکرر عرض ہے کہ شمشیر خاں نمبردار جو سکندر خاں کا بھائی ہے اور اپنے بھائی کے ساتھ شدھی ہو گیا تھا لیکن اللہ کا فضل ہے کہ وہ پھر مشرف بہ اسلام ہو گیا ہے اور اس نے اپنے اثر سے دو چار کو اور بھی واپس کرایا ہے ان کا سب سے بڑا گروہ جس کا نام تنجن خاں ہے اس کو بھی واپس لا چکا ہے جس کا معاملہ آپ نے خود دیکھا ہے اس کے ساتھ اس کا لڑکا کرن خاں دوبارہ مسلمان ہو گیا۔ بنو خان نے بھی دوبارہ اسلام قبول کر لیا ہے سکندر خان کے بھائی بھی مرتد ہو گئے ہیں، انشاء اللہ دو چار روز میں سب کو واپس لائے گا۔ آریہ سماج اور ہندو ٹھاکر اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ لوگ دوبارہ مسلمان

---

[1] فائل ۲۲ ریکارڈ ۵۲ بابت ۱۹۲۳ء

نہ ہوں، جھگڑا کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں"۔[1]

علی گنج ضلع ایٹہ میں شورش :- ضلع ایٹہ کے موضع علی گنج میں بھی آریہ سماجیوں نے بڑی شورش پیدا کی اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی مہم چلائی، وہاں سے آئے ہوئے ایک خط سے صورتِ حال پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے اس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے :-

"قصبہ علی گنج ضلع ایٹہ میں میری قوم کے افراد بہت ہیں قریباً ایک سو سے زیادہ گھر ہیں جو علم سے بے بہرہ ہیں، چوں کہ میری قوم میں رسم و رواج مطابق اہلِ ہنود اکثر موجود ہیں، ادھر فتنہ ارتداد اُٹھا ہوا ہے اور اخباروں میں یہ خبر آچکی ہے کہ اس قوم کو بھی آریہ بنایا جائے گا۔ اس قوم کا زیادہ تعلق بوجہ کاشت پیشہ ہونے کے ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں سے ہے اور انھیں لوگوں کا دباؤ اس قوم پر ہے اگر کسی وقت اہلِ ہنود نے فتنہ ارتداد کے متعلق اس قوم پر حملہ کیا تو بعض جہلاء کا جن کی صحبت اکثر اہلِ ہنود کے ساتھ رہتی ہے بچنا مشکل ہوگا"۔[2]

خطرے کا الارم :- ریواڑی جمعیۃ علماء کے سکریٹری نے مرکزی جمعیۃ علماء کو اپنے ضلع میں آریہ سماجیوں کے اثرات اور خطرناک عزائم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ :-

"..... ضلع کی تنظیم ہونے تک تحصیل ریواڑی، تحصیل تجارہ، تحصیل کشن گڈھ کو عملی جولانگاہ بنانے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ کل مولانا علی حسن صاحب مبلغ جمعیۃ کو اپنے ایک مقامی مبلغ کے ساتھ تحصیل تجارہ و تحصیل کشن گڈھ کے علاقے میں روانہ کر دیا ہے، چار مواضع اس وقت تذبذب کی حالت میں ہیں، جن میں بگھیری اور تلواڑ میں زیادہ خطرہ ہے، بانس کانکر میں

---

[1] فائل نمبر ۲ ریکارڈ نمبر ۳۸ بابت ۱۹۲۳ء [2] ریکارڈ نمبر ۱۳ بابت ۱۹۲۳ء

اس سے کم مگر ہے ضرور، اس لیے ابھی ضرورت اس بات کی ہے کہ وہاں ایک دو مبلغ گشت کریں اور تلقین بھی کرتے رہیں۔" [1]

شدھی کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے :- رپورٹ بالا میں جس خطرہ کا الارم دیا گیا تھا اس کے کچھ ہی دنوں بعد جو رپورٹ دفتر کو موصول ہوئی اس میں اطلاع دی گئی کہ :-

"مولوی اصغر علی شاہ کو دہلی روانہ کرنا تجویز کر دیا گیا تھا لیکن صبح کی ڈاک سے مولانا علی حسن صاحب کا خط موصول ہوا کہ ۱۰ اگست ۱۹۲۳ء کو موضع تلواڑہ میں شدھی ہوگی اور دُور دُور کے آریہ سماجی جمع ہوں گے اور مسلمان گوجروں کو اسی روز شدھی کیا جائے گا، اس لیے مولانا اصغر علی شاہ صاحب کو پھر دوبارہ اسی علاقہ میں واپس بھیج رہا ہوں۔" [2]

آریہ بنانے کیلئے دولت کا استعمال :- ضلع آگرہ بھی ان مخدوش علاقوں میں شامل ہے جہاں آریہ سماج اپنی پوری قوت کے ساتھ مصروفِ کار تھا، چونکہ اس ضلع میں ملکانہ راجپوتوں کی آبادی زیادہ ہے اور وہ اپنی معاشرت، طور طریق، رسم و رواج کی وجہ سے مسلم و غیر مسلم کا فرق بھی اُٹھا چکے ہیں، اسلام کے بنیادی عقائد سے بھی واقف نہیں، وہی مرتد بنائے جا رہے ہیں، انھیں پر آریہ سماج بڑی سے بڑی رقمیں خرچ کر رہا ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے شعبہ تبلیغ و حفاظتِ اسلام کے ذیلی دفتر شہر آگرہ سے ایک رپورٹ مرکزی دفتر کو موصول ہوئی جس میں اطلاع دی گئی کہ :-

"آج اس وقت موضع سورج پورہ سے ہمارے مبلغ نے ایک رپورٹ بھیجی ہے کہ یہاں کل بروز منگل ۴ مارچ ۱۹۲۳ء کو شدھی کی تاریخ مقرر ہوئی ہے اور اعداء اسلام نے وہاں کے لوگوں کو زرِ کثیر دے کر ارتداد کے

---

[1] فائل ۳ ریکارڈ ۱۶ بابت ۱۹۲۳ء [2] فائل ۲ ریکارڈ ۱۷ بابت ۱۹۲۳ء

لیے تیار کر لیا ہے، اس لیے آپ سے استدعا ہے کہ براہ کرم آپ اس کے انسداد کی کارروائی فرمائیں، ہم مبلغین کے ساتھ وہاں پہونچ رہے ہیں۔"[1]

متعدد ضلعوں میں آریوں کی سرگرمیاں :- شعبہ تبلیغ وحفاظت اسلام کے دفتر آگرہ کے تحت فرخ آباد، ایٹہ اور مین پوری میں بھی تھے اس لیے مرکز کے مبلغین کا دائرۂ عمل فرخ آباد کے مواضعات تک پھیلا ہوا تھا اس لیے آگرہ دفتر سے مرکزی دفتر کو جو رپورٹ بھیجی گئی اس میں تفصیلی صورت حال کو پیش کیا گیا، رپورٹ میں ہے :-

"ضلع ایٹہ میں آریوں کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ رہا ہے حالت اندیشہ ناک ہے ضلع فرخ آباد میں موضع جے سنگھ پورہ تحصیل چھرا ٹو میں وہاں کا زمیندار میاں خان نو مسلم راجپوت آریہ ہو گیا ہے اور دوسرے لوگ بھی تیار ہیں موضع خوجو پور میں ایک خاندان آریہ ہونے کو تیار ہے اور وہاں آریوں کی ریشہ دوانیاں جاری ہیں اسی کے قریب ایک گاؤں کمال پور ہے وہاں آریوں کی کارروائی جاری ہے۔ کسی انجمن کا مبلغ وہاں نہیں ہے یہ اطلاع بہت معتبر اور صحیح طور پر ملی ہے، میاں صاحب زمیندار جے سنگھ پور، پورے کنبہ کے ساتھ آریہ ہو گیا ہے۔ ضلع مین پوری اور ایٹہ میں قادیانیوں نے اپنا تسلط جما لیا ہے اور اب یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ مسلمانوں میں جو مسلمان راجپوت ہیں قدیم مسلمان نہیں ہیں، اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں اور قادیانی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ضلع متھرا کی ایک رپورٹ :- مخدوش علاقوں میں ضلع متھرا بھی شامل تھا، وہاں آریہ سماجیوں نے پوری طاقت لگا دی ہے اور بہت سے قدیم الاسلام مسلمانوں کو شدھی کر کے ان کو آریہ سماجی

---

[1] فائل ۲/ ریکارڈ ۲۳ بابت ۱۹۲۳ء (آگرہ)

[2] فائل ۲/ ریکارڈ ۲۳ بابت ۱۹۲۳ء ریکارڈ روم جمعیۃ علماء ہند دہلی مسجد عبدالنبی۔

بنالیا ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب دہلوی ناظم جمعیۃ علماء ہند کے نام جمعیۃ کے مبلغ نے مندرجہ ذیل اطلاع دی:۔

"آپ نے جس کام کے لیے مجھے روانہ کیا تھا اس کام کو میں نے انجام دے دیا ہے دیگر یہ کہ رتنا نمبردار سے میری گفتگو ہوئی اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ہم واپس آجائیں گے، لیکن ہم کو خطرہ ہے کہ آریوں نے ہم سے نشانی انگوٹھا لیا ہے ہم کو کوئی نقصان نہ پہونچائیں، ہم نے نمبردار کو کچہری لے جاکر وکیلوں سے دریافت کرادیا کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے، بخوبی واپس آسکتے ہیں، اب وہ نمبردار یہ کہتا ہے کہ ہمارے اوپر "تگائی" کے آٹھ سو روپے ہیں اگر تم مجھ کو یہ روپے دلوادو تو ہم مع تمام گاؤں کے واپس آجائیں گے"۔[1]

حالات پر ایک طائرانہ نظر:۔ میں نے کئی سو خطوط اور رپورٹوں میں سے یہ چند رپورٹیں اور خطوط آپ کے سامنے پیش کیے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۲ء کی نان کوآپریشن تحریک میں حصہ لے کر جیل جانے والے ایک سوامی نے معافی مانگ کر رہائی حاصل کرکے شدھی اور سنگھٹن کا جو فتنہ برپا کیا وہ درحقیقت آریہ سماج کا وہ جارحانہ رُخ تھا جو صرف مسلم دشمنی پر مبنی تھا، اس فتنہ نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جتنی بھی ہندو ریاستیں تھیں جے پور، جودھ پور، الور، بھرت پور، ان میں آریہ سماجی مسلمانوں کے ایمان پر شبخون مارنے میں بہت جری تھے، ان کے علاوہ اتر پردیش کے مغربی اضلاع میں دس بارہ اضلاع ایسے تھے جہاں آریہ سماج کا یہ فتنہ بڑی شدت اختیار کرگیا اور اخبارات میں روزانہ مسلمانوں کے مرتد ہونے کی خبریں موٹی موٹی سرخیوں سے شائع ہوتی رہتی تھیں مسلمان گھبرا اٹھا لیکن مسلمانوں کی کوئی مستحکم تنظیم ایسی نہیں تھی کہ وہ ان تمام مقامات پر اپنی مدافعانہ

---

[1] ریکارڈ روم مرکزی جمعیۃ علماء دفتر نمبر ۲ دہلی فائل نمبر ۲ ریکارڈ ۷۹ بابت ۱۹۲۳ء (متھرا)

سرگرمیاں جاری رکھ سکتی، بعض افراد نے ذاتی طور پر اس مہم کو چلایا لیکن اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ تب جمعیۃ علماء ہند کے رہ نماؤں نے اس ذمہ داری کو اپنے سروں پر لیا۔ ابھی جمعیۃ علماء کو قائم ہوئے تین چار ہی سال ہوئے تھے لیکن یہ تنظیم اپنا ایک اثر رکھتی تھی اور اس تنظیم کے ذمہ دار حضرات کا ذاتی طور پر ملک میں اثر تھا، ان کی شخصیتیں متعارف اور ان کے علم و فضل اور ان کے جوشِ عمل اور عظمت کردار سے پورا ملک واقف تھا، اس لیے انہوں نے ارتداد کے سیلاب کی روک تھام کے لیے جان ہتھیلیوں پر لے کر عمل کے میدان میں آگئے، اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ جو حضرات پوری دل سوزی کے ساتھ اس مہم کو سرانجام دینے میں لگ گئے ان میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ دہلوی

ؒ حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ صاحب شاہ جہاں پوری ثم دہلوی علماء دیوبند کے سرخیل اور ہندوستان کے متفقہ مفتی اعظم تھے۔ آپ کی ولادت شاہ جہاں پور میں ۱۲۹۲ھ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزازیہ میں حاصل کی پھر آپ جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے، حدیث آپ نے دیوبند میں پڑھی آپ کے اساتذہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوری اور مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ فراغت کے بعد شاہ جہاں پور میں مدرسہ عین العلم میں تعلیم و تدریس کا کام کیا، پھر آپ مدرسہ امینیہ دہلی میں بلا لیے گئے۔ پھر پوری زندگی آپ نے اس مدرسہ کو بنانے اور سنوارنے میں صرف کردی اور عمر کے آخر لمحوں تک اسی مدرسہ سے وابستہ رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے قیام سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برابر آپ صدر رہے، سعودی حکومت نے حجاز پر قبضہ کرنے کے بعد دنیائے اسلام کے علماء کرام کی ایک کانفرنس بلائی تھی تاکہ حجاز کے نظام حکومت میں ان سے مشورہ لے۔ حضرت مفتی صاحب اس کانفرنس میں جمعیۃ علماء ہند کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں آپ کی ذہانت و فطانت کا جوہر کھلا۔ اس کانفرنس میں آپ کا کردار بہت ہی مؤثر رہا۔ قاہرہ (مصر) میں فلسطین کانفرنس ہوئی، ہندوستان کی طرف سے آپ نمائندہ بن کر تشریف لے گئے۔ جامعہ ازہر کے علماء نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ ۱۹۲۳ء میں جب آریوں کا فتنہ ارتداد اٹھا تو آپ خود و فود لے کر ان علاقوں میں برابر جاتے رہے اور پورا نظام قائم کردیا، آزادی کے بعد دہلی کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور مولانا احمد سعید صاحب دہلوی اور مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنوی کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں ان کے ساتھ دبستانِ دیوبند کے بے شمار علماء دست و بازو بنے ہوئے تھے۔

ان حضرات نے دفتر جمعیۃ علماء ہند کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور تمام مخدوش علاقوں میں وفود اور مبلغین کو بھیج کر ان کے کاموں کی نگرانی فرمائی، آدمیوں اور سرمایہ کی فراہمی مرکزی دفتر کی ذمہ داری تھی، دارالعلوم دیوبند نے چوبیس مبلغین کا ایک بڑا جتھہ اس کام کے لیے جمعیۃ علماء ہند کو دیا۔ ان تمام علماء کو مخدوش علاقوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا، اس طرح دو تین برسوں تک شب و روز کی جدوجہد کے بعد اس فتنہ پر کچھ قابو پایا گیا۔

اب آریہ سماجی صرف اسٹیج سے اسلام پر اعتراضات کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر جارحانہ رویہ اختیار کرلیا اور ایسے شکار تلاش کرنے شروع کردیئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں آپ نے سرفروشانہ خدمات انجام دیں۔ آخر عمر میں سیاسیات سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو انتقال فرمایا اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے روضہ کے جنوبی دروازے کے چبوترے پر آپ کو دفن کیا گیا، مزار پر کتبہ لگا ہوا ہے۔

لہ ہندوستان کے طوطی شکر بیان شیریں زبان مقرر جن کو ملک نے سحبان الہند کا خطاب دے دیا تھا۔ آپ کی پوری زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں گذری، تحریک خلافت کے زمانہ سے قومی خدمات کے میدان میں آئے اور قیام جمعیۃ علماء ہند کے وقت سے ۱۹۴۰ء تک مسلسل اس کے ناظم اعلیٰ رہے۔ ۱۹۴۱ء میں مبارک پور ضلع اعظم گڈھ کی ایک تقریر پر مقدمہ چلا اور اعظم گڈھ جیل میں رہے۔ یہیں جیل میں آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ ۱۹۲۳ء کے فتنہ ارتداد میں آپ کا کردار مثالی رہا، سارے نظام کو آپ چلاتے رہے۔ ہر طرح کی تنظیم و مالی امداد آپ کے ذمہ تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی مدت میں آپ نے قرآن پاک کی ایک تفسیر دہلی کی شستہ اور پاکیزہ اردو زبان میں لکھی "جو کشف الرحمٰن" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۶۰ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے اور مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے جنوبی دروازے کے چبوترے پر آسودۂ خواب ہیں۔

جن کو آسانی کے ساتھ شکار کیا جا سکے، اس کام میں ابتداءً ان کو کامیابی بھی ملی، علماء دیوبند نے بھی اسٹیج چھوڑا اور عملی جدوجہد کے میدان میں سر سے کفن باندھ کر کود پڑے غنیمت یہ تھا کہ عام ہندو طبقہ اس جارحانہ اقدام سے متفق نہیں تھا کیونکہ ان کے نزدیک کوئی مسلمان مذہب بدل کر ہندو نہیں ہو سکتا ہے اور پھر کانگریس کی تحریک نان کوآپریشن شباب پر تھی، اور تعلیم یافتہ ہندو طبقہ اس کو آزادی کی راہ میں سنگ گراں سمجھتا تھا اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے اس لیے سیاسی لیڈروں کی ہمدردیاں آریہ سماجیوں کے ساتھ نہیں تھیں لیکن یہ حقیقت تھی کہ دیہات کے ہندو زمیندار آریہ سماجیوں کے ہم نوا ہو جاتے تھے اور مخدوش علاقوں میں عام ہندو شدھی میں دلچسپی لیتے اور آریہ سماجیوں کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے اس لیے مسلمان علماء کا ان علاقوں میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا، بہت سے علاقوں میں مبلغین کے لیے جان کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور خطرناک سے خطرناک علاقوں میں پہونچتے رہے اور آریوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی جدوجہد کرتے رہے، اور اکثر و بیشتر کامیاب ہوتے رہے۔

دین کی حفاظت ہمارا پہلا فرض :- علماء دیوبند اور دبستانِ دیوبند کا ایک مؤقر طبقہ اگرچہ کانگریس کی تحریک ترکِ موالات و عدم تعاون میں شریک تھا اس لیے وہ ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے تھے لیکن جب آریہ سماجیوں کا فتنہ ابھرا اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو دین کی حفاظت کے اہم ترین فریضہ کی ادائیگی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا کیونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دین کی حفاظت ہماری زندگی کا سب سے اہم اور سب سے پہلا فریضہ ہے، انہوں نے شبانہ روز اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے وسائل فراہم کیے اور اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے طریقۂ کار متعین کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے ان تمام مخدوش علاقوں کا سروے کیا جہاں جہاں یہ فتنہ سر اٹھا رہا ہے، اس کی فہرست بنائی اور مختلف مرکزی مقامات پر اپنے ذیلی دفاتر قائم کیے ان دفاتر کے لیے ہمہ وقتی کارکن اور مبلغ مہیا کیے اور خود مرکز میں بیٹھ کر اس مشنری کو متحرک رکھتے رہے، اور مالیات کا بندوبست کرتے رہے۔

سرکلر اور ہدایات :- جب شعبۂ تبلیغ و حفاظتِ اسلام کے نام سے ایک مستحکم نظام عمل بن گیا تو تمام شاخوں اور کارکنوں کو باہم مربوط رکھنے اور ہر ایک کے لیے دائرہ کار متعین کرنے کے لیے حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی ناظم جمعیۃ علماء ہند نے ایک سرکلر جاری کر کے ماتحت شاخوں کو مندرجہ ذیل ہدایات دیں، اور ان کو احکام جاری کیے:-

"جناب کی مرسلہ رپورٹ موصول ہوئی، مندرجہ ذیل باتیں آپ کی اطلاع کے لیے تحریر کی جاتی ہیں۔ مخدوش اضلاع کو دو مرکزوں کے تحت تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک مرکز دہلی اور ایک مرکز متھرا ہوگا، دہلی مرکز کے تحت مندرجہ ذیل اضلاع ہیں، گوڑگانوہ، رُہتک، کرنال، میرٹھ، حصار، بلند شہر، متھرا مرکز کے تحت حسب ذیل اضلاع ہیں، متھرا، آگرہ، بھرت پور، اٹاوہ، علی گڈھ، ایٹہ، مین پوری، فرخ آباد۔

جس قدر مبلغین آپ کے تحت ہیں انھیں مختلف علاقوں میں منقسم کر دیجیے۔، دارالعلوم دیوبند نے جو چوبیس مبلغین بھیجے ہیں وہ آپ کے تحت کام کریں گے، انھیں آپ جہاں چاہیں متعین کر دیجیے، ان کی فہرست اور علاقہ اور کارکردگی، تاریخ تعین وغیرہ دفتر ہذا کو ارسال فرما دیجیے، جس قسم کے آدمی کی ضرورت ہو فوراً مطلع کیجیے۔ جس طرح مخالف آپ کے خلاف کوشش کر رہے ہیں آپ کو بھی یہی حق ہے کہ آپ بھی ان کے خلاف اپنے کو کامیاب بنائیں"[1]

خصوصی کارکن :- دبستانِ دیوبند کی مشہور تنظیم جمعیۃ علماء ہند سیاست و مذہب دونوں کو لے کر کام کرتی تھی، دونوں کے حدود اور فرائض مقرر تھے اس لیے وہ ایک طرف انتہا پسند سیاست میں قید و بند کی سزائیں بھگتتے تھے اور جیلیں کاٹتے تھے، دوسری طرف جب کبھی دین پر حرف آنے لگتا تھا تو اسلام دشمن

---

[1] فائل نمبر ۲ ریکارڈ ۴۶ بابت ۱۹۲۳ء

طاقت کے سامنے سینہ سپر بھی ہوجاتے تھے اور بلاخوف لومتہ لائم اپنی دینی سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کر دیتے تھے، اسی لیے جب فتنۂ ارتداد اٹھا اور شدھی سنگھٹن کی تحریک چلی اور آریوں نے دولت و طاقت سے کام لے کر ایمان پر ڈاکہ ڈالنا شروع کیا تو یہی علماء اس کے سامنے ایک آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے اور اس مقصد کے لیے ایک نیا شعبۂ تبلیغ و حفاظتِ اسلام کے نام سے کھول دیا جو جمعیۃ علماء ہند کا ایک تحتی نظام تھا، اس کی چھیتر شاخیں فتنۂ ارتداد سے متاثر تمام مخدوش علاقوں میں مصروفِ کار ہوگئیں، ان تمام شاخوں کی مفصل فہرست، ان کے ذمہ داروں اور کارکنوں کی فہرست جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر نئی دہلی کے ریکارڈ روم میں موجود ہے۔ مختلف مقامات پر ان کے نام اگرچہ مختلف ہیں لیکن ہر ایک کا مرکزی جمعیۃ علماء سے باضابطہ الحاق تھا، ان سب کو ہدایات یہیں سے دی جاتی تھیں اور مرکزی دفتر کے مرتب کردہ نقشۂ عمل اور حکمنامہ کے مطابق کام کرنا ہوتا تھا۔[1]

آگرہ سے رپورٹ اور مرکز سے ہدایت :- آگرہ دفتر سے کارگذاری رپورٹ موصول ہوئی جس میں مانگلہ کے بارے میں حسبِ ذیل تفصیل پیش کی گئی :-

"دہلی سے واپسی کے بعد آٹھ شدھیاں توڑیں اور مرتدین نے کلمۂ توحید پڑھا، اور آئندہ کے لیے تمام رسومِ شرکیہ سے توبہ کی، اُمید قوی ہے کہ بقیہ مرتدین بہت جلد واپس ہوں گے۔"[2]

دوسری رپورٹ :- متھرا سے متعلق ایک دوسری رپورٹ میں ہم کو یہ تفصیل ملتی ہے :-

"آج کل آریوں نے پنچائتوں کا بہت شور مچا رکھا ہے مگر اس پنچائت میں بھی بحمداللہ کامیابی رہی، تین چار یوم کے بعد پھر وہیں پنچائت

---

[1] فائل نمبر ۲ ریکارڈ نمبر ۶ بابت ۱۹۲۳ء

[2] فائل نمبر ۳ ریکارڈ نمبر ۲ بابت ۱۹۲۳ء

ہے، اس کے متعلق کام کر رہا ہوں"۔[1]

مرکزی دفتر سے ذمہ داروں کو ہدایت دی گئی کہ تروڑی (متھرا) کی پنچائت کے متعلق تمام آریہ سماجی اخبارات بڑا شور وغل مچا رہے ہیں، جلد روداد بھیجیں، اپنی رپورٹ ہفتہ وار بھیجتے رہیں[2]

مسلسل نگرانی وہدایات:- مخلص اور جفاکش علماء کو ان علاقوں میں متعین کرکے مرکزی دفتر خاموش نہیں ہو گیا بلکہ ان کو مسلسل ہدایات دیتا رہا اور ان کی کارگذاریوں کا جائزہ لیتا رہا اور ہر قسم کے تعاون کا ان کو بھرپور یقین دلاتا رہا تاکہ وہ یکسو ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ مولانا عبدالحلیم[3] صدیقی لکھنوی کا ایک سرکلر ریکارڈ میں ہے جو ان دنوں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم تھے

> "مولانا اکرام اللہ اور مولوی محمد یونس صاحب تشریف لا رہے ہیں مستقل طور پر کام کریں گے، کسی مقام پر ان کو مقرر کر دیجئے اور جس قدر مبلغین کی ضرورت ہو فوراً تحریر کیجئے، جمعیۃ کے شعبہ تبلیغ کی شاخ متھرا میں قائم کر دیجئے، اندھی، نوگانواں اور جن قصبات میں مناسب سمجھئے اپنا ایک آدمی چھوڑ کر مقامی راسخ العقیدہ جفاکش مسلمان راجپوت کو خدمت تبلیغ کے لیے چنیئے وہ ہمارے مبلغین کے مددگار ہوں گے، راجپوت مبلغین معتمد علیہ جس مقدار

---

[1] فائل ۳۳ ریکارڈ ۵ بابت ۱۹۲۴ء [2] فائل ۳۳ ریکارڈ ۵ بابت ۱۹۲۴ء [3] مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنوی نے پوری زندگی قومی خدمات میں گذاری، عربی کے بہترین ادیب اور اہل زبان کی طرح عربی بولتے تھے جب حجاز پر سعودی حکومت کا قبضہ ہوا تو شاہ نے علماء اسلام کی ایک کانفرنس مکہ مکرمہ میں بلائی تھی تاکہ نظام حکومت کے سلسلہ میں مشورہ لیں، اس کانفرنس میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے ہمراہ مولانا عبدالحلیم لکھنوی بھی تشریف لے گئے تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے متعدد بار جیل گئے۔ آپ کا وطن ملیح آباد ضلع لکھنؤ ہے۔ ساری زندگی قومی خدمات کی وجہ سے عسرت میں گذری اور اسی عسرت کی زندگی میں آخرت کا سفر اختیار کیا۔

میں فراہم ہوسکیں لے لیجئے، ان کے معاوضہ خدمت کا تخمینہ لکھیئے تاکہ منظوری دی جائے اور جہاں جہاں مساجد و مدارس کے قیام کی ضرورت ہو وہاں اس سلسلہ کو شروع کرنے کے لیے ایسے مقامات کی فہرست تیار فرما کر بھیجئے غرضیکہ کام کو ایسا منظم کر دیجئے کہ معمولی نگرانی بھی کافی ہو۔"[1]

مخدوش علاقوں میں مساجد و مدارس:۔ جہاں جہاں فتنہ ارتداد پوری شدت سے ابھرا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں بہت سے مسلمان دور افتادہ گاؤں اور آبادیوں میں سکونت پذیر تھے ان کی چاروں طرف غیر مسلموں کی آبادی تھی اور وہ ان کے مقابلہ میں خوش حال یا زمیندار اور جاگیر دار تھے، مسلمان یا تو کاشتکار تھے یا مزدور پیشہ اور اپنی ضرورتوں کے موقعہ پر ہندو ساہوکاروں سے سودی قرض لیتے تھے اس لیے وہ ہر طرح سماجی اعتبار سے غیر مسلموں کے دست نگر محتاج اور زیر اثر تھے اور دور افتادہ دیہاتوں میں رہنے کی وجہ سے وہاں مبلغین کا پہونچنا دشوار تھا اس لیے وہ اسلام کے بنیادی عقیدوں اور ایمان کے تقاضوں سے نابلد تھے بہت سے رسم و رواج جو ان کے گرد و پیش کے غیر مسلموں میں رائج تھے یہ نام کے مسلمان بھی ان میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے، دیوی دیوتاؤں کی پوجا پاٹ، چڑھاوے کے سلسلہ میں جو میلے ٹھیلے ہندوؤں میں ہوتے تھے ان میں مسلمان مرد اور عورتیں بھی برابر شریک ہوتی تھیں، ہولی، دیوالی، دسہرہ کے ہندوانہ تیوہاروں میں بھی وہ برابر کے شریک تھے اور یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ کون ان میں ہندو ہے اور کون مسلمان، ایسے ہی مسلمانوں کو آریوں نے نشانہ بنایا تھا، مغربی اضلاع کے دیہاتوں میں ملکانہ راجپوتوں کی ایک قوم تھی جو صدیوں سے مسلمان چلی آرہی تھی لیکن ان کی شکل و صورت لباس، کھانے پینے کے برتن، رسم و رواج طور طریق سب ہندوانہ ہو چکے تھے، سب سے پہلے آریوں نے انھیں میں کام شروع کیا اور ان کو اس لیے کامیابی ملی کہ ان نام کے مسلمانوں کو پتہ ہی نہیں تھا

---

[1] فائل نمبر ۲۔ ریکارڈ نمبر ۴۳ بابت ۱۹۲۳ء۔

کہ ہم کوئی بہت اہم نازک اور خطرناک کام کر رہے ہیں، اور وہ بڑی آسانی سے شکار ہو گئے حالانکہ وہ پشتہا پشت سے مسلمان تھے لیکن ان میں اور ہندوؤں میں کوئی مابہ الامتیاز چیز باقی نہیں رہ گئی تھی، ان کا مذہب بدلنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی ایک کپڑا اُتار کر دوسرا کپڑا پہن لے اس سے زیادہ تبدیلی مذہب کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی، ارتداد کی اصل وجہ یہی جہالت اور اسلام سے ناواقفیت تھی، علماء دیوبند نے سب سے اہم اور ضروری یہ سمجھا کہ ان میں پہلے اپنے مسلمان ہونے کا یقین اور احساس پیدا کیا جائے، اور اس کے لیئے واحد شکل یہ سمجھ میں آئی کہ اس طرح کے مسلمانوں کی ہر قابلِ ذکر آبادی میں ایک مسجد قائم کر دی جائے اور اس میں کسی پڑھے لکھے آدمی کو امام مقرر کر دیا جائے، جو بتدریج ان کو مسجدوں میں لائے، دعائیں سکھائے، نماز کا طریقہ سکھائے اور نمازی بنائے اور دین کی ابتدائی اور بنیادی باتیں ان کے ذہن نشین کراتا رہے، دوسرا بنیادی کام یہ طے کیا گیا کہ اس طرح کے مسلمانوں کی کسی بڑی آبادی میں دینی مکتب کھول دیا جائے اور قرب وجوار کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں رہنے والے مسلمانوں کے پاس جا کر ان کے بچوں کو مکتب میں لا کر اسلام کی بنیادی تعلیم دی جائے، یہ دونوں کام بنیادی تھے اور یہی ان مسلمانوں کے فتنۂ ارتداد سے مستقبل میں بچنے کا مستقل اور دیرپا علاج تھا۔ ہمارے علماء نے اس پروگرام پر پوری سرگرمی سے عمل شروع کر دیا اور پورے علاقے کا جائزہ لے کر مختلف آبادیوں میں اس طرح کے مکاتب قائم کر کے مرکزی دفتر سے وہاں معلمین کی پوری ٹیم بھیج دی گئی اور انہوں نے کام شروع کر دیا۔ ان تمام مخدوش علاقوں میں جہاں جہاں ارتداد اور شدھی کے خطرات زیادہ تھے ان علاقوں میں چالیس دینی مکاتب جمعیۃ علماء ہند نے قائم کیئے اور سارا بجٹ، مکاتب کی عمارت، فرنیچر، کتاب، کاپیاں، معلمین کی تنخواہیں، غرضیکہ ان مکاتب کے جملہ اخراجات کی ذمہ دار جمعیۃ علماء ہند کا مرکزی دفتر تھا اور سارا بجٹ یہیں سے پورا کیا جاتا تھا، مرکزی دفتر سے ان مکاتب کی پوری نگرانی کی جاتی تھی اور ہر مہینہ ان سے کارگذاری رپورٹ مانگی جاتی تھی اور سال کے آخر میں مکاتب کے سارے رجسٹر حاضری طلبہ، رجسٹر حاضری مدرسین، ان کی تنخواہوں کی ادائگی کا رجسٹر لڑکے اور لڑکیوں کی فہرست معہ ذات وقوم مقدار خواندگی کی مفصل رپورٹ

مرکزی دفتر میں منگوائی جاتی تھی۔ آج بھی وہ سارے کاغذات اور رجسٹر مرکزی دفتر کے ریکارڈ روم کی فائل نمبر ۲۔ ریکارڈ ۵۷ بابت ۱۹۲۳ء میں موجود ہیں اور دیکھے جا سکتے ہیں۔

دولت کا جادو:- آریوں نے ان مخدوش علاقوں کے پسماندہ مسلمانوں پر پنچائتوں کے ذریعہ حملہ کا آغاز کیا چند ممتاز راجپوت مسلمان چودھریوں کو مرتد بنایا اور ان چودھریوں اور نمبرداروں کو اپنا ہم نوا بنا کر برادری کے نام سے پنچائتیں بلانی شروع کیں۔ ان پنچائتوں میں برادری کے چودھریوں کے ذریعہ ان پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ اپنا دھرم تبدیل کر دیں اس کام کے لیے انہوں نے ان مرتد اور شدھی ہونے والے مسلمانوں کو روپے دے کر ان کی خدمات حاصل کر لیں اور یہ بھی آریوں کی بولی بولنے لگے اور ان کا برادری پر بڑا دباؤ تھا اور جب وہ سیکڑوں آدمیوں کی پنچائت میں ان کمزور مسلمانوں کو برادری سے خارج کرنے اور حقہ پانی بند کرنے کی دھمکی دیتے تو یہ بیچارے سہم جاتے اور مجبور ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے اور ایک ساتھ بہت سے لوگ دھرم تبدیل کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے اور اگر ان میں سے کچھ ہمت رکھتے اور انکار کرتے تو ہندو ساہوکاروں کے ذریعہ ان مقروض مسلمانوں پر دباؤ ڈالتے کہ یا تو ابھی قرض ادا کرو یا آریہ ہو جاؤ، دولت کا یہ جادو بھی ان کا کچھ کچھ کام کرتا تھا۔ دہلی کے مرکزی دفتر کو جب اس صورت حال کی اطلاع ملی تو اس کے علاج کی طرف بھی توجہ کی گئی چنانچہ ریکارڈ میں ہم کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کا ایک خط ملتا ہے جس میں آپ سربراہ دفتر کو تحریر فرماتے ہیں:-

> "مولانا محمد عرفان صاحب کو سردست ایک ہزار روپیہ دیدیا جائے تاکہ مولانا آگرہ تشریف لے جائیں اور کنور عبدالوہاب خاں صاحب و چودھری نذیر احمد خاں صاحب سے ملیں اور دہلی میں حکیم محمد اسحاق صاحب نے جو انتظامات کر لیے ہیں اس کی اطلاع دے دیں وہاں ضروریاتِ پنچایت کے متعلق ایک کام کا ذمہ دار شخص کنور صاحب اور چودھری صاحب کی معرفت مقرر کرالیں اور ہر ذمہ دار شخص کی تحریر پر اس سے مل کر اطمینان کر کے

ادا کریں، کنور صاحب اور چودھری صاحب اس امر پر پوری طرح گفتگو کرلیں کہ پنچایت کو کامیاب بنانے کے لیے راجپوت مقرر سمجھدار لوگ ضروری طور پر بلائے جائیں اور جو صورتیں پنچایت کی کامیابی کی ہوں ان کو عمل میں لانے کی پوری کوشش کریں"۔ [۱]

تحقیقات کی پیچیدگیاں:۔ شدھی ہونے والے لوگوں کے بارے میں یہ تفتیش بھی ضروری تھی کہ کیا وہ خاندانی اعتبار سے مسلمان تھے یا نہیں یا وہ کوئی ہندوؤں ہی کی پسماندہ قوم ہے، کیونکہ معاشرتی زندگی کچھ اس طرح کی تھی کہ ہندو مسلمان میں امتیاز کرنا مشکل تھا اس لیے جب اخباروں میں کسی گاؤں کے آریہ سماجی ہونے شدھی کیے جانے کی خبر شائع ہوتی تھی تو قدرتاً تشویش ہوتی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں؟ کیا وہ حقیقتاً مسلمان تھے اور ان کو زبردستی آریہ بنایا گیا یا وہ ہندوؤں ہی کی کوئی پچھڑی ذات یا برادری کے افراد ہیں جنہوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے اور آریہ اخبار اس کو مسلمانوں کے شدھی ہونے کے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اخباروں میں آیا کہ ضلع بدایوں میں ایک آبادی کو آریہ بنایا گیا تو مرکزی دفتر سے اس علاقہ کے ذمہ دار مبلغ سے رپورٹ طلب کی گئی اور ان کو لکھا گیا:۔

"ان لوگوں کی مذہبی و معاشرتی حالت لکھیں، اور یہ بھی لکھیں کہ یہ لوگ کس قوم سے تعلق رکھتے تھے، ان کے نام مسلمانوں کے سے ہیں؟ یا ہندوانہ؟ عورتیں لہنگا پہنتی ہیں یا پاجامہ؟ مردوں کے سروں پر چوٹیاں ہیں یا نہیں؟ اس کی بھی اطلاع دیجئے کہ مسجد کو کس نے گرایا ہے؟ مفصل حالات لکھیے، تاکہ کوئی کارروائی کی جائے"۔ [۲]

یہ تفتیش اس لیے ضروری تھی کہ موضع بہراوٹی تحصیل گنور تھانہ رجپورہ ضلع بدایوں

---

[۱] فائل نمبر ۲ ریکارڈ نمبر ۴۵ بابت ۱۹۲۳ء

[۲] فائل نمبر ۲ ریکارڈ نمبر ۷۶ (بدایوں) ۱۹۲۳ء ریکارڈ روم مرکزی جمعیۃ علماء نئی دہلی۔

کے بارے میں مبلغ نے یہ اطلاع دی کہ اس موضع میں پچاس گھر مسلمانوں کے ہیں مگر سب کے سب غریب و بے کس ہیں، صرف چھ آدمی مستحکم اور مضبوط ہیں، باقی تمام عنقریب مرتد ہونے والے ہیں۔

بازپرس و تنبیہہ و تاکید:۔ مبلغین کی کوتاہی یا کمزوری کی وجہ سے اگر آریہ سماجی غالب ہو جاتے اور مسلمانوں کو شدھی کر کے آریہ بنا لیتے تو مرکزی دفتر کی طرف سے ان سے باز پرس ہوتی اور ان کو تہدیدنامہ کے ذریعہ ان کی ذمہ داریاں اور فرائض کی طرف توجہ دلائی جاتی۔ رستم گڈھی ضلع آگرہ میں اس طرح کا واقعہ ہوا تو ٹھاکر محمد امین صاحب کو لکھا گیا کہ:۔

"موضع رستم گڈھی کی شدھی کی رپورٹ بھی موصول ہوئی، یہاں یہ خیال تھا کہ آپ کی کوششوں سے وہاں شدھی نہ ہو سکے گی لیکن یہ معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا کہ آپ موقعہ پر تشریف نہیں لے گئے، مجھے امید ہے کہ آپ کی کوششوں سے یہ مرتدین جلد واپس ہو جائیں گے۔"[1]

مرکزی دفتر ہر دم باخبر رہتا تھا:۔ دُور افتادہ علاقوں میں آریوں کی سرگرمیوں سے ہمارے علماء ہمہ وقت باخبر رہتے تھے اور جہاں بھی اسلام دشمن طاقتیں اقدامات شروع کرتیں فوراً علاقہ کے ذمہ داروں کو اس طرف توجہ دلائی جاتی اور فوری رپورٹ طلب کی جاتی، فائل میں اس طرح کی ایک رپورٹ میں ہے کہ:۔

"ضلع آگرہ سے دفتر کو رپورٹ موصول ہوئی ہے کہ مانگلہ کے بارے میں ۳۱ مئی کے "تیج" اور یکم جون کے "کیسری" میں جو خبر ایک "سنو دو ملکانوں کے شدھی ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی اس کی تحقیقات کے لیے ہم نے مولوی عزیز احمد صاحب بھوپالی مبلغ انجمن ہدایت الاسلام بھوپال متعینہ شعبۂ تبلیغ

---

[1] فائل ۲۰ ریکارڈ ۲۴ بابت ۱۹۲۳ء (آگرہ)

جمعیۃ علماء ہند کو بھیجا تھا تو وہ رپورٹ کرتے ہیں کہ یہ خبر بالکل غلط ہے، موضع مانانگلہ میں کوئی شدھی نہیں ہوئی البتہ ایک مدت سے آریوں کی نظر اس موضع پر ہے اور وہ تمام تر قوت اس موضع کے مسلمانوں کے خلاف صرف کر رہے ہیں۔ روپیوں کا لالچ دیتے ہیں، زمین سے بیدخل کرنے کا دباؤ ڈالتے ہیں، خفیہ سازشوں سے کام لیتے ہیں اور باوجودیکہ ملکان خان نمبردار نے نہایت بری طرح سے ان کو ڈانٹ پلائی اور آئندہ گاؤں میں آنے سے روکا مگر باوجود اس کے سازباز کرتے رہتے ہیں، ان کی آمد و رفت برابر جاری ہے"۔[1]

فتنہ کا استیصال:- ۱۹۲۲ء سے آریہ سماج نے یہ جارحانہ طرز عمل اختیار کیا اور پوری قوت سے یہ فتنہ برپا کیا ان کے تمام اقدامات طاقت کے بل بوتے پر برملا اور علی الاعلان ہوتے تھے، حالات اور ماحول ان کے موافق تھے کیونکہ در پردہ حکومت کی شہہ ان کو حاصل تھی، ہندو مسلم منافرت کی آگ کو پوری طرح سے بھڑکا کر عام ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی خلیج کو اتنا وسیع کر دیا کہ وہ شریف ہندو جو آریہ سماجی نہیں تھے وہ بھی اس منافرت کی آگ کی آنچ سے متاثر تھے جبکہ مسلمانوں کی اس تبدیلی مذہب سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ذہنی دوری پیدا کر دینے کی وجہ سے وہ آریہ سماج کے طرز عمل کی مخالفت میں کچھ نہیں بولتے تھے بلکہ سماجی طور پر آریہ سماجیوں کے وہ مددگار ہی بن گئے تھے اور فضا کے تناؤ میں ان کے طرز عمل سے اضافہ ہی ہوتا رہا۔

آریہ سماجی جب کسی گاؤں کے کچھ آدمیوں کو مرتد بنا لیتے تو اخباروں میں اس کی خوب تشہیر کرتے اور فخریہ اس کو بیان کرتے، دو تین اخبار جو دہلی سے نکلتے تھے وہ وہ آریہ سماجیوں کے اخبار تھے۔ ان اخبارات نے فضا کو بگاڑنے میں کلیدی رول

---

[1] فائل نمبر ۲ ریکارڈ نمبر ۳۶ بابت ۱۹۲۳ء (آگرہ)

ادا کیا، اتفاق سے یہ اخبارات اُردو کے اخبارات تھے اور مسلمان بھی ان کو پڑھتے تھے، اس صورتِ حال نے مسلمانوں کو بے چین کر دیا، ہمارے علماء نے صورتِ حال کی نزاکت کو شدت سے محسوس کیا اور اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے ان کو پوری قوتِ ارادی کے ساتھ میدان میں اُترنا پڑا، اس دور میں مسلمانوں کے ممتاز رہنماؤں میں مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی اور مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنوی اور دوسرے علماء دیوبند تھے، ابھی جمعیۃ علماء ہند کو قائم ہوئے تین چار ہی برس ہوئے تھے اور وہ اس مختصر مدت میں بھی ایک مستحکم تنظیم بن چکی تھی علماء حق نے جمعیۃ علماء کی تنظیم کو اس مورچہ پر لگا دیا اور شب و روز بے چینی کے ساتھ صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

مخدوش علاقوں میں جانا، پورے ملک سے جَری اور باہمت مبلغین کو تلاش کر کے کام پر لگانا، جری اور فولادی عزم و ارادے کے عالموں کو فراہم کرنا ان کو محاذِ جنگ پر بھیجنا، گھڑی گھڑی بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہدایات جاری کرنا، ہر طرح کے وسائل فراہم کرنا، مخدوش علاقوں ہی سے کچھ بہادر راجپوتوں کو اپنا ہم نوا بنا کر ان سے کام لینا، سالوں سال اور شبانہ روز اسی تگ و دو میں اللہ کے ان مخلص بندوں نے گذار دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار سالوں میں کڑی مدافعت و مقابلہ کے بعد اس فتنہ نے دم توڑ دیا، جتنے لوگ مرتد ہو گئے تھے ان کو پھر سے مشرف بہ اسلام کیا اور ان کو مستقبل میں دین پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان علاقوں میں دینی تعلیم کو عام کیا جائے اور دین کی ضروری معلومات سے ان کو واقف کرایا جائے اس کے لیے ان کے بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے بہت سے دینی مکاتب قائم کیے گئے اور ان مکاتب میں کام کرنے والے معلمین کو تاکید کی گئی کہ وہ گھر گھر جا کر بچوں کے والدین کو متوجہ کریں کہ وہ اپنے بچوں کو ان مکتبوں میں پابندی سے بھیجیں اس طرح چالیس پینتالیس دینی مکاتب ان مخدوش علاقوں میں جمعیۃ علماء ہند نے اپنی سرپرستی میں قائم کیے، اور مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری نے اپنے حلقۂ اثر سے کچھ افراد نکالے جو ان مخدوش علاقوں میں گئے اور ارتداد کے

خلاف جاری مہم میں حصہ لیا ان میں مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مظاہر علوم سہارن پور، مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی اور مولانا محمد الیاس صاحب بانی تبلیغی جماعت اس مہم میں پیش پیش رہے۔ اور اُن تھک جدوجہد فرمائی اور اسی ارتداد کے مقابلہ کے لیے انجمن ہدایت الرشید قائم کی اس انجمن نے بھی علی گڈھ ضلع میں اور متھرا کے ضلع میں اپنے وسائل وذرائع سے چودہ دینی مدرسے قائم کیے جن میں بیک وقت ساڑھے تین سو بچے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے لگے [1]

اس طرح جمعیۃ علماء ہند اور انجمن ہدایت الرشید کے قائم کردہ یہ دینی مکاتب و مدارس بچپن کی تعداد میں ہو گئے جس میں بیک وقت ہزاروں بچے دین کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگے، ہر طرف دین کا چرچا ہونے لگا، ان تمام مکاتب و مدارس کے اخراجات جمعیۃ علماء ہند پورا کرتی رہی اور انجمن ہدایت الرشید اپنے جاری کردہ مکاتب کے نظام کو سنبھالتی رہی۔

دوسرا زبردست کام علماء نے یہ کیا کہ ہر بڑی آبادی میں مسجدوں کی بنیاد ڈالی، جیسے حالات ہوئے کہیں خام کہیں پختہ مسجدیں ہر قابل ذکر بستی میں تعمیر کرادی گئیں اور ان میں باقاعدہ ایک عالم دین امام مقرر کیا گیا اور ان کو تاکید کی گئی کہ ہر نماز کے بعد نمازیوں کو ایک یا دو مسئلہ ضرور بتا دیا جائے، اور ان کو دین کی اہم اور بنیادی باتوں سے مسلسل روشناس کرایا جائے، کلمہ کی تصحیح کی جائے، دعائیں یاد کرائی جائیں نماز کی اہمیت اور طریقۂ نماز بتایا جائے اور بتدریج ان میں جو مشرکانہ رسم و رواج اور پوجا پاٹ اور دیوی دیوتاؤں پر چڑھاوے کی رسمیں جاری ہیں ان کو بند کرایا جائے شکل و صورت، وضع قطع، رہن سہن غرضیکہ پورے معاشرے کو مسلمانوں جیسا بنانے کی مسلسل جدوجہد کی جائے تاکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں خط امتیاز کھنچ جائے اور دونوں کی سماجی زندگی میں حدِ فاصل ہو جائے اور دُور سے پہچانا جا سکے کہ یہ مسلمان ہے

---

[1] حیات خلیل مصنفہ مولانا محدث الٰہ حسنی ص ۲۴۰

اور یہ ہندو ہے، یہ امتیاز ان علاقوں کے لیے انتہائی ضروری تھا حتّٰی کہ ناموں کی تبدیلی بھی ضروری سمجھی گئی۔ عام طور سے مسلمان کہلانے والوں کے نام بھی ہندوؤں جیسے تھے صرف نام سے کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ شخص مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ ان کے اسلامی ناموں کو رواج دیا گیا۔

دن رات کی اس جدوجہد نے اپنا اثر دکھایا اور اللہ کے فضل سے وہ علاقے دین دار ہوگئے ان کو اپنے مسلمان ہونے کا صحیح احساس پیدا ہوا اور انہوں نے دین کے تقاضوں کو سمجھنا شروع کیا اور انھیں علاقوں سے ایسے بچے پیدا ہوئے جنھوں نے دارالعلوم دیوبند اور دوسرے بڑے مدرسوں سے تعلیم حاصل کرکے سندِ فضیلت حاصل کی اور انہوں نے اپنے علاقوں میں جاکر دینی زندگی کو نشاۃ ثانیہ بخشی اور آج الحمدللہ وہ علاقے ان خطرات سے بہت دُور ہوچکے ہیں اب وہاں سے ایسے لوگ نکل رہے ہیں جو تبلیغِ دین کے لیے دور دراز کے شہروں کا سفر کرتے ہیں اور وہ خود دین کے داعی بن گئے۔ جو خود راہ بھولے ہوئے تھے اب دوسروں کی رہ نمائی کرنے لگے اور آج ان علاقوں کے مسلمان ان تمام خطروں سے بہت دُور ہوچکے ہیں جو آج سے پہلے خوفناک اژدھے کی طرح منہ کھولے ہوئے نگل جانے کے لیے کھڑے تھے، یہ سب کچھ علماءِ حق کے اخلاص، جدوجہد اور اللہ کے کرم سے ہوا۔

باب

فتنۂ قادیانیت

قادیانیت کا فتنہ

ہندوستان کی سرزمین نے نویں صدی ہجری میں ایک مہدی موعود پیدا کیا تھا جو تاریخ میں سید محمد مہدی کے نام سے مشہور ہیں، جون پور کے رہنے والے تھے، لیکن خود ان کا اور ان کے متبعین کا بڑا ہی عبرت ناک انجام ہوا اور ہندوستان سے فرقہ مہدویہ کا وجود ہی مٹ گیا کیونکہ اس وقت ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی جس نے اس فتنہ کے سر اٹھاتے ہی اسے کچل دیا اور یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

لیکن ۱۸۳۵ء میں پنجاب میں ایک شخص پیدا ہوا جو مہدی موعود اور مسیح موعود بنتے بنتے نبوت کا مدعی ہوگیا اس کے دعویٰ نبوت کے وقت ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی تھی اور یہ انگریزی حکومت کا خود کاشت پودا تھا اس لیے ہندوستان کی آب و ہوا اس کے پنپنے اور بڑھنے کے لیے سازگار ثابت ہوئی۔ اس خود ساختہ نبی کا نام مرزا غلام احمد تھا جو قادیان ضلع گورداس پور میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۵ء کے آس پاس اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

مرزا غلام احمد کے باپ کا نام غلام مرتضیٰ اور اس کے بڑے بھائی کا نام مرزا غلام قادر تھا جو انگریزی حکومت میں گورداسپور میں دفتر ضلع کے سپرنٹنڈنٹ تھے، مرزا غلام احمد نے پہلے مسیح اور مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مرکز قادیان سے مرزا غلام احمد کی سوانح حیات شائع ہوئی ہے اس میں سوانح نگار نے ان کے دعویٰ مسیحیت کے سلسلہ میں لکھا

"جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو آپ کو الہام ہوا کہ تم ہی وہ

مسیح اور مہدی ہو جس کے آنے کا مسیحیوں اور مسلمانوں سے وعدہ تھا، جب یہ الہام ہوا تو آپ نے ایک مدت اس کو ظاہر پر محمول کیا لیکن بار بار الہام ہونے کے بعد آپ نے اپنے مسیح و مہدی ہونے کا اعلان کیا۔" [1]

مرزا غلام احمد کے دو لڑکے ہوئے مرزا بشیر الدین محمود جو خلیفۂ اول کہے جاتے ہیں جن کو مرزا غلام احمد کے مرنے کے بعد جانشین بنایا پھر ان کے لڑکے مرزا ناصر احمد کو خلیفہ بنایا گیا۔

دعوئ نبوت :- مرکز قادیان کی شائع کردہ سوانح کے مطابق انہوں نے چالیس سال کی عمر میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا لیکن ان کے اندر استقلال اور یکسانیت نہیں رہی بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی زود اشتعال فطرت و مزاج کو پیش نظر رکھ کر بتدریج اپنے دعووں کی نوعیت بدلتے رہے۔ مہدی موعود کے پہلے دعویٰ کے بعد انہوں نے اپنی کتاب "اربعین" کے صفحہ ۳ پر لکھا کہ :-

"خدا وہ خدا ہے کہ جس نے اپنے رسول کو یعنی اس عاجز کو ہدایت اور دین حق اور تہذیب و اخلاق کے ساتھ بھیجا۔" [2]

یعنی اس کے بعد انہوں نے صراحتاً نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کر دیا، قادیان سے شائع ہونے والی ان کی سوانح عمری کے مصنف نے مزید تفصیلات مہیا کی ہیں، وہ لکھتا ہے۔

"حضور کا وہ مکتوب جو آخری مکتوب کہلاتا ہے اور جو ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کے اخبار عالم لاہور میں شائع ہوا تھا جس کی عبارت یہ ہے کہ جس بنا پر میں اپنے تئیں نبی کہلاتا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ میں خدائے تعالیٰ کی ہم کلامی سے مشرف ہوں وہ میرے ساتھ بہ کثرت بولتا ہے اور کلام کرتا ہے اور میری باتوں کا جواب دیتا ہے اور بہت سی غیب کی باتیں میرے پر ظاہر کرتا ہے اور آئندہ زمانوں کے وہ راز میرے پر کھولتا ہے۔ جب تک کہ انسان کو اس کے ساتھ خصوصیت کا قرب نہ ہو دوسرے پر وہ اسرار

---

[1] "سیرت و سوانح" شائع کردہ مرکز قادیان ص ۹ ۔ [2] اربعین ص ۳۴

نہیں کھولتا اور انہیں اُمور کی کثرت کی وجہ سے اس نے میرا نام نبی رکھا ہے سو میں خدا کے حکم کے مطابق نبی ہوں۔"[1]

مرزا غلام احمد پر وحی آنے کی کیفیت :- مرزا غلام احمد اب نبی بن گئے، اب ان پر وحی آنے لگی اور مسلسل آنے لگی، ان پر جب وحی آتی تھی تو ان کی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کی منظر کشی انھیں کے الفاظ میں سنیئے :-

"وحی آسمان سے دل پر ایسی گرتی ہے جیسے کہ آفتاب کی شعاع، میں روز دیکھتا ہوں، جب مکالمہ مخاطبہ کا وقت آتا ہے تو اول دل پر ایک ربودگی طاری ہو جاتی ہے تب میں ایک تبدیل یافتہ کے مانند ہو جاتا ہوں اور مری حس اور مرا ادراک اور میرے ہوش گو بہ گفتن باقی ہوتے ہیں مگر اس وقت میں یوں پاتا ہوں کہ گویا ایک وجود شدید الطاقۃ نے میرے تمام وجود کو اپنی ہستی میں لے لیا ہے اور میں اس وقت محسوس کرتا ہوں کہ میری ہستی کی تمام رگیں اس کے ہاتھ میں ہیں اور جو کچھ میرا ہے اب وہ میرا نہیں بلکہ اس کا ہے، جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے خدا تعالیٰ دل کے ان خیالات کو میری نظر کے سامنے پیش کرتا ہے جن پر اپنے کلام کی شعاع ڈالنا اس کو منظور ہوتا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک خیال دل کے سامنے آیا تو جھٹ اس پر ایک ٹکڑا کلام الٰہی کا شعاع کی طرح گرتا ہے اور بسا اوقات اس کے گرنے کے ساتھ ہی تمام بدن ہل جاتا ہے"[2]

احمدیوں کے علاوہ تمام مسلمان کافر ہیں :- مرزا صاحب مہدی سے نبی تک ترقی کر گئے اور الہام سے وحی تک پہونچ گئے اور ان کے حلقہ بگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا

---

[1] عقائد احمدیت شائع کردہ انجمن احمدیہ قادیان ص ۷، ۹ و ۸ [2] عقائد احمدیت مطبوعہ قادیان ص ۱۱۴ و ۱۱۵

تو انہوں نے اور بھی ہاتھ پاؤں نکالے۔ اب تک اپنے کو مسلمان بھی کہتے تھے اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے عقائد پر قائم رہنے کا اعلان بھی کرتے تھے لیکن جب نبی بن کر اپنی شریعت خاص کا اجرا کیا تو اپنے متبعین کے سوا سارے مسلمانوں کو خارج از ایمان ہونے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ :-

"جو لوگ میری تکذیب کریں گے ان کو الحمد سے والناس تک پورا قرآن چھوڑنا پڑے گا، پھر سوچو کیا میری تکذیب کوئی آسان امر ہے۔ یہ میں از خود نہیں کہتا، خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حق یہی ہے کہ جو مجھ کو چھوڑیگا اور میری تکذیب کرے گا گو زبان سے نہ سہی مگر اپنے عمل سے، اس نے سارے قرآن کی تکذیب کر دی اور خدا کو چھوڑ دیا، اس کی طرف میرے ایک الہام میں بھی اشارہ ہے۔ انت منی و انا منك بے شک میری تکذیب سے خدا کی تکذیب لازم آتی ہے، پھر میری تکذیب، میری تکذیب نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔" [1]

پنجاب میں مسیلمہ کذاب :- چونکہ مرزا غلام احمد مسلمان خاندان میں پیدا ہوا مسلمانوں جیسا نام پایا، اس لیے اس کے دعوائے نبوت کا عذاب اُمتِ مسلمہ کو بھگتنا پڑا، غیر مسلموں کو قادیانی بنانا تو اس کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے اس نے مسلمان خاندانوں کے افراد کو مذہب حق سے منحرف کر کے ان کو مرتد بنانے کا کام شروع کر دیا اور بتدریج اس کی پھیلائی ہوئی ضلالت و گمراہی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور پنجاب کے کئی شہروں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا کیونکہ پنجاب ہمیشہ سے جاہل اور مصنوعی پیروں کی جولانگاہ رہا ہے اور پھر مرزا غلام احمد نے پہلے ہی مرحلے پر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اس لیے مسلمان حلقوں میں اس کی باتیں سنی جاتی تھیں کیونکہ وہ عیسائیوں اور آریوں سے مسلمان بن کر مناظرے

---

[1] عقائد احمدیت ص ۱۲۳ و ۱۲۴۔

کرتا رہا اور لوگ اس کو ایک پُرجوش مسلمان عالم سمجھتے رہے اور اسلام کی ہمدردی میں لوگ اس کے ساتھ تھے اس طرح جب اس کے گرد و پیش کچھ افراد جمع ہوگئے تو وہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوا اور پورے طور پر پُرزے نکالے اور اپنے عقائد کا اظہار کیا، تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ فریب کا جو جال بچھایا جا رہا تھا اس کی حقیقت یہ تھی کہ دعویٰ نبوت کے لیے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔

علماء اسلام نے اس کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے دعووں کا تجزیہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مرزا غلام احمد کے متبعین کا شمار مسلمانوں کے ایک فرقہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ وہ غیر مسلموں کا ایک فرقہ ہے جس کا اسلام کے مسلمہ اور بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ غیر مسلموں سے کہیں زیادہ یہ گروہ اسلام دشمن ہے تب دینی حیثیت سے اس کے مقاطعہ کا فیصلہ کیا گیا۔ اس طرح وہ فرقہ آہستہ آہستہ طاقت پکڑتا رہا اور تیرہویں صدی کے آخر میں شباب پر پہونچ گیا، سیرت و سوانح مرزا غلام احمد کا قادیانی مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"۱۸۹۱ء میں آپ نے دعویٰ کیا تھا ۱۸۹۷ء میں سات سال بعد کل ہندوستان میں آپ کی جماعت قریباً پانچ چھ سو زن و مرد تک پہونچ گئی اس کے بعد یک لخت لوگوں کو آپ کے دعویٰ کی طرف توجہ ہوئی اور جماعت کی ترقی کی رفتار بہت بڑھ گئی اور ۱۹۰۱ء سے تو اس کثرت سے لوگ سلسلہ میں داخل ہونے شروع ہوئے کہ چند ہی سال میں تمام ہندوستان میں آپ کی جماعت پھیل گئی حتیٰ کہ ان کی تعداد کئی لاکھ تک پہونچ گئی۔"[1]

بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس وقت اس کی جماعت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی اور اس کے مبلغین ہندوستان سے باہر قادیانیت کی تبلیغ کرنے لگے تھے۔

* * * * *

[1] حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی سیرت و سوانح شائع کردہ مرکز قادیان ص ۵۶ و ۵۷

باب ۸

قادیانیت کے خلاف صف آرائی

قادیانیت ایک نیا مذہب ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا، اس کی عمر تقریباً ایک صدی ہے، اس کا بانی پنجاب میں واقع ایک شہر قادیان کا باشندہ مرزا غلام احمد ہے جو ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۱ء میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور ۱۹۰۸ء تک تقریباً اٹھارہ سال تک وہ مسلمانوں کے ایمان پر شب خون مارتا رہا ۱۹۰۸ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوا اور ملت اسلامیہ کو اس کے شر سے نجات ملی۔

اس کے ناپاک وجود سے یہ سرزمین تو پاک ہوئی لیکن اس کے شر نے اسلامی دنیا میں ایمان و اسلام کی جو تباہی و بربادی پھیلائی وہ علیٰ حالہٖ قائم ہے اور قادیانیت جسدِ اسلام کا ایک رستا ہوا ناسور بن گئی ہے، آج یہ فرقہ دنیا کا مالدار ترین فرقہ ہے۔ اس کا نظام کار کردگی عیسائی مشنریوں جیسا ہے، وہ پوری دنیا میں قادیانیت کے فروغ کے لیے اسی نہج پر کام کرتے ہیں جس نہج پر ہندوستان میں عیسائی مشنریوں نے آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے کام شروع کیا تھا اور اس کے تھوڑے بہت آثار آج بھی ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پائے جاتے ہیں۔

قادیانیت کے دو مرکزی دفاتر:۔ اب قادیانیوں کے دو مرکزی دفاتر ہیں

ایک ہندوستان کے شہر قادیان میں ہے جو مرزا غلام احمد کی جنم بھومی ہے وہیں سے اشاعتی لٹریچر تیار کر کے پورے ملک میں پھیلائے جاتے ہیں اور لاکھوں روپے کے کتابچے، پمفلٹ، رسالے، بہترین آرٹ پیپر پر فوٹو آفسیٹ پر چھاپ کر شاندار گیٹ اَپ کے ساتھ مفت تقسیم کیے جاتے ہیں اور ایک ہفتہ وار اخبار "بدر" کے نام سے شائع کرتے ہیں۔ اس مرکز کے تحت کئی درجن باتنخواہ مشنری پورے ملک میں اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت میں شب و روز مصروف ہیں۔

قادیانیوں کا دوسرا بڑا مرکزی دفتر پاکستان میں چنیوٹ کے قریب خود آباد کردہ شہر "رَبوَہ" واقع ہے، اس دفتر سے عالمی پیمانے پر قادیانیت کی نشرواشاعت کے پروگرام بنائے جاتے ہیں، یہیں کی تربیت گاہ سے نکلے ہوئے قادیانی مشنری دنیا کے مختلف ملکوں میں جاکر اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام کرتے ہیں، رَبوہ میں ان کے بہت سے مدارس، کالج اور اسکول ہیں ان میں سب سے اہم احمدیہ مشنری کالج ہے جہاں قادیانیت کے مشنری تیار کیے جاتے ہیں، قادیان اور ربوہ کے دونوں مرکزی دفتروں کا سالانہ بجٹ ۱۹۸۷ء میں گیارہ کروڑ کے قریب تھا۔[1]

قادیانیوں کا دائرۂ کار:- قادیان اور رَبوَہ یہی دونوں مرکز دنیا میں قادیانیت کی تبلیغ کرنے والے مشنریوں کو منظم کرتے ہیں، کام کا نقشہ مرتب کرتے ہیں، لائحہ عمل بناتے ہیں، ہدایات دیتے ہیں اور ان کا بجٹ پورا کرتے ہیں، ان کے ایک سو کے قریب مرکزی مشنری ہیں اور ۱۶۴ ہر علاقہ کے لوکل مشنری کام کرتے ہیں[2]، اس طرح ۲۶۴ پُرجوش بااختیار افراد عالمی پیمانے پر قادیانیت کے تبلیغی نظام کو پوری قوت سے چلا رہے ہیں، یہ طریقۂ کار انہوں نے عیسائی مشنریوں سے سیکھا ہے اور ٹھیک انہیں کے نہج پر کام کرتے ہیں۔ قادیانیوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی ایک اجمالی جھلک میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کرسکیں کہ وہ آج کتنے بڑے

---

[1] و [2] سوانح مرزا غلام احمد قادیانی شائع کردہ دفتر قادیان (ہند) ص ۶۰

پیمانے پر قادیانیت کی نشر و اشاعت کا کام کرتے ہیں۔

امریکہ کی چار ریاستوں میں ان کے ۹ مشن کام کرتے ہیں، ان کی چودہ عبادتگاہیں ہیں تین مذہبی مدرسے ہیں اور پانچ اخبارات و رسائل وہاں سے شائع کیے جاتے ہیں۔ یورپ کے ملکوں میں کنیڈا، انگلینڈ، ہالینڈ، سوئزرلینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، بلجیم، اسپین اور اٹلی میں ان کے ۴۲ مشن ۱۳ عبادت گاہیں، دو مذہبی مدرسے مصروف کار ہیں اور ۹ اخبارات و رسائل جاری ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں فلسطین شام، لبنان، عدن، مصر، کویت، بحرین، مسقط، دبئی اور اردن میں دس مشن، چار عبادت گاہیں ایک مدرسہ ہے اور ایک ماہوار رسالہ "البشریٰ" عربی زبان میں شائع ہوتا ہے۔

افریقہ میں سرگرمیاں:۔ مشرقی افریقہ کی ریاستوں میں کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا، زامبیا، اور وسطی افریقہ میں کل ۲۶ مشن ۱۷ عبادتگاہیں اور پانچ مذہبی مدارس ہیں پانچ رسالے اور اخبارات جاری ہیں، سب سے زیادہ زور مغربی افریقہ پر لگایا گیا ہے وہاں نائجیریا، گھانا، سیرالیون، گیمبیا، آئیوری کوسٹ، لائیسیریا، ٹوگولینڈ، نائیجر، بینن اور صومالیہ میں ۲۳۷ مشن ۶۹ عبادت گاہیں، ۵۴ مذہبی مدرسے اور ۲۵ ہسپتال ہیں اور چار اخبارات و رسائل شائع کیے جاتے ہیں، مشرق بعید میں انڈونیشیا، ملیشیا، فجی آئی لینڈ، جاپان، فلپائن، جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن میں ۳۷ مشن اور ۲۷ عبادت گاہیں اور پانچ مدرسے ہیں اور چھ اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں، مشرق بعید میں سب سے زیادہ کامیابی ان کو انڈونیشیا میں حاصل ہوئی جو ایک مسلمان ملک کہا جاتا ہے، صرف انڈونیشیا میں ۳۰ مشن مصروف کار ہیں اور ۱۵ عبادت گاہیں اس کے مختلف شہروں میں موجود ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل جو قادیانیوں کے اشاعتی لٹریچر سے جمع کی گئی ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قادیانیت کی تبلیغ میں کتنی منظم اور کتنی بڑی فوج لگی ہوئی ہے اور

یہ ساری فوج صرف اُمت اسلامیہ پر حملہ آور ہے اور اس کی مدافعت میں کوئی مستحکم تنظیم ہماری نگاہوں میں نہیں ہے جو اس زہر کا تریاق بہم پہونچائے۔

اسلام پر کاری ضرب :- قادیانیت کی سب سے کاری ضرب اُمتِ اسلامیہ پر ان کے ترجمہ قرآن سے پڑتی ہے، وہ اپنی تائید میں مسلمانوں کی کتاب قرآن مجید کو استعمال کرتے ہیں اس کا دنیا کی تمام قابلِ ذکر زبانوں میں ترجمہ کرتے ہیں اور ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں شائع کرتے ہیں، تمام ترجمہ کرنے والے قادیانی اور قادیانیت کے پُرجوش مبلغین ہیں، انہوں نے ترجمے میں کتنی تحریفیں کی ہوں گی، کیا کیا بددیانتی کی ہوگی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ان تراجم کو اتنے بڑے پیمانے پر تمام ممالک میں پھیلا چکے ہیں کہ آپ اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

قرآن کے تراجم :- قرآنِ پاک کے انگریزی ترجمے کے متعدد ایڈیشن کئی لاکھ کی تعداد میں وہ شائع کر چکے ہیں، انگریزی زبان میں پانچ جلدوں میں ایک قرآن کی تفسیر بھی شائع کی ہے جو تین ہزار تین سو صفحات پر مشتمل ہے، اس تفسیر کی تلخیص بھی انگریزی زبان میں کی گئی ہے جو پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہے، ہالینڈ کی ڈچ زبان میں قرآن کے ترجمے کے تین ایڈیشن اب تک وہ شائع کر چکے ہیں، جرمنی ترجمے کے تین ایڈیشن، مشرقی افریقہ میں واقع کینیا کی سواحیلی زبان میں ترجمہ قرآن کے تین ایڈیشن یعنی تین ہزار نسخے شائع ہوئے ہیں، نائیجریا کی زبان یوروبا میں قرآن کا ترجمہ کیا گیا، اس کے بھی تین ایڈیشن نکلے ہیں، ڈنمارک کی زبان ڈینش میں ترجمہ کرکے اس کو دس ہزار کی تعداد میں طبع کرا کے تقسیم کیا گیا، یوگنڈا کی زبان یوگنڈی میں، یورپ کی جدید زبان اسپرنٹو میں، انڈونیشیا کی زبان انڈونیشن میں، فرانس کی زبان فرنچ میں، روسی، اٹالین، سپینش، پُرتگالی اور بنگلہ زبان میں قرآن کے ترجمے کرائے گئے ہیں۔ مشرقی افریقہ کی بعض دوسری زبانوں کیکویو، لُوَو، کیکامیہ میں بھی قرآن کا ترجمہ کیا جا چکا ہے، آسامی، پنجابی اور ہندی زبانوں میں ترجمے کرائے جا چکے ہیں جن میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں بعض طباعت کے انتظار میں ہیں، عنقریب وہ بھی شائع ہو جائیں گے، مغربی افریقہ کی مقامی زبانوں میں مثلاً

سیرالیون کی زبان بینڈی، گھانا کی زبان فنٹے، توائی نائیجیریا کی ایک زبان ہاؤسا اور فجی کی زبان فجین میں ترجمہ کا کام جاری ہے۔ مستقبل قریب میں وہ بھی شائع ہوجائیں گے چینی زبان میں بھی ترجمہ قرآن کی تیاریاں ہورہی ہیں[1]

کانٹوں کا ایک جنگل :- ۱۹۸۶ء کی یہ تازہ رپورٹ ہے جو اس کتاب سے لی گئی ہے جو قادیانیوں کے مرکز قادیان سے اُردو میں شائع کی گئی ہے، مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید کو مرزا غلام احمد کی نبوت کی صداقت کے ثبوت کے سلسلہ میں مسلسل استعمال کررہے ہیں۔ ایک مقدس کتاب کو اپنے مذموم مقاصد میں استعمال کرکے مسلمانوں کی راہ میں کانٹوں کا ایک جنگل بورہے ہیں کہ بعد میں اس کا عبور کرنا مسلمانوں کے لیے مشکل ہوجائے، وہ تو خدا کا فضل ہے کہ علماء دیوبند کی برسہا برس کی جدوجہد کے بعد ایک مسلم حکومت نے قادیانیوں کو مسلمانوں کی فہرست سے خارج کرکے ساری دنیا کو یہ بتادیا کہ قادیانیوں کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں، نہ اسلام سے اس کو کوئی سروکار ہے اور نہ وہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہے بلکہ وہ ایک غیر مسلم فرقہ ہے، اس لیے بڑی حد تک اسلام اور مسلمانوں کو جواب دہی سے بری الذمہ کردیا۔

قادیانیت کے خلاف محاذ آرائی :- مرزا غلام احمد نے جب "براہین احمدیہ" نامی کتاب لکھی جس میں اسلام کے دینِ برحق ہونے اور قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کے دلائل دیئے گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات کیا گیا تھا۔ یہ ضخیم کتاب جب شائع ہوئی تو بہت سے اہلِ علم اس سے متاثر ہوئے ان میں ایک قابلِ ذکر نام مولانا محمد حسین بٹالوی کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے رسالہ "اشاعت السنۃ" میں اس کتاب پر ایک طویل تبصرہ لکھا جو رسالہ کے چھ نمبروں میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس مضمون میں کتاب کو بڑے شاندار لفظوں میں سراہا گیا اور اس کو عصرِ حاضر کا ایک علمی کارنامہ اور تصنیفی

---

[1] یہ تمام تفصیل سیرت وسوانح مرزا غلام احمد شائع کردہ مرکز قادیان کے صفحہ ۶۲ سے صفحہ ۶۷ تک سے لی گئی ہیں۔

شاہ کار قرار دیا گیا، مرزا صاحب نے اس کتاب میں جو بلند بانگ دعوے کئے اور اپنے اوپر ہونے والے مسلسل الہامات کا غیر مبہم اور واضح الفاظ میں بار بار جو ذکر کیا ہے اس کی تہہ میں کام کرنے والے جذبے پر نگاہ نہیں پڑی، جن علماء نے اس کتاب کا غائر مطالعہ کیا اور باریک بینی کے ساتھ اس کے طرزِ بیان اور اظہارِ مدعا کا جائزہ لیا ان کے دلوں میں فوراً کھٹک پیدا ہوگئی اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شخص دعویٰ نبوت کے خبط میں مبتلا معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس نے ابھی دعوی نبوت نہیں کیا ہے لیکن عنقریب وہ یہ دعویٰ کرنے والا ہے۔

ان صاحب فراست لوگوں میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے دادا مولانا عبدالقادر لدھیانوی اور ان کے دونوں صاحبزادگان مولانا محمد صاحب لدھیانوی اور مولانا عبدالعزیز صاحب لدھیانوی تھے، انھیں کے ساتھ کچھ اور دوسرے علماء حق نے بھی مرزا کے ان الہامات کی مخالفت کی۔

مرزا غلام احمد کی کتاب "براہین احمدیہ" ۱۸۸۰ء میں لکھی گئی اور ۱۸۸۶ء میں مرزا غلام احمد نے ہوشیار پور میں آریوں سے مناظرہ کیا اور مناظرہ کے بعد آریوں کے اعتراضات کے جواب میں ایک کتاب "سرمۂ چشم آریہ" لکھی، اس میں معجزات وغیرہ کے سلسلہ میں انہوں نے عقلی دلائل دیئے تھے اس لیے مناظرہ سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس کتاب کو پسند کیا، لیکن اسی کتاب میں انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے پر عقلی اشکالات پیش کئے تھے جس نے دقیقہ رس علماء کے دلوں میں مزید کھٹک پیدا کر دی اور انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ شخص اپنی نبوت کے دعویٰ کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے۔

مسیح موعود ہونے کا دعویٰ:۔ "براہین احمدیہ" اور "سرمۂ چشم آریہ" ان دونوں کتابوں کے لکھنے کے بعد لوگوں کی نگاہیں ان کے مصنف کی جانب اٹھنے لگیں تو دل کا روگ ظاہر ہونے لگا اور اسی دوران مرزا نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا، مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے ہیں اور دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے، مرزا نے

مسلمانوں کے اس عقیدے کا مصداق اپنی ذات کو قرار دیا۔

مرزا غلام احمد نبی بن گئے :۔ مرزا غلام احمد کے دعوائے مسیحیت کے خلاف ابھی مسلمانوں میں شورش برپا ہی تھی کہ اس نے ایک اور چھلانگ لگائی اور اچھل کر تختِ نبوت پر بیٹھ گیا۔ یہ ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہے۔ اب اس نے صاف لفظوں میں کہنا شروع کر دیا کہ خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے، مجھ پر وحی آتی ہے، غیب کی باتیں خدا مجھے بتاتا ہے، پھر اس نے اپنے مذہب کی دعوت شروع کر دی اور مسلمانوں کے ایمان پر مسلسل شبخون مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا، سیکڑوں آدمی اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گئے۔

ویسے تو قادیانیوں کے لٹریچر میں مرزا کے دعوئے نبوت کو ۱۸۸۵ء میں بیان کیا جاتا ہے وہ صرف اس لیے کہ ان کے نزدیک ان کی پیدائش ۱۸۳۵ء میں مانتے ہیں اور ۱۸۸۵ء میں ان کی عمر کے چالیس سال ہوتے ہیں اور نبوت کے لیے یہی عمر اہلِ اسلام کے نزدیک مسلم ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا ایک بیک نبی نہیں بنے، پہلے مجدد بنے، پھر مسیح بنے، پھر مہدی موعود بنے تب کہیں جا کر نبوت کے دعوے تک پہونچے، کیونکہ ان کی مشہور کتاب "براہین احمدیہ" ۱۸۷۹ء میں شروع ہوئی ہے اور ۱۸۸۴ء تک اس کا سلسلۂ تصنیف دراز رہا، اس میں انہوں نے اپنے الہامات کا ذکر بار بار کیا لیکن اپنے نبی ہونے کا کہیں دعویٰ نہیں کیا ہے، اور اس وقت مسلمانوں نے ان کو آریوں اور عیسائیوں کے مقابلہ کا علاقائی مناظر سمجھ رکھا تھا، ان کا دعوائی نبوت ۱۹۰۱ء میں صاف صاف ہوا ہے جیسا کہ سیرۃ المہدی میں وضاحت کی گئی ہے اس لیے مرزا کی سیرت و سوانح نگار نے قصداً کذب بیانی سے کام لیا ہے۔

سب سے پہلا فتویٰ :۔ براہینِ احمدیہ کی پہلی جلد جب شائع ہوئی تو دقیقہ رس اور باریک بین علماء کی نگاہوں نے اس حقیقت کو پالیا تھا کہ اس کا مصنف دل میں چور رکھتا ہے وہ مستقبل میں صراطِ مستقیم پر نہیں رہ سکتا، اور کتاب میں مذکور الہامات نے ان کو اس کے یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ یہ شخص دل کی گہرائیوں میں دعوائی نبوت چھپائے ہوئے ہے اور بتدریج اس منزل تک پہونچنے کی کوشش کر رہا ہے

کیونکہ دعوای مجددیت کے بعد وہ محدث اور مثیلِ مسیح بن چکا تھا یہ آخری زینہ تھا جس سے وہ نبوت کی بلندیوں پر چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو چکا تھا، اتفاق سے اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ لدھیانہ نہ گیا اور اس نے اپنے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تو لدھیانہ کے مشہور عالم مولانا عبدالقادر صاحب[1] لدھیانوی جو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مشہور احراری لیڈر کے پردادا تھے، ان کے صاحبزادے مولانا شاہ عبداللہ صاحب اس وقت لدھیانہ میں موجود تھے وہ بڑے ہی صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے وہ مرزا غلام احمد کی قیامگاہ پر گئے اور مرزا کو دیکھتے ہی فرمایا:۔

"یہ شخص کافر و مرتد ہے اس کی بیعت مت کرو، یہ اپنے آپ کو مجدد نہیں بلکہ نبی اور پیغمبر ثابت کرنا چاہتا ہے"

مرزا کی مجلس میں اس طرح کے اظہارِ حق پر بڑا شور و شر ہوا کہ بلا کسی دلیل کے مولانا شاہ عبداللہ نے مرزا کو کافر و مرتد قرار دے دیا ہے، اس وقت مرزا کی کتاب "براہین احمدیہ" چھپ چکی تھی۔ مولانا شاہ محمد صاحب جو مولانا شاہ عبداللہ صاحب کے بھائی اور مولانا حبیب لدھیانوی کے دادا تھے، انہوں نے رات بھر اس کتاب کا مطالعہ کیا اور صبح کو مرزا کی تحریروں

---

[1] مولانا عبدالقادر صاحب لدھیانوی اپنے وقت کے جیّد عالم، صاحب زہد و تقویٰ اور مردِ مجاہد تھے۔ ان کا گھرانہ ایک علمی گھرانہ تھا، سب سے پہلے کانگریس میں شرکت کا فتویٰ چار سو علماء کے دستخط سے آپ ہی نے شائع کیا تھا۔ ان کے چار صاحبزادے تھے۔ مولانا محمد صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب مولانا سیف الرحمٰن صاحب۔ مولانا شاہ محمد عبداللہ صاحب۔ مولانا محمد صاحب مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولانا احمد حسن صاحب کان پوری کے استاد ہیں۔ انھیں کے صاحبزادے مشہور احرار لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی تھے۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب ریشمی رومال تحریک میں شریک ہوئے اور شیخ الہند کے حکم سے یاغستان گئے اور تا زندگی وہیں رہے، مولانا شاہ عبداللہ صاحب ضلع سہارنپور کے پیر و مرشد ہوئے، صاحب کشف و کرامت تھے انہیں کے صاحبزادے مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے جو احرار کے لیڈروں میں شامل تھے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے چچا تھے مگر ہم عمر تھے (مقدمہ کتاب تبصیر الاحرار مصنفہ عبدالرحمٰن)

کی بنیاد پر مکمل فتویٰ لکھ کر شائع کر دیا کہ مرزا غلام احمد اپنی ان تحریروں کی بناء پر کافر اور مرتد ہے۔

دعوتِ مُباہلہ:۔ امرت سر قادیان سے قریب تھا، مرزا غلام احمد کی سرگرمیوں کی اطلاع یہاں ہر دم پہونچتی رہتی تھی اور یہاں اس زمانے میں مشہور مناظر اور وسیع النظر عالم مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب[1] امرتسری رحمۃ اللہ علیہ اپنا اخبار "اہلِ حدیث" نکالتے تھے انہوں نے پہلے پہل مرزا کے دعوؤں کا پوسٹ مارٹم کیا اور بتدریج ان کے اخبار کا لب و لہجہ سخت ہوتا گیا، آپ نے مرزا کے خلاف گرم گرم مضامین لکھنے شروع کیے اور اس کے سارے دجل و فریب کو انہوں نے چاک کرنا شروع کر دیا، اس کی ہفوات اور بکواس

---

[1] مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری ہندوستان کے جلیل القدر علماء میں سے تھے، آپ کشمیری الاصل تھے امرتسر میں آپ کی ولادت ۱۲۸۷ھ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم مولانا احمد اللہ صاحب امرتسری سے حاصل کی، حدیث شیخ عبدالمنان وزیرآبادی سے پڑھی پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور کئی سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد کان پور تشریف لائے اور مولانا احمد حسن صاحب کان پوری سے مزید تعلیم حاصل کی ۱۳۱۱ھ میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور وعظ و تذکیر اور مناظرہ میں لگ گئے تصنیف و تالیف کا بھی زندگی بھر مشغلہ رہا۔ فن مناظرہ سے زیادہ شغف تھا، آریوں، قادیانیوں اور عیسائیوں سے کامیاب مناظرہ کرتے تھے بہت سے غیر مسلم ان مناظروں کے بعد آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ آپ ایک ہفتہ وار اخبار "اہلِ حدیث" نکالتے تھے۔ اور چوالیس سال تک پابندی سے یہ اخبار نکلتا رہا، آپ مسلکاً اہل حدیث تھے، رد قادیانیت میں آپ کی سیکڑوں کتابیں، رسالے اور کتابچے ہیں، جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں سے ہیں اور اس تنظیم کو مضبوط و مستحکم بنانے میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک زمانے تک رکن رہے۔ آپ کی اردو میں قرآن پاک کی ایک تفسیر بھی ہے جو "تفسیر ثنائی" کے نام سے مشہور ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے آپ سے مباہلہ کیا کہ جھوٹا سچے کی زندگی میں کسی وبائی بیماری میں مبتلا ہو کر مر جائے گا۔ تاریخ مباہلہ کے ایک سال بعد مرزا غلام احمد ہیضہ میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے چل بسا۔ مولانا موصوف اس کے بعد چالیس سال حیات رہے، تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور گجرانوالہ میں سکونت پذیر تھے۔ اسی سال کی عمر میں سرگودھا میں ۱۵ جمادی الاول ۱۳۶۷ھ کو راہی ملکِ بقا ہوئے۔

پر سخت ترین تنقیدیں کرتے رہے اور مسلسل کرتے رہے یہاں تک کہ اخباری سطح پر ہونے والی اس مخالفت سے مرزا نے سخت پریشان ہو کر ۵ راپریل ۱۹۰۷ء کو ایک اشتہار جاری کیا جس میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"اگر میں ایسا ہی مفتری اور کذاب ہوں جیسا کہ آپ اکثر اوقات اپنے ہر ایک پرچے میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مفسد اور کذاب کی بہت عمر نہیں ہوتی اور آخر وہ ذلت و حسرت کے ساتھ اپنے اشد دشمنوں کی زندگی ہی میں ناکام و ہلاک ہو جاتا ہے اور اس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہوتا ہے تاکہ خدا کے بندوں کو تباہ نہ کرے، اور اگر میں کذاب و مفتری نہیں ہوں اور خدا کے مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہوں اور مسیح موعود ہوں تو میں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ سنت اللہ کے موافق آپ مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے، پس اگر وہ سزا جو انسانوں کے ہاتھوں سے نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ سے ہے یعنی طاعون، ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں وارد نہ ہوئیں تو میں خدا کی طرف سے نہیں۔" [1]

مرزا غلام احمد کا یہ چیلنج ہزاروں نے پڑھا اور دیکھا، اس کی خوب شہرت ہوئی، لوگ اس کے انجام کے منتظر تھے۔ مقدرات کو کون جانتا ہے، مسلمان تو جانتے ہی تھے کہ مرزا غلام احمد مسیلمۂ کذاب کی طرح خانہ ساز نبی بننے والا کاذب اور جھوٹا ہے لیکن کسی کی زندگی و موت کا حساب تو اللہ کے یہاں ہے لیکن اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے بھروسے پر کوئی قسم کھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو رسوا نہیں ہونے دیتے اور اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں رب اشعث اغبر لو اقسم علی اللہ لابرہ،

مرزا کا انجام:۔ اس اعلان کے ایک سال بعد مرزا غلام احمد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو

---

[1] تبلیغ رسالت ج ۱۰ ص ۱۲۰ پر اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کی کئی کتابوں کے آخری صفحہ پر یہ اشتہار چھپا ہوا ہے۔

ہیضہ میں مبتلا ہوا اور ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو اپنے اعلان کے مطابق اپنے انجام کو پہونچ گیا، اور بقول خود اپنے کذّاب اور مفتری ہونے پر مہر تصدیق ثبت کرکے اس دنیا سے چل بسا، اور اللہ نے اس سرزمین کو اس کے وجود سے پاک کر دیا، اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرت سری مرزا غلام احمد کی موت کے بعد برہان حق بن کر پورے چالیس سال زندہ رہے۔ اور آزادی کے بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو اسّی برس کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا۔

مرزا کی موت کے بعد:- ۱۹۰۸ء میں مرزا غلام احمد قادیانی اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے لیکن اس نے جو خاردار پودا لگایا تھا وہ برگ و بار لاتا رہا، پھیلتا اور بڑھتا رہا، اس کے مریدین کا ایک مضبوط حلقہ اس وقت تک بن چکا تھا اس کی موت کے بعد اس کے کارندوں نے سستی نہیں دکھائی، بلکہ قادیانیت کی نشر و اشاعت میں اپنی تمام توانائیاں لگا دیں، اور ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک ان کے شکاری پہونچ گئے اور اپنا جال پھیلاتے رہے اور کوئی نہ کوئی شکار پھنس آہی جاتا تھا لیکن ان سے براہ راست تصادم کم ہوتا تھا، علماء حق جلسۂ عام میں رد قادیانیت پر تقریریں کرتے، قادیان تک میں جاکر ہفتوں ٹھہر کر جلسے کرکے دیکھے لیکن قادیانیوں نے اپنے کان بند کر لیے اور خاموشی کے ساتھ اپنی تبلیغی مہم میں لگے رہے اور قادیانیت کا دائرہ بتدریج وسیع ہوتا رہا کیونکہ وہ اس سلسلہ میں مختلف وسائل و ذرائع سے کام لیتے تھے، اس طرح بہت سے شہروں میں ان کے افراد پیدا ہوتے چلے گئے۔

چونکہ ہر قادیانی اپنے کو مسلمان کہتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول مانتا تھا اور کہتا تھا۔ آپ کو خاتم النبیین اور قرآن پاک کو خدا کی کتاب کہتا تھا اور کلمۂ شہادت پڑھتا تھا اس لیے امتیاز کرنا مشکل تھا کہ کون قادیانی ہے اور کون مسلمان ہے اس لیے عوام نے قادیانیت کو اس نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جس سے اوروں کو دیکھا جاتا ہے، ایک ہی خاندان میں بعض مسلمان رہتے تھے اور بعض قادیانی ہوجاتے تھے لیکن ان میں کسی طرح کی غیریت نہیں آتی تھی، انھیں اسباب کی بنا پر قادیانی اور غیر قادیانی شادی بیاہ آپس میں بلا تردد کرتے رہتے تھے، کچھ دنوں کے بعد قادیانیوں کے خلیفہ نے اپنے فرقے کے لوگوں کو ہدایات

دیں کہ کسی غیر قادیانی سے کسی قادیانی لڑکی کی شادی نہ کی جائے، البتہ دوسروں کی لڑکیوں سے قادیانی لڑکوں کی شادیاں ہوسکتی ہیں، اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا تو ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ قادیانیوں کے عقائد کے پیشِ نظر ایک مسلمان لڑکی کا کسی قادیانی سے نکاح نہیں ہوسکتا، اور اگر شوہر نکاح کے بعد قادیانی ہوجائے تو لڑکی کا نکاح فسخ ہونا ضروری ہے۔

شیخ الہند کا فتویٰ:۔ جب یہ کشمکش بہت بڑھ گئی تو بہت سے لوگوں نے علمائے سے استصواب کیا اور فتویٰ طلب کیا، استفتاء مرتب ہوا، مفتیوں کے پاس بھیجا گیا اور سوال کیا گیا کہ اس سلسلہ میں مسئلہ کی صحیح صورتِ حال کیا ہے، سب سے پہلا باضابطہ فتویٰ میرا خیال ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کا ہے جو بہت مفصل تھا جس میں قادیانیوں کو مرتد کہا گیا تھا، اس فتویٰ کو مولانا نور احمد صاحب امرتسری نے شائع کیا تھا، اس فتویٰ کے ساتھ بھوپال کے مفتیٔ اعظم کا بھی فتویٰ تھا۔ ان دونوں فتووں کو انہوں نے اپنے رسالہ "استنکاف المسلمین عن الاختلاط بالمرزائین" میں شائع کیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ:۔ غالباً ۱۹۱۶ء کے آخر کی بات ہے کہ چند علماء نے ایک استفتاء مرتب کیا جس میں قادیانیوں کے پچیس عقائد اور ان کے اقوال کو ذکر کرکے یہ سوال کیا گیا تھا کہ جو شخص مرزا غلام احمد کے ان اقوال و عقائد کا مصدق ہو، اس کے ساتھ مسلم غیر مصدق کا رشتۂ زوجیت کرنا جائز ہے یا نہیں اور بعد نکاح قادیانی ہوجانے کے بعد موجب افتراق ہے یا نہیں؟

یہ استفتاء ہندوستان کے مشہور علماء اور تمام بڑے اور ممتاز دینی اداروں اور مدرسوں کے پاس بھیجا گیا، اس استفتاء کا جواب دارالعلوم دیوبند کے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی نے تحریر فرمایا تھا اور انہوں نے جواب میں لکھا کہ:۔

> "اقوالِ مذکورہ کا کفر و ارتداد ہونا ظاہر ہے، پس وہ شخص جو ایسا عقیدہ رکھتا ہے اور کہتا ہے اور جو اس کی پیروی اور تصدیق کرنے والے ہیں وہ کافر و مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اہلِ اسلام کو ان سے مناکحت درست

نہیں اور ان کے ساتھ نکاح منعقد نہ ہوگا، اگر کوئی مسلمان نکاح کے بعد مصدق قادیانی کا ہو جاوے تو وہ فوراً مرتد ہو جاوے گا اور نکاح اس کا فسخ ہو جاوے گا اور تفریق لازم ہوگی[1]"

اس فتویٰ پر دار العلوم دیوبند کے دار الافتاء کی مہر ہے اور مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی مفتی دار العلوم دیوبند کے دستخط ہیں اور جواب پر تاریخ ۱۲ رجب ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۱۸ء پڑی ہوئی ہے، چونکہ استفتاء اور جواب بڑی اہمیت رکھتے تھے اس لیے دار العلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ کے دستخط بھی ہیں۔ فتویٰ کی تصویب و تصدیق کرنے والوں میں مولانا گل محمد خان صاحب، مولانا غلام رسول صاحب۔ مولانا محمد حسن صاحب۔ مولانا محمد رسول خان صاحب۔ مولانا شاہ اصغر حسین صاحب۔ شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب۔ شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ مولانا احمد امین صاحب مولانا محمد تفضل حسین صاحب اور مولانا عبد الوحید صاحب کے اسماء گرامی ہیں۔ یہ حضرات اس زمانہ میں دار العلوم دیوبند کے اساتذہ تھے۔

خانقاہ تھانہ بھون کا جواب:۔ مذکورہ بالا استفتاء مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی خدمت میں تھانہ بھون گیا تھا، اس کے جواب میں حکیم الامت حضرت تھانوی نے غیر مبہم الفاظ میں فتویٰ دیا کہ:۔

"جو مسلمان ایسے عقائد اختیار کرے جن میں بعضے یقینی کفر ہیں بحکم مرتد ہے اور مرتد کا نکاح مسلمان عورت سے اور اسی طرح مرتدہ کا نکاح مسلمان مرد سے صحیح نہیں اور نکاح ہو جانے کے بعد اگر عقائد کفریہ اختیار کرے تو نکاح فسخ ہو جاوے گا"[2]

اس جواب پر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے دستخط ہیں اور فتویٰ تحریر کرنے کی تاریخ میں ۱۳۳۶ھ سال لکھا ہے مہینہ اور تاریخ نہیں، غالباً کاتب کا سہو ہے

---

[1] و [2] "فسخ نکاح مرزائیان" شائع کردہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری سال اشاعت ۱۹۲۵ء

قیاس یہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کی تاریخ کے کچھ آگے پیچھے یہ جواب بھی لکھا گیا ہے

مظاہر علوم سہارنپور کا فتویٰ :- مذکورہ بالا استفتاء مظاہر علوم سہارن پور بھیجا گیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب شارح ابوداؤد بذل المجہود کے مصنف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری، مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں استاذ تھے، استفتاء کا جواب دارالافتاء کی طرف سے لکھا گیا کہ:-

سوال مذکور الصدر میں اکثر ایسے امور ذکر کیے گئے ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ناجائز، موجب کفر وارتداد..... ہیں پس جو شخص ایسا عقیدہ رکھتا ہو اور ان اقوال کا مصداق ہو تو اس کے کفر میں کچھ کلام نہیں وہ شرعاً مرتد ہوگا جس کے ساتھ نکاح جائز نہیں اور جو پہلے اہل اسلام تھا بعد نکاح کے قادیانی عقائد کا ہوگیا اس کا نکاح فوراً شرعاً باطل ہوجاوے گا قضاً قاضی اور حکم حاکم کی بھی شرعاً اس میں ضرورت نہیں، ارتداد احد هما (الزوجین) فسخ عاجل بلاقضاء (شامی جلد ثانی ص ۴۲۵۔

لایجوزله ان یتزوج مسلمة الخ ویحرم بیعته وصیدہ الخ عالمگیری ص ۷۷، ۸ [1]

جواب کی عبارت مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کی ہے فتویٰ کی تصدیق وتصویب مظاہر علوم کے اکابر اساتذہ نے کی ہے، فتوے پر مندرجہ ذیل اساتذہ کے دستخط ہیں جو اس وقت مظاہر علوم میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مصنف "بذل المجہود" شرح ابوداؤد، مولانا ثابت علی صاحب، مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا عبداللطیف صاحب (جو بعد میں مظاہر علوم کے مہتمم بنائے گئے) مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی، مولانا محمد ممتاز میرٹھی، مولانا منظور احمد صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا

---

[1] رسالہ "فسخ نکاح مرزائیان" از مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری۔

عبدالقوی صاحب مولانا محمد فاضل صاحب، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھ (مہاجر مکی، صاحب ترجمان السنہ وتصانیف کثیرہ) مولانا علم الدین صاحب حصاری، مولانا غلام حبیب پشاوری، مولانا عبدالکریم نوگانوی، مولانا فصیح الدین سہارنپوری، مولانا روشن الدین صاحب محمد پوری، مولانا نور محمد صاحب، مولانا دلیل الرحمٰن صاحب، مولانا محمد صاحب بلوچستانی، مولانا ظریف احمد صاحب مظفر نگری، مولانا محمد حبیب اللہ صاحب۔

خانقاہ رائے پور کا فتویٰ:۔ مذکورہ بالا استفتار رائے پور ضلع سہارنپور کی مشہور شخصیت حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی خدمت میں بھی بھیجا گیا۔ اس وقت خانقاہ میں جتنے علماء و مشائخ تھے، ہر ایک نے اس فتویٰ کی تصدیق وتصویب کی، استفتار کے جواب میں تحریر کیا گیا کہ:۔

"جو شخص مسلمان ہو کر ان اقوال وعقائد کا معتقد ہو وہ بلا تردد مرتد ہے، اس سے کوئی اسلامی معاملہ کرنا اور رشتہ ناطہ کرنا جائز نہیں اور جو ان کے عقائد تسلیم کر کے مرتد ہو جائے تو اس کی بیوی اس پر حرام (حررہ (مولانا) نور محمد لدھیانوی)"

مندرجہ ذیل علماء ومشائخ خانقاہ نے فتویٰ کی تائید وتصدیق فرمائی۔ مولانا عبدالقادر شاہ پوری، مولانا مقبول سبحانی کشمیری، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، مولانا خدا بخش صاحب فیروز پوری، مولانا محمد سراج الحق صاحب، مولانا محمد صادق صاحب شاہ پوری، مولانا احمد شاہ امام جامع مسجد بھٹ اور اللہ بخش صاحب بھاول نگر۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کا فتویٰ:۔ مذکورہ فتویٰ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دار الافتاء کو بھیجا گیا تو اس کے جواب میں مفتی صاحب نے تحریر فرمایا کہ:۔

"جو شخص ان اقوال مندرجہ استفتار کا مصدق ہو اس کے ساتھ مسلمہ غیر مصدقہ کا رشتہ زوجیت کرنا ہرگز جائز نہیں اور جو شخص کہ

نکاح کے بعد ان اقوال کا مصدق ہوا، اس کی یہ تصدیق ضرور موجب افتراق ہے۔ قال تعالیٰ فان علمتموھن مؤمنات فلا ترجعوھن الی الکفار لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن۔ خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ اگر تم یقیناً معلوم کرلو کہ عورتیں مسلمان ہیں تو کبھی کفار کو واپس نہ دو، یہ (عورتیں) ان کے لیے حلال ہیں نہ وہ (کافر) ان کے لیے حلال ہیں۔ واللہ اعلم۔

کتبہ محمد عبداللہ۔ ۱۱ر جمادی الآخر ۱۳۳۶ھ

فتویٰ کی تصدیق و تائید کرنے والوں نے لکھا کہ :۔

"جو ان اقوال کا معتقد اور مصدق ہو وہ ہرگز مسلمان نہیں ہے اور نکاح وغیرہ ایسے لوگوں سے ناجائز ہے۔" (حررہ الراجی رحمۃ ربہ القوی ابوالعماد محمد شبلی المدرس دارالعلوم لندوۃ العلماء)

مولانا امیر علی مہتمم و صدر مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے تحریر فرمایا :۔

ان اقوال مذکورہ استفتاء کا جو شخص قائل ہو وہ کافر ہے اور اسلام سے خارج ہے مناکحت وغیرہ اس سے ناجائز ہے۔ (دستخط امیر علی دارالعلوم ندوۃ العلماء)

مذکورہ بالا جوابات بالکل صحیح ہیں (مولانا) عبدالودود استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اسی طرح مولانا حیدر شاہ فقیہہ دوم ندوہ کی تائید میں عبارت ہے اور دستخط،

یہ فتویٰ فرنگی محل کے مولانا عبدالباری صاحب انصاری اور مولانا فتح اللہ صاحب صدر مدرس انجمن اصلاح المسلمین لکھنؤ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ سب نے فتویٰ مذکور کی تائید و توثیق کی۔ ان کے علاوہ ملک کے بہت سے مقامات سے مذکورہ استفتاء کے جوابات آئے ہر ایک میں قادیانیوں کو خارج از دین اور مرتد قرار دیا گیا، ان تمام فتووں کو ایک رسالہ "فسخ نکاح مرزائیان" کے نام سے شائع کر دیا گیا تھا۔ میرے سامنے جو کتابچہ ہے وہ دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۲۵ء میں طبع ہوا ہے۔ خیال یہ ہے کہ جوابات کچھ ۱۹۱۷ء کے آخر کے ہیں اور کچھ ۱۹۱۸ء کی ابتدا کے ہیں اس لیے اس کی پہلی اشاعت ۱۹۱۸ء میں ہوئی ہوگی، بعد میں دوبارہ ان کو ۱۹۲۵ء میں ضرورت پڑنے پر شائع کیا گیا۔

علماءِ دارالعلوم دیوبند کو دعوتِ مباہلہ :- مولانا ثناء اللہ امرتسری کو دعوتِ مباہلہ دے کر قادیانیوں کا پیغمبر اپنی بددعا کے مطابق ہیضہ میں مبتلا ہو کر ایک ہی سال بعد مر کر اپنے کذب و افترا پر مہرِ تصدیق ثبت کر گیا تھا، یہ مباہلہ ہی تمام قادیانی اُمت کے لیے برہانِ حق ہو جانا چاہیئے تھا لیکن خدا نے جن کے قلوب پر مہر لگا دی ہے تو وہ کان رکھ کر سنتے نہیں، آنکھ رکھ کر دیکھتے نہیں اور سینہ میں دل رکھتے ہوئے بھی عبرت حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں، یہی حال قادیانیوں کا بھی تھا۔

مرزا غلام احمد کے انتقال کے دس سال بعد ان کے خلیفہ مرزا محمود پر بھی وہی باپ کا پاگل پن سوار ہو گیا اور انہوں نے علماء دارالعلوم دیوبند کو پھر دعوتِ مباہلہ دے دی، ایک اشتہار مطبوعہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۹۱۹ء کو ایڈیٹر الفضل (قادیان) کی طرف سے دارالعلوم دیوبند پہونچا جس کا عنوان تھا :-

"امامِ جماعتِ احمدیہ علماء دیوبند سے مباہلہ کے لیے تیار ہیں"

اس سے پہلے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند اور مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کی طرف سے خود مرزا محمود کو دعوتِ مباہلہ دی جا چکی تھی اور مرزا محمود نے خاموشی میں عافیت سمجھ کر اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ٹھیک اس کے ایک سال بعد اس نے یہ شگوفہ چھوڑا تاکہ لوگوں کی نظر اور توجہ قادیانیت کی طرف ہو جائے۔

فراستِ مؤمن :- علماء دیوبند قادیانیوں کی عیاریوں سے واقف تھے اس لیے وہ ایسی دعوتِ مباہلہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے جس کا مظاہرہ ہزاروں عوام کی موجودگی میں نہ ہو، جب مرزا غلام احمد اشتہاری مباہلہ کے بعد اس دنیا سے رسوا ہو کر رخصت ہو گئے تو عوام پر اس کا کوئی دُور رس اثر نہیں پڑا کیونکہ وہ اپنے خلوت خانہ میں تھے، مجمع عام میں نہیں تھے، اس لیے علماءِ دیوبند نے یہ شرط لگائی کہ مباہلہ اس طرح ہوگا کہ پہلے مجمع عام میں قادیانیوں سے مناظرہ ہوگا اور مناظرہ میں حق نمایاں طور پر واضح نہ ہونے کی صورت میں مجمعِ عام میں دونوں فریق کی موجودگی

میں مباہلہ ہوگا، علماء دیوبند کی طرف سے اعلان ہوا کہ:۔

"ہم صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ جن شواہد و دلائل کی بنا پر آپ نے ان کی نبوت (معاذ اللہ) تسلیم کی ہے وہ میدانِ مناظرہ میں پیش کیجئے اور جو کچھ اعتراضات ہم کو ہیں ان کا معقول جواب عنایت فرمایئے، تاکہ جس نبی پر آپ ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں اور جس کو مفتری کہنے والوں کو آپ کافر اور خارج از دائرۂ اسلام سمجھتے ہیں اور اُن سے مباہلہ کرنا چاہتے ہیں اس کی تصدیق مجمع عام میں علی رؤس الاشہاد ہو جاوے اور اگر بعد مناظرہ بھی نمایاں طور پر حق واضح نہ ہو تو پھر آخری صورت مباہلہ ہے جو اسی وقت اسی میدانِ عمل میں آئے گا..... میں یقین کرتا ہوں کہ میرے اس اعلان کے بعد آپ کو کسی قسم کا پس و پیش نہ ہوگا۔"[1]

محمد عبدالسمیع الانصاری مدرس دارالعلوم دیوبند ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ
مطابق ۲۱ جنوری ۱۹۱۹ء

یاددہانی پر یاددہانی:۔ مرزا محمود کی توقع کے برخلاف جب یہ اعلان شائع ہوا تو اس کے ردِّ عمل کا مظاہرہ نہیں ہوا اس لیے پھر علماء دیوبند نے اس کو للکارا اور شرم و غیرت دلاتے ہوئے لکھا گیا کہ:۔

"آخر میں پھر اس کا مکرر اعلان کیا جاتا ہے کہ علماء دیوبند احقاقِ حق کے جملہ طرق کے استعمال کے لیے آمادہ ہیں، مرزائی جماعت کو اگر دعویٰ صداقت ہے تو بے تور بہ سامنے آئے اور مرزا محمود کو آگے بڑھنا چاہیئے"[2]

اس اعلان کے مکرر شائع کرنے کے بعد قادیانی ٹال مٹول کرتے رہے اور باتوں میں اُلجھاتے رہے، مناظرہ پہلے مباہلہ بعد میں اور اسی میدانِ مناظرہ میں اس شرط کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی جان نکل جاتی تھی، اس لیے وہ باتوں کے اُلٹ پھیر میں لگے رہے

---

[1] رسالہ "القاسم" دیوبند جمادی الاول ۱۳۳۷ھ مطابق فروری ۱۹۱۹ء ص ۳۔ [2] رسالہ القاسم جمادی الآخر ۱۳۳۷ھ ص

اور ہر مہینہ ایک نیا اشتہار مباہلہ کی دعوت کا نکالتے رہے، قادیانیوں کا چوتھا اشتہار اس مطالبہ کے لیے شائع کیا گیا کہ علماء دیوبند متفقہ طور پر کسی کو اپنا وکیل اور نمائندہ مقرر کر دیں تب ہم اس سے مناظرہ اور مباہلہ کے مسئلہ پر گفتگو کریں گے ورنہ نہیں علماء دیوبند کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مرزا محمود فرار کی راہیں تلاش کر رہا ہے اس لیے اس کو فرار کی کوئی راہ نہ دی جائے اور ایک ایسا اعلان شائع کر دیا جائے جو اس کی زبان بند کر دے اور وہ مناظرہ و مباہلہ کی شرائط کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے اور اس کو سامنے آنا ہی پڑے۔

مولانا عبدالسمیع صاحب استاد دارالعلوم نے تین ماہ قبل قادیانیوں کی دعوتِ مباہلہ کو منظور کرتے ہوئے جو اعلان کیا تھا اور اس میں اپنی یہ شرط لگائی تھی کہ مناظرہ پہلے ہوگا اور مباہلہ اسی میدانِ مناظرہ میں اسی دن وہیں ہوگا تو قادیانیوں کے چوتھے اشتہار کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا کہ مرزا محمود کا مطالبہ پورا کر کے دوبارہ پھر چیلنج کر دیا جائے اس لیے تیسرے مہینے جب مولانا عبدالسمیع صاحب نے اپنا چیلنج پھر شائع کیا تو اس اعلان کے ساتھ ذمہ داران دارالعلوم دیوبند کی تائید و توثیق کو بھی شائع کر دیا جائے تاکہ پھر اس کو بہانہ بنانے کا موقعہ نہ مل سکے۔ مولانا عبدالسمیع کے اعلان پر ان کے دستخط کے بعد یہ عبارت شائع کر دی گئی کہ:۔

"ہم تصدیق کرتے ہیں کہ مولوی عبدالسمیع صاحب انصاری مدرس دارالعلوم دیوبند نے جو کچھ اب تک جماعتِ قادیان کے مقابلہ میں لکھا جو آئندہ اسباب میں لکھیں گے وہ سب ہم حرف بہ حرف منظور ہے۔"

محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ محمد انور شاہ قائم مقام صدر مدرس دارالعلوم دیوبند۔[1]

قادیان شہرِ خموشاں بن گیا:۔ چار ماہ مسلسل سوال و جواب، شرائط کی تنقیح، ہر بار شرطوں کا اضافہ ہوتا رہا لیکن

---

[1] رسالہ القاسم دیوبند شمارہ رجب ۱۳۳۷ھ مطابق اپریل ۱۹۱۹ء ص ۱۲۔

علماء دیوبند یہ تہیہ کر چکے تھے کہ اب کی بار خلیفہ قادیان کے لیے فرار کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں چھوڑا جائے گا اس لیے چوتھے ماہ کے اعلان پر جو مولانا عبدالسمیع صاحب استاد دارالعلوم دیوبند کی طرف سے شائع کیا گیا، مرزا محمود کی آخری شرط کی تکمیل کے لیے حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور علامہ انور شاہ کشمیری صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے اپنی حمایت اور تصدیق و توثیق کر کے اور مولانا عبدالسمیع صاحب کو اپنا وکیل بنا کر مرزا محمود اور ایڈیٹر الفضل کا راستہ اس طرح بند کر دیا کہ پھر دونوں کو سانپ سونگھ گیا، بار بار کے اعلان کے باوجود خاموشی چھائی رہی۔

بات یہ تھی کہ اب کی بار صرف مباہلہ کا ڈرامہ کرنے کا قادیانیوں کو موقعہ نہیں دیا جا رہا تھا، مباہلہ کی شرط اول یہ تھی کہ مجمع عام میں قادیانیوں سے مرزا کی نبوت پر مناظرہ ہوگا اور اس میں مرزا کی نبوت پر دلائل فراہم کرنا قرآن و احادیث کی کڑی کسوٹی پر ان کے ذمہ ضروری تھا اور یہی ان کے بس کی بات نہیں تھی، قادیانیوں کے لیے میدانِ مناظرہ میں کھڑے ہو کر مرزا کی نبوت کا ثبوت دینا قیامت میں خدا کے سامنے حساب و کتاب دینے کے لیے کھڑے ہونے کے برابر ہولناک تھا۔ اور جب وہ مناظرہ کے پل صراط پر آئیں گے تو ان کو یقین تھا کہ وہ اپنے کذب و افترا کے گناہوں کی وجہ سے کٹ کر ذلت و رسوائی کی جہنم میں گر چکے ہوں گے، پھر مباہلہ کا کہاں سوال رہ جائے گا، اور اگر بالفرض وہ اس پل صراط کو کسی طرح پار کر گئے تو سنتِ رسول کے مطابق علماء دیوبند کی جماعت کے ساتھ مرزا محمود کی ذریت کو بھی لے کر میدانِ مباہلہ میں حاضر ہونا ہوگا، پھر مجمع عام میں کھڑے ہو کر جھوٹے پر لعنت اور بددعا کرنی ہوگی۔ اس تصور ہی سے وہ گھبرا گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادیانیوں نے چار ماہ کے شور و غوغا کے بعد پہلے بناکر کنارہ کشی اختیار کر لی اور پھر اس کے بعد انہوں نے علماء دیوبند کے مقابلہ میں مباہلہ کا نام نہیں لیا۔[1]

---

[1] یہ تمام تفصیل رسالہ "القاسم" دیوبند شمارہ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب اور شعبان ۱۳۳۶ھ میں موجود ہے۔

ایک دلچسپ مقدمہ اور فیصلہ:- علماء دیوبند سے پانچ ماہ کے بعد قادیانیوں کو گفتگو کی پھر ہمت نہیں ہوئی، اسی سال تمام دینی اداروں کے فتاویٰ کا مجموعہ قادیانیوں کے کافر مرتد ہونے سے متعلق شائع ہوا۔ مسلمانوں کے اہم ترین اداروں نے ان کے کفر وارتداد کا متفقہ فیصلہ کیا، اسی سال انگریزی عدالت کے ایک غیر مسلم مجسٹریٹ نے بھی کچھ ایسا ہی فیصلہ کیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ایسی عدالت جس کا مجسٹریٹ بھی غیر مسلم، مسلمانوں کا وکیل بھی غیر مسلم اور فیصلہ وہ ہوا ہے جو اسلامی ادارے اپنے دارالافتاء میں تجویز کرتے ہیں۔ اس کی مختصر روداد ایک انگریزی اخبار "دی اُڑیا کٹک" کے ایڈیٹر کی زبانی سنیئے:-

"واقعہ یہ تھا کہ اُڑیسہ میں قادیانی مشنریوں کی کوششوں سے کچھ مسلمان مرتد ہوکر قادیانی ہوگئے تھے، ایک قادیانی عورت مرگئی، قادیانیوں نے لاش کو مسلم قبرستان میں دفن کرنا چاہا، قبر کھودی جاچکی تھی، لاش قبر پر لاکر رکھدی گئی تھی کہ مسلمانوں کو اس کا علم ہوا، وہ آئے، اور لاش کو اُٹھا کر قبرستان سے باہر لاکر ایک قادیانی کے گھر میں رکھدیا، قادیانیوں نے تھانے میں ایف، آئی، آر درج کرائی، مسلمان گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، عدالت ماتحت نے سزا تجویز کی، مسلمانوں نے جج کے یہاں اپیل کی، اور مسٹر داس ایک غیر مسلم کو اپنا وکیل بنایا، انہوں نے کہا کہ میں رضاکارانہ اس مقدمہ کی پیروی کروں گا اور کوئی فیس نہیں لوں گا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وکیل نے عدالت میں یہ ثابت کیا کہ قبرستان مسلمانوں کا ہے اور قادیانی مسلمان نہیں ہیں، دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دونوں دو فرقے ہیں اور دو پیغمبروں کو مانتے ہیں، اس لیئے اگر مسلمان اپنے قبرستان کو دوسرے فرقوں کے استعمال سے روکتے ہیں تو یہ ان کا مذہبی حق ہے، حکومت کو اس میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے، یہ بات اتنے مدلل طریقے سے کہی گئی کہ جج کو یقین ہوگیا کہ

قادیانی مسلمان نہیں ہیں اس لیئے ان کو مسلمانوں کا قبرستان استعمال کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ اس لیے جن لوگوں نے قادیانیوں کی لائی ہوئی لاش کو قبرستان سے باہر کر دیا تو انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنا حق استعمال کیا اور اپنے قبرستان کو دوسروں کو استعمال کرنے سے منع کر کے قانونی طور پر کوئی جرم نہیں کیا، اس لیے عدالت ماتحت نے جو فیصلہ کیا ہے اس لیے اس کو کالعدم کیا جاتا ہے اور میں تمام ماخوذ مسلمانوں کو باعزت بری کرتا ہوں"۔ [1]

(انگریزی اخبار دی اڑیا کٹک ۲۶ مارچ ۱۹۱۹ء)

تھانہ بھون کا ایک اور فتویٰ:- ۱۳۴۱ھ میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی خدمت میں مندرجہ ذیل استفتار آیا کہ:-

"کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو کافر ہیں یا نہیں؟ کیا کسی مسلمان کو حق ہے کہ ان کو مسجد میں جانے اور نماز پڑھنے سے روکے؟ بینوا توجروا"

مولانا تھانوی نے اس استفتار کے جواب میں تفصیلی فتویٰ دیا اور غیر مبہم الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:-

"خود مرزا کے بقاء اسلام کے قائل ہونے کی تو اس کے اقوال دیکھنے کے بعد کچھ گنجائش نہیں، چنانچہ خود مرزا کے رسائل اور اس کے رد کے رسائل میں وہ اقوال بہ کثرت موجود ہیں، جن میں تاویل کرنا ایسا ہی ہے جیسے بت پرستی کو اس تاویل سے کفر نہ کہا جاوے کہ توحید وجودی کی بناء پر یہ شخص غیر خدا کا عابد نہیں، اب رہ گئے اس کے پیرو تو قادیانی پارٹی تو ان

---

[1] رسالہ القاسم دیوبند شمارہ ماہ رمضان ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء

اقوال کو بلا تأمل مانتی ہے، ان پر بھی حکم بالا سلام کی کچھ گنجائش نہیں، باقی لاہوری پارٹی کے متعلق شاید کسی کو تردد ہو، کیونکہ وہ مرزا کے دعویٰ نبوت میں کچھ تاویل کرتے ہیں، سو اس تاویل کا صادق ہونا مرزا کے کاذب ہونے کو مستلزم ہے جیسا کہ اوپر اس تاویل کا متحمل نہ ہونا مذکور ہوا ہے اور مرزا کا صادق ماننا اس تاویل کے باطل ہونے کو مستلزم ہے، پس اس جماعت پر حکم بالا سلام کی صرف ایک صورت ہے کہ یہ مرزا کو کاذب کہیں اور اگر اس کو صادق کہیں گے تو پھر ان پر بھی اسلام کا حکم نہیں کیا جا سکتا اور جب اُن سے نفی اسلام کی ثابت ہو چکی تو ان کے ساتھ کوئی معاملہ اہل اسلام کا کرنا جائز نہ ہوگا۔"[1]

(۹ ذی الحجہ عرفہ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء)

مباہلہ کی شہرت اور فتوؤں کا اثر:- ۱۹۰۸ء میں مرزا کے مرنے کے بعد ان کے مُریدوں نے بڑی سرگرمی سے اپنے مذہب کی اشاعت شروع کر دی تھی اور ان کا دائرۂ کار بڑھتا جا رہا تھا، اس لیے ہندوستان کے ہر خطہ میں مسلمان اس نئے فرقہ کو حیرت و تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور اکّا دُکّا مسلمان مرتد بھی ہو رہے تھے، اسلام کو قادیانیوں سے نقصان پہونچنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں میں گھسے ہوئے تھے اور ابتداءً عام مسلمانوں نے قادیانیوں کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ تصور کیا اور وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ قادیانیوں کے جال میں پھنس کر اپنے ایمان سے بھی وہ ہاتھ دھو بیٹھیں گے لیکن جو لوگ اس فتنۂ ارتداد کی حقیقت سے واقف تھے وہ قادیانیت سے متأثر ہونے والے افراد کو اس کے باطل اور گمراہ ہونے کو سمجھاتے تو اگر ان کے دل میں اسلام و ایمان کا ذرا بھی شائبہ ہوتا تھا تو اب ان کو صحیح صورتِ حال سمجھنے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، علماء کرام کے ان فتوؤں نے عوام کی اسی تشنگی کو بجھانے کا کام کیا، ان فتوؤں نے قادیانیوں کے عقائد کا پردہ

---

[1] امداد الفتاویٰ جلد ششم صفحہ ۵۹

چاک کرکے قادیانیت کو شاہراہِ عام پر عریاں کھڑا کردیا اور عوام بھی اُسے اسلام سے بغاوت تصور کرنے لگے اور جہاں کہیں بھی وہ دام ہمرنگِ زمین بچھاتے تھے مسلمان اس جال کو توڑ دینے کی کوشش کرتے، مثال کے طور پر پشاور کا ایک واقعہ سن لیجیے جس سے اسلام اور قادیانیت کے درمیان ہونے والی کشاکش پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے عام طور پر جہاں مسلمان تعلیم یافتہ تھے یہ صورتِ حال پیدا ہوچکی تھی۔

مشہور محدث حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے شاگردِ رشید جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث اور جامعہ اسلامیہ کراچی کے سربراہِ اعلیٰ مولانا محمد یوسف بنوری جس سال دورۂ حدیث سے فارغ ہوکر پشاور پہونچے، اسی سال کا واقعہ ہے۔ آگے کا واقعہ مولانا بنوری کے ایک بے تکلف عالم فاضل دوست کی زبانی سنیئے:۔

"جمعیۃ علمار سرحد سے تعلق کے زمانے میں ہمیں محسوس ہوا کہ پشاور میں قادیانی اپنے پاؤں پھیلا رہے ہیں اور دین سے ناواقف طبقہ کو گمراہ کررہے ہیں، پشاور کا ایک قادیانی مسمیٰ غلام حسین جو قرآنِ کریم کی قادیانی تفسیر (یا بہ لفظِ صحیح تحریف) بھی لکھ چکا تھا، وہ پشاور میں صبح کو قرآن کا درس دیتا تھا، نوجوان وکلار اور کالجوں کے ناپختہ ذہن طالب علم اس میں شریک ہوتے تھے، پشاور کا مشہور لیڈر جو بعد میں مسلم لیگ اور پاکستان کا بڑا رہنما بنا، سردار عبدالرب نشتر، وہ بھی اس کے درس میں شریک ہوتا تھا، پشاور اسلامیہ کالج کا وائس پرنسپل تیمور مرزا بشیر الدین قادیانی کا رشتہ دار تھا، صاحبزادہ عبدالقیوم بانی اسلامیہ کالج کا چچازاد بھائی عبداللطیف قادیانی صوبہ سرحد کی قادیانی جماعت کا امیر تھا۔

قادیانی سال میں ایک دفعہ "یوم النبی" کے نام سے ایک بڑا جلسہ کرتے تھے جس میں شرکت کے لیے تمام سرکاری افسروں کو دعوت نامے بھیجے جاتے اس طرح کھلے بندوں قادیانیت کی تبلیغ کے لیے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جب ہم جمعیۃ علمار کے کام میں منہمک تھے تو میں نے دیکھا کہ

قصہ خوانی بازار میں قادیانیوں کے اس جلسے کے اشتہار لگ رہے ہیں، جن میں اسلامیہ کلب میں "یوم النبی" کا اعلان تھا، میں نے مولانا بنوری سے مشورہ کیا کہ قادیانیوں کی اس کھلی جارحیت کا سدّباب ہونا چاہیئے، میں ان دنوں اسلامیہ اسکول میں عربی کا معلم تھا، میں نے اسکول کی نویں اور دسویں جماعت کے طلبہ کو قادیانی کی حقیقت بتائی اور قادیانیوں کے "یوم النبی" کے نام پر لوگوں کو بہکانے کی مکاری عیاں کی اور انھیں بھی اس معرکہ میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا جس کا نقشہ میں اور مولانا بنوری بنا چکے تھے۔

مقررہ تاریخ پر قادیانیوں نے اسلامیہ کلب میں قالین بچھائے اسٹیج لگایا اور جلسہ کا انتظام کرنے لگے، ہم دونوں بھی وہاں پہونچ گئے اور جاکر اعلان کر دیا کہ یہاں اہل اسلام کا جلسہ ہوگا ہماری اور قادیانیوں کی کشمکش ہوئی جس میں قاضی یوسف نامی قادیانی نے مجھ پر لاٹھی سے حملہ کر دیا، ہمارے رفقاء نے اس کو پکڑ کر نیچے گرا دیا جو قادیانی کرسیوں پر براجمان تھے انھیں فرش پر گرا دیا، قادیانی ذلّت اور نامرادی کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب اسٹیج پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، مولانا بنوری نے بڑی فصیح و بلیغ اور طویل تقریر فرمائی، مسلمانوں اور قادیانیوں کی کشمکش سن کر پورا شہر اُمڈ آیا اور خوب جلسہ ہوا، قادیانیوں کو ایسی ذلّت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا کہ جب سے اب تک انھیں پشاور میں ایسا ڈھونگ رچانے کی دوبارہ جرأت نہیں ہوئی"[1]

بہار میں قادیانیت:۔ ہندوستان کے مغربی حصہ میں پشاور اور مشرقی حصہ میں اڑیسہ میں قادیانیت کی ریشہ دوانیاں آپ نے دیکھیں اب آیئے بہار چلتے ہیں، یہی زمانہ ہے جب بہار کے شہروں میں اور دُور اُفتادہ دیہاتوں

---

[1] رسالہ "بینات" کراچی مولانا یوسف بنوری نمبر ۱۹۷۸ء ص ۲۹ و ۳۰

میں قادیانیوں نے پر پُرزے نکالے، ایک پُرجوش قادیانی مبلغ سعید مختار بہار میں قادیانیت کا زہر پھیلانے میں شب و روز مصروف رہا، اس کے اثرات مونگیر اور ہزاری باغ میں زیادہ تھے، کچھ لوگ قادیانی بھی ہوگئے تھے، یہی زمانہ ہے کہ مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ خلیفہ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی خانقاہ رحمانیہ مونگیر میں اصلاح اور دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے، موصوف صاحب زہد و تقویٰ اور مرشد کامل تھے، انہوں نے سنا کہ ہزاری باغ میں کچھ لوگ قادیانی ہوگئے تو آپ نے اپنے ایک مرید کو بڑے افسوس ناک لہجہ میں اس واقعہ کے بارے میں ان کو لکھا اور قادیانیت کے زہر بونے والے پر نظر نہ رکھنے پر ملامت کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ ہزاری باغ میں سعید مختار کی سرگرمیاں شباب پر ہیں اور وہ لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

مولانا سید محمد علی صاحب نے محسوس کیا کہ اگر پوری قوت سے اس فتنہ کی سرکوبی نہیں کی گئی تو نہ معلوم کتنے مسلمانوں کے دین و ایمان پر وہ ڈاکے ڈالے گا اس لیے وہ پورے عزم کے ساتھ اس مہم کو سرانجام دینے اور بہار سے قادیانیت کی جڑ اکھیڑ دینے کے ارادے سے وہ جد و جہد کے میدان میں اُترے، انہوں نے پورے بہار کو متاثر کرنے کے لیے ضروری سمجھا کہ قادیانیوں سے مجمع عام میں مناظرہ ہو جائے تاکہ حق واضح ہو کر کفر و ارتداد کا چہرہ بے نقاب ہو جائے اور قادیانی مبلغین جو اپنے کو مسلمان کہہ کر ناواقف مسلمانوں کو قادیانیت کے جال میں پھنسا رہے ہیں اس کا سلسلہ بند ہو جائے اور پورے بہار کے مسلمان قادیانیت کی اصلیت سے واقف ہو جائیں، یہ مناظرہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ۱۹۰۸ء کے تین سال بعد ۱۹۱۱ء میں مونگیر شہر میں ہوا۔

مولانا[1] سید محمد علی کان پوری مونگیری نے اس دور کے مشاہیر علماء کو اس مناظرہ میں

---

[1] مولانا سید محمد علی کان پوری ثم مونگیری اپنے دور کے مشاہیر علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ کان پور میں آپ کی ولادت شعبان ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ آپ نے تعلیم مفتی عنایت احمد صاحب کاکوری صاحب علم الصیغہ مولانا سید حسین شاہ کشمیری اور مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی سے کان پور میں (باقی برصفحہ آئندہ)

مدعو کیا تھا جن کی تعداد تذکروں میں چالیس بتائی جاتی ہے، قادیانیوں کی طرف سے مرزا غلام احمد کی نفس ناطقہ اور خلیفۂ خاص حکیم نورالدین بھیروی تھے، درحقیقت مرزا کو مجددیت پھر مہدویت اور بعد میں نبوت کا سبق پڑھانے والے بھی حکیم نورالدین بھیروی ہی تھے، یہی قادیانیوں کی طرف سے مناظر بن کر آئے، اس دور میں قادیانیوں کے دو اور مشہور مناظر تھے حافظ روشن علی اور سرور شاہ کشمیری یہ دونوں بھی اس مناظرہ میں بڑے جاہ و طمطراق سے آئے تھے اس طرح قادیانیوں نے اپنی ساری علمی و استدلالی قوت جمع کرلی تھی۔

قادیانیوں سے مُناظرہ:۔ مونگیر میں یہ مناظرہ دونوں طرف سے پوری تیاریوں کے ساتھ ہوا، قادیانی اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ مونگیر پر حملہ آور تھے، دوسری طرف علماء حق کی ایک ناقابلِ شکست فوج بھی میدان میں آگئی، اور معرکۂ کارزار گرم ہوگیا، مناظرہ کی روداد کو مولانا سید محمد علی مونگیری کے سوانح نگار نے ایک مستند حوالے سے بیان کیا ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اُنھیں کی زبانی اس دلچسپ داستان کو سنیں، وہ کہتے ہیں کہ:۔

> "قادیانیوں کی طرف سے حکیم نورالدین بھیروی، سرور شاہ کشمیری، حافظ روشن علی قادیانیت کے مختارِ کل بن کر آئے تھے، اس طرف سے مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری (ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند) علامہ انور شاہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) حاصل کی۔ اور حدیث سہارن پور جاکر مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری صحیح بخاری شریف سے پڑھی۔ آپ مشہور صاحب کشف و کرامت بزرگ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے بیعت اور آپ کے اجلہ خلفاء میں آپ کا شمار ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام اور اس کا دارالعلوم آپ کی جدوجہد کا ثمرہ ہے، ردّ عیسائیت اور ردّ قادیانیت میں بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ قادیانیوں اور عیسائیوں کے خلاف آپ کی سیکڑوں کتابیں ہیں جن میں سے چالیس کے قریب شائع ہوچکی ہیں، آخر عمر میں آپ مونگیر منتقل ہوگئے اور وہیں خانقاہ رحمانیہ آپ کا معتکف بن گئی۔ ہزاروں افراد آپ سے بیعت ہوئے۔ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں مونگیر میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خواب ہیں۔

صاحب کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند، علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی (شارح مسلم شریف)، مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری اور مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی، تقریباً چالیس علماء بلائے گئے تھے، لوگوں کا بیان ہے کہ عجیب منظر تھا، صوبہ بہار کے اضلاع کے لوگ تماشائی بن کر آئے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ خانقاہ رحمانیہ میں علماء کی بارات ٹھہری ہوئی ہے، کتابیں اُلٹی جارہی ہیں، حوالے تلاش کیے جارہے ہیں اور بحثیں چل رہی ہیں، سوال یہ پیدا ہوا کہ مولانا محمد علی کی طرف سے مناظرہ کا وکیل اور نمائندہ کون ہو؟ قرعۂ فال مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کے نام پڑا، آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو تحریراً اپنا نمائندہ بنایا، علماء کی یہ جماعت میدانِ مناظرہ میں گئی، وقت مقرر تھا، اس طرف مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اسٹیج پر تقریر کے لیے آئے اور اس طرف آپ سجدہ میں گئے اور اس وقت تک سر نہیں اٹھایا جب تک فتح کی خبر نہیں آگئی۔

بوڑھوں کا کہنا ہے کہ میدانِ مناظرہ کا منظر عجیب تھا۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی ایک ہی تقریر کے بعد جب قادیانیوں سے جواب کا مطالبہ کیا گیا تو مرزا صاحب کے نمائندے جواب دینے کے بجائے انتہائی بدحواسی اور گھبراہٹ میں کرسیاں اپنے سروں پر لیے ہوئے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ "ہم جواب نہیں دے سکتے"۔

بہار میں قادیانیت کے خلاف مہم:- مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے مریدوں کا بہار میں ایک بڑا وسیع حلقہ تھا آپ ان علاقوں کے لوگوں کو جو آپ سے وابستہ تھے اور صاحبِ علم و با اثر تھے خطوط لکھ کر قادیانیت کے فتنہ کی طرف برابر توجہ دلاتے رہتے تھے، ایسے ہی ان تمام لوگوں کو

لہ مقالہ مولانا منت اللہ رحمانی متعلقہ سوانح ص ۴۶ بحوالہ "سیرت محمد علی مونگیری" ص ۲۹۸

مسلسل تاکید فرماتے رہتے تھے جن سے آپ کا تعلق تھا اور خانقاہ میں استفاضہ و استفادہ کی غرض سے آتے رہتے تھے، ایسے لوگوں کو حوصلہ دلاتے، کام کا طریقہ بتاتے ان کی ہمت بڑھاتے اور ان کام کرنے والوں کی مدد اور تعاون کے لیے اس حلقہ کے متمول اور بااثر افراد کو بھی توجہ دلاتے اور ان کی ہر طرح مدد کرنے پر آمادہ کرتے، اس طرح بہت سے بااثر اور اہل علم حضرات ردّ قادیانیت کے لیے جدوجہد کے میدان میں اُتر آئے اور اپنے مرشد کی تعمیل حکم میں دین کو دشمنانِ اسلام سے محفوظ کرنے کے جذبے سے وقت کے اس اہم ترین فریضہ کی ادائیگی میں مولانا محمد علی صاحب کی توجہ دہانی کی وجہ سے ایک طاقتور ٹیم لگ گئی۔ آپ نے ایک بار اپنے حلقہ بگوشوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا کہ میرے یہاں سے ردّ قادیانیت کے رسائل منگا کر اور اس علاقہ کے مسلمانوں کو تقسیم کرو اور تم لوگوں میں جو لکھنے کی صلاحیت و استعداد رکھتے ہیں وہ قادیانیوں کے خلاف مسلسل لکھیں اور طبع کرائیں اور مسلمانوں میں خوب تقسیم کریں اور ردّ قادنیت کے سلسلہ میں اتنا کثیر لٹریچر تم لوگ پھیلا دو کہ جب مسلمان سو کر صبح کو اُٹھے تو وہ اپنے سرہانے ردّ قادیانیت کی کتاب ضرور پائے۔

ردّ قادیانیت میں موصوف کی کتابیں:- مولانا محمد علی مونگیری نے ردّ قادیانیت میں بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں، ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ صوبہ بہار میں ردّ قادیانیت کا لٹریچر ہر طرف پھیلا دیا جائے چونکہ آپ اس وقت تصنیف و تالیف ہی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اس لیے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں آپ نے لکھ ڈالیں، ان کے سوانح نگار نے ان کتابوں کی تخمینی تعداد پچاس کے قریب بتائی ہے۔ ان کی چند اہم کتابوں کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مولانا کی ایک بہترین تصنیف "فیصلہ آسمانی" تین جلدوں میں ہے، ردّ قادیانیت میں کافی مقبول ہوئی اور چند سالوں میں اس کے متعدد ایڈیشن نکل گئے، کتاب حشو و زائد سے پاک اور غیر ضروری تفصیل سے خالی ہے، آپ کی دوسری کتاب "شہادتِ آسمانی" دو حصوں میں ہے "پہلی شہادتِ آسمانی" اور "دوسری شہادتِ آسمانی" کے نام سے شائع کی گئی ہے، مرزا غلام احمد نے چاند و سورج کے ایک ساتھ گہن ہونے کو جو اتفاق سے ان کے

زمانہ میں ہوا تھا اپنے مسیح موعود ہونے کے ثبوت میں پیش کیا تھا، مولانا موصوف نے مستند تاریخوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ چاند سورج کا ایک ساتھ گہن کئی بار ہوا ہے اگر یہ مسیح موعود ہونے کی نشانی ہوتا تو آج سے سیکڑوں سال پہلے جب دونوں کا ایک ساتھ گہن ہوا تھا مسیح موعود آچکے ہوتے، اس لیے یہ مرزا غلام احمد کی بکواس ہے جو وہ چاند سورج کے ایک ساتھ گہن ہونے کو اپنے مسیح موعود ہونے کے ثبوت اور شہادت میں پیش کرتے ہیں۔ مولانا محمد علی کی رد قادیانیت میں "چشمۂ ہدایت"، "چیلنج محمدیہ"، "معیار صداقت"، "معیار المسیح"، "حقیقۃ المسیح"، "تنزیہہ ربانی"، "آئینۂ کمالات مرزا"، "نامۂ حقانی" زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ رد قادیانیت میں کچھ کم وبیش آپ کی پچاس کتابیں ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کے شائع ہونے کے وقت کتاب کے سرورق پر یہ بھی چھاپ دیا گیا تھا کہ جو شخص اس کتاب کا ٹھیک ٹھیک جواب دے گا اس کو دس ہزار روپے انعام دیئے جائیں گے۔ اس میں مرزا کے مفتری اور کاذب ہونے کے ثبوت میں اُسی کے اٹھارہ اقوال نقل کیے گئے تھے لیکن کسی قادیانی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔

حیدرآباد میں قادیانیت:۔ قادیانیت رینگتی ہوئی حیدرآباد پہونچ گئی، مولانا مونگیری کو جب اس کا علم ہوا کہ مشہور قادیانی خواجہ کمال الدین حیدرآباد میں قادیانیت کا جال پھیلا رہا ہے اور اس نے "صحیفۂ آصفیہ" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے، اس کی وجہ سے نظام حیدرآباد کے دربار میں اس کو تقرب بھی حاصل ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اس کا کام آسان ہوگیا ہے، تو آپ کو اس خبر سے سخت تشویش ہوئی۔ واقعہ یہ تھا کہ خواجہ کمال الدین کے طریقہ کار سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو رہا تھا اور خواجہ کمال الدین سے بہت قریب ہوگیا تھا، اندیشہ یہ ہوا کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو جلد ہی حیدرآباد میں قادیانیوں کا ایک بڑا وسیع حلقہ قادیانیوں کا بن جائے گا اس لیے مولانا مونگیری نے اس کا ایک حل سوچا اور آپ نے نظام حیدرآباد مولانا انوار اللہ خاں صاحب کو حیدرآباد ایک خط تحریر فرمایا کہ:-

---

ط مولانا انوار اللہ خان حیدرآبادی اپنے دور کے مشہور علماء میں سے تھے۔ آپ کی پیدائش (باقی بر صفحہ آئندہ)

"کچھ عرصہ سے سُن رہا ہوں کہ خواجہ کمال الدین وکیل لاہور مرید خاص مرزا غلام احمد قادیانی وہاں پہونچے ہوئے ہیں اور تمام مسلمانوں میں بہت غل مچا دیا ہے، اور سنا جاتا ہے کہ ہمارے شہریار دکن کی نظروں میں وہ مقبول ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر ایک کو اُن سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی، مجھے سخت حیرت ہے کہ باوجودیکہ وہاں کے فرماں روا آپ کو بہت مانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کتاب "افادۃ الافہام" آپ ہی نے لکھی ہے اور بہت عمدہ کتاب لکھی ہے اس کے مقابلہ میں "صحیفۂ آصفیہ" خواجہ صاحب تقسیم ہو رہا ہے، یعنی تریاق کے بعد زہر کی تخم پاشی ہو رہی ہے اور آپ خاموش ہیں۔"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قندھار ضلع ناندیڑ (دکن) میں ۱۲۶۴ھ میں ہوئی، حفظ قرآن اور ابتدائی کتابیں اپنے یہاں پڑھیں پھر لکھنؤ جا کر مولانا عبدالحلیم انصاری فرنگی محلی لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور پھر جب مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی حیدرآباد تشریف لے گئے تو آپ نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ فن تفسیر آپ نے شیخ عبداللہ یمنی سے پڑھا تکمیل علوم و فنون کے بعد آپ نواب محبوب علی خاں آف حیدرآباد کے استاد مقرر ہو گئے۔ یہ ۱۳۰۱ھ کا واقعہ ہے بعد میں آپ نواب عثمان علی خاں نواب حیدرآباد کے اتالیق بنا دیئے گئے، جب میر عثمان علی خاں نواب ہوئے تو آپ نے اپنے استاد کا مرتبہ بہت بڑھا دیا۔ آپ کو وزیر اوقاف اور صدر الصدور بنا دیا گیا اور "نواب فضیلت جنگ" کے خطاب سے نوازا گیا، حیدرآباد میں آپ کو بہت اثر و رسوخ حاصل تھا، بڑے ہی عالم فاضل، عابد، شب بیدار اور زاہد مرتاض تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے شرف بیعت حاصل تھا، بدعات و خرافات سے سخت نفرت اور قادیانیت کے دشمن تھے، قادیانیوں کے رد میں آپ کی ایک بہترین کتاب "افادۃ الافہام" دو جلدوں میں ہے، اس کے علاوہ آپ کی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ آپ کا انتقال جمادی الآخر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں ہوا اور اپنے قائم کردہ مدرسہ نظامیہ میں مدفون ہوئے + [1] سیرت مولانا سید محمد علی ص ۲۲۳

خط کے آخر میں آپ نے مولانا کے سامنے ان وجوہ کو رکھا جس کی وجہ سے خواجہ کمال الدین کو کامیابی ملی اور خواجہ کمال الدین کے دل کے چور کی نشان دہی فرماتے ہوئے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ نظام حیدر آباد سے گفتگو کر کے قادیانیت کی نشر و اشاعت پر پابندی عائد کرادیں۔

اس خط کا اثر کیا ہوا؟ اس کی تفصیل تو میرے پاس نہیں ہے لیکن دونوں بزرگوں کے تعلقات اور مولانا انوار اللہ صاحب کا قادیانیوں کے رد میں مفصل کتاب لکھنا مولانا کے جذبۂ دینداری کو بہت نمایاں کرتا ہے اس لیے گمان غالب ہے کہ یہ خط رائیگاں نہیں گیا ہوگا، اس لیے قیاس یہ کہتا ہے کہ اگر خواجہ کمال الدین بے لگام ہو کر اپنی مہم میں آزاد ہوتا اور کامیاب ہوتا تو حیدر آباد میں یقیناً قادیانیوں کا ایک وسیع حلقہ بن گیا ہوگا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حیدر آباد میں قادیانیت کا وہ اثر اور حلقہ نہیں جس کا خواجہ کمال الدین کے اثر و رسوخ سے اندیشہ تھا۔

بہار میں جدّوجہد کا ثمرہ:- مولانا محمد علی مونگیری ایک خدا رسیدہ بزرگ اور بڑے علم و فضل والے تھے، ملت کا درد ان کے سینہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، قادیانیت جو مسلمانوں کو مرتد بنانے اور ان کے دین و ایمان پر شبخون اور ڈاکہ مارنے کی ایک ناپاک مہم تھی اس کو دیکھ کر آپ بے چین ہو اُٹھے اور دل کے درد کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور پورے سوز و گداز کے ساتھ بات کہتے تھے جس کا قدرتی طور پر اچھا اثر مرتب ہوتا تھا۔ یہی باعث تھا کہ مولانا موصوف کے خطوط نے ان کے مریدین کے حلقے میں ایک جوش اور اضطراب پیدا کر دیا، اور ان لوگوں نے اپنے مرشد کے تعمیلِ حکم میں اس جوش و جذبہ کے ساتھ دیوانہ وار قادیانیت کو سرزمینِ بہار میں بیخ و بُن سے اُکھیڑ دینے کی مہم میں لگ گئے۔ دل کی گہرائیوں سے مولانا موصوف کتابیں اور رسالے لکھتے تھے جو تاثیر سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مریدین ان کتابوں اور رسالوں کو ان تمام علاقوں میں پہونچانے میں مصروف تھے جہاں جہاں بھی قادیانیت کا منحوس سایہ پڑتا تھا، یہ کتابیں اور رسالے قادیانیت کے زہر کے لیے تریاق ثابت

ہوتی رہیں، مولانائے محترم کی تصنیفات، رسائل اور خطوط نے اتنا کام کیا کہ بعض قادیانی مبلغ یہ علم ہوتے ہی کہ مولانا موصوف کے رسائل فلاں جگہ تقسیم کیے جا رہے ہیں وہ علاقہ چھوڑ کر چلے جاتے تھے کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ ان کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے والے ان سے وہی سوالات کریں گے جو مولانا نے قادیانیت سے کیے ہیں اور ان کے جوابات ان کے پاس نہیں تھے اس لیے سوائے فرار کے اور کوئی دوسری صورت ان کے یہاں نہیں رہ جاتی تھی، بہار کے مشرقی علاقوں میں مولانا موصوف کا نام قادیانیت کے بھوتوں کے لیے وہی کام کرتا تھا جو شیطان کے لیے لاحول، ویسے تو موصوف نے چار درجن کے قریب ردّ قادیانیت میں کتابیں، رسالے اور کتابچے تحریر فرمائے لیکن آپ کی کتاب "فیصلہ آسمانی" اور "شہادتِ آسمانی" ان دونوں کتابوں نے قادیانیوں کے لیے کوئی راہِ فرار نہیں چھوڑی، مولانا کے اس قلمی جہاد نے ہزاروں نہیں لاکھوں کی دولتِ ایمان کو بچایا اور وہ لوگ جو قادیانیت کی دہکتی ہوئی جہنم کے کنارے پہونچ چکے تھے اور بہت بڑا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مستقبلِ قریب میں اس جہنم کی خندق میں گر جانے والے ہیں، مولانا موصوف کی کتابوں نے اس سے ان کو بچایا، ان کو راہِ مستقیم دکھائی اور جہنم کے کنارے کھڑے ہونے والے افراد پلٹ کر آئے اور نخلِ اسلام کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں واپس آکر اپنی پوری زندگی کے دن گذار کر راہی ملکِ بقا ہوئے۔

یہ آواز دُور تک گئی:-

مولانا سید محمد علی مونگیری کے سوانح نگار ہمیں بتاتے ہیں کہ:-

"ان کتابوں اور رسائل کا اثر بہار تک محدود نہ تھا، پنجاب، بنگال، مدراس، بمبئی، گجرات، حیدرآباد، سلہٹ، ڈھاکہ، نواکھالی، ہمین سنگھ جس جس جگہ قادیانیوں کے قدم پہونچے، وہاں مولانا موصوف کی تصنیفات بھی ان کے تعاقب میں پہونچیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یا تو قادیانی بھاگنے پر مجبور ہوئے یا خاموشی اختیار کر لی۔"[1]

---

[1] سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۳۲۶

وہی سیرت نگار ہماری معلومات میں اور اضافہ کرتے ہیں اور پورے یقین کے ساتھ بتاتے ہیں کہ برما اور افریقہ جیسے دور دراز ملکوں میں بھی مولانا کی تصنیفات اور رسائل بڑی تعداد میں پہونچے اور اس کی وجہ سے قادیانیت کے جمتے ہوئے قدم ڈگمگانے لگے اور بہت سے مسلمان جو اس سے متاثر ہوئے تھے اس کی اصلیت سے واقف ہو کر قادیانیت سے کنارہ کش ہو گئے۔ صوبہ سرحد میں بھی مولانا کے رسائل کی اشاعت اچھی ہوئی اور متعدد رسائل کا انگریزی، گجراتی اور بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا گیا، اس طرح اس کی افادیت کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔ کٹک اور اس کے اطراف میں قادیانیت نے خاصا زور پکڑ لیا تھا اور ان کی ایک مضبوط جماعت بن گئی تھی اور ان کی شبانہ روز کی کوششوں کی وجہ سے قادیانیوں کا دائرۂ عمل بڑھتا جا رہا تھا لیکن وہاں کے ایک مدرسہ سلطانیہ کے صدر مدرس مولوی محمد قاسم صاحب بہاری نے مولانا موصوف کی کتابیں اپنے یہاں منگوا کر ان کی اشاعت کی کوشش کی اور اس کے نتیجہ میں ان اطراف میں یہ فتنہ بالکل ختم ہو گیا، کٹک کے ایک بزرگ نے مولانا موصوف کو جو خط لکھا ہے اس کو سوانح نگار نے نقل کیا ہے جس سے کٹک کی صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے، اس خط کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ:۔

"حضور کے رسالوں اور کتابوں کا اس ملک میں اچھا اثر پڑا، مسلمانوں کے عقائد بہت درست ہو گئے، ایک جمِ غفیر اور بڑی جماعت جو قادیانی ہونے والی تھی انھیں کتابوں کی بدولت قادیانی ہونے سے بچ گئی اور اب یہ حالت ہے کہ کسی قادیانی کو اپنے مذہب سے دلچسپی نہیں رہی۔"[1]

بہار کی بہت سی مساجد پر قادیانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور مسلمانوں نے صبر کر لیا تھا، لیکن مولانا کی ہمت افزائی اور پشت پناہی سے تین چار مسجدیں مسلمانوں نے ہائی کورٹ کے

---

[1] سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۳۲۷ بحوالہ صحیفہ رحمانی

فیصلہ کے بعد حاصل کیں۔ پنجاب میں بھی اس طرح کے مقدمات ہو چکے تھے اور بہار کے اس واقعہ کے بعد پنجاب کے مسلمانوں کو بھی اپنے مقدمات میں کامیابی حاصل ہوئی اور قادیانی غصب کردہ مسجدوں سے بے دخل کیے گئے، اور مسلمانوں کا ان پر قبضہ ہوا، خدا نے خلوص میں جو قوت و تاثیر دی ہے اس کا لازمی نتیجہ کامیابی ہے مولانا موصوف کا اخلاص ہی ساری کامیابیوں کی کلید تھا۔

قادیانیت کے نادان دوست :۔ قادیانیوں کے مذہب اور اس کے نبی کی حقیقت کھل جانے کے بعد مسلمانوں سے قادیانیت کے ٹکراؤ کی ایک ہلکی سی جھلک میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، کچھ کم و بیش پورے ملک میں ایسی ہی صورت حال ہو گئی تھی، ہر جگہ مسلمان ان کو صفوں سے علیحدہ کرنے میں مصروف تھے، تمام مستند اور مشہور علماء ان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر چکے تھے۔ اب اس مسئلہ میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں یہ دور بڑا ہنگامہ خیز دور تھا، اقلیت و اکثریت کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا، مسلمانوں کی اس ملک میں تعداد کتنی ہے؟ آزاد ہندوستان میں ان کی کیا حیثیت ہوگی؟ اس طرح کے مسائل زیر بحث تھے، اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار (لاہور) نے قتلِ مرتد کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا اور قادیانیوں کو مرتد قرار دیا تھا، اس مضمون کے جواب میں اخبار "پیغام صلح" کے ایڈیٹر نے اپنے اخبار کے ذریعہ علماء اسلام سے استصواب کیا کہ اگر قادیانیوں کو مرتد نہ کہا جائے تو کیا حرج ہے؟ کیوں کہ قادیانیوں کو مسلمانوں کی فہرست سے خارج کر کے مسلمانوں کی تعداد گھٹ جائے گی، اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے سخت نقصان اٹھانا پڑے گا اس لیے ان کے غیر مسلم ہونے کا اعلان نہ کیا جائے، اس کے بعد انہوں نے چار سوالات لکھے تھے اور اس کو مورخہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں شائع کر کے آخر میں لکھا کہ :۔

اگر میرے مندرجۂ ذیل سوالات کا تسلی بخش جواب مل جائے تو میں نے جو احمدیوں کو مؤمن اور ان کے قتل کو قتلِ مؤمن لکھا ہے اس سے رجوع کر لوں گا،

سوالات یہ ہیں :-

۱- خداوند کریم نے اپنے کلام پاک میں کفر و اسلام یا ایمان و ارتداد کی کیا تعریف فرمائی ہے؟

۲- وہ کون سے شعائر اللہ یا حدود اللہ ہیں جن کو توڑنے سے کوئی شخص من کل الوجوہ دائرۂ اسلام سے خارج یا کافر و مرتد ہو جاتا ہے؟

۳- آیا احمدیوں نے ان جملہ شعائر اللہ یا حدود اللہ کو جو کسی شخص کے مسلمان ہونے کی علامت ہو سکتے ہیں من کل الوجوہ خیر باد کہدیا ہے یا ابھی تک ان میں ان شعائر اللہ یا حدود اللہ کی کوئی ایسی رمق باقی ہے جس سے وہ مسلمان کہلائے جانے کا استحقاق رکھتے ہوں؟

۴- اگر ان میں اسلام کی ایک بھی نشانی موجود نہ ہو تب بھی موجودہ صورت میں جبکہ دنیا میں مسلمانوں کے مقابلہ پر غیر مسلموں کی کثرت رائے کا غلبہ تو ڑ کر مسلمانوں کو کامیاب بنانے کے لیے احمدیوں کی آراء کو مسلمانوں یا غیر مسلموں میں سے کسی کے حق میں شمار کیے جانا مسلمانوں کے لیے مفید یا مضر ہو سکتا ہے؟

تحقیق الکفر والایمان :- پیغام صلح کے چاروں سوالات کے جواب میں حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب[1] چاندپوری نے "تحقیق

---

[1] مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے شاگرد رشید تھے جو دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس تھے، مولانا چاندپوری ۱۳۰۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سے شرف بیعت حاصل ہوا۔ آخر میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی طرف رجوع کیا اور پھر مجاز بیعت ہوئے، دربھنگہ (بہار) اور مراد آباد کے مدرسوں میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر ایک عرصہ تک دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات و ناظم شعبۂ تبلیغ رہے۔ یکم رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ سے اپنے وطن چاندپور ضلع بجنور میں قیام فرمایا اور وہیں ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ میں واصل بحق ہوئے۔ مولانا مرحوم کو فرق باطلہ بالخصوص قادیانیت اور رضاخانیت (باقی برصفحہ آئندہ)

الکفر والایمان"، تحریر فرمائی اور مرزا غلام احمد قادیانی کے خارج از اسلام ہونے پر ناقابل شکست دلائل دے کر لاہوری پارٹی جس کے کفر و ایمان میں کچھ لوگوں کو تذبذب تھا ان کے بھی مرتد ہونے کو چوبیس وجوہ سے ثابت کیا ہے، بالترتیب آپ نے پیغام صلح کے چاروں سوالات کے مدلل جوابات تحریر فرمائے۔ کتاب اپنے موضوع پر قول فیصل ہے اور ایک سو دو صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب اسی زمانہ میں بڑی تعداد میں شائع کر کے عام کر دی گئی۔

فیصلہ کن مرحلہ آ رہا ہے:۔ قادیانیوں سے مناظرے، مباحثے، رسالوں، اخباروں، کتابچوں کے ذریعے سوال و جواب چیلنج اور مباہلہ اور فتووں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۳۲ء آ گیا اور پورے ملک میں ہندوستان کی سطح پر قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک مستقل باطل مذہب پر اعتقاد رکھنے والا دشمن اسلام مذہب قرار دینے کا وقت آ گیا، قادیانیوں کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا، بہت سے علماء اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں موجود تھے لیکن اس کا ملک گیر پیمانے پر اثر مرتب نہیں ہو رہا تھا اور قادیانی ہر جگہ مسلمانوں کی معاشرتی و سماجی زندگی میں گھسے ہوئے تھے اور یہ امتیاز کرنا کہ کون قادیانی ہے اور کون مسلمان، ناممکن تھا، کہیں بھی عملاً اس کو غیر مسلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) کے رد اور مناظرہ میں ید طولیٰ حاصل تھا، بار بار ان فرقوں سے آپ کے مناظرے ہوئے اور فریق مخالف کو ذلت آمیز شکست دی، بہار میں مونگیر کے مقام پر ہونے والے قادیانیوں سے مناظرہ میں تو آپ کا رعب اتنا غالب ہوا کہ آپ کی پہلی ہی تقریر کے بعد وہ کرسیاں سروں پر لے کر بھاگے، ہندوستان بھر میں آپ کی شعلہ نوائی کی گونج تھی، تقریر و خطابت کے بادشاہ تھے، باطل اور گمراہ فرقوں کے رد میں بہت سے رسائل لکھے، رد قادیانیت میں ان کے مندرجہ ذیل رسائل پائے جاتے ہیں "اشد العذاب علی مسیلمۃ البنجاب"، "فتح قادیان کا مکمل نقشہ جنگ"، "مرزائیوں کے گلے میں لعنت کا طوق"، "تعلیم الخبیر فی حدیث ابن کثیر"، "قادیانیوں سے ستر سوالات"، "صاعقۂ آسمانی بر فرقۂ قادیانی"، "الابطال لاستدلال الدجال"، "تحقیق الکفر والایمان"۔ یہ رسائل آج بھی دستیاب ہیں۔

نہیں سمجھا جارہا تھا کیونکہ ظاہری طور پر عام مسلمانوں میں اور ان میں کوئی مابہ الامتیاز چیز نظر نہیں آتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی و رسول کہتے تھے، قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ بھی کرتے تھے، مساجد کی تعمیر کرتے تھے، یوم النبی مناتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کے معاشرہ کے لیے وہ اجنبی نہیں رہتے تھے اور ہر جگہ اغماض، چشم پوشی اور نظر انداز کیے جانے کی پالیسی اختیار کی جاتی تھی، مسلمانوں میں ان کا یہی اختلاط سب سے زیادہ خطرناک تھا اور اسی کی وجہ سے لوگوں کو مرتد کرنے کا ان کو موقعہ مل جاتا تھا اور روز بہ روز ان کی تعداد میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو رہا تھا، جن علماء نے اس فتنہ کو انتہائی خطرناک فتنہ تصور کیا، ان کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی، وہ بے چین ہو کر اپنی ساری طاقت اس فتنہ کو دبانے اور اس کی سرکوبی کرنے اور اس کے اثرات کو مٹانے کے لیے صرف کر رہے تھے لیکن جو کامیابی وہ حاصل کرنا چاہتے تھے وہ نہیں مل رہی تھی اس لیے ان کی بے چینی بدستور تھی بلکہ اس میں اور اضافہ ہوتا جارہا تھا، انھیں بزرگوں میں دار العلوم دیوبند کے سابق صدر المدرسین اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، حالانکہ وہ خالص علمی کاموں میں منہمک رہنے والے اور تحقیقات علمیہ میں مصروف رہنے والے عالم تھے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ اس فتنہ کی آنچ مسلم ممالک مصر و عراق تک پہونچنے لگی ہے تو آپ کی بے چینی حد سے فزوں ہوگئی اور پھر آپ نے تہیہ کر لیا کہ اس فتنہ کو دبانے میں جتنی بھی امکانی کوشش ہو سکے گی اس میں لگاؤں گا اور اب اس میں کسی کوتاہی کو دخیل نہ ہونے دوں گا، اس تہیہ اور عزم و ارادہ کے ساتھ آپ نے اپنے مخصوص تلامذہ کو بھی اس فتنہ کی طرف توجہ دلا کر شب و روز اس کے مٹانے کے لیے کام کرنے کا حکم فرمایا اور خود عملی اقدامات کا آغاز کر دیا۔

قادیان میں مسلمانوں کے جلسے:۔

مرزا غلام احمد کی جنم بھومی پنجاب میں واقع ہے، سب سے پہلے اہل پنجاب ہی کا فرض تھا کہ وہ اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے میدان میں آئیں اس لیے جب ان حضرات کو فتنہ کی شدت و مضرت کا شدید احساس ہوا تو انہوں نے پنجاب کو

بیدار کرنے اور مسلمانانِ پنجاب میں احساسِ فرض کو جگانے کے لیے ایک فیصلہ کیا، علامہ انور شاہ کشمیری نے امرتسر، پٹیالہ اور لدھیانہ کے چند علماء کو اپنی مہم میں شریک کیا اور ان سے فرمایا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جڑ پر کلہاڑی چلائی جائے اور خاص قادیان میں تبلیغی جلسہ کیا جائے تاکہ باہر کے عوام کو فریب میں ڈالنے کے لیے جو مناظرے، مباہلے اور چیلنج کے ڈرامے قادیانی روزمرہ کھیلتے ہیں اس کی قلعی کھول دی جائے اور اس کی حقیقت لوگوں پر واضح کر دی جائے، اس پروگرام اور مقصد کے تحت قادیان میں مسلمانوں کا جلسہ ہونا طے کر دیا گیا، پھر یہ جلسہ قادیانیوں کی تمام اندرونی و بیرونی سازشوں اور دھمکیوں کے باوجود ہوا اور پوری شان و شوکت سے ہوا اور وہیں جلسہ میں یہ بھی طے کر دیا گیا کہ قادیان کا یہ جلسہ ہر سال ہوا کرے گا چنانچہ اس پروگرام کے تحت کئی سالوں تک یہ جلسہ مسلسل ہوتا رہا اور قادیان میں بیٹھ کر قادیانیت کا بخیہ اُدھیڑ کارروائی کی جاتی رہی اور پوسٹ مارٹم کیا جاتا رہا، اگرچہ علماء کی جانوں کو خطرات تھے، لیکن جو لوگ کفن سر سے لپیٹ کر اور جان ہتھیلیوں پر لے کر دین کی خدمت کا تہیہ اور عزم و ارادہ کر چکے ہیں ان کی راہوں میں نہ پہاڑ حائل ہو سکے اور نہ دریاؤں نے ان کا راستہ روکنے کی ہمت کی، ان جلسوں میں علماء پنجاب کے علاوہ خود علامہ انور شاہ کشمیری اور دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ شریک ہوتے رہے جن میں مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مفتی دارالعلوم دیوبند۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ قادیانیوں نے انگریزی حکومت کے ذریعہ یہ امکانی کوشش کی کہ علماء حق کے یہ جلسے قادیان میں نہ ہونے پائیں لیکن حکام کو کوئی ایسا بہانہ ہاتھ نہ آیا کہ ان جلسوں پر پابندی عائد کر سکیں، قادیانی جب اپنے آقاؤں کی مدد سے محروم ہو گئے تو انہوں نے چھچھوری حرکتیں شروع کر دیں۔ حضرت شاہ صاحب اور علماء دیوبند کو گمنام خطوط لکھنے لگے جن میں قتل کی دھمکیاں ہوتی تھیں اور صاف صاف لکھتے تھے کہ اگر قادیان کے جلسے میں شرکت کی تو زندہ واپس نہ ہو سکو گے، اور صرف خطوط لکھنے

ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ عملاً بھی اس طرح کی حرکتیں برابر کرتے تھے کہ باہر سے جانے والے علماء اور مسلمانوں پر حملے کیے جاتے تھے، ایک مرتبہ جلسہ گاہ میں آگ بھی لگائی گئی مگر ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن　　پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اور خدا کے فضل سے قادیان میں مسلمانوں کا یہ جلسہ کئی سالوں تک مسلسل ہوتا رہا اور اس کے گھر میں بیٹھ کر اس کی فرضی نبوت کے تار و پود بکھیرے جاتے رہے، اور برابر اس کے کفر و ارتداد کا اعلان کیا جاتا رہا۔

مناظرہ، اور قادیانیوں کا فرار:- جب علامہ کشمیری نے قادیانیوں کے خلاف اپنی مہم کا آغاز فرمایا تو ان کی سرگرمیاں جو پنجاب اور سرحد تک جاری تھیں ان پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے اور جب جب اور جہاں جہاں جیسی جیسی صورتِ حال تقاضا کرتی تھی آپ اس کے مطابق عملی اقدامات کرتے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں فیروزپور میں قادیانیوں کا بڑا اجتمع ہوگیا اور انہوں نے فیروزپور چھاؤنی (پنجاب) کو اپنا قلعہ بنانا شروع کیا اور عام مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی اور اپنے جلسوں میں عام مسلمانوں کو خطاب کرکے مناظرہ و مباحثہ کا چیلنج کرنے لگے ضلع سہارن پور کے کچھ مسلمان فیروزپور میں بغرضِ ملازمت و تجارت مقیم تھے، انہوں نے مذہبی جوش میں آکر خود ہی قادیانیوں کو دعوتِ مناظرہ دے دی، قادیانی کچھ زیادہ چالاک ثابت ہوئے، انہوں نے ان ناخواندہ مسلمانوں سے شرائطِ مناظرہ طے کرکے ان سے تحریر لے لی اور ان کو موقعہ نہیں دیا کہ وہ اپنے علماء کو مدعو کرکے ان کے ذریعہ شرائطِ مناظرہ طے کراتے، قادیانیوں نے مناظرہ کی کچھ ایسی اہم شرطیں لکھوالی تھیں جو صرف ان کے موافق تھیں اور اہلِ اسلام کی راہ میں ان کی وجہ سے بہت سی دشواریاں پیدا ہوگئی تھیں مگر وہ بے چارے غیر تعلیم یافتہ تھے ان کی چال اور مکاری کو نہ سمجھ سکے اور ان شرائط کو منظور کرکے انہوں نے اس پر دستخط کردیئے تھے اور ان تمام اُمور کے طے ہوجانے کے بعد انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو خطوط لکھنے شروع کیے اور صورتِ حال سے علماء

دارالعلوم کو مطلع کیا۔

جب فیروز پور سے یہ خط دیوبند پہونچا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے مشورے سے مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب[1] میرٹھی مہاجر مدنی اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند اور مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند کو فیروز پور بھیجنا طے کر دیا گیا۔

جب قادیانیوں کو معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند سے مناظرہ کے لیے علماء آرہے ہیں تو انہوں نے پورے ملک کے مشہور قادیانیوں کو فیروز پور میں جمع کر لیا، اس دور میں

---

[1] مولانا بدرِ عالم میرٹھی ہندوستان کے ان جلیل القدر علماء اور بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ ہجرت کی اور ساری زندگی وہیں گذار کر وہیں سے سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے، آپ کی ولادت بدایوں میں ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ہوئی، جہاں آپ کے والد بسلسلہ ملازمت قیام پذیر تھے۔ ابتداءً انگریزی تعلیم میں مصروف ہوئے مگر میٹرک کرنے کے بعد انگریزی ترک کر کے عربی شروع کر دی اور مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں آٹھ سال مسلسل رہ کر مولانا خلیل احمد صاحب محدث کی زیرِ نگرانی علوم و فنون کی ساری کتابیں پڑھیں ۱۳۳۶ھ میں سندِ فراغت حاصل کی اور وہیں معینِ مدرس بنا دیئے گئے دو سال کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور علامہ انور شاہ کشمیری سے پھر حدیث پڑھی اور سندِ حدیث حاصل کی اور دارالعلوم ہی میں استاد بھی بنا دیئے گئے، ۱۹۲۷ء میں علامہ کشمیری کے ساتھ آپ ڈابھیل چلے گئے، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی مفتی دارالعلوم دیوبند سے بیعت تھے مفتی صاحب کے ایک جلیل القدر خلیفہ سے آپ کو خلافت ملی، آخر میں آپ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے اور وہیں حیاتِ مستعار کے بقیہ سال گذار کر ۵ رجب ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور جنت البقیع میں دفن کی سعادت حاصل کی۔ آپ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں علم حدیث سے آپ کو خصوصی شغف تھا، اس لیے علامہ کشمیری کے افادات کو "فیض الباری" کے نام سے چار جلدوں میں جمع کیا اور شائع کیا۔ "ترجمان السنہ" اردو میں اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔ ردِّ قادیانیت میں بھی آپ کے بعض رسالے ہیں۔

قادیانیوں کا عالم سرور شاہ کشمیری تھا اور ان کا سب سے بڑا مناظر حافظ روشن علی اور دوسرا عبدالرحمن مصری تھا، یہ سبھی فیروزپور میں وقت سے پہلے پہونچ کر تیاریوں میں لگ گئے۔

علماء دیوبند کو پہلے سے تفصیلی طور پر شرائط مناظرہ کا علم تھا، جب یہ چاروں حضرات فیروزپور پہونچے تو ان کو مطبوعہ شرائط نامہ ملا، اس کو دیکھا تو اس میں ہر حیثیت سے قادیانیوں کے لیے آسانیاں اور اہل اسلام کے لیے ہر طرح کی پابندیاں تھیں اور چیلنج کرنے والے ناواقف مسلمانوں نے ان شرائط کو منظور کر رکھا تھا۔

ان شرائط کی وجہ سے صورت حال بہت پیچیدہ ہو چکی تھی۔ اگر ان شرائط کو تسلیم کیا جاتا ہے تو ہمارے مناظر کے لیے قدم قدم پر مشکلات اور دشواریاں تھیں، اگر یہ کہہ کر شرائط کو رد کر دیا جاتا ہے کہ مناظرہ ہم کریں گے شرائط ہمارے سامنے طے ہونی چاہئیں تو ان مسلمانوں کو ندامت ہوتی جنہوں نے شرائط کو تسلیم کر لیا تھا اور دستخط کر دیئے تھے، پھر بھی علماء نے فیصلہ کر لیا کہ ہر چہ باد آباد مناظرہ انھیں شرائط پر ہوگا اور ہم کو میدان مناظرہ میں چلنے کی پوری تیاری کر لینی چاہیئے، البتہ بذریعہ تیلی گرام علامہ انور شاہ کشمیری کو دیوبند موجودہ صورت حال سے مطلع کر دیا گیا۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر دونوں فریق میدانِ مناظرہ میں آگئے اور مناظرہ کی کارروائی شروع ہوگئی، ابھی مناظرہ شروع ہی ہوا تھا کہ دیکھا جا رہا ہے کہ حضرت علامہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی اور چند دیگر علماء مناظرہ گاہ کی طرف چلے آرہے ہیں، ان حضرات نے شاہ صاحب کو شرائط دکھائیں تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ قادیانیوں سے کہدو کہ تم نے عوام سے اپنے موافق جتنی شرطیں منظور کرالی ہیں اتنی ہی شرائط اور بھی بڑھا لو ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں، تم چوروں کی طرح ناواقف مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے عادی ہو، کسی بھی شرط پر اور کسی بھی طریق پر تم میدانِ مناظرہ میں آؤ ہم ہر طرح تیار ہیں، علامہ کشمیری کے اس جرأت مندانہ اعلان کے بعد علماء کے حوصلے بلند ہوگئے اور پوری طمانینتِ قلب کے ساتھ میدانِ مناظرہ میں پہونچ کر قادیانیوں کو للکارا اور مناظرہ شروع ہوگیا۔

پہلے دن ختم نبوت پر مباحثہ ہوا اور مفتی محمد شفیع[1] صاحب مناظر تھے اور دوسرے اور تیسرے دن مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی اور مولانا محمد ادریس صاحب[2] کاندھلوی نے دوسرے

---

[1] حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳۱۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے اور ۱۱ شوال ۱۳۹۶ھ (۱۹۷۶ء) کو کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا، ابتدا سے انتہا تک تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی قابل ذکر ہیں، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے احسان و تصوف کی تعلیم حاصل کی اور آپ کے ممتاز خلفاء میں سے ہوئے دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم کراچی میں زندگی بھر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آٹھ سال تک دارالعلوم دیوبند میں منصب افتاء پر فائز رہے۔ سینتیس ہزار بیاسی فتوے اس عرصہ میں گئے۔ آپ کے مجموعی فتاویٰ کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے، پاکستان منتقل ہونے کے بعد آپ پاکستان دستور ساز اسمبلی آف تعلیمات اسلام کے رکن رکین رہے اور اسلامی دستور کی ترتیب میں نمایاں کردار ادا کیا۔ دو سو کے قریب وقیع تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا۔ چند کتابیں درج ذیل ہیں ۱ تفسیر معارف القرآن آٹھ جلدوں میں ۲ جواہر الفقہ دو جلدوں میں ۳ آلات جدیدہ کے شرعی احکام ۴ ہدیۃ المہدیین ۵ ختم نبوت فی القرآن ۶ ختم نبوت فی الحدیث ۷ ختم نبوت فی الآثار ۸ مسیح موعود کی پہچان ۹ دعاوی مرزا ۱۰ وصول الافکار الی اصول الکفار وغیرہ

[2] مولانا محمد ادریس کاندھلوی ۱۹۰۰ء میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے اور ۲۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو لاہور میں واصل الی الحق ہوئے۔ ابتدائی تعلیم تھانہ بھون میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم مظاہر علوم سہارن پور اور دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی شامل ہیں۔ سلوک و معرفت کی تعلیم امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت تھانوی سے حاصل کی۔ مدرسہ امینیہ دہلی، دارالعلوم دیوبند، حیدر آباد دکن، جامعہ عباسیہ بہاول پور اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں مختلف اوقات میں اپنے علمی فیوض جاری کیے، مختلف موضوعات پر ۲۰ درجن سے زائد عالمانہ و محققانہ تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ چند اہم کتابیں یہ ہیں ۱ التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح آٹھ جلدوں میں ۲ تفسیر معارف القرآن پانچ جلدوں میں ۳ تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری ۴ سیرۃ المصطفیٰ ۵ الکلام الموثوق فی تحقیق ان القرآن غیر مخلوق ۶ علم الکلام ۷ کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ ۸ مسک الختام (باقی بر صفحہ آئندہ)

مسائل پر مناظرہ کیا، ان تین دن کی بحثوں میں قادیانیوں کی زبان اس طرح بند ہوئی کہ اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے کترانے لگے، اہل اسلام کے سوالات کی یورش سے وہ حواس باختہ ہوگئے، ان کی ساری طلاقتِ لسانی عمیق و دقیق علمی مسائل میں دھری کی دھری رہ گئی اور اہل اسلام کے کسی بھی سوال کا ان کے پاس ایسا جواب نہیں تھا جو مناظر علماء تو ایک طرف عوام کو بھی مطمئن کر سکے چونکہ مجلس مناظرہ میں تعلیم یافتہ طبقہ بڑی اکثریت میں تھا اس لیے دھاندلی کی گنجائش نہیں تھی، عوام اُچھل اُچھل کر قادیانیوں سے جواب کا مطالبہ کرتے رہے مگر ع

کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

تین دن کے مناظرہ میں ان کی ساری چولیں ڈھیلی ہوگئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے دن ان کے مناظرین چپکے سے فیروزپور سے نکل بھاگے، اور فیروزپور کا ہر گلی کوچہ ان کی رسوائی کے ساتھ فرار کی داستان سنا رہا تھا، مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خود قادیانیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اقرار کر رہا تھا کہ ہماری طرف سے کسی دعویٰ کو ثابت نہیں کیا جا سکا، اور اہل اسلام نے جو بات کہی دلیل کے ساتھ کہی اور دلوں میں اُتر جانے والی بات کہی۔ چوتھے دن مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ شہر میں ایک جلسۂ عام کیا جائے اور عام پبلک کے سامنے مناظرہ کی روداد بیان کر دی جائے، یہ جلسہ پوری شان و شوکت اور پوری اُمنگوں کے ساتھ ہوا، اس جلسہ میں حضرت علامہ کشمیری اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے رد قادیانیت پر زبردست اور مدلل تقریریں فرمائیں، یہ تقریریں اتنی مؤثر ثابت ہوئیں کہ جو قادیانی دجل و فریب کا شکار ہو چکے تھے اس مناظرہ اور تقریر کے بعد وہ اسلام پر لوٹ آئے۔

قادیانیت کے خلاف جہادِ عام:۔ پنجاب کی اس سرزمین میں مناظرہ اپنے نتیجہ کے لحاظ سے بہت ہی مفید ثابت ہوا، اس سے یہ اندازہ ہوا کہ اب بھی ایسی سعید روحیں موجود ہیں کہ اگر

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی ختم نبوۃ سید الانام ۹؎ اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف ۱۰؎ القول المحکم فی نزول عیسیٰ ابن مریم۔
۱۱؎ دعاوی مرزا ۱۲؎ اسلام اور نصرانیت ۱۳؎ شرح مقاماتِ حریری۔

ان کے سامنے صداقت پیش کی جائے تو اس کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر سکتی ہیں، اس سے حوصلہ ملا، اور علمائے دیوبند کی ایک جماعت نے فیصلہ کیا کہ قادیانیت کے خلاف جہاد عام کا آغاز کر دیا جائے اور جہاں جہاں وہ جال پھیلا رہے ہیں علماء کو ہر جگہ پہونچ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا ضروری ہے، وقت کا تقاضا یہی ہے، دینی حمیت اور غیرت ایمانی اسی کی متقاضی ہے، اس تحریک کے محرک بھی علامہ انور شاہ کشمیری ہی ہوئے، انہوں نے تجویز رکھی کہ ناخواندہ عوام کا طبقہ زیادہ کتابیں نہیں پڑھ سکتا رد قادیانیت پر اگرچہ اب تک کئی سو کی تعداد میں کتابچے اور رسالے لکھے گئے مگر ناخواندہ عوام کی رسائی وہاں تک نہیں ہے، یہ لٹریچر ان کے کسی کام کا نہیں ہو سکتا اور قادیانی مبلغین زیادہ تر انھیں میں چل پھر کر اپنا دجل و فریب پھیلاتے ہیں، مناظرہ و مباہلہ کے جھوٹے چیلنج کرتے پھرتے ہیں اور ان کو مرعوب کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے پنجاب کے مختلف مقامات کا ایک تبلیغی دورے کا پروگرام بنایا جائے اور اس دورے میں مشاہیر علماء شریک ہوں اور ہر جگہ واشگاف لفظوں میں قادیانیوں کے دشمن دین و ایمان ہونے کو مؤثر انداز میں دکھایا اور بتایا جائے تاکہ ناخواندہ عوام ان کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار نہ ہو سکیں۔

چنانچہ اس پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے دورے کا خاکہ مرتب کیا گیا، علماء دیوبند کی ایک جماعت علامہ انور شاہ کشمیری کی سرکردگی میں تشکیل دی گئی، اس جماعت میں علامہ کشمیری کے ہمرکاب علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ الاسلام پاکستان، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند شامل تھے۔ یہ علم و فضل کے پہاڑ، زہد و تقویٰ کے پیکر جمیل، پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہونچے اور مرزائیت کے خلاف اعلان حق کیا، منکرین کو دفع شبہات کی دعوت دی، لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ، ہزارہ، کھوٹا وغیرہ میں ان حضرات کے بیانات اور

تقریریں ردّ قادیانیت پر ہوتی رہیں اور اس کو دلائل و براہین کی واضح روشنی میں کذّاب اور مفتری اور خارج از دین ثابت کیا جاتا رہا، اور خدا کی جانب سے ان لوگوں کی زبان سے یہ اعلانِ حق کرایا جاتا رہا جو ہندوستان کی سرزمین پر برہانِ حق اور اسلام کی حقانیت کی دلیل بن کر رہے، جنہوں نے اپنی زندگی کی ساری توانائیاں اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ باقی رکھنے کی راہ میں صرف کر دیں، ان میں سے ہر ایک علم و فضل کا بحرِ زخّار، علوم و معارفِ اسلامیہ کا امین، حدیث و قرآن کی تشریح و تفسیر کا امام اور اسلامی کتابوں کی چلتی پھرتی لائبریری اور کتب خانہ تھا، ان میں کوئی علم و فضل، استدلال، معقولات و منقولات کا ماہر فن اور طوطی شکر خارا تھا، ان میں کوئی حدیث و قرآن کے رموز و حقائق اور افتاء کا رمز شناس اور تحقیقات و تدقیقات کا امام تھا، ان میں کوئی فتویٰ اور جزئیات فقہ کے سمندر کا ماہر فن تیراک تھا، ان میں کوئی اپنی شیریں بیانی، حلاوت لسانی کے لیے پورے ہندوستان میں ضرب المثل تھا، ایسے امتیازات و کمالات اور خصوصیات کی مالک ہستیوں کی تقریریں کیا رائیگاں جا سکتی تھیں، قدرتی طور پر ان کی تقریروں کے جو اثرات مرتب ہونے چاہئیں تھے، اس پورے دورے میں پورے طور پر نمایاں ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانوں میں جو تاثیر دی تھی اس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں ایمان و یقین کی جھلملاتی ہوئی شمع پوری طرح روشن ہو گئی، ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو تیز سے تیز تر ہو گئی، راکھ اور خاک ہوتے ہوئے شعلے لَو دینے لگے جس میں قادیانیت کے مکر و فریب کا سارا اثاثہ راکھ ہوتا گیا، غرضیکہ اس دورے نے ان تمام علاقوں میں بہت اچھے اثرات ڈالے اور قادیانیت کی بڑھتی ہوئی طاقت پر اوس پڑ گئی، ان کی تعداد یک بیک جامد ہو گئی۔ اب قادیانیوں کے لیے اپنا جال پھیلا کر اَن پڑھ اور ناخواندہ عوام کو بہکانا اور پھنسا لینا آسان نہیں رہ گیا

پنجاب میں بھی قادیانیت سہم گئی:۔ پنجاب اگرچہ قادیانیت کی جنم بھومی تھی اس لیے ان کا گڑھ بنتا جا رہا تھا اور ہر ضلع میں ان کے اثرات پھیلتے اور بڑھتے جا رہے تھے اور تعلیم یافتہ طبقہ اور سرکاری ملازمتوں سے وابستہ طبقہ اور اونچے منصبوں پر رہنے والے لوگ ہی زیادہ تر اس کے

دام ہمرنگ زمین میں گرفتار ہوتے تھے اس لیے قدرتی طور پر ان کی جرأت بڑھی ہوئی تھی اور اسی لیے وہ اپنے ہر جلسہ میں مناظرہ و مباہلہ کا چیلنج دیتے پھرتے تھے لیکن قادیانیوں پر اب اتنی مرعوبیت طاری ہوئی کہ اس پورے دورے میں کہیں بھی کوئی قادیانی سامنے نہیں آیا اور نہ کسی نے سوال و جواب کرنے کی ہمت کی، البتہ پولیس اور انتظامیہ کی سازش سے رکاوٹیں پیدا کرنے کی ضرور کوشش کرتے رہے لیکن وہ کہیں کامیاب نہیں ہوئے۔

فیصلہ کن گھڑی آگئی:۔ علماء حق کے مسلسل دوروں اور احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی کوششوں، بیانات اور تقریروں سے پورے ملک کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا، بلا مبالغہ ردِ قادیانیت میں ہزاروں کی تعداد میں رسالے، کتابچے، پمفلٹ اور ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئیں اور شائع ہوئیں اور ہندوستان کے کونے کونے میں پہونچیں، درجنوں مقامات پر قادیانیوں سے اہلِ حق کے مناظرے و مباحثے ہوئے جن کی شہرت پورے ملک میں ہوئی، ردِّ قادیانیت کے لٹریچر اُردو، فارسی اور عربی میں بھی شائع کیے گئے۔ اس طرح قادیانیت کو بے نقاب کرنے میں علماء حق نے کوئی کوتاہی نہیں کی، لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ عدالت کے ذریعہ بھی قادیانیوں کو ایک بار غیر مسلم، دائرۂ اسلام سے خارج اور مرتد ثابت کر دیا جائے اور انگریزی عدالت میں ریکارڈ بن جائے تو یہ ایسا کارنامہ ہوگا جو کسی کے مٹائے مٹ نہ سکے گا اور ہر جگہ بطور ثبوت پیش کیا جا سکے گا، قدرت کو بھی اس جھوٹے مدعی نبوت کی حقیقت کھول دینی منظور تھی اس لیے جلد ہی وہ گھڑی بھی آگئی جب قادیانی ملزم بن کر بہاولپور کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا اور اپنے بددین، مرتد اور خارج از اسلام کا سچا فیصلہ سننے پر مجبور کر دیا گیا۔

مقدمہ بہاول پور:۔ بہاول پور ایک مسلم ریاست تھی، وہاں کے ایک شہر احمد پور شرقیہ بہاولپور میں ایک واقعہ ہوگیا وہاں کی ایک لڑکی مسماۃ عائشہ بنت الٰہی بخش کی ایک شخص سے شادی ہوئی،

اس کا نام عبدالرزاق تھا، شادی کے کچھ دنوں بعد عبدالرزاق قادیانی ہوکر مرتد ہوگیا خاتون نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ میرا شوہر عبدالرزاق قادیانی ہوکر مرتد ہوگیا اس کے ساتھ کسی مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہوسکتا اس لیے عدالت ہمارے نکاح کو فسخ کردے، یہ واقعہ ۱۹۲۶ء کا ہے، یہ مقدمہ مختلف عدالتوں میں سات برس تک چلتا رہا، ۱۹۳۲ء میں یہ مقدمہ دربارِ معلّٰی بھاول پور میں فیصلہ کے لیے پہونچا، دربار کی طرف سے اس مقدمہ کی مسل پر یہ لکھ کر عدالت میں واپس کردیا گیا کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح کرنی ضروری ہے اور دونوں فریق کو موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کی شہادتیں پیش کریں اور دونوں طرف کے مکمل بیانات سن کر اس مقدمہ کا کوئی آخری فیصلہ کیا جائے۔

فریقین کی تیاریاں:- جب مقدمہ دوبارہ عدالت میں واپس ہوا اور فریقین کو اپنی اپنی شہادتیں پیش کرنے کا حکم ہوا تو دونوں طرف کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں اور مضبوط سے مضبوط تر شہادتوں کی تلاش شروع ہوگئی عبدالرزاق قادیانی قادیان پہونچا اور صورتِ حال بتائی، پھر تو قادیان کا بیت المال اور رجالِ کار مقدمہ کی پیروی کے لیے وقف ہوگئے، اس کے تمام شاطر و عیار افراد مناظرین و وکلاء نے اپنی خدمات پیش کیں اور مدعی اور مقدمہ کے سارے اخراجات قادیان نے ادا کرنے کی ذمہ داری لی۔

مُدّعیہ عائشہ خاتون کی بیچارگی:- دوسری طرف مدعیہ عائشہ خاتون ایک مفلوک الحال عورت تھی، اس کا گھرانہ بھی غریب تھا، اس کی طاقت سے یہ بات باہر تھی کہ ملک کے مشاہیر علماء کو جمع کرکے اپنی طرف سے شہادت میں ان کو پیش کرسکے، یا اس مقدمہ کی پیروی کرسکے مگر قدرت کو جب کبھی حق کے کلی طور پر ظاہر کردینے کی مصلحت منظور ہوتی ہے تو وہ ایسے اسباب فراہم کردیتی ہے جو آدمی کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتے، قادیانیوں کی جب تیز تر سرگرمیوں کا مسلمانانِ بھاول پور کو احساس ہوا

تو ان کی غیرتِ ایمانی نے گوارا نہیں کیا کہ ایک مظلوم عورت اپنے سچے مقدمہ میں اس لیے ہار جائے کہ اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے، اور اس کے مقدمہ کی بدولت حق و باطل کا جو فیصلہ ہونے والا ہے وہ تاریخ میں اس طرح لکھا جائے کہ مسلمانوں کی بے حسی کی وجہ سے وہ ایک سچا مقدمہ بھی ہار گئے۔

بھاول پور میں مسلمانوں کی ایک تنظیم "موید الاسلام" انجمن تھی، اس انجمن نے مدعیہ عائشہ خاتون کو ڈھارس بندھائی کہ تمہارے مقدمہ کی پیروی کا ہم بندوبست کریں گے اور انجمن کے ارکان اس عزم و ارادہ کے ساتھ میدان میں آگئے کہ بھاولپور کی سرزمین میں حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ کرنا ہے اور ہم پوری قوت کے ساتھ حق کو سربلند کرنے کے لیے جدوجہد کے میدان میں اتر رہے ہیں۔

بھاولپور کے غیرت مند مسلمان:۔ انجمن موید الاسلام نے مولانا محمد حسین صاحب شیخ الجامعہ بھاولپور کے زیر سرپرستی اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا اور ملک کے مشاہیر علماء حق کو خطوط لکھ کر اس مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لیے مدعو کیا، اس مقدمہ میں سب سے اہم شہادت کے لیے حضرت مولانا انور شاہ کشمیری پر نگاہِ انتخاب گئی، علامہ کشمیری ان دنوں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے اور اتفاق سے اس وقت علالت کی وجہ سے اپنے گھر دیوبند آئے ہوئے تھے، یہیں آپ کو بھاولپور کا خط ملا، جن حضرات کو خصوصیت سے اس مقدمہ میں بیان دینے کے لیے منتخب کیا گیا ان میں علامہ کشمیری کے علاوہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور اور علامہ شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند جیسے جلیل القدر علماء اور اہلِ علم و فضل تھے۔

مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوری:۔ انجمن موید الاسلام نے سب سے اہم ذمہ داری مشہور مناظر سبحان الہند

حضرت مولانا ابوالوفا صاحبؒ[1] شاہ جہان پوری کو دی اور آپ کو مستقل طور پر دعوت دے کر اپنے یہاں مقدمہ کی پیروی کے لیے بلالیا اور تقریباً ڈیڑھ سال تک بھاول پور میں رہ کر آپ نے مقدمات کی فائل کو مرتب کیا اور مقدمہ کی کامیابی کے لیے ہر امکانی جدوجہد کی اور اس کی تدابیر اختیار کیں، اور سب سے اہم رول انہوں نے اس وقت ادا کیا جب قادیانیوں کے بیانات ہوئے تو تمام علماء نے متفقہ طور پر ان سے جرح کرنے اور

---

[1] مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہاں پوری سے ہندوستان کا خطہ خطہ واقف ہے، انہوں نے آدھی صدی تک سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر دل کش، پاکیزہ لب و لہجہ اور اپنی شیریں زبان میں عالمانہ تقریریں کیں، مسلمانوں کا کوئی بڑا جلسہ ان کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا، آپ کا اپنا ایک خوبصورت اور مخصوص اندازِ بیان تھا۔ ہندوستان کے بہت سے واعظین اور مقررین نے ان کی نقل کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے، کیونکہ ع ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ مولانا موصوف اپنے وقت کے بےمثال خطیب اور زبردست مناظر تھے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مخصوص تلامذہ میں آپ کا شمار تھا۔ ساری تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی اور وہیں استاد بھی بنا دیئے گئے لیکن قدرت نے ان کی فطرت کو صحرانوردی بخشی تھی اس لیے وہ تقریر و خطابت کے اسٹیج کے بادشاہ بن کر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتے رہے، قادیانیوں اور رضاخانیوں سے بہت سے مناظرے کیے۔ مقدمہ بھاول پور میں آپ نے قادیانیوں کے بیانات پر جو جرحیں کی ہیں وہ آپ کے علم و فضل کا شاہ کار ہیں۔ قادیانیوں کے اہلِ علم پر جب عدالت میں آپ جرح کرتے تھے تو وہ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے اور آپ ان سے ایسی باتیں اگلوا لیتے تھے جو خود انھیں کے خلاف جاتی تھیں۔ اس مقدمہ میں آپ کا کردار بڑا اہم رہا۔ شعر و شاعری سے بھی دل چسپی تھی، عارف آپ کا تخلص تھا، صرف نعت پاک لکھتے تھے اور سیرت النبی کے جلسوں میں جب پڑھی جاتی تھیں تو ایک سماں بندھ جاتا تھا، آخر عمر میں آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور خانہ نشین ہو گئے اور بڑی عسرت اور تنگ دستی کی حالت میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا۔ اپنے وطن شاہجہانپور میں ۱۴۰۰ھ (۱۹۷۹ء) میں چمنستانِ رسول کا چہکتا ہوا بلبلِ خوش نوا خاموش ہو گیا اور اپنی شیریں اور مترنم نواسنجیوں سے ہم کو ہمیشہ کے لیے محروم کر گیا۔

اپنے کام کی بات اُگلوانے کے لیے مولانا موصوف کو یہ ذمّہ داری سپرد کی اور انہوں نے جس ذہانت و فراست اور بصیرت و قابلیت کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا کہ وکلاء اور قانون کے ماہرین حیرت زدہ رہ گئے کہ ایک مدرسہ کا مُلّا اتنی گہرائیوں سے باتوں کی گرفت کرتا ہے اور فریقِ مخالف کو زچ کر کے رکھ دیتا ہے۔

اکابر علماء کی موجودگی :- انجمن نے مذکورہ بالا مشاہیر علماء کے علاوہ اور دوسرے اکابر اہلِ علم کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ مولانا محمد صاحب انوری لائل پوری تلمیذِ خاص علامہ کشمیری مصنف "انوارِ انوری"، مولانا عبدالحنان صاحب خطیب آسٹریلیا مسجد لاہور و ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء صوبہ پنجاب، مولانا محمد زکریا صاحب لدھیانوی اور دوسرے علماء اتنی بڑی تعداد میں آ گئے کہ علامہ کشمیری کی مجلس میں جگہ کی تنگی محسوس کی جانے لگی۔

چونکہ اس مقدمہ کی شہرت ملکی سطح پر ہو چکی تھی اس لیے قدرتی طور پر تمام مسلمانوں کی نگاہیں اس مقدمہ پر لگی ہوئی تھیں، ان اکابر علماء کی حاضری اور دلچسپی کی وجہ سے یہ مقدمہ "مسلمان بنام قادیان" ہو کر رہ گیا تھا، انفرادی مقدمہ نہیں تھا، اس لیے ہر شخص اپنے سینہ میں تڑپ رکھتا تھا، بہت سے اکابر علماء قلبی تعلق اور دینِ حق کی کامیابی کے جذبے سے معمور ہو کر از خود بھاولپور پہونچ گئے اور اپنی ساری مصروفیتوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اس طرح چند دنوں کے لئے بھاولپور کے آسمان پر علم و فضل کے اتنے چاند سورج طلوع ہو گئے کہ غیر مشہور علماء ستاروں کی طرح چھپ گئے اور اسی وجہ سے رُودادِ مقدمہ میں ان حضرات کے نام نہیں ملتے ہیں مگر واقعہ یہ تھا کہ علماء اسلام کا ایک جمِّ غفیر اس موقعہ پر تھا اور ان دنوں بھاولپور میں قیام پذیر تھا۔

علامہ کشمیری کی بے چینی :- اس مقدمہ کو کامیاب بنانے کے لیے علامہ کشمیری کس قدر بے چین تھے اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ جب آپ کو بھاولپور کا خط ملا ان دنوں آپ علیل چل رہے تھے لیکن آپ نے اپنی بیماری کو فراموش کر دیا اور اپنے تلامذہ کو حکم دیا کہ آپ لوگ بھاولپور چلنے کی تیاری

کریں اور آپ خود تاریخ مقدمہ سے بہت پہلے ہی بھاولپور پہونچ گئے اور اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دینے کا فیصلہ فرماکر سب بیانات کے اختتام تک تقریباً بیس پچیس روز تک بھاولپور میں قیام فرمایا، یہ مقدمہ بھاولپور کے جج محمد اکبر خان کی عدالت میں تھا۔

بیانات کا سلسلہ شروع ہوگیا:۔ عدالت میں سب سے پہلا بیان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی مفتی دارالعلوم دیوبند کا ہوا جو ساٹھ صفحات میں املا کرایا گیا، جج کی اصل توجہ علامہ کشمیری کے بیان پر تھی، آپ کا بیان پانچ روز مسلسل ہوا اور جج نے ساٹھ صفحات میں قلمبند کیا، عدالت میں دیئے جانے والے سارے بیانات کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ردّ مرزائیت کے لیے بلکہ اسلام و ایمان اور کفر و ارتداد کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے یہ بیان ایک روشن آئینہ ہے، اس مقدمہ میں کیا ہوا؟ اس کی پوری تفصیل سے واقفیت تو اس وقت ہوگی جب مفصل فیصلہ پڑھا جائے جو عدالت کی طرف سے مؤرخہ ۲، فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ کو دیا گیا جو اسی وقت اُردو میں ترجمہ کر کے ۱۵۲ صفحات پر شائع ہو چکا تھا۔

عدالت کا فیصلہ شائع کر دیا گیا:۔ جب عدالت نے مدعیہ عائشہ خاتون کے حق میں فیصلہ سنایا تو فوراً اس کی نقل لیکر اردو ترجمہ کیا گیا اور اسی دور میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ ناشر نے مقدمہ میں جو باتیں لکھی ہیں اس سے فیصلہ کی اہمیت معلوم ہو جائے گی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور اور مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے، حضرت شاہ صاحب کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ کے لیے جذب مقناطیسی کا کام کیا، اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہوگئی، حضرات علماء کرام

نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم وعرفان کے دریا بہا دیئے اور فرقہ ضالہ مرزائیہ کا کفر وارتداد روز روشن کی طرح ظاہر کر دیا اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت مسکت جواب دیئے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحب نے ایمان وکفر، زندقہ، ارتداد، ختم نبوت، اجماع، تواتر، متواترات کے اقسام، وحی، کشف اور الہام کی تعریفات اور ایسے اصول وقواعد بیان فرمائے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علیٰ وجہ البصیرۃ بطلان مرزائیت کا یقین کامل حاصل کر سکتا ہے، پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروکاری اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل وتزویر کو آشکارا کرنے کے لیے شہرۂ آفاق مناظر حضرت مولانا ابوالوفا صاحب نعمانی شاہ جہان پوری تشریف لائے، مولانا موصوف نے مختار مدعیہ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروی کی، فریق ثانی کی شہادت پر ایسی باطل شکن جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیاد کو کھوکھلا اور مرزائی دجل وفریب کے تمام پردے پارہ پارہ کر کے فرقہ مرزائیہ ضالہ کا ارتداد عالم آشکارا کر دیا۔

فریقین کی شہادت ختم ہونے کے بعد مولانا موصوف نے مقدمہ پر بحث پیش کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا، کامل دو سال کی تحقیق وتنقیح کے بعد عالی جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر نے اس تاریخی مقدمہ کا بصیرت افروز فیصلہ ۷ رفروری ۱۹۳۵ء کو بحق مدعیہ سنایا، یہ فیصلہ اپنی جامعیت اور قوت استدلال کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر وبے عدیل ہے مسلمانان ہند کی بہرہ اندوزی کی خاطر فیصلہ کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے، درحقیقت یہ مواد مقدمہ کی تیسری جلد کا ہے اس سے پہلے دو جلدیں اور ہوں گی۔"[1]

---

[1] "الانور" مصنفہ عبدالرحمٰن کوندو ص ۲۹۸ و ص ۲۹۹

مدارِ بحث کیا تھا؟ :- یہ مقدمہ صرف اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے چل رہا تھا کہ قادیانی مسلمان ہیں یا نہیں؟ قادیانی وکلاء ہر امکانی کوشش کر رہے تھے کہ اپنے کو مسلمان ثابت کریں، اور ہمارے علماء کے یہاں مرزا کی نبوت پر یقین رکھتے ہوئے ان کے مسلمان ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی، قادیانیوں نے جتنے دلائل دیئے وہ جرح میں تارِ عنکبوت ثابت ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے قادیانی وکلاء کو جس طرح گھیرا تھا اس کا ایک ہلکا سا نمونہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ شاہ صاحب نے مرزا کے عقائد کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

مرزا صاحب کی پیدائش چونکہ مسلمان گھرانے میں ہوئی تھی اور نسلی کافر نہیں تھے اس لیے ابتداءً ان کی نشو و نما اسلامی عقائد پر ہوئی۔ اور وہ ان کے پابند رہے پھر تدریجاً ان سے الگ ہونا شروع کیا یہاں تک کہ آخری اقوال میں بہت سے ضروریاتِ دین کے منکر ہو گئے۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے باطل اور جھوٹے دعووں کو رواج دینے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ اسلامی عقائد کے الفاظ وہی قائم رکھے جو قرآن اور احادیث میں مذکور ہیں اور عام و خاص مسلمانوں کی زبانوں پر جاری ہیں لیکن ان کے حقائق کو ایسا بدل دیا کہ جس سے ان عقائد کا بالکلیہ انکار ہو گیا، مثلاً جس طریق سے نفخِ صور یا قیامت کی خبر قرآن و حدیث میں آئی ہے اس سے بالکل انکار ہے صرف ظاہری الفاظ رکھے مگر معنی اُلٹ دیئے اس لیے ان کی کتابوں سے ایسے اقوال پیش کرنا جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعض عقائد میں اہلِ سنت والجماعت کے ساتھ شریک ہیں ان کے اقوالِ کفریہ و افعالِ کفریہ کا کفارہ نہیں بن سکتے، جب تک کہ اس کی تصریح نہ ہو کہ جو عقائدِ کفریہ انہوں نے اختیار کیے تھے ان سے توبہ کر چکے ہیں اور جب تک توبہ کی تصریح نہ ہو چند عقائدِ اسلام کے الفاظ کتابوں میں لکھ کر کفر سے نہیں بچ سکتے کیونکہ زندیق اسی کو کہا جاتا ہے جو عقائدِ اسلام ظاہر کرے اور قرآن و حدیث کی اتباع

کا دعویٰ کرے لیکن ان کی ایسی تاویل و تحریف کر دے جن سے ان کے حقائق بدل جائیں، لہٰذا جب تک اس کی تصریح نہ دکھلائی جائے کہ مرزا صاحب ختمِ نبوت اور انقطاعِ وحی کے اس معنی کے لحاظ سے قائل ہیں جس معنی سے کہ صحابہ و تابعین اور تمام امتِ محمدیہ قائل ہے اس وقت تک ان کی کسی ایسی عبارت کا مقابلہ میں پیش کرنا مفید نہیں ہو سکتا جس میں خاتم النبیین کے کے الفاظ کا اقرار کیا ہو، اسی طرح نزولِ عیسیٰ وغیرہ عقائد کے الفاظ کا کسی جگہ اقرار کر لینا یا لکھ دینا بغیر تصریح مذکور کے ہرگز مفید نہیں ہے خواہ وہ عبارت تصنیف میں مقدم ہو یا مؤخر، یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مرزا صاحب اپنی آخری عمر تک دعوائے نبوت پر قائم رہے اور اپنے کفریہ عقائد سے کوئی توبہ نہیں کی، علاوہ ازیں اگر یہ ثابت بھی نہ ہو تو کلماتِ کفریہ اور عقائدِ کفریہ رکھنے اور لکھنے کے بعد اس وقت تک ان کو مسلمان نہیں کہہ سکتے جب تک ان کی طرف سے ان عقائد سے توبہ کرنے کا اعلان نہ پایا جائے، یہ اعلان ان کی کسی کتاب یا تحریر سے ثابت نہیں کیا گیا۔" [1]

شاہ صاحب کی یہ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ قادیانی وکلاء کے پاس اسکے جواب کے لیے کوئی ثبوت اور دلیل نہیں تھی، یہی بحث کا حاصل تھا، مرزا کا ثبوتِ ایمان توبہ پر منحصر تھا اور اس کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

مرزا کے کفر پر دلائل :- مولانا سید احمد رضا صاحب نے اپنی کتاب "نطق انور" کے حصہ اول میں حضرت شاہ صاحب کی ایک مجلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۲ اور ۱۳ ستمبر کی کئی مجلسوں میں شاہ صاحب نے مقدمہ بہاولپور کے حالات اور اپنی شہادت اور بیان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"میں نے عدالت میں پانچ وجوہ سے تکفیرِ مرزائیت کا ثبوت پیش کیا

---

[1] "الانور" مؤلفہ عبدالرحمٰن کوندو ص ۴۶۶

تھا (۱) دعوائے نبوت (۲) دعوائے شریعت (۳) توہین انبیاء علیہم السلام (۴) انکار متواترات وضروریات دین (۵) سبّ انبیاء علیہم السلام"۔

پانچ دنوں تک علامہ کشمیری مرزائیوں کے خارج از اسلام اور ان کے مرتد ہونے پر دلائل دیتے رہے، جن دنوں علامہ کشمیری کا عدالت میں بیان چل رہا تھا، رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں اطراف وجوانب کے علماء، رؤسا اور اُمَرا سے تماشائیوں کی گیلری بھر جاتی تھی اور کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جج بھی علامہ کے دلائل وبراہین کے استحکام اور آپ کے علم وفضل کا اندازہ کر چکا تھا، اور مرعوب تھا جیسا کہ سنا گیا کہ جج نے کہا کہ فیصلہ علامہ کشمیری کے بیان پر منحصر تھا، چونکہ قادیانی وکلاء ان کے دلائل کا جواب نہیں دے سکے، اس لیے عدالت نے فیصلہ کیا کہ مُدعیہ حق بجانب ہے اور اس کو اسلامی اصولوں کے مطابق فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے، مدعیہ مسلمان ہے اور قادیانیت، اسلام کے خلاف ایک دوسرا مذہب ہے اور کسی مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا، اس لیے زوجین میں تفریق کی جاتی ہے اور مدعیہ کو شریعت کی رُو سے یہ حق ہے کہ وہ اپنا دوسرا نکاح کرلے، جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ

علامہ کشمیری نے ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست کی عدالت اور حکومت کو اپنے دلائل سے مجبور کر دیا کہ وہ اعلان کرے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں، اور یہ بھی تاریخ کی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ علامہ کشمیری ہی کے ایک شاگردِ رشید علامہ محمد یوسف بنوری شیخ الحدیث[1] جامعہ اسلامیہ ڈابھیل وشیخ الحدیث وبانی جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی نے

---

[1] مولانا محمد یوسف بنوری ایک جلیل القدر محدث اور علامہ انور شاہ کشمیری کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، آپ کی ولادت ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں مہابت آباد متصل شکئی ضلع مردان میں ہوئی۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ سید آدم بنوری خلیفہ حضرت مجدد الفِ ثانی رح ضلع انبالہ کے ایک گاؤں بنور میں اقامت پذیر تھے اسی نسبت سے آپ کو بنوری کہا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کابل (افغانستان) کے ایک مکتب میں ہوئی، متوسطات پشاور اور کابل میں پڑھیں، اس کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند چلے آئے اور یہاں دو سال رہ کر مشکوٰۃ تک تعلیم حاصل کی (باقی برصفحہ آئندہ)

دنیا کی سب سے بڑی مسلمان حکومت پاکستان سے قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کا اعلان کرایا اور تمام دنیا کی اسلامی حکومتوں نے اس فیصلہ کا پورے شرح صدر کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

رَدِّ قادیانیت پر لٹریچر:- مرزا کے دعوائے مسیحیت و دعوائے نبوت سے لے کر مقدمہ بہاول پور تک بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں، رسالے، کتابچے، ٹریکٹ وغیرہ شائع ہوئے اگر ان کی فہرست تیار کی جائے تو وہ فہرست خود ایک کتاب بن جائے گی، ایک ایک عالم نے سو سو کتابیں اور رسالے لکھے ہیں ان کتابوں میں بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں، بہت سے پچیس پچاس صفحات کے رسالے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مجاہد جلیل مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری کا نام لیے جانے کا مستحق ہے، انہوں نے مرزا کے رد میں ان گنت کتابیں اور رسالے لکھے، خود مولانا موصوف کو بھی اپنی تصنیفات کی تعداد یاد نہیں رہ گئی تھی۔ ان کا اخبار "اہل حدیث"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کے بعد حضرت شاہ صاحب دار العلوم کے قضیۂ نامرضیہ کے سلسلہ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے تو استاد سے غایت عقیدت کی بنا پر آپ بھی ان کے ہمراہ ڈابھیل منتقل ہو گئے وہیں آپ نے دورۂ حدیث پڑھا، آپ کے اساتذہ میں علامہ کشمیری مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ فراغت کے بعد آپ پشاور چلے گئے اور چار سال وہاں جمعیۃ علماء صوبہ سرحد کے صدر کی حیثیت سے قومی و ملی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو ڈابھیل بلایا گیا اور استاد مقرر ہوئے کچھ دنوں کے بعد آپ کو یہاں صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بنا دیا گیا۔ اسی دوران نصب الرایہ اور فیض الباری کی طباعت کے سلسلہ میں مصر کا سفر کیا تقسیم ملک کے بعد آپ پاکستان منتقل ہو گئے۔ ابتداءً ٹنڈو الہ یار کے دار العلوم میں شیخ التفسیر رہے لیکن جلد ہی وہاں سے استعفاء دے کر کراچی چلے گئے اور وہاں نیو ٹاؤن میں ایک مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے نام سے قائم کیا اور اس کو اتنی ترقی دی کہ اس کا شمار پاکستان کے تین بڑے اسلامی اداروں میں ہوتا ہے۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ترمذی کی شرح "معارف السنن" آپ کے علم و فضل کا شاہ کار ہے نفحۃ العنبر، بغیۃ الاریب تتمۃ البیان آپ کی علمی یادگار ہیں۔ ۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ردِّ مرزائیت کے لیے وقف تھا، مولانا موصوف کے اس موضوع پر بارہ رسالے اس وقت میرے سامنے ہیں جن میں مرزا کی زندگی اور ان کے دعوؤں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ کتابچہ ہے جس میں انہوں نے ان تمام فتوؤں کو شائع کیا ہے جو انہوں نے ایک استفتاء مرتب کرکے پورے اسلامی ہند کے ہر قابلِ ذکر ادارے اور ہر مکتبۂ فکر کے علماء کے پاس بھیجا تھا جس میں مرزا کے بہت سے اقوال نقل کرکے اس کے قائل کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی گئی تھی اور بلا استثناء ہر ایک نے مرزا کو کافر و مرتد قرار دیا تھا۔ ان تمام فتوؤں کو جمع کرکے ایک کتابچہ میں شائع کردیا جو اس وقت میرے سامنے ہے اور صرف چوبیس صفحات پر مشتمل ہے لیکن ہزاروں صفحات میں لکھی جانے والی کتاب جو ردِّ مرزائیت میں ہو اس پر بھاری ہے فتاویٰ کے اس مجموعہ نے عوام و خواص اور اہلِ علم سب کی نگاہوں کے سامنے مرزا کی اصل صورت بے نقاب کردی ہے اور ان کی حقیقت کھول کر رکھدی ہے۔

کثرتِ تصانیف کے سلسلہ میں دوسرا نام مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کا لیا جاسکتا ہے انہوں نے ردِّ مرزائیت پر تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں اور ان کو شائع بھی کیا ہے اور بالعموم مفت تقسیم کی ہے، صوبہ بہار میں ان کتابوں نے ردِّ قادیانیت میں مؤثر کردار انجام دیا۔

علامہ کشمیری اور ان کے تلامذہ کی تصانیف

علامہ کشمیری نے اگرچہ خود تصنیف و تالیف کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی لیکن فتنۂ قادیانیت کی ہلاکت آفرینی سے مجبور ہوکر قلم اٹھایا اور چند کتابیں تصنیف فرمائیں البتہ آپ نے اپنے تلامذہ کو جو بذاتِ خود ہندوستان کے اکابر علماء میں شمار ہوتے رہے، ردِّ قادیانیت کے موضوع پر کتابیں لکھنے کی ہدایت و تاکید فرماتے رہے اور عنوان بھی آپ خود ہی طے کردیتے تھے، علامہ کشمیری کی کتابوں میں رسالہ "عقیدۃ الاسلام فی حیٰوۃ عیسیٰ علیہ السلام" اس کے بعد اس کے حاشیہ یا ضمیمہ کے طور پر "تحیۃ الاسلام" دوسرا رسالہ

تصنیف فرمایا۔ مسئلہ کفر و اسلام کے حدود پر علامہ کشمیری نے "اکفار الملحدین فی شیٔ من ضروریات الدین" عربی میں تصنیف فرمائی، کیونکہ آپ کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ قادیانی اب اسلامی ممالک تک پہونچ رہے ہیں، اور وہاں بھی ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں اور لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ اسی لیے "اکفار الملحدین" کی زبان آپ نے عربی رکھی تاکہ عرب ملکوں میں اس کو پہونچایا جائے یہ ایک سو اٹھائیس صفحات کا عجیب و غریب رسالہ ہے، اس میں کفر و ایمان کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اصولی طور پر بحث کی گئی ہے کہ مدار ایمان کیا کیا امور ہیں اور کن کن عقیدہ و اعمال کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور کس قسم کے عقائد میں تاویل کرنا بھی موجب کفر ہے، یہ بحث اصولی تھی اس کسوٹی پر مرزا کے بیانات، اقوال اور عقائد کو الگ الگ پیش کر کے پرکھا نہیں گیا ہے اس کو اہل علم کی فہم و فراست پر اعتماد کر کے چھوڑ دیا گیا ہے کہ کتاب میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں ان پر مرزا کے اقوال کو پرکھا جائے اور وہ کسوٹی پر مسلمان ثابت ہوتا ہے یا کافر؟

مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۹۳۱ء میں جب اس کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کیا تو اس کے آخر میں صفحہ ۱۰۵ سے صفحہ ۱۲۳ تک مرزا کے خیالات، اقوال و عقائد کو ان کی کتابوں سے مع حوالہ نقل کر کے اس کسوٹی پر پرکھ کر دکھا دیا گیا جو شاہ صاحب نے "اکفار الملحدین" میں بتائی ہے کہ اصولوں کی بنیاد پر یہ سب کفر و زندقہ میں شامل ہیں مثلاً سبّ انبیاء یا توہین سے کفر لازم آتا ہے۔ اصولاً کتاب میں ثابت کر دیا گیا ہے۔ یہاں حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم کے صفحہ ۷ سے مرزا کا قول نقل کر دیا گیا ہے کہ:۔

"حضرت عیسیٰ کا خاندان بھی نہایت "پاک اور مطہر" ہے، تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زناکار کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا"

اسی طرح ہر اصول کے تحت تیس حوالوں سے اس کے اقوال نقل کر دیئے گئے ہیں اور ہر جگہ مرزا کی کتابوں کا پورا حوالہ موجود ہے، اصل کتاب "اکفار الملحدین" اور اس ضمیمہ

کو ملا لیا جائے تو آسانی سے یہ بات ہر قاری کو معلوم ہو جائے گی کہ اسلام میں جو کفر و ایمان کے حدود مقرر ہیں مرزا ان حدود کو پار کر جاتے ہیں یا نہیں؟ مرزا کے ان کفریہ اقوال و عقائد کو ان کی کتابوں سے نکال کر مرتب کرنے والے نے جس زبان میں وہ منقول ہیں وہی زبان نقل کی ہے اُردو کے اقوال کو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے عربی میں ترجمہ کر دیا ہے اور عربی و اُردو دونوں عبارتوں کو ایک صفحہ میں دو کالم کر کے آمنے سامنے چھاپ دیا گیا ہے کہ مرزا کی اصل عبارت و الفاظ بھی سامنے ہوں اور اہل عرب عربی سے مرزا کے عقائد و اقوال کو سمجھ سکیں اور صفحہ ۱۲۴ سے ۱۲۸ تک تمام مشاہیر علماء دیوبند میں سے چوٹی کے علماء کی تائیدی عبارت نقل کر دی گئی ہے اور بصورت تقریظ ان کی تحریروں کو شائع کر دیا گیا ہے، ''اکفار الملحدین کی تائید و توثیق و تصویب کرنے والوں میں بذل المجہود شرح ابوداؤد کے مصنف مشہور محدث مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہتمم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا نام ہے۔ دوسری تقریظ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ہے تیسری تائید مفتی اعظم ہند، مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث و سرپرست صدر الاساتذہ اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ چوتھی تائید مفتی اعظم دار العلوم دیوبند مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی کی ہے، پانچویں تقریظ شارح مسلم شریف علامہ شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دار العلوم دیوبند کی ہے، اس طرح اکفار الملحدین گویا علماء دیوبند کے اجتماعی نقطہ نگاہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کی گئی ہے اور اسی زمانہ میں مرزا کے مرتد اور خارج از اسلام ہونے کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا گیا تھا جبکہ اس کے بعد بھی بہت دنوں تک کچھ لوگ تذبذب کا شکار رہے اور بہت بعد میں اس کے مرتد اور کافر ہونے کا فیصلہ کیا۔

شاہ صاحب نے ختم نبوت کے موضوع پر ''خاتم النبیین'' کے نام سے فارسی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی اور یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر فارسی زبان میں لکھی کیونکہ ان دنوں کشمیر میں قادیانی فتنہ سر اٹھا رہا تھا، یہ کتاب علامہ کشمیری نے کس جذبے سے لکھی تھی اس کے سلسلہ میں آپ کے شاگرد رشید

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے مرض وفات میں رُو رُو کر فرمایا کہ:-

"ہم نے عمر ضائع کی، اور کوئی کام آخرت کے لیے نہ کیا، ہاں یہ رسالہ "خاتم النبیین" اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے، توقع ہے کہ شاید یہی میری نجات کا ذریعہ ہو جائے۔" [1]

علامہ کشمیری نے خود تو کم لکھا لیکن اپنے تلامذہ سے اپنی رہنمائی میں جو کتابیں لکھوائیں وہ اپنے اپنے موضوع پر حرفِ آخر ثابت ہوئیں اور ان لکھنے والوں کو مشورے اور ہدایات برابر دیتے رہے ان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے اور ان کی کوششوں پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے رہے، سراہتے رہے اور دعائیں دیتے رہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ہمیں بتایا کہ ایک بار ہم چند افراد حضرت کی خدمت میں حاضر تھے، آپ کے چہرے پر اضمحلال اور ایک اندرونی کشمکش کی وجہ سے اضطراب نمایاں تھا، آپ نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ زمانہ کو الحاد کے فتنوں نے گھیر رکھا ہے اور قادیانی دجال کا فتنہ ان سب میں شدت اختیار کرتا جا رہا ہے اُمت کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے ہمارا سب سے پہلا فریضہ ہے کہ اس کے رد میں مسلسل کتابیں لکھی جائیں جو دلائل و براہین سے اتنی مستحکم اور ٹھوس بنیاد فراہم کریں کہ جو لوگ ان کتابوں کا مطالعہ کریں ان پر قادیانیت کا جادو نہ چل سکے اور کچھ بعد میں ہر جگہ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو قادیانیت کو اسلام کے خلاف ایک فتنہ سمجھ کر اس کی مدافعت کے لیے جدوجہد کے میدان میں آجائیں، میری مجبوری یہ ہے کہ میری تحریریں مغلق ہونے کی وجہ سے عوام کے لیے ناقابلِ فہم ہو جاتی ہیں، اگر آپ لوگ آمادہ ہوں تو میں اس تمام مواد کو آپ لوگوں کے سپرد کر دوں جو میں نے اب تک قادیانیت کے خلاف جمع کیا ہے۔

---

[1] حیاتِ انور ص ۲۳۴

اس وقت علامہ کشمیری کی مجلس میں ملک کے مشاہیر علماء میں مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی استاد دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد ادریس صاحب شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند، مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاندپوری ناظم شعبۂ تبلیغ دارالعلوم دیوبند موجود تھے، ہر ایک کو الگ الگ موضوع دے کر فرمایا کہ آپ لوگ ان کتابوں کو مرتب کریں، آپ نے عنوانات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں پہلی اور بنیادی چیز مسئلہ ختم نبوت ہے، اس پر ایک محققانہ اور مکمل تصنیف ہونی چاہیئے اور اس پہلو کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ قادیانیوں کے شکوک و شبہات کا قرار واقعی ازالہ بھی ہو دوسرا موضوع جس پر کتاب کا آنا ضروری ہے وہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ ہے، حیاتِ مسیح کی مکمل تحقیق قرآن و حدیث و آثار سنت سے ہونی چاہیے۔ اس کتاب میں یہ پہلو پیش نظر ہو کہ جو شکوک و شبہات قادیانی پیدا کرتے ہیں ان کا قلع قمع ہونا چاہیئے، تیسرا موضوع خود مرزا کی ذات اور اس کی زندگی کے واقعات، اس کے گرے ہوئے اخلاق، متعارض و متناقض اقوال، انبیاء کرام اور اولیاء عظام کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں، اس کا دعوائے نبوت و وحی اور اس کے متضاد قسم کے دعوے، ان سب باتوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کیا جائے جس سے مسلمانوں کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

علماء کو ذمہ داریاں سپرد کر دی گئیں اور ہر ایک نے اپنی ذمہ داری کو پورے جوش اور پوری لگن کے ساتھ پورا کیا جیسا کہ ان حضرات کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے۔

مولانا بدر عالم صاحب کی تصنیف :- مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی نے حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام پر اردو میں ایک کتاب "الجواب الفصیح لمنکر حیوٰۃ المسیح" تحریر فرمائی جو اپنے زور استدلال اور قرآن و احادیث کے شواہد کی وجہ سے ایک اہم علمی کتاب بن گئی، اس مسئلہ پر آپ نے تحقیق و تفتیش کا حق ادا کر دیا، حضرت شاہ صاحب نے کتاب کو دیکھ کر مسرت کا اظہار فرمایا، کتاب اسی سال ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳ء) میں شعبۂ تبلیغ دارالعلوم دیوبند سے

شائع ہوئی۔

مولانا محمد ادریس صاحب کی تصانیف :- مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کو علم تفسیر و حدیث سے خصوصی شغف تھا اس لیے آپ کی ہر تصنیف عالمانہ اور محققانہ ہوتی ہے، آپ نے بھی حیاتِ مسیح پر "کلمۃ السر فی حیات روح السر" تصنیف فرمائی، اس کتاب نے بھی مقبولیت حاصل کی اور ۱۹۲۳ء میں دار العلوم دیوبند سے شائع ہوئی، اس کے علاوہ رد قادیانیت میں کلمۃ اللہ فی حیوۃ روح اللہ"۔ "مسک الختام فی ختم نبوۃ سید الانام" "اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف"۔ "القول المحکم فی نزول عیسیٰ ابن مریم"۔ "دعاوی مرزا" تحریر فرمائیں، یہ ساری کتابیں اسی زمانہ میں شائع کی گئیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب کی تصانیف :- مفتی محمد شفیع صاحب نے ان ممالک کو جن کی زبان عربی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر عربی میں ایک کتاب "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" تصنیف فرمائی جس میں مستند اور معتبر روایات جمع کر کے حیاتِ مسیح اور آخر زمانہ میں ان کے نزول کو ثابت کیا گیا ہے، علامہ کشمیری کی پسندیدگی کے بعد اسی سال ۱۹۲۳ء میں دار العلوم دیوبند کی طرف سے شائع کی گئی، مفتی صاحب کی دوسری اہم ترین کتاب "ختم نبوت" ہے جو پونے چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس کے تین حصے ہیں، پہلے حصے کا نام "ختم النبوۃ فی القرآن" ہے جس میں صرف آیات قرآنی سے ختم نبوت کو ثابت کیا گیا ہے اور اس سلسلہ کی ایک سو آیات پیش کی گئی ہیں، کتاب کا دوسرا حصہ "ختم النبوۃ فی الحدیث ہے"، اس حصہ میں آپ نے دو سو دس احادیث معتبرہ سے ختم نبوت کو ثابت کیا ہے اور ملحدین اور مرزائیوں کو جواب دیا گیا ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ "ختم النبوۃ فی الآثار" ہے جس میں سیکڑوں اقوال صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ دین کے ختم نبوت کے مسئلہ پر جمع کر دیئے گئے ہیں اور منکرین ختم نبوت اور ان کی تاویلاتِ باطلہ پر گرفت کی گئی ہے، پہلی اشاعت کے موقعہ پر یہ تینوں حصے علٰحدہ علٰحدہ شائع کیے گئے تھے اور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء کی مدت میں شائع ہوئے

بعد میں ان تینوں حصوں کو ایک مکمل کتاب کی شکل میں "ختم نبوت" کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے جو اس وقت میرے سامنے ہے اور ۳۶۷ صفحات پر مشتمل ہے، مفتی صاحب کی تیسری کتاب "دعاوی مرزا" اور "مسیح موعود کی پہچان" ہے جو ۱۹۲۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی پھر اس کے بعد برابر شائع ہوتی رہی۔

مولانا محمد مرتضیٰ حسن صاحب کی تصانیف :-

مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری بہترین خطیب و مناظر تھے۔ پوری زندگی آپ کی فرق باطلہ سے مناظروں میں گذری، آپ اس کوچے سے خوب واقف ہیں اس لیے آپ کی ساری کتابیں مناظرانہ رنگ میں ہیں اور جس زمانہ میں شائع ہوئیں دل و دماغ کو بہت اپیل کرنے والی ثابت ہوئیں، آپ قادیانیوں سے کئی مقامات پر مناظرے کر چکے تھے خاص طور سے مونگیر (بہار) میں قادیانیوں سے مولانا سید محمد علی مونگیری کی دعوت پر مناظرہ ہوا تھا، تمام اکابر کی موجودگی میں آپ ہی مناظر بنائے گئے اور ایک ہی تقریر میں قادیانیوں کی ہوا اکھڑ گئی اور سر پر پیر رکھ کر بھاگے، آپ نے دسیوں کتابیں رد قادیانیت میں تصنیف کیں، ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں "قادیانیت میں قیامت خیز بھونچال"۔ "اشد العذاب علی مسیلمۃ الکذاب"۔ "فتح قادیان" "مرزائیوں کی تمام جماعتوں کو چیلنج"۔ "مرزائیت کا خاتمہ"۔ "مرزائیت کا جنازہ بے گور و کفن"۔ "ہندوستان کے تمام مرزائیوں کو چیلنج"۔ "مرزا اور مرزائیوں کو دربار نبوت سے چیلنج" "مرزائیوں کے گلے میں لعنت کا طوق"۔ "تعلیم الخبیر فی حدیث ابن کثیر"۔ "قادیانیوں سے ستر سوالات"۔ صاعقہ آسمانی بر فرقہ قادیانی"۔ "الابطال لاستدلال الدجال"۔ "تحقیق الکفر والایمان"۔ یہ سب رسالے ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک دار العلوم دیوبند سے شائع ہو کر ملک میں تقسیم ہوئے۔

مولانا نور محمد ٹانڈوی کی تصانیف :-

مولانا نور[1] محمد ٹانڈوی فاضل مظاہر علوم سہارنپور مشہور واعظ اور بہترین

[1] مولانا نور محمد ٹانڈوی فاضل سہارنپور ہیں۔ ابتدائی تعلیم عین العلوم ٹانڈہ ضلع فیض آباد پائی اگلے صفحہ پر

مناظر تھے، ماضی قریب میں وہ ہم سے جدا ہو گئے، ان کی بڑی خدمات ہیں۔ ساری زندگی باطل فرقوں سے مناظروں میں گذری، رد بدعت اور فتنہ قادیانیت کے عہدِ شباب میں بڑی پامردی سے اس کا مقابلہ کیا۔ آپ مظاہر علوم سہارنپور کے شعبۂ تبلیغ سے وابستہ تھے۔ اسی زمانہ یعنی ۱۹۳۳ء میں آپ نے مرزائیوں سے مناظرہ کے ساتھ ان کے رد میں بہت سے رسالے لکھے اور شائع کیے گئے آپ کی تحریر کا ایک خاص رنگ تھا طنز و تعریض اور چبھتے ہوئے جملوں کا برمحل استعمال ان کی تحریر میں شوخی اور دلچسپی پیدا کر دیتی ہے اور فریق مخالف تلملا کر رہ جاتا ہے اسی لیے ان کے مناظرانہ رنگ کے رسالے اور کتابچے بڑے ذوق شوق سے پڑھے جاتے تھے ان کے رسالوں کی فہرست حالات کے ضمن میں دیدی گئی ہے۔

مولانا عبدالغنی صاحب کی کتاب :- ایک اور بزرگ مولانا[1] عبدالغنی پٹیالوی ثم شاہ جہان پوری مدرسہ امینیہ دہلی کے

(حاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ) میں حاصل کر کے مظاہر علوم سہارنپور چلے گئے وہیں سے ۱۳۴۳ھ میں سند فراغت حاصل کی اور وہیں شعبۂ تبلیغ سے وابستہ ہو گئے۔ سیاسیات میں مولانا حسین احمد مدنی کے متبع اور اجلاس جمعیۃ منعقدہ ۱۹۳۰ء میں حضرت مدنی کے ہاتھ پر جان کی بیعت کی۔ انگریزی حکومت کے خلاف تقریروں کی وجہ سے کئی بار جیل گئے، فرق باطلہ شیعیت، رضاخانیت، قادیانیت کے لیے شمشیر برآں تھے ان کے تعاقب اور تردید میں تصنیف و تالیف تقریر و تحریر، بحث و مناظرہ ہر راہ سے اہم خدمات انجام دیں، سامراجی نبوت کے تعاقب میں ملایا، سنگاپور افریقہ، کینیا، فرانس وغیرہ ممالک کے طویل سفر کیے۔ اس فتنہ مرزائیت کے عہدِ شباب میں کراچی سے پشاور تک تمام قصبات میں اپنی زبردست تقریروں سے زلزلہ ڈال دیا۔ شیعیت، رضاخانیت اور قادیانیت کے رد میں دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ قادیانیت پر ان کی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں ۱ کرشن قادیانی ۲ اختلافاتِ مرزا ۳ کفریاتِ مرزا ۴ امراضِ مرزا ۵ کذباتِ مرزا ۶ مغلظاتِ مرزا ۷ دفع الالحاد عن حکم الجہاد چند برس ہوئے کہ یہ مردِ مجاہد اپنے ربِ حقیقی سے جا ملا رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

[1] مولانا عبدالغنی صاحب پٹیالوی اصلاً ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے لیکن آپ نے شاہ جہاں پور کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا اور عرصہ دراز تک یہاں کے ایک مدرسہ عین العلوم میں صدر مدرس رہے پھر آپ کو (باقی اگلے صفحہ پر)

استاد تھے اور بڑے ذی علم تھے ۱۹۲۷ء میں رد قادیانیت کے جذبے سے ایک ضخیم کتاب "ھدایۃ الممتری عن غوایۃ المفتری" کے نام سے لکھی اور شائع کی۔ اس کتاب میں اسلامی عقائد اور قادیانیوں کے باطل عقیدوں کا تقابلی انداز ہے، مرزا غلام احمد قادیانی کے اصول، عقائد، الہامات، پیش گوئیوں پر منصفانہ طور پر بحث کی گئی ہے، وحی، رسالت، ختم نبوت، حیات و وفات مسیح، معراج جسمانی، حشر اجساد اور دیگر ضمنی مسائل کو قرآن و حدیث اور اقوال سلف کی روشنی میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا گیا ہے، مرزائیوں کی تمام کتب میں کوئی دلیل بھی ایسی نہ ہوگی جس کا اس کتاب میں کافی شافی جواب نہ دیا گیا ہو، بعد میں یہ کتاب "اسلام اور قادیانیت کا تقابلی مطالعہ" کے نام سے دار العلوم دیوبند سے شائع کی گئی، کتاب ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا موصوف نے خاص طور پر یہ کام بھی بڑا اہم کر دیا ہے کہ مرزا غلام احمد کی جتنی چھوٹی بڑی کتابیں ہیں ان سب کی مکمل فہرست بھی درج کتاب کر دی ہے اور سنہ اشاعت بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا ہے انہوں نے مرزا کی ۸۷ کتابوں کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ ان کے اخبار "البدر" کے مضامین کا بھی حوالہ دیا ہے، کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے اور اپنے دلائل و براہین اور طرز استدلال کے اعتبار سے بڑی اہم کتاب ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے بلایا اور یہیں تعلیم و تدریس میں آخر دم تک مصروف رہے اور یہیں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کے خصوصی شاگردوں میں آپ کا شمار ہے۔

باب (۹)

آئینی طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کی داستان

ریاست بہاول پور کے مقدمہ کا فیصلہ ۱۹۳۵ء میں ہوا جس میں قادیانیوں کو مسلمانوں سے علٰحدہ ایک مذہب کا پیروکار تسلیم کیا گیا اور عائشہ خاتون مدعیہ کے حق میں فیصلہ دے کر اس کے قادیانی شوہر عبدالرزاق سے اسلامی قانون کے مطابق تفریق کرا دی گئی کیونکہ کسی بھی مسلم عورت کا نکاح غیر مسلم سے منعقد ہی نہیں ہو سکتا، قادیانی چونکہ مسلمان نہیں ہیں جیسا کہ علماء اسلام کے بیانات سے ثابت ہو چکا تھا اس لیے ایک قادیانی مرد، مسلمان عورت کا شوہر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک چھوٹی سی مسلم ریاست کی عدالت کا فیصلہ تھا اس لیے عالم اسلام میں اس کی شہرت نہیں ہوئی، اس لیے قادیانیت ملک کے دور دراز علاقوں میں مصروف عمل رہی کبھی کشمیر میں ان کی سرگرمیاں بڑھ گئیں تو مولانا

عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت پنجاب اور ان کے ساتھ مجلس احرار اسلام کو میدان میں آنا پڑا کبھی وہ پشاور کے قصہ خوانی بازار میں بازی گری دکھانے لگے اور کبھی برما اور رنگون میں ان کی سرگرمیوں کا ذکر سنا جانے لگا، لیکن مقدمہ بہاول پور کے فیصلہ کے بعد اس کی شہرت تمام ملحقہ صوبوں میں ہو چکی تھی اور رد قادیانیت میں جتنے لٹریچر لکھے گئے وہ سب اسی علاقے کے علماء نے لکھے اور وہ تمام ادارے جنہوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم اور مرتد قرار دیا، وہ تمام ادارے انھیں علاقوں میں تھے اس لیے ان صوبوں میں عام مسلمان قادیانیت کی حقیقت کو بہتر طور پر سمجھ چکے تھے اس لیے قادیانیوں نے پنجاب، اتر پردیش، بہار اور اڑیسہ اور اس سے ملحقہ صوبوں سے ہٹ کر اپنی سرگرمیوں کا دائرۂ عمل بنایا اور پوری سرگرمی سے اپنے مذہب کی اشاعت میں لگے۔

دوسری طرف ہمارے علماء سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں اس طرح مصروف ہوئے کہ ان کی بڑی تعداد بسا اوقات برطانوی جیلوں میں بستر لگائے ہوئے رہنے لگی، ملک میں تیز تر سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں اور سیاسی گروہ بندی شباب پر تھی، الیکشن کی ہنگامہ آرائیاں، لیگ اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی آپسی جنگ، پھر کانگریسی وزارتوں کا قیام، یورپ کی دوسری جنگ عظیم کا آغاز جس کی آنچ ہندوستان کی سرحدوں تک آنے لگی، ان حالات میں تمام اکابر علماء انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے اس بہترین وقت کو کھو دینا نہیں چاہتے تھے اس لیے ان کی ساری توجہ سیاسی مسائل پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔

قادیانیت جسم اسلام کا ناسور بنتی رہی:۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادیانی خاموشی کے ساتھ دور افتادہ علاقوں میں اسلام کے خلاف زہر بوتے رہے اور مسلمانوں کے ایمان پر شبخون مارتے رہے یہاں تک کہ اگست ۱۹۴۷ء آگیا اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ملک کی تقسیم کے بعد قادیانیوں کا مولد اور اس کی جنم بھومی قادیان ہندوستان میں رہ گیا۔ قادیانیوں کی بدقسمتی سے جو ٹکڑا ہندوستان سے کٹ کر پاکستان بنا وہی ان کی سرگرمیوں کی جولانگاہ تھا جن صوبوں

پر مشتمل نئے ہندوستان کی تشکیل ہوئی وہ قادیانیوں کے لیے قطعاً ناسازگار تھے کیونکہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے لیے یہ خطے کسی طرح کارآمد نہیں تھے، ان کی ساری مخالفت انھیں علاقوں سے ہوئی، پوری دنیا میں ان کی ذلت و رسوائی یہیں کے اداروں اور یہیں کے علماء حق کے ہاتھوں ہوئی، یہاں کے مسلمان دوسرے خطے کے مسلمانوں کے مقابلہ میں ضروریاتِ دین سے زیادہ واقف، زیادہ حساس تھے، یہاں قدم قدم پر ذہین و فطین علماء آباد ہیں، ہر چھوٹے بڑے شہر، قصبات حتی کہ گاؤں میں بھی اسلامی مدارس موجود ہیں، ہر سال ہزاروں کی تعداد میں فضلاء فارغ ہوکر دینی مدارس سے نکلتے ہیں اور اسلام کے مجاہد بن کر نکلتے ہیں اگر قادیانی اسی ہندوستان میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں تو ان کے لیے قدم قدم پر مصیبتوں کا سامنا ہے ان کی راہ میں کانٹوں سے بھری وادیاں ہیں، یہاں ایک قدم بھی ان کا چلنا دشوار ہوگا۔ یہی وہ حالات تھے جن پر مدبرین قادیانیت نے غور کیا، راہ کی مشکلات کا جائزہ لیا اور رات کی تنہائی میں اس صورتِ حال پر غور کرکے ایک فیصلہ کیا اور اس پر پہلی فرصت میں عمل شروع کر دیا، دوسرے دن دنیا نے سنا کہ مرزا محمود خلیفہ مرزا غلام احمد بن کر پرواز کر گیا اور سرزمین پاکستان پر اُتر گیا۔

قادیان سے رَبوہ تک:- ان کے پاس دولت کی کمی کبھی نہیں رہی، مرزا غلام احمد کا خاندان بادشاہوں کی طرح شاہانہ زندگی گذارتا تھا، اس نے پاکستان جاتے ہی حکومت سے ایک بہت بڑا قطعہ اراضی حاصل کیا اور تعمیرات کا سلسلہ چھیڑ دیا، لاکھوں اور کروڑوں روپے صرف کرکے تمام عمارات بنوائیں اور پورا ایک شہر آباد کر دیا، اسکول اور کالج کی عمارتیں بنوائیں، رہائشی فلیٹ تعمیر کرائے، دارالخلافت کا فلک بوس محل تعمیر ہوا اور ہندوستان میں قادیانیت کے جو مشنری رہ گئے تھے ان کے مکانات بنوائے اور سب کو سمیٹ کر وہیں آباد کیا اور کسی غیر قادیانی کو اس علاقہ میں آباد ہونے کے لیے زمین نہیں دی گئی۔ یہ ان کا خالص مذہبی شہر تھا، آج اسی کو "رَبوہ" کہا جاتا ہے، جو قادیانیت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی قادیانیوں کے پاکستان کی طرف کوچ کرنیکا

ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"مرزا محمود قادیانی اپنے "مکۃ المسیح"، "ارض حرم" اور "مسجد اقصیٰ" (یعنی قادیان) سے برقعہ پہن کر فرار ہوا اور سیدھا لاہور آکر دم لیا پاکستان میں دجل و تلبیس کا نیا دارالکفر "ربوہ" کے نام سے آباد کیا، قبر فروشی کی آبائی اسکیم کے لیے "بہشتی مقبرہ" کا یہاں ڈھونگ رچایا اور قادیانی خلافت کے شاہوار ترکتازیاں دکھانے اور پورے ملک کو مرتد بنانے کا اعلان کرنے لگا۔" [1]

پاکستان میں قادیانیوں کی توقعات :۔ پاکستان میں اپنا مرکز منتقل کرنے میں قادیانیوں کے دلوں میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ پاکستان ایک نومولود حکومت ہے اور پہلے ہی دن سے حکومت کے اہم اور کلیدی عہدوں پر قادیانی قابض ہیں اور سب سے خوش آئند بات ان کے لیے یہ تھی کہ پاکستان کی فوج میں بلند ترین عہدوں پر قادیانیوں کا قبضہ ہے، پاکستان کا وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں کٹر قادیانی ہے اور اپنے مسلک کا اتنا پختہ کہ بانی پاکستان اور سربراہ حکومت مسٹر محمد علی جناح کے جنازہ کے وقت موجود رہتے ہوئے بالقصد اس نے نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی، ایسا متشدد قادیانی پاکستان کی خارجہ پالیسی پر حاوی تھا دوسرے ممالک میں قادیانیوں کو اس کے ذریعہ جو سہولتیں مل سکتی تھیں اس کا نقشہ ان کے دماغ میں موجود تھا، ان حالات میں پاکستان کی سرزمین میں اپنے جھوٹے نبی کے کھوٹے سکے کو رائج الوقت بنانے میں کچھ زیادہ دشواریاں نہیں ہوں گی۔

پاکستان پہونچ کر قادیانی کچھ ایسا محسوس کرنے لگے تھے کہ ہم قید سے چھوٹ کر بھاگے ہیں کیونکہ تقسیم ملک سے کچھ پہلے تک سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کی جماعت مجلس احرار اسلام نے قادیانیوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کر دیا تھا اور قادیانیوں کا چلنا پھرنا دوبھر کر دیا

---

[1] رسالہ "البینات" کراچی مولانا محمد یوسف نمبر ۱۹۷۸ء ص ۳۵۱

تھا، مجلس احرارِ اسلام مجاہدانِ صف شکن کی جماعت تھی، امیرِ شریعت پنجاب عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا مردِ آہن ان کا رہنما اور قائد تھا اس لیے قادیانیوں سے ٹکرانے میں مجلسِ احرار نے اپنے دلوں میں کوئی نرم گوشہ نہیں رہنے دیا تھا، پاکستان پہونچ کر قادیانی اس مصیبت سے نجات پا چکے تھے۔ اگرچہ عطاء اللہ شاہ بخاری پاکستان میں تھے لیکن وہ نیشنلسٹ تھے اور پاکستان میں ایسے تمام لیڈران معتوب تھے اس لیے ایک طرح سے شاہ صاحب کی زبان بند تھی اور عوامی اسٹیج پر آکر کوئی ایسی تقریر کرنی ان کے لیے ممکن نہیں تھی جس کو بہانہ بنا کر حکومت ان کو غیر معین مدت کے لیے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دے اس لیے انہوں نے سیاست سے علٰحدگی کا اعلان کر دیا تھا، قادیانیوں کی اس پر خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی کیونکہ ان کو مسلم لیگ والوں سے اپنی مخالفت کی کوئی اُمید یا خطرہ نہیں تھا، شاہ صاحب کی عزلت نشینی اور مجلس احرارِ اسلام کے بکھراؤ کی وجہ سے قادیانیوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ اب پاکستان میں ہماری راہ میں کوئی سنگِ گراں بننے والا نہیں رہا اور اگر کسی نے ہماری راہ میں رُکاوٹ بننے کی کوشش کی تو حکومتِ پاکستان میں کلیدی عہدوں پر قابض قادیانی حکام کے ذریعہ اُسے جیل کی ہوا کھانے کے لیے آسانی سے روانہ کر دیں گے، ان جذبات وخیالات اور توقعات کو لے کر قادیانیوں کا خلیفۂ وقت مرزا محمود پاکستان جاتا ہے اور اپنا مرکزِ خلافت ربوہ میں قائم کرتا ہے۔

علماءِ حق کی فراستِ ایمانی:۔ نوزائیدہ مملکتِ پاکستان میں بسنے والے علماءِ حق جو اپنی دینی بصیرت اور فراستِ مؤمن کی دولت سے مالا مال تھے، ان کی نگاہیں پاکستان کے داخلی خلفشار، کوتاہیوں اور کمزوریوں پر لگی ہوئی تھیں، وہ دیکھ رہے تھے کہ صدر کا سکریٹری ایک قادیانی ہے، وزارتِ خارجہ پر ایک اور قادیانی کا قبضہ ہے، پاکستان کی فوجی طاقت پر نظر جاتی ہے تو ایک ٹکا خان کو چھوڑ کر دس بارہ بڑے فوجی افسران سب کے سب قادیانی ہیں، اور حکومت کے تمام دفاتر میں اہم کلیدی عہدوں پر قادیانیوں کا تسلط ہے، ہر دفتر میں قادیانی چھائے ہوئے ہیں، حکومت کی پالیسی میں قادیانیوں کا

بہت عمل دخل ہے اور اگر کچھ برسوں اسی طرح قادیانی حکومت کے دروبست پر قابض ہوتے چلے گئے تو وہ دن دُور نہیں کہ جب ایک دن پاکستانی رات کو سو کر صبح کو اُٹھینگے تو معلوم ہوگا کہ مملکت خداداد پاکستان کے دارالحکومت کے سب سے اونچے محل پر قادیانی جھنڈا لہرا رہا ہے اور فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا جا چکا ہے کہ جو شخص سر اُٹھائے اُسے گولیوں سے بھون دو، اب یہ قادیانی نبی کا دارالخلافت بن چکا ہے اور مرزا محمود اس خلافت کا سب سے پہلا "امیر القادیین" بن چکا ہے۔

علماء حق سُقراط کی طرح زہر کا پیالہ پی کر مرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اسلام گھُٹ گھُٹ کر مرنے کی تعلیم نہیں دیتا وہ صداقت کو باطل کے ساتھ پوری قوت سے ٹکرا جانے کی ہدایت دیتا ہے، حالات چاہے کتنے ہی ناسازگار ہوں ایک مسلمان کو حالات کی شکایت کا حق نہیں دیا گیا ہے، اگر زمانہ تمہاری موافقت نہیں کرتا اور زمانہ تمہارے لیے سازگار نہیں ہوتا ہے تو تم اس کو اپنی قوت بازو سے سازگار بناؤ اور سازگار نہیں بنتا تو اس سے ٹکرا جاؤ، چیختے ہوئے طوفان اور شور مچاتے ہوئے سیلاب میں ایک بار نعرۂ تکبیر بلند کرو اور چھلانگ لگا دو، ع یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جن کا متحدہ ہندوستان میں طوطی بولتا تھا جب وہ سیاسی اسٹیج پر تلوار سے ٹیک لگا کر انگریزی اقتدار کے قلعہ پر الفاظ کے بم برساتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ محمد بن قاسم ساحل سندھ پر یا طارق بن زیاد ساحل اندلس پر کھڑے ہو کر اپنی فوج کو للکار رہا ہے، مسلمانو! دنیاوی سہاروں پر بھروسہ مت رکھو، جن کشتیوں سے آئے ہو، ان میں آگ لگا دو اور سوچ لو کہ اب تم کو اپنے وطن واپس جانا نہیں ہے یا تو پورے مُلک پر اسلام کا پرچم لہرا دو اور اعلان کر دو کہ ہمارا وطن کسی خاص سرزمین کا نام نہیں ہے ع ہر مُلک مُلکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔

اور اگر تم ناکام ہوتے ہو تو اس سرزمین سے دو دو گز زمین اپنی قبروں کے لیے ضرور حاصل کر لو کہ مسلمان اس سے کم پر راضی نہیں ہو سکتا۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے مردِ آہن تاریخ کبھی اکرتی ہے، وہی فولادی

عزم وارادہ کا انسان اب بھی سرزمینِ پاکستان میں موجود تھا، لیکن جنگِ آزادی کے میدان میں وہ مسلم لیگ کا حریف تھا اس لیے پاکستان بننے کے بعد وہ ناخدایانِ پاکستان کی نگاہوں میں معتوب تھا اور ایک ناکام سیاست داں کی طرح خاموشی کی زندگی گذارنے پر مجبور تھا، لیکن وہ دنیاوی سیاست تھی، اقتدار سے ایک قوم کو بے دخل کرکے اس پر قبضہ کرنا تھا عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کے سوال پر جنگ تھی لیکن تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں جو اسلام کے نام پر بنا تھا اس پر کافروں کے قبضہ کرنے کی ریشہ دوانیاں اس درجہ خطرناک ہو چکی تھیں کہ اب اس سرزمین میں اسلام کی بقاء وفناء کا سوال پیدا ہو گیا تھا، ان حالات میں حضرت شاہ صاحب اگر گوشۂ عزلت سے نہیں نکلتے تو ضمیر کی ملامت ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی، ایمان کے تقاضوں نے ان کو گوشۂ عزلت سے نکلنے پر مجبور کیا اور سیاست سے علیحدگی کے اعلان کے ساتھ دین پر اپنی متاعِ زندگی قربان کر دینے اور اس کی حفاظت میں اپنی جان جاں آفریں کو سپرد کر دینے کے آہنی عزم کے ساتھ جد وجہد کے میدان میں اُتر آئے اور انہوں نے ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو ملتان کی ایک چھوٹی سی مسجد میں اپنے مخلص دوستوں کی ایک خصوصی میٹنگ بلائی جس میں امیرِ شریعت خطیب العصر مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری کے علاوہ پاکستان کے مجاہد ملت مولٰنا محمد علی جالندھری خطیبِ پاکستان تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد شریف بہاول پوری، مولانا شیخ احمد، مولانا محمد عبداللہ درخواستی پوری، مولانا عبدالرحمن میانوی، مولانا تاج محمود لائل پوری، مولانا محمد شریف جالندھری، مولانا عبدالرحیم اشعر، مولانا غلام محمد بہاول پوری جیسے علماء حق شریک ہوئے۔ شاہ صاحب نے پاکستان میں قادیانیوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور حکومت کے در وبست پر بتدریج ان کے قبضہ وتسلط کے حقائق ان کے سامنے پیش کیے، اور انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر حالات کی رفتار یہی رہی تو وہ دن دُور نہیں جب پاکستان کی اسلامی حکومت پر مسیلمۂ پنجاب کی حکومت ہو جائے اور مسلمان جیتی ہوئی بازی ہار جائے، اگر ہماری غفلت اور چشم پوشی کی وجہ سے یہ بُرا دن آگیا تو سات کروڑ مسلمانوں کے ایمان واسلام کی کون حفاظت

کرے گا، خدا کے مواخذے سے ہم بچ نہیں سکیں گے، اس لیے پہلی فرصت میں مخلص مسلمانوں کو جدوجہد کے میدان میں اتر کر اپنی تیز رفتار سرگرمیوں کا آغاز کر دینا چاہیئے۔

چونکہ اس مجلس مشاورت میں پاکستان کے چوٹی کے علماء شریک تھے، بیدار مغز، دیدہ ور، ذہین و فطین علماء تھے اس لیے شاہ صاحب کے بیان کردہ حقائق کو بلا کسی تذبذب کے سب نے قبول کر لیا اور اتفاق رائے سے ایک غیر سیاسی خالص تبلیغی تنظیم "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی بنیاد ڈال دی گئی اور متفقہ طور پر حضرت شاہ صاحب کو اس قافلہ کا امیر و قائد تسلیم کر لیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ ع

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

پاکستان میں قادیانیوں کی سرگرمیاں:۔ قادیانی روز اول سے پاکستان کو اپنی سب سے بہتر چراگاہ سمجھتے رہے کیونکہ جماعتی طور پر پاکستان میں وہ خود کو سب سے زیادہ مضبوط سمجھتے تھے، پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کے قتل کے سلسلہ میں بھی بعض لوگوں کی زبانوں پر قادیانیوں کے نام آئے تھے اور یہ قرین قیاس بھی تھا کیونکہ لیاقت علی خاں پاکستان کے سب سے مخلص وزیر اعظم تھے، وہ جانتے تھے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے دلی جذبات کی تصویر بن کر وجود میں آیا ہے اس لیے اس ملک میں مسلمان اسی طرح مطمئن اور پرسکون رہے گا جیسے مچھلی پانی میں، اس کے دور عروج میں قادیانیوں کو پنپنے کے امکانات کم سے کم تر تھے اس لیے قرین قیاس یہ بات ہے کہ ان کے قتل میں قادیانیوں کا ہاتھ رہا ہو لیکن اس حقیقت سے پردہ اٹھانے والا کوئی فولادی ہاتھ نہیں تھا اس لیے یہ حقیقت خرافات میں کھو گئی۔

علماء حق کی جدوجہد کا آغاز:۔ قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں میں بیداری ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئی اور عملی جدوجہد کا آغاز مشہور قادیانی اور پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں کی برطرفی کے لیے عوامی تحریک چلائی گئی، یہ سر ناظم الدین (بنگال) کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ تھا، اس

تحریک کی پاکستانی قیادت نے مخالفت کی اور اس کو طاقت کے ذریعہ کچل دیا گیا، اگرچہ سر ناظم الدین اس تحریک کے خلاف تشدد استعمال کرنے کی سزا میں تختِ اقتدار سے رخصت کر دیئے گئے اور خدا کی بے آواز لاٹھی اپنا کام کر گئی، لیکن اس سے اندازہ ہوا کہ ابھی وہ لوگ جو پاکستان کی حکومت پر قابض ہیں کسی ایسی تحریک کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو قادیانیوں کے خلاف ہو، یا دوسرے لفظوں میں ابھی قادیانیوں کی طاقت حکومت میں اتنی مضبوط تھی کہ اہلِ اسلام اس فرقہ کے خلاف آسانی کے ساتھ کوئی جدوجہد اور کوئی تحریک نہیں چلا سکتے لیکن بیدار مغز اور حساس علماء نے ہمت نہیں ہاری اور تحریک کے لیے فضاء کو سازگار بنانے کی مہم میں لگے رہے، اندرونِ ملک و بیرونِ ملک کے مخلص مسلمانوں کو قادیانیوں کے پاکستان پر غلبہ کے سلسلہ میں بتاتے رہے اور پاکستان میں ان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ پر اپنے اندیشوں کا اظہار کر کے ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

ایک اور مجاہد جلیل:- علماء دیوبند میں علامہ انور شاہ کشمیری کو اس وقت مرکزی حیثیت حاصل تھی ان کے علم و فضل کی وجہ سے سارا ہندوستان ان کے احترام پر مجبور تھا، قادیانیت کے خلاف ان کا سینہ جذبات کی دہکتی ہوئی بھٹی بن چکا تھا وہ برسہا برس فتنہ قادیانیت کی بڑھتی ہوئی رفتار کو دیکھ کر اضطراب و بے چینی کا شکار رہے اور جب تک زندہ رہے اس فتنہ کے خلاف جہاد جاری رکھا، زندگی کے آخری دنوں میں آپ کی آخری تقریر دیوبند کی جامع مسجد میں ہوئی اس وقت حضرت العلامہ علیل چل رہے تھے، پالکی میں جامع مسجد تک لائے گئے تھے اور شاگردوں نے اٹھا کر آپ کو منبر پر بٹھایا تھا، مولانا محمد ایوب صاحب مہتمم دارالعلوم سرحد پشاوری اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے اور شاہ صاحب کے شاگرد تھے وہ فرماتے ہیں کہ میں اس جلسہ میں موجود تھا اور دورۂ حدیث کا طالب علم تھا حضرت شاہ صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"میری وصیت ہے کہ میرے تمام شاگرد فتنۂ قادیانیت کا مقابلہ کریں اور اس فتنہ کو بیخ و بُن سے اُکھیڑ دیں۔" [1]

اس تقریر کے موقعہ پر وہ مردِ مجاہد، محدّثِ وقت، عالمِ بے مثال مولانا محمد یوسف بنوری سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ کراچی قائدِ تحریک تحفظ ختم نبوت" پاکستان اس زمانے میں مشکوٰۃ کے طالب علم تھے اور تقریر میں موجود تھے، حضرت الاستاذ کی وصیت ان کے دل میں پیوست ہو کر رہ گئی اور انہوں نے اپنی زندگی میں اس فتنہ کی جڑ کاٹ کر اپنے استاذ کی وصیت کو پورا کیا اور دین و دُنیا دونوں میں سُرخ روئی حاصل کی جیسا کہ بعد کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے۔

تحریک کن مراحل سے گذری؟ :- پاکستان میں ردّ قادیانیت کی مہم کو کامیابی سے سرانجام دینے کا یہ مطلب نہیں رہ گیا تھا کہ ان کے مذہب کے باطل ہونے کا لوگوں کو صرف یقین دلا دیا جائے یا ان کو کتابوں، رسالوں اور اخباروں میں مرتد ہونے کا اعلان کر کے خاموشی اختیار کر لی جائے، ایک اسلامی حکومت میں حکومت کی سطح پر یہ منظور کرا لیا جائے کہ قادیانی مسلمان نہیں اور نہ یہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہے بلکہ اسلام سے بالکل علٰحدہ ایک مذہب ہے جس کا خدا جس کا نبی، جس کی اُمت سب مسلمانوں سے جداگانہ ہے اور حکومت پارلیمنٹ میں بل لا کر اس کو قانونی شکل دیدے کہ قادیانی پاکستان میں بسنے والی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہے اور پاکستان کی ایک غیر مسلم اقلیت ہے جس کا مسلمانوں سے الگ اپنا ایک مذہب ہے اس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ کام کچھ آسان نہیں تھا پھر ان حالات میں جبکہ پاکستان پر قادیانیوں کا پورا پورا اثر تھا اور وہ کلیدی عہدوں پر قابض تھے، دوسرے وہ لوگ جن کو قادیانیت کے زہریلے اثرات کا شدید احساس تھا وہ علماء کی جماعت تھی جو اپنے مدرسہ کے بوریوں پر بیٹھ کر صرف کتابیں پڑھانا جانتے تھے ملک کی سیاسیات سے نہ ان کا کوئی تعلق تھا اور نہ حکومت کے کسی بڑے اور ذمہ داری کے عہدوں پر فائز تھے اور نظامِ حکومت پر جو لوگ قابض تھے وہ

یورپ کی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور وہ نئی تہذیب کی خوش باشیوں کو متاعِ زندگی سمجھتے تھے یا اندرونِ ملک کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلے تھے ان کے سامنے بھی اپنی اور اپنے خاندان کی شاندار زندگی اور عیش و تنعم کی تلاش تھی، اسلام کا درد اور مسلمانوں کے ساتھ مذہبی حیثیت سے ہمدردی صرف ان کی زبانوں پر تھی، ان کے سینے اس درد و کرب سے خالی تھے جو علماء کے سینوں میں تھا، پھر علماء پاکستان کا حکومتِ پاکستان پر کوئی براہِ راست اثر بھی نہیں تھا، علامہ شبیر احمد عثمانی جو پاکستان کے شیخ الاسلام کہے جاتے تھے دستور ساز اسمبلی میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور ارکان سے تلخ و ترش باتیں سننے پر مجبور تھے ایسے حالات میں علماء اسلام کے لیے آسان نہ تھا کہ حکومت کو اس بات پر آسانی کے ساتھ آمادہ کر دیتے کہ وہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے کوئی قدم اٹھائے، حکومت کو مجبور کرنے اور اس مرحلہ تک لانے کے لیے علماء کو کیا کیا کرنا پڑا؟ اس کی ایک ہلکی سی جھلک میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ وہ کارواں جو عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے جلیل القدر علماء اور رہنماؤں کی قیادت میں سرگرمِ سفر تھا وہ کس طرح کن خارزار وادیوں سے گذر کر اپنی منزل پر پہونچا؟۔

اندرونِ مُلک بیداری پیدا کرنے کی جدّوجہد:- سب سے پہلے مرحلہ پر یہ ضروری تھا کہ پاکستان میں اس مسئلہ پر رائے عامہ کو بیدار کیا جائے اور لوگوں کو قادیانی فتنہ کی شدت اور ہلاکت آفرینی سے آگاہ کیا جائے، اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے ہمارے سامنے جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردِ رشید مولانا محمد یوسف بنوری کی ہے، انہوں نے پاکستان کے با اثر علماء اور شخصیتوں سے رابطہ پیدا کیا، رؤساء اور تجارت پیشہ اور حکومت میں اثر و رسوخ رکھنے والے افراد کو قریب کیا اور پاکستان میں قادیانیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی تباہ کاری سے باخبر کیا اور ان لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کیں، اس کام میں کئی برس صرف ہو گئے، لیکن یہ تحریک کا بنیادی پتھر تھا جب تک اندرونِ ملک بڑے پیمانے پر اس تحریک سے عام ہمدردی اور

دل کی لگن شامل نہیں ہوتی اس میں کامیابی ممکن نہیں تھی۔ جب ایک حد تک یہ مرحلہ تمام ہوگیا تو تحریک کی کامیابی کے دوسرے راستوں کی تلاش شروع کی گئی۔

بیرونِ مُلک سرگرمیاں :- چونکہ قادیانیت کا مسئلہ صرف ایک ملک اور صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ عالمِ اسلام اور عام مسلمانوں کا بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کا مسئلہ تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ تحریک کا قائد عالمِ اسلام کے اکابر علماء اور سربراہانِ حکومت اسلامیہ سے رابطہ پیدا کرے اور انھیں قادیانیت کی بڑھتی ہوئی قوت اور فتنہ کے اثرات اور تفصیلات سے آگاہ کرے اور قادیانی مذہب کے عقائد و خیالات اور نظریات اور ان کے ناپاک عقیدوں اور ان کے کافرانہ و منافقانہ عزم و ارادہ کی طرف ان کو متوجہ کرے اور اس فرقہ کی مسلم کش پالیسی کی نشاں دہی کی جاتی رہے، اس لیے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور بیرونِ پاکستان سے اگر اکابر علماء اور اہلِ علم پاکستان آئے تو مولانا بنوری یا تو ان کو خود مدعو کرتے یا آپ خود جاکر ان سے ملتے، خود مولانا بنوری بھی بین الاسلامی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اسلامی ممالک میں تشریف لے جاتے اور وہاں بیک وقت کئی ملکوں کے اہل الرائے قائدین سے ملاقات ہوجاتی اور پھر مولانا بنوری سال میں کم از کم دو بار حرمین شریفین حاضری دیتے وہاں عالمِ اسلام کا دل و دماغ سمٹ آتا ہے ان تمام موقعوں پر آپ اپنے دلی درد کو غیر مبہم الفاظ میں بیان کرتے اور اس اسلام دشمن فرقہ قادیانیت کے بارے میں دوسرے ممالک کے لوگوں کو تفصیل سے بتاتے اور ملتِ اسلامیہ کو جو اس سے مسلسل نقصان پہونچ رہا ہے اس کی تفصیل بیان فرماتے، پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ لوگ متاثر نہ ہوتے جن کے دلوں میں اسلام کا درد تھا اس طرح مولانا بنوری جو اب "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے قائد و امیر تھے مسلسل خاموش جدوجہد کرتے رہے، سوچنے والے دماغوں کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کرتے رہے۔

عالمِ اسلام کے سربراہوں کو توجہ دہانی :- سب سے اہم اور سب سے

مؤثر جو کارنامہ مولانا بنوری نے اس سلسلہ میں انجام دیا جس نے "تحریک تحفظ ختم نبوت" کو مضبوط بنیادی پتھر فراہم کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے عالم اسلام کے ارباب اقتدار، ملکوں کے سربراہ اعلیٰ، اسلامی ممالک کے سفراء سے رابطہ قائم کرتے اور انھیں قادیانی فتنہ سے باخبر کرتے، اتفاق سے جو سفیر بن کر آتے اور وقتاً فوقتاً پاکستان میں بھیجے جاتے ان میں سے اکثر و بیشتر مولانا موصوف کے شناسا بلکہ قدردان تھے، اسلامی ممالک کے وزراء و اُمراء سے بھی اچھا تعارف تھا، شاہ فیصل (سعودیہ عربیہ) تو آپ کے بہت ہی قدرشناس تھے۔ شاہ فیصل سے آپ نے متعدد بار ملاقات کی اور بالمشافہہ قادیانی فتنہ کی ریشہ دوانیوں سے آپ کو آگاہ کیا، مولانا بنوری کی شاہ فیصل سے ایک ملاقات کا ذکر مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ

> "مولانا عبدالرحیم اشرف نے مولانا بنوری کی زبانی سنا، انہوں نے بیان کیا کہ ایک بار حرمین میں حاضر ہوئے اور شاہ فیصل سے ملاقات ہوئی، شاہ نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور مولانا بنوری کی باتیں کامل التفات سے سنیں، یہ ساری گفتگو قادیانیت کے مسئلہ پر تھی، اکثر و بیشتر امور میں پُرزور تائید اور گرم جوشانہ حمایت کا وعدہ فرمایا۔"[1]

عالم اسلام کی جن عظیم شخصیتوں تک آپ نہیں پہونچ سکے ان حضرات کو خطوط لکھ کر قادیانیت کے فتنہ سے آگاہ فرمایا اور جب ضرورت محسوس ہوئی آپ نے مختلف سربراہان حکومت کو تفصیلی خطوط لکھے اور پاکستان کے اس اندرونی مسئلہ کی طرف ان کو توجہ دلائی اور اس کے حل کرنے کے لیے ان سے تعاون کی درخواست کی، بطور مثال صرف دو خطوط آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، یہ خطوط ان دنوں لکھے گئے تھے جب پاکستان کی رگ رگ میں قادیانیت کا زہر بڑی تیزی سے سرایت کرتا جا رہا تھا اور موہوم خطرات پاکستان پر منڈلانے لگے تھے، ان خطوط سے وہ درد و اضطراب

---

[1] رسالہ "بینات"، جنوری، فروری مولانا یوسف بنوری نمبر کراچی ۱۹۷۸ء

چھلکا پڑتا ہے جو مولانا بنوری کے سینہ میں موج مار رہا تھا، آپ نے سعودی عرب کے شاہ فیصل کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

"..... آج پاکستان قادیانیت کی جانب سے عظیم خطرے میں ہے بحریہ کا سربراہ حفیظ قادیانی ہے، فضائیہ کا سربراہ چودھری ظفر قادیانی ہے اور بری فوج میں ٹکا خان کے بعد ۷ اجرنیل لگاتار قادیانی ہیں حکومت یا تو اس مہیب خطرے سے غافل اور جاہل ہے یا پھر استعماری قوتوں برطانیہ اور امریکہ کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے، وہ مسلمانوں کو فوجی مناصب سے برطرف کر رہی ہے اور قادیانیوں کو بھرتی کر رہی ہے، لاریب کہ قادیانی اور ان کا امام متنبی کذاب قبحہ اللہ برطانیہ کا خود کاشتہ پودا ہے اور برطانوی استعمار کا ساختہ پرداختہ ہے، قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ "ظل اللہ فی الارض" ہے، جہاد منسوخ ہے، اور یہ کہ تمام مسلمانوں پر برطانیہ کی نصرت وحمایت فرض ہے وغیر ذالک من الکفر والہذیان، ان لوگوں کی کوشش ہے کہ کسی طرح برطانیہ کا عہدِ رفتہ واپس لوٹ آئے اور پاکستان ان قادیانیوں کے ہاتھوں میں آکر اس کا آلۂ کار بنے اور برطانیہ کو از سرِ نو بحر احمر پر تسلط حاصل ہو جائے، اس بدترین سازش کے ہولناک نتائج آں جناب سے مخفی نہیں ہیں۔

آں جناب سے توقع رکھتا ہوں کہ پاکستان کو قادیانیوں کے چنگل سے چھڑانے میں اس کی مدد کریں، صدر بھٹو کو ان ہولناک نتائج سے متنبہ فرمائیں اور اُسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں کہ وہ ان لوگوں کو کلیدی مناصب سے الگ کر دیں تاکہ یہ لوگ اسلام کے لیے اور اسلام سے پہلے خود بھٹو کے لیے خطرہ نہ بن جائیں۔

الغرض آپ اس نہایت خطرناک مصیبتِ کبریٰ سے پاکستان کو بچانے اور بھٹو کی کجروی کی اصلاح کے لیے ہر ممکن جہد بلیغ فرمائیں اور محض اللہ کی

رضا کے لیے، اللہ کی عطا فرمودہ طاقت وقوت اور وسائل کے ذریعہ آپ وہ کردار ادا کریں جو واقعی ایک خلیفہ اور امام المسلمین کی فہم وبصیرت اور قوت کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔

ہم جناب والا کے حق میں ہر خیر وسعادت کے متمنی ہیں اور آرزو رکھتے ہیں کہ آپ کے مبارک ہاتھوں کے ذریعہ اسلامی ممالک کو ان ریشہ دوانیوں اور ملعون سازشوں سے نجات ملے، اللہ تعالیٰ آں جناب کی ذات کو اسلام کے لیے ذخیرہ اور مسلمانوں کی پناہ گاہ کی حیثیت سے باقی رکھے اور ربانی سائے تلے جس کے جھنڈے آپ کے ملک پر لہراتے ہیں آپ کی سلطنت کو بقائے دوام بخشے،

آخر میں میری طرف سے آں جناب کی ذات اور مملکت کے حق میں بہترین دعائیں اور گہری تمنائیں قبول فرمائیں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا مخلص :۔ محمد یوسف بنوری مُدیر مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی
خادم الحدیث النبوی [1]

مولانا بنوری کے اس خط کے ایک ایک لفظ سے وہ درد وکرب پھوٹا پڑتا ہے جو پاکستان میں اسلام کی مظلومیت اور قادیانیت کی بالادستی کے دِل خراش تماشے کو دیکھ کر آپ کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔

کرنل قذافی کے نام ایک خط :۔ اسی درد وکرب کے ساتھ ایک اور خط آپ نے لیبیا کے صدر کرنل قذافی کے نام لکھا تھا، چوں کہ یہ خطوط تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے ان کو پورا پورا نقل کیا جا رہا ہے، مولانا بنوری کرنل قذافی کو تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

---

[1] رسالہ بیّنات جنوری و فروری ۱۹۷۸ء کراچی، مولانا محمد یوسف بنوری نمبر

برادرِ گرامی قدر!

آپ نے پاکستان کے موقف کی تائید کرکے اور ہر ممکن مادی مدد کرکے جو احسان فرمایا ہے، اس کا ہمیں اجمالی علم ہوا، حق تعالیٰ آپ کو اس حسنِ سلوک کا بدلہ عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت میں آپ پر انعامات فرمائیں، آمین۔

اور اب میں آں جناب کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک عظیم خطرہ میں گھرا ہوا ہے اور وہ ہے قادیانی فتنہ یا قادیانی تحریک، بحریہ کا قائد ایک قادیانی ہے، فضائیہ کا سربراہ قادیانی ہے اور بری فوج میں ٹکا خان کے بعد ۱۷ جرنیل ہیں جو سب کے سب قادیانی ہیں، کچھ عرصہ بعد ٹکا خان بھی ریٹائر ہو جائیں گے، حکومت مسلمان افسروں کو معزول کر رہی ہے، صدر کا اقتصادی مشیر ایم، ایم احمد قادیانی ہے اور سر ظفر اللہ خاں کے جو بڑا خبیث سازشی قادیانی ہے، صدر سے خصوصی روابط ہیں اور صدر اس کے مشوروں کی تعمیل کرتا ہے۔

غالباً آں جناب کو علم ہوگا کہ اس گروہ کا ضال و مُضل مقتدا مرزا غلام احمد قادیانی مدعی نبوت تھا، اس نے پہلے مجدد، مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور ازاں بعد نبوت کا دعویٰ کر دیا، اس کا عقیدہ تھا کہ برطانوی حکومت روئے زمین پر خدا کا سایہ ہے، جہاد منسوخ ہے اور یہ کہ برطانیہ کی نصرت و حمایت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے وغیر ذالک من الکفر والہُراء۔

قادیان کے بعد (جو ہندوستان میں رہ گیا) انہوں نے مغربی پاکستان میں "ربوہ" آباد کیا، جس کی حیثیت ان کے دارالخلافہ کی ہے وہاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑی سرگرمی سے سازشیں تیار ہوتی ہیں، اور یہ عجلت میں تحریر کردہ عریضہ ان تفصیلات کا متحمل نہیں، میں

آں جناب سے اس وقت دو گذارشیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ صدر بھٹو کو اس خطرہ عظیمہ سے آگاہ کیجئے یعنی قادیانی بغاوت، ملک کا قادیانی حکومت کے تحت آجانا، بحرِ احمر میں برطانیہ کی عزتِ رفتہ کا دوبارہ لوٹ آنا اور بیک وقت تمام عربی اسلامی ممالک کا ناک میں دم آجانا، بس آں جناب سے درخواست ہے کہ آج حکومت پاکستان کو قادیانیوں کے یا بہ لفظِ صحیح برطانیہ کے چنگل سے چھڑا کر اس پر احسان کیجئے جیسا کہ اس سے پہلے آپ اس کی اخلاقی مدد کر کے احسان کر چکے ہیں اور محض اللہ تعالیٰ کی اس کے رسول کی، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے ہر قسم کی تدبیر و حکمت، عزم و حزم کے ساتھ صدر بھٹو کی کج روی کی اصلاح کیجئے، بلاشبہ اسلام کی یہ عظیم الشان خدمت اللہ و رسول کی رضامندی کا موجب ہوگی، اسی کے ذریعہ اس رخنہ کو بند کیا جا سکتا ہے اور اس شگاف کو پُر کیا جا سکتا ہے کیونکہ فتنہ کا سیلاب خطرہ کے نشان سے اوپر گذر رہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت و مدد فرمائے۔

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا" (قرآن)

دوسری گذارش یہ ہے کہ جمہوریۂ لیبیا میں قادیانی ڈاکٹر یا انجینیر کی حیثیت سے آئے ہیں انھیں نکالیے، سنا گیا ہے کہ آپ کے ملک میں قادیانیوں کی ایک بڑی تعداد آئی ہے ان میں ایک ڈاکٹر خلیل الرحمٰن طرابلس میں ہے جو شعاؤں کے ذریعہ سرطان کے علاج کا خصوصی ماہر ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ ایسے لوگوں کا سُراغ لگایا جائے اور محض اللہ کی، اس کے رسول کی، اس کی کتاب کی، اور مسلمانوں کے قائدین کی خیر خواہی کی غرض سے آپ کو ان کی اطلاع دی جائے۔

میری دعا رہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خدمتِ اسلام اور مسلمانوں کی

مدد میں ثابت قدم رکھے، آپ کو اپنی رضا اور اپنے دین کی خدمت کی مزید توفیق عطا فرمائے، اور آپ کے ہاتھ سے خیر و سعادت کے وہ کام لے جن کے ذریعہ مشرق و مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کی عزت و حرمت میں اضافہ ہو، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کا مخلص :- محمد یوسف البنوری خادم الحدیث النبوی الکریم فی کراچی

مندوب مؤتمر الدعوۃ الاسلامیہ الدول من باکستان [1]

رابطہ عالم اسلامی کی تجویز :- پاکستان میں مولانا محمد یوسف بنوری اور ان کے ساتھ علماء حق نے اسلامی مملکتوں کے سربراہوں اور عالم اسلام کی اہم ترین شخصیتوں کو قادیانیوں کی حقیقت اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کی تفصیلات سے مطلع کرکے عالم اسلام کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی جو مہم چلائی تھی وہ بے نتیجہ نہیں رہی اور سب سے بڑی اور پہلی کامیابی قادیانیت کے خلاف اس وقت ملی جب رابطہ عالم اسلامی کانفرنس نے قادیانیت اور پاکستان کے مسئلہ پر اپنی قرارداد منظور کی، مکہ مکرمہ میں ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق اپریل ۱۹۷۴ء میں ایک بین الاسلامی عظیم الشان کانفرنس جس میں عالم اسلام کی ۱۴۴ تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی، اس کانفرنس نے قادیانیت کے بارے میں جو قرارداد منظور کی وہ عربی میں ہے اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں :-

"قادیانیت ایک نہایت خطرناک باطل مذہب ہے جو اپنی اغراض خبیثہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھتا ہے، اس کی اسلام سے مخالفت ان باتوں سے ظاہر ہے، اس کے بانی کا دعوائے نبوت کرنا، قرآنی آیات میں تحریف کرنا، جہاد کے باطل ہونے کا فتویٰ دینا،

---

[1] شاہ فیصل (سعودیہ عربیہ) اور کرنل قذافی (لیبیا) کے نام اصل خطوط عربی میں تھے ان کا اردو ترجمہ یہاں دیا گیا ہے یہ دونوں خطوط رسالہ "بینات" جنوری فروری ۱۹۷۵ء کراچی مولانا محمد یوسف بنوری نمبر سے لیے گئے ہیں۔

قادیانیت کی داغ بیل برطانوی سامراج نے ڈالی، اسی نے اس کو پروان چڑھایا، یہ سامراج کے ظلِ حمایت میں پنپتی ہے، قادیانیت نے اُمتِ اسلامیہ کے مفادات سے ہمیشہ غداری کی ہے، وہ سامراج اور صیہونیت کی حلیف رہی ہے اور انہی اسلام دشمن طاقتوں کے بل بوتے پر وہ اسلامی عقائد کو پامال کرنے اور ان میں تحریف کرنے میں سرگرم ہے اس کا طریقۂ کار حسبِ ذیل ہے:-

الف۔ اسلام دشمن طاقتوں کی مدد سے دنیا میں "مساجد" کے نام پر اڈے بنانا جن میں قادیانی کفر و ارتداد کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کیا جائے۔

ب۔ مدارس، اسکولوں اور یتیم خانوں کے نام پر اڈے بنانا جن میں اسلام دشمن طاقتوں کی منشاء کے مطابق قادیانیت کی سازشی سرگرمیوں کی تربیت دی جائے۔ [1]

ج۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآنِ کریم کے تحریف کردہ ترجمے پھیلانا۔

قادیانیت کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے کانفرنس نے طے کیا ہے کہ:-

(۱) دنیا کی تمام اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں قادیانیوں کے معابد مدارس اور یتیم خانوں اور ان تمام جگہوں میں جہاں قادیانی سرگرمیاں جاری ہیں ان پر کڑی نگرانی رکھیں، ان کی سازشوں کا محاسبہ کریں، لوگوں کو قادیانیوں کے جال سے بچانے کے لیے انھیں بے نقاب کریں اور عالم اسلام کو ان کی حقیقت سے آگاہ کریں۔

(۲) اس گروہ کے کفر اور خارج از اسلام ہونے کا اعلان کیا جائے

(۳) قادیانیوں سے کوئی لین دین نہ کیا جائے بلکہ ان سے اقتصادی، معاشرتی اجتماعی بائیکاٹ کیا جائے، ان سے شادی بیاہ نہ کیا جائے، انھیں مسلمانوں

---

[1] رسالہ "بینات" جنوری و فروری ۱۹۷۸ء کراچی ص ۳۴۰

کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا جائے اور ہر بات میں ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو کافروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۴) اسلامی حکومتوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ قادیانیوں کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر پابندی لگائیں، انھیں قانونی طور پر "غیر مسلم اقلیت" قرار دیں، اور انھیں کسی اسلامی ملک میں کوئی ذمہ دارانہ عہدہ نہ دیا جائے۔

(۵) قرآنِ کریم میں قادیانیوں کی تحریفات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے قادیانی تراجم کو ضبط کیا جائے، ان کی ترویج و اشاعت کا انسداد کیا جائے۔

مجاہدینِ اسلام میدانِ کارزار میں:- جب اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک قادیانیت کے خلاف رائے عامہ ہموار کر لی گئی تب براہِ راست قادیانیت پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا، یہ جن دنوں کا ذکر ہے ان دنوں "تحفظ ختم نبوت" تحریک کے قائد مشہور محدث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری تلمیذ رشید حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی تھے، اور ان کے دوش بدوش کئی اور علماء جو یا تو فضلاء دارالعلوم دیوبند تھے یا حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے تلامذہ تھے انہوں نے اپنے قائد کے ساتھ سر دھڑ کی بازی لگائی اور میدانِ جہاد میں اُتر پڑے۔

ایک بار ۱۹۵۳ء میں سر ظفر اللہ خاں قادیانی کو برطرف کرانے کے لیے تحریک چلائی گئی تھی، اس زمانہ میں سر ناظم لدین (بنگال) وزیر اعظم تھے، انہوں نے طاقت کے ذریعے اس تحریک کو کچل دیا، اگرچہ بعد میں دونوں کو اس تحریک کو کچلنے کی پوری پوری سزا ملی لیکن بہر حال تحریک کو انہوں نے اس وقت ناکامی سے ہم کنار کر دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی اندرونِ ملک رائے عامہ ہموار نہیں ہوئی تھی، علماء حق کی طاقت انتشار کا شکار تھی، حکومتِ پاکستان اپنے قیام کے ابتدائی مرحلے میں تھی، نظریاتی اختلافات اور ٹکراؤ، جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور علماء کے نقطۂ نگاہ میں زمین آسمان کی دوری تھی اس لیے ایک مضبوط عسکری طاقت نہ بن سکی جو اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرتی۔

لیکن اب جبکہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ذہنی و فکری اتحاد پیدا کیا جا چکا تھا قادیانیت کو عالمِ اسلام میں ننگا کر کے اس کی ساری خباثتوں کو عالم آشکارا کیا جا چکا تھا، اب اگر کوئی تحریک چلائی جاتی ہے تو اس کو ناکامی کا خطرہ مول لینا نہیں پڑے گا، اسی اعتماد و یقین کے ساتھ مولانا بنوری نے راست اقدام کا فیصلہ کیا اور اس اقدام کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں مولانا مفتی محمود صاحب شیخ الحدیث مدرسہ قاسم العلوم ملتان (فاضل دیوبند) نے کلیدی رول ادا کیا۔

جب کوئی تحریک مناسب وقت پر شروع ہوتی ہے وہ کتنی جلد کامیابی کی منزلوں تک پہونچ جاتی ہے، پاکستان میں "تحفظ ختم نبوت" یعنی قادیانیت کے زہریلے دانتوں کو توڑ دینے کی تحریک اس کی ایک روشن اور تابناک مثال ہے، اس تحریک کے عملی اقدام اور اس کو منزل تک پہونچنے میں صرف ایک سو دن لگے۔ ۲۹ مئی کو راست اقدام کا آغاز ہوتا ہے اور ۷ ستمبر کو سفینۂ ملت ساحل پر لگ جاتا ہے اور بات وہی ہے کہ کل امر مرھون باوقاتھا۔

فوج مارچ کرتی ہے:۔ مولانا بنوری "تحریک تحفظ ختم نبوت" کی مجلسِ عمل کے صدر منتخب ہوئے ابھی دو ہی ماہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے گذرے تھے کہ قادیان کے دارالخلافہ ربوہ اسٹیشن پر قادیانیوں نے جو کچھ کیا اس نے پاکستان کے سارے مسلمانوں کو ایک دم مشتعل کر دیا، ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو ربوہ کا حادثہ پیش آیا اور حالات نے جلد ہی نازک صورت اختیار کر لی، مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ ہو کر شعلہ سوالہ بن گئے، مگر حکومت پر قادیانیوں کا غلبہ تھا اس لیئے اس نے بروقت صحیح قدم نہیں اٹھایا اور ۱۹۵۳ء میں جس طرح تحریک کو طاقت کے ذریعہ کچل دیا گیا تھا، اب کی بار بھی اس نے وہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہا، لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔

حادثہ کے تیسرے دن ۲ جون ۱۹۷۴ء کو راولپنڈی میں علماء کرام اور مختلف فرقوں کے نمائندوں کا ایک اجتماع ہوا، حکومت اس کانفرنس کو ناکام بنانے کے لیئے میدان میں آگئی اور اس کے تین ممتاز مندوبین مولانا مفتی زین العابدین مولانا عبدالرحیم اشرف، مولانا

تاج محمود صاحب کو پولیس کے ذریعہ ایک ریلوے اسٹیشن پر اُتار لیا گیا اور اپنی نگرانی میں رکھ لیا۔ شرکاء اجتماع نے اس گرفتاری سے ہوا کے رُخ کو پہچانا، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اس کے ایک ہفتہ بعد ۹ مارچ ۱۹۷۴ء کو مولانا بنوری کی جانب سے ایک نمائندہ اجتماع لاہور میں بلایا گیا جس میں مسلمانوں کے تمام فرقوں اور جماعتوں کے مندوب شریک ہوئے، یہ پاکستان کی بیس جماعتوں کا نمائندہ اجتماع تھا، سب سے پہلے مولانا بنوری نے مختصر سی افتتاحی تقریر میں اجتماع کے اغراض و مقاصد اور تحریک کے لائحہ عمل پر روشنی ڈالی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

"ہمارا یہ اجتماع اس وقت صرف ایک دینی عقیدہ کی حفاظت کے لیے ہے۔ یہ اجتماع تحفظ ختم نبوت کے مسئلہ پر ہے، اس کا دائرہ آخر تک محض دین رہے گا۔ سیاسی آمیزشوں سے اس کا دامن پاک رہنا چاہیئے جو سیاسی حضرات اس میں شامل ہیں ان کا مطمح نظر دین ہی ہوگا اور حزب اقتدار و حزب اختلاف کی کشمکش سے بالاتر ہوگا، ختم نبوت کی تحریک کا طریق کار نہایت پُرامن ہوگا اور اُسے تشدد سے کوئی سروکار نہ ہوگا، اگر کوئی مزاحمت ہوئی یا تکلیف پیش آئی تو دین کے لیے اس کو برداشت کرنا ہوگا اور صبر کرنا ہوگا، مظلوم بن کر رہنا ہوگا، اور ہمارا مدِمقابل صرف مرزائی اُمت ہوگی، ہم حکومت کو ہدف بنانا نہیں چاہتے، اگر حکومت نے ان کی حفاظت یا ان کی حمایت میں کوئی غلط قدم اٹھایا تو اس وقت مجلس عمل کوئی مناسب فیصلہ کرے گی، ابھی قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں۔"[1]

خاموش احتجاج:- مولانا بنوری کی اس وضاحتی تقریر کے بعد مفتی محمود صاحب رکن دستور ساز اسمبلی اور بعض دوسرے حضرات کی تقریریں

---

[1] رسالہ "بینات" کراچی جنوری و فروری ۱۹۷۴ء ص ۳۵۹

ہوئیں اور آخر میں مجلس عمل کی جانب سے ۱۴ جون ۱۹۷۴ء کو پورے ملک میں مکمل ہڑتال کا اعلان کیا گیا اور دوسرا فیصلہ یہ کیا گیا کہ قادیانی اُمت سے مکمل مقاطعہ کیا جائے اور یہ دونوں فیصلے کرکے اجلاس برخاست ہوگیا، چونکہ اس اجلاس میں پورے ملک کی نمائندگی تھی اس لیئے ہڑتال کے اس اعلان نے صورِ اسرافیل کا کام کیا اور پورے ملک میں ایسی بے مثال ہڑتال ہوئی کہ اب تک پورے پاکستان میں ایسی کوئی ہڑتال نہیں ہوئی تھی، حکومت نے مجلس عمل کے اس ہمہ گیر اثر کا بچشم خود مشاہدہ کیا، اس کے کان کھڑے ہوئے، اس نے اس پُرجوش تحریک کو ٹھنڈا کرنے کی تدبیریں کیں اور چاہا کہ حالات پر قابو حاصل کرلیا جائے۔

تحریک کے مقصد کی وضاحت:- وزیرِ اعظم پاکستان نے مجلس عمل کے ارکان سے فرداً فرداً ملاقات شروع کرکے ان کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی، اسی سلسلہ میں وزیرِ اعظم نے مولانا یوسف بنوری سے بھی ملاقات کی جو ان دنوں مجلسِ عمل کے صدر اور قائد تھے، انہوں نے وزیرِ اعظم کے سامنے نہایت صفائی اور سادگی سے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کی، آپ نے وزیرِ اعظم سے جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ:-

"قادیانی مسئلہ بلاشبہ پاکستان کے روزِ اول سے موجود ہے، پہلی غلطی اس وقت ہوئی جب ظفر اللہ قادیانی کو وزیرِ خارجہ مقرر کیا گیا، خان لیاقت علی خان کو اس غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے قادیانیت کو اقلیت قرار دینے کا عزم کرلیا تھا لیکن افسوس کہ وہ شہید کردیئے گئے اور ہوسکتا ہے کہ ان کا یہ عزم ہی ان کی شہادت کا سبب ہوا ہو، اس وقت مرزائیوں کو جو جرأت ہوئی ہے اگر اس وقت اس کا تدارک نہیں کیا گیا اور وہ غیر مسلم اقلیت قرار نہیں دیئے گئے تو مسلمانوں کے جذبات بھڑکیں گے اور ان کی (قادیانیوں) جان اور مال کی حفاظت حکومت کے لیے مشکل ہوگی، اقلیت قرار دیئے جانے کے بعد اس ملک میں ان کی حیثیت "ذمی" کی ہوگی اور ان کے جان و مال کی

حفاظت شرعی قانون کی رُو سے مسلمانوں پر ضروری ہوگی، اس طرح ملک میں اَمن قائم ہوجائے گا۔

میں مانتا ہوں کہ آپ پر خارجی غیر اسلامی حکومتوں کا دَباؤ ہوگا لیکن اس کے بالمقابل ان اسلامی ممالک کا تقاضا بھی ہے کہ ان کو جلد از جلد غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، جن ممالک سے ہمارے اسلامی تعلقات بھی ہیں اور ہر قسم کے مفادات بھی وابستہ ہیں، خارجی دنیا میں غیر اسلامی حکومتوں کے بجائے اسلامی حکومتوں کو مطمئن اور خوش کرنا زیادہ ضروری ہے، نیز ایک معمولی سی اقلیت کو خوش کرنے کے لیے اتنی بڑی اکثریت کو غیر مطمئن کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ اگر آپ حق تعالیٰ پر توکل و اعتماد کرکے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ فرمائیں تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کا بال بیکا نہیں کرسکتی، اور اس راستہ میں موت بھی شہادت ہے۔"[1]

راستے کے نشیب و فراز:- ان ملاقاتوں اور وضاحتوں نے بھٹو کے دل و دل و دماغ کو صاف نہیں کیا اور انہوں نے سیاسی مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھا اور کوئی عملی قدم اٹھانے کے بجائے ۱۳ر جون ۱۹۷۴ء کو ریڈیو سے ایک تقریر نشر کی جس میں تازہ واقعہ ربوہ اسٹیشن پر جو کچھ ہوا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور مسلمانوں کی اشک شوئی معمولی بھی آپ نے نہیں فرمائی، البتہ آپ نے "ختمِ نبوت" کے مسئلہ پر اپنے عقیدہ کا اعلان کیا اور کہا کہ ختمِ نبوت پر میرا ایمان ہے لیکن قادیانیت کا مسئلہ نوے سال پُرانا ہے اتنی جلدی کیسے حل کیا جاسکتا ہے، پورے ملک نے اس تقریر کو سنا اور دیکھا کہ ان کے دل کے زخموں پر کوئی پھایا نہیں رکھا گیا، مجلسِ عمل کے اعلان کے مطابق ۱۴ر جون ۱۹۷۴ء کو اس تقریر کے دوسرے دن مکمل ہڑتال ہوگئی، وہ ہڑتال کیسی ہوئی؟ اخبارات بتاتے ہیں کہ درّۂ خیبر سے کراچی اور لاہور سے کوئٹہ تک ایسی مکمل ہڑتال

---

[1] رسالہ "بینات" کراچی جنوری و فروری ۱۹۷۵ء ص ۳۵۷

ہوئی کہ پاکستان کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔

پھر صورِ بیداری پھونکا جائے :۔ ۱۴ جون کی ہڑتال نے علماء حق کو حوصلہ اور ہمت عطا کی، تیسرے دن ۱۶ جون ۱۹۷۴ء کو مجلسِ عمل کا اجلاس لائل پور میں ہوا جس میں وزیرِ اعظم کی ۱۳ جون والی تقریر پر خصوصیت سے غور کیا گیا اور طے کیا گیا کہ عوامی بیداری کی لہر کو تیز سے تیز تر کرنا ضروری ہے، مولانا بنوری نے محسوس کیا کہ عوام تک جا کر مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کو براہ راست ان کے ذہن نشین کرایا جائے اس لیے آپ نے ایک طوفانی دورہ کا پروگرام بنایا اور کراچی سے پشاور تک کا سفر کیا ہر بڑے شہر اور قصبوں میں آپ نے تقریریں کیں اور لوگوں کو اس عظیم مقصد کے حاصل کرنے میں عملی حصہ لینے پر آمادہ کیا، حکومت بھی خاموش تماشائی نہیں رہی، اس نے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور تحریک میں حصہ لینے والوں پر سختیاں کی جانے لگیں، مولانا بنوری نے صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ :۔

> "ادھر مجلسِ عمل کی پالیسی تو یہ تھی کہ حکومت سے تصادم کرنے سے بہر صورت گریز کیا جائے، ادھر حکومت نے ملک کے چپہ چپہ میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی، پریس پر پابندی عائد کر دی، پولیس اور انتظامیہ نے اشتعال انگیز کارروائیوں سے کام لیا اور مسلمانوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا، چنانچہ سیکڑوں علماء اور طلباء کو گرفتار کیا گیا، بعد میں گرفتاریوں کا سلسلہ اور بڑھتا گیا، جیلوں میں گرفتارانِ تحریکِ ختمِ نبوت کو نہایت بے دردی سے اذیتیں دی گئیں، پولیس اور جیل کے عملہ کے ہاتھوں انسانیت کی مٹی پلید کی گئی، قادیانیوں نے پہلے سے اسلحہ جمع کر رکھا تھا، انہوں نے حربی کافروں کی طرح جگہ جگہ مورچے لگائے اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کیا گیا، حکومت اور پولیس قادیانیوں کی حفاظت و حمایت کر رہی تھی، مسلمانوں کو ناروا ایذائیں دی گئیں، کبیر والا، اوکاڑہ، سرگودھا

لائل پور، کھاریاں وغیرہ میں دردناک واقعات رونما ہوئے جن کو مظلومانہ صبر کے ساتھ برداشت کیا گیا، صرف ایک شہر اوکاڑہ میں مظالم کے خلاف احتجاج کے طور پر بارہ دن مکمل ہڑتال ہوئی، اسی سے اندازہ کیجئے کہ ملک بھر میں مجموعی طور پر کتنا ظلم اور اس کے خلاف کتنا احتجاج ہوا؟ جگہ جگہ لاٹھی چارج کیا گیا کہیں کہیں اشک ریز گیس کا استعمال بڑی فراخ دلی سے کیا گیا، مجلس عمل کی تلقین سارے مسلمانوں کو یہی تھی کہ صبر کریں اور مظلوم بن کر حق تعالیٰ کی رحمت اور غیبی تائید الٰہی کے منتظر رہیں، تقریباً تین مہینے تک مسلسل ان حالات کا مقابلہ کیا گیا اور تمام سختیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔" [1]

ایک قدم اور آگے بڑھا:۔ پورے ملک میں تحریک کے حمایتیوں پر زندگی تنگ کی جاتی رہی، لیکن مسلمانوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، اور نہ ان میں ناکامی کی افسردگی و اضمحلال پیدا ہوا، ہر جگہ مظاہرہ، جلوس اور جلسوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر بھٹو تھے، وہ انانیت کے شکار تھے اور پوری رعونت سے اس تحریک کو کچلنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے، لیکن حالات ان کے خلاف جا رہے تھے، ان کا اقتدار خود خطرے میں پڑتا جا رہا تھا، ملک میں پھیلے ہوئے بے پناہ جوش و خروش نے ان کی تنی ہوئی گردن کو جھکنے پر مجبور کیا اور جون کے آخر میں بنگلہ دیش کے دورے پر جاتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ قادیانی مسئلہ کا حل کرنے کے لیے قومی اسمبلی کو ایک تحقیقاتی کمیٹی کی حیثیت دے دی جائے گی، بنگلہ دیش کے دورے سے واپس آئے تو یکم جولائی کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا اور اس میں قومی اسمبلی کو خصوصی کمیٹی قرار دینے کا فیصلہ ہوا، اور یہ بھی طے ہوا کہ کمیٹی کے لیے چالیس کا کورم ہوگا جن میں تیس ارکان حزب اقتدار

---

[1] رسالہ "بینات" کراچی جنوری و فروری ۱۹۷۸ء ص ۳۵۸

کے اور دس حزبِ اختلاف کے ہوں گے، اس خصوصی کمیٹی کے سامنے دو قرار دادیں بحث وتمحیص کے لیے پیش کی گئیں، ایک حزبِ اقتدار کی جانب سے وزیر قانون مسٹر حفیظ پیرزادہ نے پیش کی اور دوسری حزبِ اختلاف کی طرف سے پیش کی گئی۔

قرارداد کا متن:۔ مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت کے پارلیمانی رہ نماؤں نے مندرجہ ذیل خط اپنے دستخطوں سے اسپیکر کو لکھا اور اصرار کیا کہ قومی اسمبلی میں اُسے منظور کرایا جائے مسودۂ قانون کا متن درج ذیل ہے:۔

جناب اسپیکر صاحب قومی اسمبلی پاکستان!

جناب مکرم! ہم درج ذیل تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں، ہرگاہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا۔

اور یہ کہ جھوٹ پر مبنی اس کا دعوائے نبوت، قرآن کریم کی بے شمار آیات کو (نعوذ باللہ) جھوٹا ثابت کرنے کی کوششیں اور ترکِ جہاد کی تلقین، اسلام کے اہم اور بنیادی ارکان سے اس کی کھلی غداری کے مترادف ہے۔

اور یہ کہ تمام اُمتِ مسلمہ کا اس امر میں اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار خواہ اس کی نبوت پر یقین رکھتے ہوں یا اُسے کسی بھی شکل میں ایک مصلح، یا مذہبی رہ نما مانتے ہوں، دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

اور یہ کہ مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں ۷ سے ۱۰ اپریل تک رابطہ عالم اسلامی کے تحت منعقدہ دنیائے اسلام کی مختلف تنظیموں کے اجلاس نے (جس میں دنیا کے ہر حصہ سے ۱۴۰ مسلمان تنظیموں اور اداروں نے شرکت کی) متفقہ طور پر تسلیم کیا کہ قادیانیت اسلام اور دنیائے اسلام کے خلاف یکسر تخریبی تحریک ہے جو کذب بیانی اور فریب دہی سے اپنے آپ کو اسلام ہی کا ایک فرقہ ظاہر کرتی ہے۔

لہٰذا یہ اسمبلی اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیرو کار خواہ

وہ کوئی سا نام رکھتے ہوں مسلمان نہیں اور یہ کہ نیشنل اسمبلی میں سرکاری طور پر ایک بل پیش کیا جائے جس سے آئین میں مناسب ترمیم ہو، انہیں اس ترمیم کی رُو سے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بطور غیر مسلم اقلیت اپنے حقوق و مفادات کا تحفظ حاصل ہو۔"

دستخط کنندگان میں مولانا مفتی محمود صاحب کے علاوہ ۳۶ ارکان قومی اسمبلی کے اسمار گرامی شامل ہیں۔[1]

وزیر قانون کا مسودہ قانون :- مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے پارلیمانی نمائندوں نے اپنی تحریک اسپیکر کے سامنے پیش کر دی، اسپیکر اسے اسمبلی میں پیش کرنے کی اگر اجازت نہ دے یہ اس کو اختیار ہے لیکن اس تحریر پر ۳۷ ارکان اسمبلی کے دستخط تھے اس کو نظر انداز کرنا اسپیکر کے لیے کچھ آسان نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود ٹال مٹول اور پیچیدگی پیدا کرنے کی کوشش ہوتی رہی اور گفتگو مختلف مرحلوں سے گذرتے ہوئے اس منزل پر پہونچی کہ حکومت پاکستان کے وزیر قانون مسٹر حفیظ پیرزادہ نے ایک بل کا مسودہ مرتب کیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کے کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی متفقہ طور پر طے کرتی ہے کہ حسب ذیل سفارشات قومی اسمبلی کو غور و فکر اور منظوری کے لیے بھیجی جائیں۔

سفارشات

کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی اپنی رہنما کمیٹی اور ذیلی کمیٹی کی طرف سے اس کے سامنے پیش کردہ قومی اسمبلی کی طرف سے اس کو بھیجی گئی قراردادوں پر غور کرنے اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے اور گواہوں بشمول سربراہان انجمن احمدیہ ربوہ اور انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کی شہادتوں اور جرح پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور پر قومی اسمبلی کو حسب ذیل سفارشات پیش کرتی ہے

---

[1] رسالہ "بینات" کراچی جنوری فروری ۱۹۷۴ء ص ۳۵۹

الف۔ کہ پاکستان کے آئین میں حسب ذیل ترمیم کی جائے۔

اول۔ دفعہ ۱۰۶ (۳) میں قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) کا ذکر کیا جائے۔

دوم۔ دفعہ ۲۶۰ میں ایک نئی شق کے ذریعہ غیر مسلم کی تعریف کی جائے مذکورہ بالا سفارشات کے نفاذ کے لیے خصوصی کمیٹی کی طرف سے متفقہ طور پر منظور شدہ مسودہ قانون منسلک ہے۔

ب۔ کہ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں حسب ذیل تشریح کی جائے۔

تشریح۔ کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۶۰ کی شق (۳) کی تصریحات کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے تصور کے خلاف عقیدہ رکھے یا عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہٰذا کے تحت مستوجب سزا ہوگا

ج۔ کہ متعلقہ قوانین مثلاً قومی رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد ۱۹۷۴ء میں منتخبہ قانونی اور ضابطہ کی ترمیمات کی جائیں۔

د۔ کہ پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں کے جان و مال، آزادی، عزت اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا۔

ہنگامہ خیز لمحات:۔ قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے قادیانی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لیے دو مہینے میں ۲۸ اجلاس کیے اور ۹۶ گھنٹے نشستیں کیں، مسلمانوں کی طرف سے "ملتِ اسلامیہ کا موقف" نامی کتاب اسمبلی میں پیش کی گئی، قادیانیوں کی طرف سے ربوائی اور لاہوری پارٹیوں کے سربراہوں نے اپنے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے اپنے اپنے کتابچے پیش کیے

لہ رسالہ "بینات" کراچی جنوری و فروری ۱۹۷۴ء ص ۳۵۹

ربوہ جماعت کے سربراہ مرزا ناصر احمد پر گیارہ دن تک ۴۲ گھنٹے اور لاہوری جماعت کے امیر مسٹر صدرالدین پر سات گھنٹے جرح ہوئی، وزیراعظم بھٹو قادیانیوں کے حلیف رہ چکے تھے، وہ انھیں غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے پر رضامند نہیں تھے، وہ قادیانیوں کو کسی نہ کسی طرح آئین کی تلوار کی زد سے بچانا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ اپنی طاقت و ذہانت کا سارا سرمایہ صرف کر دینا چاہتے تھے، چنانچہ حزب اختلاف کے ارکان سے جو مجلس عمل کے نمائندے تھے وزیراعظم کی بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور کئی بار صورت حال انتہائی نازک ہوگئی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سفینہ ساحل پر پہونچ کر بھی بھٹو کی ضد سے غرق آب ہو جائے گا، آخری دن تو گویا ہنگامہ محشر تھا، اُمید و بیم کی کیفیت اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ وزیراعظم کی "اَنا" نے تصادم کے خطرے کو یقینی بنا دیا تھا، بلکہ حکومت کی جانب سے پولیس اور انٹلی جنس کو چوکنا کر دیا گیا تھا، بڑے بڑے شہروں میں فوج لگا دی گئی تھی، جو لوگ گرفتار تھے وہ تو تھے ہی، ان کے علاوہ ہزاروں علماء اور سربرآوردہ افراد کی گرفتاری کی فہرستیں تیار ہو چکی تھیں، ادھر مجلس عمل کے نمائندے بھی کفن بردوش میدان عمل میں ڈٹے رہے۔

مولانا مفتی محمود صاحب قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے ان چند مخصوص رہ نماؤں میں سے تھے جو اس تحریک کی گاڑی کو پٹرول کے بجائے اپنا خون جگر دے کر چلا رہے تھے، مفتی صاحب ہی مجلس عمل کے نمائندے کی حیثیت سے وزیراعظم سے مذاکرات کر رہے تھے۔

مذاکرات کی بار بار شستوں سے تنگ آکر ایک دن انہوں نے وزیراعظم سے فرمایا آپ ہمیں بتائیے کہ ہم کیا کریں؟ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کی رائے میں کوئی لچک نہیں آتی اور مجلس عمل والوں کے پاس جاتے ہیں تو وہ اپنے مطالبہ سے کم پر راضی ہونے کے لیے تیار نہیں، وزیراعظم بھٹو کے دماغ پر اقتدار کا نشہ چڑھا ہوا تھا انہوں نے بڑے ہی مغرورانہ انداز میں کہا کہ:۔

"میں مجلس عمل کو کچھ نہیں سمجھتا ہوں، ان کی کیا حقیقت ہے؟ میں تو آپ

لوگوں کو جانتا ہوں، آپ اسمبلی کے معزز ممبر ہیں، میں ان لوگوں کی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔"

مفتی محمود صاحب کی حمیّتِ دینی اور غیرتِ ایمانی بھڑک اٹھی اور اس نے مغرور وزیرِ اعظم سے صاف صاف دو ٹوک اور کھری کھری بات کہنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے مسٹر بھٹو وزیرِ اعظم سے تیکھے تیور سے کہا کہ:۔

"بھٹو صاحب! آپ کو قوم کے صرف ایک حلقہ نے منتخب کر کے بھیجا ہے اس لیے آپ تو اسمبلی کے ایک معزز رکن ہو گئے، میں بھی ایک حلقہ انتخاب سے چن کر آیا ہوں اور ان کا نمائندہ ہوں، اس لیے میں بھی اسمبلی کا رکن کہلاتا ہوں مگر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ "مجلسِ عمل" کسی ایک حلقہ انتخاب کی نمائندہ نہیں بلکہ وہ اس وقت پاکستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے کیسی عجیب منطق ہے کہ آپ ایک حلقہ کے نمائندہ کو عزت و احترام کا مقام دیتے ہیں مگر قوم کے سات کروڑ افراد کی نمائندہ مجلسِ عمل کو آپ پائے حقارت سے ٹھکرا رہے ہیں؟ بہتر ہے،

میں ان سے جا کر کہہ دیتا ہوں کہ وزیرِ اعظم پاکستان سات کروڑ مسلمانوں کی بات سننے کو تیار نہیں۔"[1]

مفتی صاحب موصوف کا یہ تیور اور اندازِ گفتگو دیکھ کر بھٹو وزیرِ اعظم پاکستان کی "انا" سرنگوں ہو گئی، اقتدار کے نشہ کا پارہ نیچے گر گیا اور انہوں نے مجلسِ عمل کے مجوزہ مسودہ پر دستخط کر دیئے، اس طرح ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو چار بج کر ۵ منٹ پر قادیانیوں کی دونوں شاخوں کو "غیر مسلم اقلیت" قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا گیا اور آئینی طور پر قادیانی ناسور کو جسمِ اسلام سے الگ کر دیا گیا، اسمبلی میں مندرجہ ذیل بل پیش ہو کر منظور ہوا، وزیرِ قانون مسٹر حفیظ پیرزادہ نے جو سفارشات پیش کی تھیں ان کی اساس پر

---

[1] رسالہ "بینات" کراچی جنوری و فروری ۱۹۷۵ء ص ۳۶۰

ذیل کا بل قومی اسمبلی میں پیش ہوکر منظور کیا گیا:۔

"ہرگاہ یہ قرینِ مصلحت ہے کہ بعدازیں درج اغراض کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم کی جائے لہٰذا بذریعہ ہٰذا حسبِ ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے:۔

۱۔ مختصر عنوان اور اغاز نفاذ

(۱) یہ ایکٹ آئین (ترمیم دوم) ایکٹ ۱۹۷۴ء کہلائے گا۔
(۲) یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

۲۔ آئین کی دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں جسے بعدازیں آئین کہا جائے گا، دفعہ ۱۰۶ کی شق (۳) میں لفظ "فرقوں" کے بعد الفاظ اور قوسین۔ اور قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) درج کیے جائیں گے۔

۳۔ آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں ترمیم

آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں شق (۲) کے بعد حسبِ ذیل نئی شق درج کی جائیگی یعنی (۳) جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو آخری نبی ہیں، کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا، یا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی مفہوم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے وہ آئین و قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہے۔"

بیان اغراض و وجوہ

جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارش کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے اس بل کا مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر وہ شخص جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین

ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے اُسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔

(عبدالحفیظ پیرزادہ، وزیر قانون پاکستان[1])

ایک صدی کی داستان:۔ قادیانیت کی عمر پوری سو سال ہوگئی اور وہ جسم اسلام کا ناسور بنی رہی، قادیانی اپنے کو مسلمان کہتے تھے، اپنا مذہب اسلام، قرآن کو اپنی کتاب، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کا اعلان کرتے تھے، اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کہتے تھے اور مسلمانوں میں اس طرح گھل مل کر رہتے کہ امتیاز کرنا مشکل تھا، ان کے نام بھی مسلمانوں جیسے تھے اس بہروپیے پن نے اسلام کو جتنا نقصان پہونچایا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اگر وہ اپنے پیدائش کے دن سے اسلام دشمن اور ایک الگ اور مستقل مذہب بن کر رہا ہوتا تو مسلمانوں کے لیے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی، قادیانیت قصر اسلام کے در و دیوار کو دیمک بن کر چاٹتی رہی، پہلے دور میں جتنے لوگ اس کافرانہ مذہب میں داخل ہوئے وہ سب کے سب خاندانی اعتبار سے مسلمان تھے، کسی غیر مسلم کو کبھی انہوں نے قادیانی نہیں بنایا، علماء کے لیے یہی صورت حال ناقابل برداشت رہی، اسی لیے انہوں نے اس کے یوم ولادت سے لے کر جو مخالفت شروع کی وہ ایک صدی تک دراز ہوگئی اور ۱۹۳۴ء میں پہلی بار مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست کی عدلیہ نے اس کو قانونی طور پر غیر مسلم قرار دیا لیکن وہ پورے ملک کیلئے نظیر نہیں بن سکی ۱۹۷۴ء میں علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے چند جلیل القدر تلامذہ نے اس کو غیر مسلم فرقہ و مذہب قرار دیئے جانے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائی اور مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت سے قادیانیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دلوا کر ان کو ہمیشہ کیلئے دائرۂ اسلام سے خارج کرایا، اب انکے پاسپورٹ پر نہ مسلمان لکھا جائیگا اور نہ دوسروں کو خود کو مسلمان بتا کر دھوکہ دے سکینگے، اب ہم یہ فرض کرلینگے کہ جیسے دنیا میں سیکڑوں کافرانہ مذہب ہیں قادیانیت بھی انہیں مذہبوں میں سے ایک مذہب ہے، مسلمان روز روز کی دردسری سے محفوظ ہوگیا۔

---

[1] رسالہ "بینات" کراچی جنوری و فروری ۱۹۷۵ء مولانا محمد یوسف بنوری نمبر ص ۳۴۴

باب ۱۰

شیعیّت ایک فتنۂ عظیم بن گئی

شیعیت ایک فتنۂ عظیم بن گئی

سلطنتِ مغلیہ پر ہمیشہ اہلِ سنت والجماعت کا قبضہ رہا، بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ہندوستان کی مرکزی حکومت پر کبھی شیعوں کا قبضہ نہیں رہا، نہ کوئی شیعہ وارثِ تخت وتاج بنا، لیکن جہاں گیر کے زمانے سے ایران سے آنے والے شیعوں کو نور جہاں کی بدولت مغلیہ حکومت میں کلیدی عہدے ملنے شروع ہوگئے اور وہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں حاکمانہ جاہ واقتدار کے ساتھ دادِ حکمرانی دینے لگے تھے، اکثر مقامات پر وہ زمیندار اور جاگیردار بنا دیئے گئے اور کہیں کہیں ان کی نوابیاں بھی قائم ہونی شروع ہوگئی تھیں، بہت سی ریاستوں میں وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے حتیٰ کہ دہلی حکومت اپنے آخری دور میں شیعہ گردی اور ان کی سازشوں کی آماج گاہ بن گئی اور اس کے نتیجہ میں حکومت بتدریج مائل بہ زوال ہوگئی، اس طرح دہلی سے مسلمانوں کا اقتدار ختم کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ دہلی حکومت پر شیعوں کا غلبہ ہی ثابت ہوا،

انگریزوں سے سازباز:- ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ہی سے شیعوں نے انگریزوں سے سازباز کرلی تھی، تاریخ کے پاس اس کے بہت واضح ثبوت، نظیریں، مثالیں اور حقائق ہیں اور ناقابلِ تردید دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ کئی مستحکم اور مضبوط ترین مسلم حکومتیں انگریزوں کے قبضہ میں شیعوں کی انگریزوں سے سازش کی وجہ سے چلی گئیں اور انہوں نے اپنے آقا، اپنے وطن اور اپنی قومی حکومت سے غداری کی، سلطنتِ خداداد میسور جو ہندوستان میں ایک طاقتور اور مستحکم حکومت تھی، اس کے

پاس ایک طاقتور فوج تھی، اس کے کارخانوں میں یوروپ سے بہتر اور اس سے معیاری بندوقیں تیار ہوتی تھیں، حیدر علی اور سلطان ٹیپو فرماں روایانِ میسور نے تین لڑائیوں میں انگریزوں کو ذلت آمیز شکستیں دی تھیں حتیٰ کہ ایک بار مدراس کے ساحل تک وہ انگریزوں کو کھدیڑ چکے تھے اور سمندروں میں کھڑے انگریزوں کے جہازوں پر بمباری کر چکے تھے، یورپ کے کئی مایۂ ناز فوجی کمانڈروں کو میدانِ جنگ میں شکست دے کر قید کیا جا چکا تھا اور ان کو ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، انگریزوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ سلطان ٹیپو کو میدانِ جنگ میں شکست دے دیں، لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، انگریزوں کو یقین تھا کہ اگر ہندوستان کی سرزمین میں سلطان ٹیپو کو شکست دے دی گئی تو پورے ہندوستان پر قبضہ آسان ہو جائے گا، لیکن ہزاروں تدبیروں کے باوجود جب اس کو میدانِ جنگ میں شکست نہ دی جا سکی تو ان کی نگاہ ان لوگوں پر گئی جو سلطان ٹیپو کی حکومت میں کلیدی عہدوں پر قابض تھے، ان میں میر صادق کا نام سرفہرست ہے، جو سلطان ٹیپو کا وزیرِ اعظم بھی تھا اور وزیرِ جنگ بھی، انگریزوں نے پہلے اس کے ایمان اور ضمیر کا سودا کیا اور اس کو سلطان ٹیپو سے غداری پر آمادہ کیا، دوسرے فوجی سپہ سالاروں میں میر غلام علی لنگڑا، میر قمر الدین، میر معین الدین، میر قاسم علی جو سب کے سب شیعہ تھے، ہر ایک کو سلطان ٹیپو سے غداری پر آمادہ کر لیا گیا، خفیہ طور پر انگریزوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں صلاح و مشورے ہوئے، انگریزوں کو نقشۂ جنگ، وقت اور حملہ کی جگہ انھیں غداروں نے بتائیں، چنانچہ اسی کے مطابق انگریزوں نے قلعہ سرنگاپٹم پر اس رُخ سے حملہ کیا جو قلعہ کا سب سے کمزور حصہ تھا، جس کو ایک شب قبل ان غداروں نے انگریز افسران کو بلا کر دکھایا تھا، چنانچہ سازش کے مطابق حملہ ہوا، سلطان نے مذکورہ بالا سپہ سالاروں کو انگریزوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے مختلف منزلوں پر تعینات کر رکھا تھا لیکن انگریز فوجوں کی راہ میں کہیں کوئی مزاحمت نہیں ہوتی ہے بلکہ ان غداروں نے انگریزی فوج کا خیر مقدم کیا اور وہ سیدھی دار الحکومت تک پہونچ آئیں اور قلعہ سے تھوڑی دُور ایک باغ میں مقیم ہو گئیں اور سلطان کو اس کی خبر تک نہیں دی، اور جب انگریزوں کی طرف سے

قلعہ پر گولہ باری شروع ہوئی تو سلطان کو پتہ چلا کہ دشمن سر پر آچکا ہے، سازش کے مطابق حملہ ہوتے ہی فوج کو تقسیم تنخواہ کے بہانے مورچہ سے ہٹا دیا گیا، اتنی کھلی غداری کے بعد سلطان ٹیپو اپنی حکومت کو کیونکر بچا سکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہوا اور تمام غدار انعام واکرام کے مستحق قرار دیئے گئے، مگر عوام پر اس کا ردِ عمل اتنا شدید ہوا کہ کئی سو برس گذر جانے کے بعد آج بھی جو سیاح میر صادق کی قبر سے گذرتا ہے تو وہاں ٹوٹے ہوئے جوتوں کا انبار دیکھتا ہے کیونکہ اسی زمانہ سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ جب کوئی مسلمان اس کی قبر سے گذرتا ہے تو اس کو جوتوں سے پیٹتا ہے، یہ اہانت، یہ تحقیر آمیز سلوک اس کی غداری کی سزا ہے[1]

میر جعفر کا کارنامہ:- شیعوں کا دوسرا تاریخی کارنامہ میر جعفر نے بنگال میں انجام دیا، بنگال میں علی وردی خاں اور سراج الدولہ کی حکومت کو چاٹ جانے والا اور انگریزوں کے ہاتھوں فروخت کرنے والا میر جعفر تھا جس نے سپہ سالارِ جنگ ہو کر سراج الدولہ کی فوجوں کی توپوں میں بھوسے بھروائے تھے اور سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو انگریزوں کے چند ہزار سپاہیوں نے چند گھنٹوں میں شکستِ فاش دے دی اور اس طرح میر جعفر نے پورے بنگال پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا، یہ تو تاریخ کے دو ناقابلِ فراموش شیعی کردار ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر اقبال کا شعر ضرب المثل بن چکا ہے ؎

ننگِ ایماں، ننگِ دیں، ننگِ وطن — جعفر از بنگال و صادق از دکن

سلطنتِ مغلیہ کے زوال میں شیعوں کا ہاتھ:- مغلیہ سلطنت اپنے آخری دور میں ساداتِ بارہہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی، یہ سب کے سب بلا استثنا شیعہ تھے، آئے دن انکی غداریاں اور خود غرضیاں سلطنتِ مغلیہ کو روز بہ روز کمزور کرتی جارہی تھیں، یہ اس زمانہ

---

[1] یہ ساری تفصیل "تاریخ سلطنتِ خداداد میسور" مصنفہ محمود بنگلوری سے لی گئی جو مستند ترین دستاویزی ثبوتوں اور شہادتوں کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اور آج تک اس کے اندراجات کی کوئی تردید نہیں کی جاسکی ہے۔

میں کنگ میکر (بادشاہ گر) کہے جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا عہدِ شباب تھا جب سلطنتِ مغلیہ کا وزیر حسین علی خاں شیعی تھا، اس نے محض اپنے اقتدار کے لیے مسلمانوں کے بدترین دشمن مرہٹوں کو اپنے ساتھ لاکر دہلی پر حملہ کرادیا تھا اور فرخ سیر بادشاہ کو قتل کرایا تھا اور خود بغاوت کی راہیں ہموار کر رہا تھا تاکہ حکومت دہلی پر قبضہ کرسکے، اسی زمانہ میں نجف علی خاں شیعی بھی وزیر تھا، اس نے انگریزوں سے ساز باز کرکے شاہ عالم کو بہار میں شکست دلائی تھی جس کی وجہ سے آسام بنگال، بہار اور الہ آباد تک یعنی ہندوستان کا نصف حصہ نجف علی خاں کی غداری کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

علماءِ حق پر شیعوں کے مظالم:۔ شیعوں کی غداریوں اور مفاد پرستیوں اور مسلم اقتدار کو ہندوستان سے فنا کرنے کی شیعی سازشوں کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اس لیے انہوں نے مجبور ہوکر ان شیعوں کی مکاریوں پر اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" لکھنی پڑی اور شیعوں سے مقاطعہ کا اعلان کیا۔

یہ حضرات حکومت کے دست و بازو تو تھے نہیں کہ طاقت کے بل بوتے پر شیعوں کو قرار واقعی سزا دیتے، وہ اہلِ علم تھے، انہوں نے کتابیں لکھ کر اپنا فریضہ ادا کیا لیکن دہلی حکومت پر شیعوں کا پنجہ اتنی مضبوطی سے گڑا ہوا تھا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پورے خاندان کو اس کی سزا بھگتنے پر مجبور ہونا پڑا۔

شیعی وزراء اور روافض کا حکومت پر غلبہ تھا، نجف علی خاں کا دہلی پر مکمل تسلط تھا، اس نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے پہونچے اُتروا کر ہاتھ بے کار کردیئے تاکہ وہ کوئی کتاب اور مضمون نہ لکھ سکیں، میرزا مظہر جان جاناں کو شہید کرادیا، شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی کو اپنی قلمرو دہلی سے شہر بدر کروادیا۔ [1]

---

[1] "علماء ہند کا شاندار ماضی" مولفہ مولانا سید محمد میاں دیوبندی ج دوم ص ۱۰۵

یہ دونوں حضرات مع مستورات شاہدرہ تک پیدل آئے، اس کے بعد مستورات کے لیے تو سواری کا کسی طرح بندوبست ہوگیا وہ پھلت ضلع مظفرنگر چلی گئیں لیکن شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سواری بھی نہیں ملی، شاہ رفیع الدین تو دہلی سے لکھنؤ پیدل گئے اور شاہ عبدالعزیز پیدل جون پور چلے گئے کیونکہ نجف علی خاں کی طرف سے دونوں کو سوار نہ ہونے کا حکم تھا اور نہ ساتھ رہنے کا، اس لیے پیادہ پا چلنا بھی پڑا اور علٰحدگی بھی اختیار کرنی پڑی۔

دو دفعہ رافضیوں نے شاہ عبدالعزیز کو زہر دیا تھا، اور ایک مرتبہ چھپکلی کا انڈا ملا دیا تھا جس سے شاہ صاحب کو برص اور جذام ہوگیا تھا اور جون پور کے سفر میں لُو بھی لگ گئی تھی جس سے مزاج میں حدّت پیدا ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی اور ہمیشہ بے چین رہے۔[1]

یہ تھا دہلی حکومت پر شیعوں کے اقتدار اور جبر و استبداد کا عالم، جو علمی خاندان اپنے علم و فضل کے لیے علمی دنیا میں ایک عظیم الشان مقام و مرتبہ رکھتا تھا روافض کی قہرمانیت کا شکار ہو جاتا ہے اور پورا خاندان سفاکانہ طور پر تتر بتر کر دیا جاتا ہے، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُودھ کی شیعی حکومت جس کے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے اور اور کئی صدی سے حکومت کرتے چلے آرہے تھے، وہاں اہلِ حق کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہوگا؟ میں اس کی صرف ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اُودھ کی شیعی حکومت:- امجد علی شاہ (۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ تا ۱۲۶۳ھ) غالی شیعہ تھے، ان کے زمانہ حکومت میں شیعیت کا فروغ اس درجہ ہوا کہ اہلِ سنت والجماعت کا شمار ہنود میں ہوتا تھا، ان کا ہر کام مجتہد العصر سید حسن بن سید دلدار علی کے مشورہ سے ہوتا تھا اور خود مجتہد صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ سنیوں کے عروج کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ جو جاگیریں

---

[1] ارواحِ ثلاثہ ص ۲۴۔ [2] علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۱۷۱

اور شاہی وظائف سُنّیوں کو دیئے جاتے وہ سب ضبط کر کے شیعوں کی طرف منتقل کر دیئے گئے، انھیں کے مشورے سے پوری حکومت میں اعلان کر دیا گیا کہ کسی بھی سرکاری دفتر میں کوئی ہندو یا سُنّی مسلمان اسماء مبارکہ خالق کائنات، پنجتن پاک وائمہ اطہار اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا، اس کام کے لیے ہر دفتر میں شیعوں کی تقرری کی گئی، اگر کوئی ہندو یا سُنّی سرکاری کاغذ مرتب کر رہا ہے اس میں یہ نام جتنی بار آئے وہ ہر بار کسی شیعہ سے اس نام کو لکھوا کر آگے کی تحریر لکھتا تھا، اس جبر و تشدد کی وجہ سے جو سرکاری ملازم ہندو یا سُنّی تھے وہ سب کے سب شیعہ ہو گئے، یہ قانون بہت دنوں تک جاری تھا کہ اتفاقاً ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ یہ قانون منسوخ کرنا پڑا، تاریخ اُودھ کے مصنف ہمیں یہ واقعہ سُناتے ہیں؛ وہ بتاتے ہیں کہ :-

"اتفاقاً ایک دن آدھی رات کے وقت پرچہ اخبار سے خبر آئی کہ راجہ ہردت سنگھ تعلقدار بونڈی مقید نظامت بھرائچ فرار ہو گیا، امجد علی شاہ نے بہ لحاظ قرب بود و باش راجہ بال کرشن بہادر سے طلب کیا اور شقہ لکھنے کا حکم دیا، مہاراجہ مذکور تعمیل ارشاد میں مصروف ہوئے اور کئی بار اسماء خدا و رسول حسب عرض مہاراجہ صاحب بہادر امجد علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے، جب ہر شقہ میں یہی نوبت آئی تو اسی وقت اس حکم سابق کو منسوخ فرمایا اور ہر کچہری اور دفتر میں علی الصباح احکام روانہ ہوئے اور مومنین نوبھرتی (شیعوں) کا رزق جاتا رہا۔ [1]

واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں :- اُودھ کے مشہور عالم بادشاہ واجد علی شاہ جن کا دورِ حکومت ۱۸۴۷ء سے تا انتزاع سلطنت ۱۸۵۶ء ہے، ان کے دورِ حکومت میں صحابہ کرام پر سب و شتم اور تبرا کا قانونی طور پر شیعوں کو حق حاصل تھا اور دار السلطنت لکھنؤ میں باقاعدہ تبرا کرتے

---

[1] تاریخ اودھ جہ نجم مصنفہ مولوی نجم الغنی رام پوری ص ۲۳

ہوئے جلوس گشت کرتا تھا جیسا کہ تاریخ اَودھ کے مصنف نے لکھا ہے کہ مجتہد العصر کے گھر سے جو کاغذات برآمد ہوئے ہیں ان میں اس کا ثبوت واضح طور پر ملتا ہے یہ کاغذات فارسی میں ہیں، سہولت کے لیے صرف اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، مجتہد العصر بادشاہ کو لکھتے ہیں:-

"آپ نے اپنے عہدِ مبارک میں اجراء تبرّا پر جو خصوصی توجہ فرمائی ہے اور مراسم تعزیہ داری بہ اطمینان و شان و شوکت سے ادا کی جانے لگی جس کی وجہ سے تمام سادات اور مؤمنین، ترقی درجات اور ازدیادِ جاہ سلطنت و عمر و دولت میں مصروفِ دُعا رہیں۔ خداوندِ کریم حضور والا جیسے شاہِ دین پناہ مروّج دینِ مبین، شیعیانِ آلِ طٰہٰ و یٰسٓ کی عمر دراز فرمائے کہ حضور کے حکم اور حکومت کی اعانت سے پوری قوت کے ساتھ تبرّا کا ہم کو اختیار حاصل ہوا۔" [1]

اس کے بعد اس معروضہ میں تبرّا کے ایک جلوس کا تذکرہ کیا گیا ہے جو شیعوں نے سُنّی محلوں میں نکالا اور جب برملا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر سب وشتم کی گئی تو سنیوں کی طرف سے مزاحمت ہوئی اور مار پیٹ کی نوبت آئی، اس واقعہ کی تفصیل لکھ کر واجد علی شاہ سے سنیوں کو گرفتار کرنے اور سزا دینے کی درخواست کی گئی ہے اور درخواست کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ:-

"حضور والا جیسے عظیم المرتبت بادشاہ جو ترویج دینِ مبین اور اجراء تبرّا و عزاداری از شرق تا غرب مشہور ہیں، شیعوں کی بے حرمتی کیونکر گوارا فرمائی، ہمیں یقین ہے کہ اس طرح کے واقعات کا اس طرح سدِّ باب فرمایا جائے گا کہ آئندہ مراسم عزاداری اور تبرّا یوماً فیوماً ترقی پذیر رہے۔" [2]

واجد علی شاہ کے زمانہ میں مجتہد العصر کا ایک فتویٰ شائع ہوا جس میں انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ:-

---

[1] تاریخ اودھ ج ۵ ص ۱۶۵ [2] تاریخ اودھ ج ۵ ص ۱۶۶

حال اعلانِ تبرا مثل اعلان گاؤ کشی و اذان است، بلے اینقدر فرق است کہ آں از شعائرِ ایمان است و ایں از شعائرِ اسلام، اگر تشیع بسبب ترکِ تبرا زائل نہ شود اسلام نیز بسبب ترک گاؤ کشی و اذان زائل نمی شود۔

چنانچہ در بلادِ اسلام با وجود قدرت اعلان شعائرِ اسلام لازم است ہمچنیں در بلادِ ایمان ترویج شعائرِ آں لازم و در صورت عدم قدرت ہر دو امر ترک اعلان متحتم و تقیہ در دار التقیہ می باشد نہ در غیرِ آں، چنانچہ در عملِ مشرکین اعلان مراسم نشاید و ہم چنیں در ہنگامِ تسلط اہل خلاف احتراز اعلانِ مراسمِ ایمان می باید و سدِ ابوابِ فساد تعلق بہ حاکم دارد، موقوف بر ترکِ مراسمِ ایمان نیست۔ [1]

اس زمانہ میں بر ملا تبرا کہنا اذان اور گاؤ کشی کی طرح ہے صرف اتنا فرق ہے کہ تبرا شعائرِ ایمان میں سے ہے اور اذان و گاؤ کشی شعائرِ اسلام میں سے ہیں، اگر تشیع تبرا کے ترک سے ختم نہیں ہو جاتا تو اذان اور گاؤ کشی کے بند ہونے سے اسلام بھی ختم نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اسلامی شہروں میں بشرطِ قدرت شعائرِ اسلام کا اعلان ضروری ہے، اسی طرح ایمانی شہروں میں ایمانی شعائر کا اعلان ضروری ہے اور جب قدرت نہ ہو تو دونوں امور ترک کیے جائیں گے، تقیہ تو دار التقیہ میں ہوتا ہے (شیعی حکومت میں نہیں) جیسا کہ مشرکین کی عملداری میں شعائرِ اسلام کے اعلان کا حکم نہیں ہے، اسی طرح غیر شیعی کا تسلط و غلبہ ہو تو تبرا جو شعارِ ایمان ہے اس کا اعلان نہیں کیا جائیگا، فساد کے ڈر سے تبرا ترک نہیں ہوگا، فساد کی ذمہ داری حکامِ انتظامیہ پر ہے، شعائرِ ایمان کے ترک کرنے پر موقوف نہیں ہے۔

ہندوستان میں شیعیت کا فروغ:۔ لکھنؤ کی شیعی حکومت کی مدت بہت طویل ہے، اس کی حدودِ سلطنت بھی ان تمام علاقوں تک پھیلی ہوئی تھیں جو ہمیشہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی و مذہبی

---

[1] تاریخِ اودھ مصنفہ مولوی نجم الغنی رام پوری ج ۵ ص ۱۶۷

سرگرمیوں اور اہلِ سنت والجماعت کا مرکز رہے ہیں، اور پھر اودھ کی شیعی حکومت میں وہ اداری کا رجحان کم اور جبر و تشدد زیادہ کارفرما رہا، مراسم تعزیہ داری کی اشاعت و فروغ میں حکومت کا ہر کارندہ دل و جان سے لگا ہوا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی سے لے کر اتر پردیش کی آخری حدود تک ہی نہیں بلکہ بہار و بنگال تک اس کے اثرات پھیلے ہوئے تھے، ہندوستان کا عمومی ذہن و مزاج اہلِ سنت والجماعت کا تھا، سلطنتِ مغلیہ بھی اسی مسلک پر کاربند تھی، شیعوں کا وجود ہندوستان میں عنقا تھا اکبر کے زمانہ میں چند ایرانی طالع آزماؤں نے ہندوستان میں قدم رکھا تھا، مگر جہاں گیر کے زمانہ میں جب حکومت کے سیاہ و سفید کی مالک ایک شیعی عورت نور جہاں ہوگئی تو یہاں ایرانیوں کی آمد کا تانتا لگ گیا اور حکومت کے ہر کلیدی عہدہ پر قابض ہوتے چلے گئے اور پھر یہ حکام ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تعینات کیے جاتے رہے اور یہ جہاں بھی گئے اپنے شیعی جراثیم کے ساتھ گئے اور اپنے پورے دائرۂ کار میں ہر جگہ شیعیت کے جراثیم پھیلاتے رہے اور ہر چھوٹی بڑی آبادی میں جہاں شیعوں کا نام نشان تک نہیں تھا اور نہ عوام شیعیت سے واقف و شناسا تھے، ایسے تمام مقامات میں بھی انہوں نے یا تو حکومت کے اہلکاروں کو مجبور کر کے یا ان پڑھ عوام کو لالچ دے کر مراسم تعزیہ داری کی ادائیگی پر آمادہ کیا اور اس آبادی میں ایک چوک (پختہ چبوترہ) بنوا دیا، اس چوک پر ایک دو بیگھہ زمین وقف کرادی اس زمین کے لالچ میں غریب عوام تعزیہ بنانے لگے، اس طرح پنجاب سے لے کر بنگال تک ہر جگہ بانس کی کھپچیوں اور رنگین کاغذوں اور کپڑوں کے تعزیئے کربلائے معلیٰ یا ضریح کی صورت کے بنانے لگے اور ڈھول تاشے، گتکا پھری اور ٹین کی تلواروں کے کھیل کو تمام سُنّی عوام دین و مذہب سمجھ کر کرنے لگے۔

جنوبی ہند میں شیعی اثرات:۔ یہ صورتِ حال پورے ہندوستان میں ہوئی چاہے وہ شمالی ہندوستان ہو یا جنوبی ہند اودھ میں شیعی حکومت کے جبر و تشدد اور اس کے اثرات کی ایک جھلک آپ دیکھ چکے اب ایک مثال دکن کی بھی ملاحظہ فرمائیں "تاریخ سلطنت خداداد" کا مصنف اپنے

چشم دید حالات بیان کرتا ہے :-

"دکن کی اسلامی سلطنتیں جیسے احمد آباد، گول کنڈہ، بیجاپور بہ لحاظ عقیدہ شیعہ سلطنتیں تھیں، انہوں نے محرم کو بہت زیادہ فروغ دیا، عَلموں اور تعزیوں کے لیے عاشور خانے بنوائے اور انھیں جاگیریں دی گئیں، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آج بھی انت پور، بلاری، کڈپہ، میسور، گدک اور ہوبلی وغیرہ ضلعوں میں ہر جگہ گاؤں، دیہات میں مسجد تو نہ ہوگی لیکن عاشور خانے ضرور ملیں گے جس کے لیے جاگیریں وقف ہیں، حکومت کی تقلید میں مرہٹے اور ہندو بھی محرم کی رسومات میں شامل ہونے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہولی اور دسہرہ کی بہت سی رسومات محرم میں شامل ہوگئیں" [1]

یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ :-

"لارڈ کارنوالس نے مسلمانوں کی اسی ذہنیت سے فائدہ اٹھاکر مذہبی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے خاص طور پر محرم منانے کی اجازت دی، اور خود بھی تعزیوں اور عَلموں کی تعظیم کی" [2]

اَوَدھ میں شیعی اثرات :- یہی صورت حال اودھ و آگرہ، بہار و بنگال کا بھی تھا، شیعوں کی آبادی پورے ہندوستان میں چند مخصوص شہروں میں تھی اور ان کی تعداد بھی محدود تھی لیکن شیعی عقائد کے اثرات تمام ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے اور عقیدوں کی سرزمین میں مشرکانہ رسم و رواج کے زہریلے پودے بو دیئے گئے، آپ صرف ممالک متحدہ آگرہ و اَوَدھ جو آج اتر پردیش کے نام سے موسوم ہے آپ اس کا جائزہ لیں، پندرہ کروڑ کی آبادی والے اس صوبے میں شیعوں کی تعداد ڈیڑھ دو لاکھ سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے لیکن اُتر پردیش کا کون سا ضلع یا شہر، قصبہ اور گاؤں ہے جہاں محرم کا تعزیہ اسلامی اور مذہبی

---

[1] و [2] تاریخ سلطنتِ خداداد مصنفہ محمود بنگلوری ص ۴۰۵ و ۴۰۶

تیوہار نہ سمجھا جاتا ہو، اور اسی عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ مراسم تعزیہ داری نہ ادا کیے جاتے ہوں جو شیعوں میں پائے جاتے ہیں، حتیٰ کہ ان دُور افتادہ گاؤں میں جہاں صرف ایک یا دو گھر کسی نام کے مسلمان کے ہیں لیکن اس گاؤں میں بھی تعزیہ کے لیے ایک چوک ایک امام باڑہ اور ایک دو بیگھہ زمین اس چوک پر وقف ملے گی، ڈھول اور تاشے دیوار کی کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے ملیں گے اور پوری عقیدت اور احترام کے ساتھ کاغذ کے تعزیے بنا کر چوک پر رکھے جاتے ہیں اور ان کاغذی کھلونوں کو امام صاحب کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، اس پر نذر نیاز اور چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، شربت کی سبیل حُسین کے پیاسوں کے نام پر چلتی ہے۔

غیر شیعہ پر شیعی اثرات:۔ ایک زمانے تک پورے ہندوستان کا یہی حال تھا مراسم تعزیہ داری میں اور عقیدت و احترام، ماتم زنی اور سینہ کوبی میں، مرثیہ خوانی، شہادتِ حسین کی شیعی روایات کی روشنی میں گھڑی ہوئی فرضی کہانی سے جذباتی تعلق رکھنے میں سنی شیعوں سے ایک قدم بھی پیچھے ہوں، ہر شہر میں سنی تعزیہ دار اور شیعہ تعزیہ دار الگ الگ تھے، حد یہ ہے کہ امام باڑوں اور تعزیوں کے چوک کے بارے میں شیعہ سنی میں کبھی کبھی نزاع بھی ہو جاتی تھی، عدالت میں مقدمات چلتے، دونوں طرف سے شہادتیں فراہم کی جاتیں کہ یہ سنیوں کا امام باڑہ ہے یا شیعوں کا امام باڑہ ہے اس کی ایک تازہ مثال بنارس میں محلہ دوسی پورہ کا مقدمہ ہے جو پوری ایک صدی تک عدالتوں میں چلتا رہا اور ۱۹۸۴ء میں اس کا فیصلہ ہوا اور شیعوں کے حق میں ہوا، لیکن سنی مسلمانوں نے امام باڑہ کے لیے جان کی بازی لگا دی اس لیے ڈگری ہونے کے باوجود پولیس امام باڑہ پر شیعوں کو قبضہ دلانے میں ناکام ہو گئی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سُنّی مسلمانوں میں بھی شیعی عقائد کتنی گہرائی تک پیوست کر دیئے گئے ہیں، محرّم کے دنوں میں پورے ہندوستان میں اس دھوم دھام سے تعزیہ داری ہوتی تھی کہ شاید ایران میں بھی نہ ہوتی ہو، اس معاملہ میں شیعہ اور سُنّی مسلمانوں میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں ہے۔

شیعی عقائد کی جڑیں اسلامی معاشرہ میں کتنی گہرائی تک پہونچی ہوئی تھیں اس کے اندازہ کے لیے میں اپنے مشاہدات کی روشنی میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے پورے ملک کی صورتِ حال سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

شیعیّت کے جراثیم کا اثر:- ہمارے ضلع میں ایک قصبہ ہے جس کی آبادی لاکھ سوا لاکھ ہے اتنے بڑے قصبہ میں صرف ایک شیعہ خاندان ہے جو چند افراد پر مشتمل ہے اور صرف دو گھروں میں آباد ہے لیکن اس قصبہ میں چالیس کے قریب تعزیئے بڑے اہتمام سے بنائے جاتے تھے، تعزیہ کے جلوس میں کئی ہزار مسلمان اسی مذہبی جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتے جیسے شیعہ اپنے مرکزی مقامات پر تعزیوں کے جلوس میں شرکت کرتے تھے، سارے تعزیئے ایک قطار میں چار چار مزدوروں کے کندھوں پر سوار رہتے، تعزیوں کے آگے آگے ایک پارٹی بڑے بڑے ڈھول موٹی موٹی چوب سے پیٹتے چلتے، تاشے بجانے والے اس چابک دستی اور تیزی کے ساتھ چوب چلاتے کہ ایک شور قیامت برپا ہو جاتا، تاشوں کی کڑکڑاہٹ اور ڈھولوں کی ڈھما ڈھم سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، پھر اس کے بعد ایک پارٹی سینوں پر دو ہتھڑ مارتی ہوئی انیس و دبیر کے لکھے ہوئے مرثیے پڑھتی اور پچاسوں زبانوں سے بیک لہجہ اور بلند آہنگی کے ساتھ مصرعے اٹھائے جاتے جیسے قیامت نئی چیخ و پکار شروع ہوگئی ہو، پھر نوخیز لڑکوں اور جوانوں کا غول بیابانی ہوتا جو یا حسین، ہائے حسین چیخ چیخ کر کہتے اور سینہ کوبی کرتے، اس کے بعد ایک اور پارٹی اکھاڑے کے نام سے ہوتی، ایک ٹھیلہ پر ٹین کی زنگ خوردہ تلواریں، پٹے، بانے، لاٹھیاں، گدکا، پھری ہوتی اور ہر دس قدم پر رک رک کر اکھاڑہ جمتا، لاٹھی، بنوٹ، شمشیر زنی کے کرتب، گدکا پھری کے مقابلے ہوتے، اس طرح حسین و یزید کی جنگ کا عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش کی جاتی، ان تمام کاموں میں صرف سنی مسلمان ہوتے، ایک بھی شیعہ اس میں کہیں نظر نہیں آتا، اس سج دھج، شان و شوکت اور عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ یہ تعزیئے امام باڑے یا کربلا نام کی ایک عمارت تک پہونچائے جاتے جو شہر کے کنارے واقع تھا،

دن بھر غم حسین میں کسی کے گھر چولہا نہیں جلتا، تجہیز و تکفین سے دن ڈوبتے ڈوبتے فراغت حاصل ہوتی تب زندگی کے دوسرے مسائل کی طرف توجہ کی جاتی، کہنے کے لیے یہ صرف ایک قصبہ کی مثال ہے جہاں صرف سنّی مسلمان تعزیہ داری کرتا ہے لیکن یہ مثال آئینہ ہے پورے ہندوستان کے حال کا، ہر جگہ شیعوں سے زیادہ سُنّی مسلمان تعزیہ داری میں پیش پیش تھے اور بدعقیدہ اور گمراہ شیعوں کے سانچے میں اپنی مذہبی زندگی کو ڈھال دیا تھا، بات وہی ہے کہ ؎

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیّاد کے اقبال کا

تعزیہ کے جلوس میں اکثر کسی درخت کی شاخ کاٹنے پر کسی نو تعمیر بڑھے ہوئے سائبان یا بارجہ کے گرانے، کسی کا چوترہ کھدوانے کے مسئلہ پر تعزیئے روک دیئے جاتے، پولیس آتی، جھگڑے ہوتے، گرفتاریاں ہوتیں، اور ان گرفتار ہونے والوں اور جیل جانے والوں میں صدفی صد صرف سُنّی مسلمان ہوتے اور وہ یہ سمجھتے کہ ہم دین کا کام کر رہے ہیں۔

روزمرّہ کی زندگی میں شیعی جراثیم:۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ پورے اسلامی معاشرہ میں، ناخواندہ عوام سے لے کر تعلیم یافتہ طبقہ تک شیعی عقائد کے جراثیم پھیلے ہوئے تھے اور اس طرح دلوں پر ان کے اثرات چھا گئے تھے کہ یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ صحبتِ ناجنس کے غلط اور دین و شریعتِ اسلامیہ کی حقیقی تعلیمات و روایات کی منشار کے خلاف ہیں، آج ہر شخص حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بجائے "امام حسین علیہ السلام" بلا تکلف کہتا ہے، لغوی معنی کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں، لیکن شیعوں کے اثر سے یہ لفظ ہماری زبانوں پر آیا ہے امام کا لفظ خاص شیعوں کی ایجاد کردہ اصطلاح ہے اور ان کے بنیادی عقیدہ کا حقیقی ترجمان ہے وہ امام کے لفظ کو ایک خاص اصطلاحی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں وہ "امام" کو انبیاء کی طرح معصوم مانتے ہیں، ان کے لیے دین و شریعت میں تصرف کا حق تسلیم کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کو "فرقہ اثنا عشریہ" کہا جاتا ہے، حضرت حسین کو امام وہ اسی معنی میں کہتے ہیں جبکہ حضرت حسین کا شمار صحابہ صغار میں ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

کے وقت ان کی عمر چھ سات برس کے قریب تھی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ شیعوں کے یہاں "علیہ السلام" کا اضافہ بھی ایک معنی رکھتا ہے جبکہ لغوی اور معنوی اعتبار سے اس کا استعمال ہر مسلمان پر کیا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں کی کچھ مخصوص مذہبی اصطلاحیں ہیں اور اجماع اُمت نے اس کو تسلیم کیا ہے اور ان اصطلاحات کے محلِ استعمال بھی متعین ہیں، دوسری جگہ ان کا استعمال نہیں کیا جاتا، انھیں میں سے "علیہ السلام" کی اصطلاح بھی ہے جو اسلامی اصطلاح کے اعتبار سے انبیاء کے لیے مخصوص ہے، جس طرح "صلی اللہ علیہ وسلم" کا جملہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لیے خاص ہے، دوسروں کے لیے اس کا استعمال نہیں کیا جا سکتا، لیکن سُنّی مسلمان شیعوں سے متاثر ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بجائے ہمیشہ "امام حسین علیہ السلام" ہی کہتے ہیں ٹھیک اسی طرح قادیانی مرزا غلام احمد کو نبی ماننے کی وجہ سے اپنی ہر تحریر میں ان کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" لکھتے ہیں اور ان کی بیوی کو "اُم المؤمنین" اور "رضی اللہ عنہا" کہتے ہیں اور مرزا کے جانشینوں کو "خلیفۃ المسلمین" اور ان کے مخصوص ماننے والوں اور شرفِ صحبت پانے والوں کو صحابہ کا درجہ دے کر ہر نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" کا جملہ ضرور کہتے اور لکھتے ہیں جو اسلام کی خاص اصطلاحیں ہیں، ازواج مطہرات ہی کو "اُم المؤمنین" اور صحابہ کرام کے لیے رضی اللہ عنہ کا جملہ خاص ہے، قادیانی ان اسلامی اصطلاحوں کو استعمال کر کے دوسرے لوگوں کو یہی تاثر دینا چاہتے ہیں کہ یہ جملے ٹھیک اسلامی اصطلاح کے مطابق ہی استعمال کیے گئے ہیں، کیونکہ ان کے عقیدہ میں ان کو وہی مقام حاصل ہے۔

اسی طرح ایامِ عزا میں "یا حسین" کی صدا سنائی دے گی، اسی طرح "مولیٰ علی" اور "علی مشکل کشا" ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھا ہوا ہے، جوش و جذبہ کے اظہار کے موقعہ پر اکھاڑے میں اُترنے والے پہلوانوں کی زبان سے "یا علی" کا نعرہ لگوایا گیا،

جب وبائیں چلتی تھیں تو دعاء و استغفار کے بجائے ان کو تلقین کی جاتی تھی کہ یہ شعر لکھ کر اپنے گھروں میں لگا دیا جائے، تو گھر وباؤں سے محفوظ رہے گا:۔

لِیْ خَمْسَۃٌ اُطْفِیْ بِھَا حَرَّ الْوَبَاءِ الْحَاطِمَۃْ الْمُصْطَفٰی وَالْمُرْتَضٰی وَاَبْنَاھُمَا وَالْفَاطِمَۃْ

ہر سال لاکھوں کی تعداد میں ایسے کلنڈر شائع کیے جاتے رہے جن کو "پنجتن پاک" کا کلنڈر کہا جاتا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم کے اسمار گرامی رہتے ہیں، مسلمان اس کو اسلامی کلنڈر سمجھتے ہیں اور عام و خاص کے گھروں کی زینت بنتے ہیں، "پنجتن پاک" فارسی لفظ ہے اور شیعوں کی خاص اصطلاح ہے اور یہ شیعیت کے عقائد کی فیکٹری میں ایران سے ڈھل کر ہندوستان آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں اس کا بدل نہیں ہے۔

شیعوں ہی کے اثر سے اہل سنت والجماعت مسلمانوں کے یہاں بھی شادی بیاہ یا اور کوئی خوشی کی تقریب ماہ محرم میں ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ غم اور عزاداری کا مہینہ ہے اور صفر کا مہینہ بھی ۲۰ تاریخ تک انھیں ممنوع ایام میں شمار کرتے ہیں کیونکہ "امام حسین" کا چالیسواں اسی مہینہ میں ۲۰ صفر کو پڑتا ہے، اس طرح پورے ہندوستان میں سنی مسلمانوں کے یہاں ان دونوں مہینوں میں کوئی تقریب ناممکن ہے اور شیعیت کا یہ اثر آج تک کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے۔

یکم محرم سے ۱۰ محرم تک ہندوستان کے بڑے شہروں میں دس روزہ محرمی اجلاس بلائے جاتے ہیں جن میں علماء اہل سنت کو صرف شہادت حسین کے واقعہ کو بیان کرنے کے لیے کہا جاتا ہے اور واہی تباہی روایتوں کے ذریعہ اس واقعہ کو اسلامی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ثابت کیا جاتا ہے اور اس شہادت کو تمام شہید ہونے والے صحابہ کرام کی شہادتوں سے بلند و بالا مقام ثابت کیا جاتا ہے اور تمام شیعی روایتوں سے اس واقعہ کو دنیا میں اسلام کی حفاظت و بقا کا واحد ذریعہ بتایا جاتا ہے، اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلام میں اگر شہادت کا ارفع ترین مقام ہے تو وہ صرف کربلا کے میدان میں ہونے والی شہادت ہے اور نعوذ باللہ پوری اسلامی تاریخ میں تمام جلیل القدر صحابہ کرام کی قربانیاں، جاں نثاریاں اور فداکاریاں اس واقعہ کی عظمت کے سامنے گرد ہیں اور اس عظیم الشان قربانی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں اور اسی قربانی و شہادت ہی کی وجہ سے دنیا میں اسلام زندہ رہا، اسی واقعہ کربلا کے تذکرے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات کو بھی ہدف ملامت بنانے کی جسارت کی جاتی ہے جبکہ وہ صحابی رسول، کاتب وحی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت

سی دعائیں ان کے لیے حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، یہ ساری گمراہی کی باتیں شیعوں کے اثر سے مسلمانوں میں سرایت کر گئی ہیں۔

حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم اور اہل بیت کے فضائل و مناقب کے سلسلہ میں صحیح روایتوں کے علاوہ ابتدائی دور میں روافض نے جتنی واہی تباہی روایتیں گڑھ کر عالم اسلام میں پھیلائی تھیں، اتفاق سے یہ رطب و یابس اور جھوٹی اور موضوع روایتیں کسی نہ کسی مجموعہ حدیث میں درج ہو گئی ہیں، انھیں فرضی اور جھوٹی روایتوں کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص اپنا سلسلۂ نسب اہل بیت تک پہونچانے کے خبط میں مبتلا ہے اور آج عالم یہ ہے کہ ایران، عراق، شام اور ہندوستان اور دوسرے ممالک میں صرف سیدوں کی تعداد پندرہ بیس کروڑ سے کم نہیں جو مختلف نسبتوں سے موسوم ہیں ان تمام کا سلسلۂ نسب حضرت علی اور حضرت فاطمہ پر منتہی ہوتا ہے اس طرح چودہ سو ۱۴ سال میں دو نفر سے بیس کروڑ اولاد پیدا ہو گئی۔ یہ تاریخ عمرانیات کا انتہائی حیرت ناک واقعہ بن گیا ہے۔ یہ سب اسی شیعی اثرات کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

اس تفصیل سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ شیعوں نے اپنے دور عروج میں اسلامی ہند کو اپنے مراسم تعزیہ داری، اپنے مشرکانہ عقائد سے کس طرح متاثر کر رکھا تھا اور اس کی کتنی گہری چھاپ اسلامی معاشرہ پر ڈال دی تھی اور اس کے اثرات کہاں تک پہونچے ہوئے تھے؟ اور اہل سنت والجماعت مسلمانوں سے ان کے دلوں میں کتنی نفرت و عداوت بھری ہوئی تھی اس کا آپ اندازہ کر سکیں، جہاں ان کو طاقت کے استعمال کا موقعہ ملا، انہوں نے حق پرستوں کی زبانوں پر تالے لگوائے، اہل قلم کے ہاتھ قلم کروائے کبھی پہونچے اتروائے، اہل علم مسلمانوں کو شہر بدر کرایا اور جہاں عوام کو متاثر کرنا ہوا وہاں لالچ، ترغیب و تحریص اور پروپیگنڈہ سے کام لے کر اپنے سیکڑوں مشرکانہ عقیدوں کا زہر عام مسلمانوں کی رگوں میں پیوست کر دیا اور اس طرح کہ ان کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ میرے صالح خون میں زہر ملا دیا گیا، ان کو پتہ ہی نہیں کہ یہ شیعی عقائد ہیں، ان کو اسلامی عقیدہ سمجھ کر اس پر مرمٹے اور عملی طور پر شیعوں کے تمام مراسم میں اسی عقیدت و احترام سے حصہ لیتے رہے

جو روافض اور شیعوں کے ساتھ خاص ہے۔ تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے آغاز میں یہی صورتِ حال رہی جس کی اب تک وضاحت کی گئی ہے، دارالعلوم دیوبند کا قیام اسی زہر آلود فضا میں ہوا اور جب علماء دیوبند جد وجہد کے میدان میں آئے تو اسلامی معاشرہ سے ان تمام شیعی لعنتوں کو مٹایا اور شیعی جراثیم جو مسلمانوں کی شریانوں میں داخل کر دیئے گئے تھے اسلام کے خالص اور سچے عقیدوں کے انجکشن سے جراثیم کش دوائیں ان شریانوں تک پہونچائی گئیں اور اسلامی معاشرہ کو روافض کے زہریلے اثرات سے پاک صاف کیا گیا۔ یہ داستان آپ کو آگے سنائی جارہی ہے۔

باب (۱۱)

شیعیّت کے خلاف

عُلَمائِ حق جدّوجہد کے میدان میں

شیعیّت کے خلاف علماءِ حق جدّوجہد کے میدان میں

ہندوستان کے مسلمانوں میں شیعی عقائد کے جراثیم پھیلنے کی بنیادی وجہ ان کی حکومت تھی، اور مرکز میں ان کا عمل دخل تھا جبکہ مغل بادشاہوں میں کوئی شیعہ نہیں تھا، لال قلعہ میں تعزیہ داری اور شاہزادوں کا اس میں پوری دلچسپی سے حصہ لینا یہ سب کچھ شیعی اقتدار کا ثمرہ تھا، لکھنؤ کی شیعی حکومت کا ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے الحاق کرکے اس کا وجود مٹا دیا اور واجد علی شاہ کو مٹیا محل کلکتہ بھیج دیا لیکن صدیوں کی حکومت نے اپنے مذہبی عقائد کی چھاپ پورے ہندوستان پر ڈال دی تھی، ہندوستان میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک شیعی عقائد اور ان کے مشرکانہ رسوم اس طرح غیر شیعہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں رچ بس چکے تھے کہ اگر صحیح طور پر ان کو کلمۂ شہادت بھی ادا کرنا نہ آتا ہو مگر وہ تعزیہ داری اور اس کے ساتھ عقیدت مندی کا والہانہ جذبہ سینوں میں موج زن رکھتے تھے اور اس کو اپنے مسلمان ہونے کی سند سمجھتے تھے، عشرۂ محرم میں ان کے جوش و جذبہ کے اظہار کا نظارہ قابلِ دید ہوتا تھا، حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ شیعوں کی تعداد اتنے بڑے ملک میں چند لاکھ سے زیادہ کبھی نہیں رہی لیکن کروڑوں اہلِ سنت والجماعت مسلمانوں کے دلوں میں شیعوں نے اپنے سارے عقائد و مراسم، جذبات و خیالات کی چھاپ ڈال دی اور پورے ہندوستان کو شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا،

ان کے دورِ عروج میں ان کے خلاف زبان کھولنا کچھ آسان نہیں تھا، عام مسلمانوں کی مرعوبیت کا عالم یہ تھا کہ بڑے بڑے سنی المذہب جاگیردار شیعی حکومت کی دار و گیر سے ڈر کر شیعہ ہو گئے تھے اور اپنے شیعہ ہونے کا اعلان و اظہار کر دیا تھا کیونکہ بہت سے سنّی

مسلمان جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط کرکے شیعوں کو دی جا چکی تھیں، اس لیے ۱۸۵۷ء تک ردِّ شیعیت میں کسی تصنیف کو تلاش کریں تو بڑی مشکل سے اس میں آپ کو کامیابی مل سکتی ہے، شیعوں سے بحث و مناظرہ تو بہت دُور کی بات ہے، سنّی مسلمانوں کے پاس جو سب سے بڑا ذخیرہ و سرمایہ تھا وہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" یہ ننگی تلوار ان کے سروں تک تقریباً ایک صدی تک لٹکی رہی، درجنوں کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں اور جواب لکھنے والوں کا دل کہہ رہا تھا کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، ہم کو ہر طرف سناٹا ہی نظر آتا ہے یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء آجاتا ہے اور شیعی اقتدار مٹ جاتا ہے، سارے ہندوستانی عوام ایک سطح پر آگئے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے، اس کے دس سال بعد دارالعلوم دیوبند قائم ہوتا ہے، جو علماء انگریزوں کی دار و گیر سے بچ جاتے ہیں، اور تختۂ دار سے اتر کر عوامی زندگی میں آجاتے ہیں اور اپنی مادی و روحانی تباہیوں اور بربادیوں کے کھنڈر کو دیکھ کر دل میں جو درد و کرب اُبھرتا ہے اس نے ان کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنا شروع کر دیا اور وہ ایک روحانی تعلق کی بنیاد پر منظم ہونے لگے اور دارالعلوم دیوبند کا مرکز بن جانے کے بعد ان کے حوصلے اور اُمنگیں بیدار ہوئیں اور ان کے تنِ مردہ میں جان آئی، اور دین کی حفاظت کو انہوں نے جان و مال کی حفاظت پر ترجیح دی اور دارالعلوم میں صرف رسمی تعلیم پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان کے پیشِ نظر پورے اسلامی معاشرہ کی اصلاح تھی جو پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو چکا تھا جس دعوت و اصلاح کی بنیاد ۱۸۵۷ء سے پہلے سید احمد رائے بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید ڈال چکے تھے، علماء دیوبند نے اسی تحریک دعوت و اصلاح کو طاقتور بنایا اور اس کے دائرے کو وسیع کیا اور اس کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی، قیامِ دارالعلوم کے کچھ ہی عرصہ بعد علماء حق نے بدعات و خرافات مشرکانہ رسم و رواج و عقائد سے جو مکھی لڑائی چھیڑ دی، اس جنگ میں علماء حق کا ایک حریف شیعہ بھی تھے۔ شیعوں کا دورِ عروج ختم ہو چکا تھا، حاکمانہ اقتدار سے تنی ہوئی گردنیں ڈھیلی

پڑ چکی تھیں، اور وہ بھی عام مسلمانوں کی طرح زوال کا شکار ہو چکے تھے، اس زوال کے بعد شیعہ مجتہدین نے نیش زنی کا آغاز کر دیا تھا، پہلے شیعیت تلوار کی نوک پر رقص کرتی تھی لیکن وہ تماشا اب ختم ہو چکا تھا، اب زبان و قلم کے کرتب دکھائے جانے لگے، شیعوں کے ایک مجتہد میر فرزند حسین نے اسلام کے خلاف ایک کتابچہ لکھ کر اس جنگ کا آغاز کر دیا اس کتابچہ میں انہوں نے حسب عادت خلفاء ثلثہ اور صحابہ کرام پر طعن و تشنیع کی، اس سے ذرا پہلے ایک اور شیعہ مجتہد جو لکھنؤ سے چل کر میرٹھ پہونچے اور انہوں نے علماء اہل سنت سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، بہت سے رؤسا جو خاندانی لحاظ سے سنی تھے لیکن شیعوں کے دورِ عروج میں اپنی جاگیر کی حفاظت کے لیے خاندانی مسلک کے برخلاف شیعہ ہو گئے تھے ایسے بہت سے رؤسا نوواردِ شیعہ تھے، اسی طرح ایک نواب محمد علی خاں میرٹھ میں تھے انھیں نواب صاحب کے محل میں لکھنؤ کے وہ مجتہد صاحب قیام پذیر ہوئے جو شیعہ مذہب کے بہت بڑے عالم فاضل مانے جاتے تھے، اور سنیوں کے لیے شمشیر برّاں سمجھے جاتے تھے، انھیں مجتہد صاحب سے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند کا سامنا ہو گیا اور یہ ملاقات مجتہد صاحب کے لیے ایک حادثہ بن گئی اور لوگوں کو ان کے مبلغ علم کا پتہ چل گیا، یہ ایک دلچسپ داستان ہے جس کو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنے ایک فارسی خط میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری کے نام ہے خود بیان فرمایا ہے، چونکہ رَدِّ روافض کی داستان کا یہ نقطۂ آغاز ہے اس لیے آپ پوری داستان سماعت فرمالیں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ علماء حق نے جب فرقِ باطلہ کا مقابلہ شروع کیا تو کس قدر جوش و جذبہ سے بھرے ہوئے تھے اور کسی طرح کے حالات کی پروا نہیں کرتے تھے، اور علماء حق کا علمی مقام و مرتبہ دوسروں کے مقابلہ میں کتنا ارفع و اعلیٰ تھا۔

اس مباحثہ میں کچھ ایسے ڈرامائی انداز میں مجتہد صاحب کی زبان بند ہوئی کہ ہندوستان کے سیکڑوں مناظروں میں سے کسی ایک مناظرہ میں فریقِ مخالف کی زبان پر ایسا سکتہ طاری نہیں کیا جا سکا، حضرت نانوتوی نے اپنے فارسی مکتوب میں یہ تفصیل بیان کی ہے، ہیں

صرف اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، اصل فارسی خط "فیوض قاسمیہ" میں دیکھا جا سکتا ہے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میر حامد حسین صاحب مجتہد لکھنوی میرٹھ میں نواب محمد علی خاں کے مکان پر فروکش تھے اور حضرت نانوتوی ان دنوں میرٹھ میں قیام پذیر تھے۔ اب آگے داستان حضرت نانوتوی کی زبان سے سماعت فرمائیے :۔

"..... ایک دن میں بغیر عمامہ و رومال اور چادر کے جیسا کہ میری عادت ہے اس مکان پر پہونچ گیا، جہاں مولوی حامد حسین لکھنوی شیعی فروکش تھے، جنھوں نے "منتہی الکلام" کے جواب میں ایک مبسوط کتاب "استقصاء الافحام" تصنیف کی ہے اور شیعوں کے خیال میں زمین و آسمان کے درمیان اس کی کوئی نظیر و مثال نہیں ہے، اور اس کو آفتاب زمانہ اور بدر منیر بے مثال سمجھتے ہیں، میں نے ان کے پاس پہونچ کر شیعوں کی طرح "سلام علیکم" لفظ سلام کی میم کی تنوین کے ساتھ کیا، اور پھر میں نے ان سے کہا کہ حضرت! میں جہاں کا رہنے والا ہوں وہاں شیعہ اور سنی ملے جلے رہتے ہیں اور آپس میں شادی بیاہ بھی کرتے ہیں، دونوں فرقوں کے لوگوں میں بڑے اچھے تعلقات ہیں اسی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلفانہ گفتگو ہوتی رہتی ہے اور ہر طرح کی گفتگو ہوتی رہتی ہے اور کبھی کبھی مذہبی گفتگو بھی چھڑ جاتی ہے، چونکہ وہاں سنی علماء بہت ہیں اور اس طرف نہیں ہیں اس لیے شیعے ان کا جواب نہیں دے پاتے ہیں، ویسے تو بہت سے مسئلے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ سنی علماء تین مسئلوں میں زیادہ زبان درازی کرتے ہیں۔

میں گردش زمانہ سے مجبور ہو کر اسی شہر میں پڑا ہوا ہوں اور جناب والا کی تشریف آوری کی خبر سنی تو مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ اب میرا مقصد پورا ہو جائیگا اور حضور والا سے ان تینوں مسئلوں کا جواب معلوم کرلوں گا جو سنیوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں، از راہ کرم ان کے جوابات اس طرح ارشاد فرمائیں کہ میرے دل میں نقش ہو جائیں اور وقت ضرورت میں اُن سے کام لے سکوں۔

۱۔ مجھے سب سے پہلے یہ بتا دیا جائے کہ "فدک" کس چیز کا نام ہے؟ وہ مسکرائے اور فرمایا کہ اس سلسلہ میں بڑی مبسوط کتابیں لکھی گئی ہیں اور موجود ہیں انھیں آپ دیکھ لیجئے، میں نے عرض کیا کہ حضور! میں پریشان حال آدمی کہاں دیکھ سکوں گا، اور نہ اتنی علمی استعداد ہے کہ پوری طرح سمجھ سکوں، میرا دیکھنا کیا، آپ کا ارشاد فرمانا بڑی بات ہے، لوگوں نے خواہ مخواہ مجھ کو مولوی کہنا شروع کر دیا ہے

چونکہ حضرت نانوتوی ایک عامی مسلمان کی طرح ان کے پاس حاضر ہوئے تھے، مگر ایک شخص مجتہد صاحب کی مجلس میں حضرت نانوتوی کو جاننے والا بھی تھا، وہ حضرت نانوتوی کے پہونچنے پر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا اور مولانا کے لفظ سے خطاب کیا تھا، اس لیے اب راز راز نہ رہا، اس وجہ سے حضرت نانوتوی نے یہ بات کہی کہ لوگ یوں ہی مجھے مولوی کہتے ہیں، میں کیا اور میرا علم کیا، البتہ اس نے مجتہد صاحب سے حضرت نانوتوی کا نام نہیں بتایا تھا یہی غنیمت تھا اس گفتگو کا موقعہ ابھی تھا۔ اب آگے کی داستان سنیئے:۔

"مجتہد صاحب نے دریافت فرمایا کہ آپ کا اسم گرامی؟ تو میں نے اپنا تاریخی نام "خورشید حسن" بتا دیا، پھر انہوں نے فرمایا کہ "فدک" ایک زمین کا نام ہے، میں نے کہا کہ وہ زمین کیسے آئی تھی؟ اُسے حضورؐ کے متعلقین نے خریدا تھا؟ تو آپ نے فرمایا، نہیں، وہ غنیمت میں آئی تھی، غنیمت میں اس کا ہونا غلط تھا یا شاید ان کو غلط معلوم ہی تھا، یا ہو سکتا ہے انہوں نے مجھے جاہل سمجھا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ یہ جاہل آدمی غنیمت اور فے کے فرق کو کیا سمجھے گا اس لیے یہ بات کہی ہو، اور صراحتاً ان کی غلطی پر میرے لیے ان کو ٹوک دینا خلاف مصلحت تھا، اس لیے میں نے کہا کہ ہم لوگوں نے غزوۂ فدک کے نام سے کسی غزوہ کا ذکر کبھی نہیں سنا ہے اگر فدک غنیمت میں سے ہوتی تو یقیناً کوئی غزوہ اس نام سے ضرور ہوتا اور سب جانتے، اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ فدک خیبر کے نواح میں تھی، اس کے بعد میں نے دریافت کیا کہ مخدوم محترم! "فے" کیا چیز ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے

کہا کہ غنیمت کو کہتے ہیں، بغیر شیعہ سنّی کا اظہار کیے میں نے کہا کہ ایک آدمی کہتا تھا کہ کلام اللہ کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فدک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں نہیں تھی، جب میں نے یہ بات کہی، وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے، اس سے پہلے وہ بڑی بے فکری سے گفتگو کر رہے تھے، بہر حال انہوں نے پوچھا، پھر کیا ہے؟ تو میں نے ان کے جواب میں ما افاء اللہ علیٰ رسولہ والی آیت پڑھ دی، اس کے جواب میں انہوں نے کچھ کہا اور میں نے اس کا جواب دیا تو وہ فوراً اُٹھ گئے یعنی انہوں نے اپنی گفتگو ختم کر دی۔"[1]

عملی جدّوجہد کا آغاز:- علماء دیوبند کا اصل مقصد عام مسلمانوں کی اصلاح تھی بحث و مناظرہ تو منزلِ مقصود تک جانے والی راہ کی منزلیں تھیں اور ناگزیر طور پر ان منزلوں سے گذرنا ہے اگرچہ مناظروں کی افادیت بنیادی طور پر کچھ زیادہ نہیں تھی، کیونکہ مناظرہ باطل اور گمراہ فرقوں میں صرف ضد اور ہٹ دھرمی پیدا کرتا ہے راہِ حق کی تلاش مقصود ہی نہیں ہوتی، اس لیے کسی گمراہ فرقہ کے نمائندہ یا نسلی طور پر اس فرقہ سے وابستہ عوام نے مناظروں سے متاثر ہو کر راہِ حق اختیار کر لی ہو، اس کی مثال عنقا تھی، مناظرہ و مباحثہ وقت کی لائی ہوئی ایک مجبوری تھی۔

شیعیت کی سب سے بڑی لعنت اور اسلامی عقیدۂ توحید پر سب سے زیادہ ضرب تعزیہ داری اور اس کے مشرکانہ مراسم سے پڑی تھی اور یہ تعزیہ داری شیعوں سے گذر کر عام سنّی مسلمانوں کے دِلوں میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ تمام مسجدوں میں تعزیئے رکھے جاتے تھے، شیعی اثرات کی انتہا یہ تھی کہ تمام سنّی مسلمان خوشی خوشی مسجد کے ایک گوشے میں ان تعزیوں کی جگہ بنا دیتے تھے اور پورے سال یہیں مسجد میں تعزیہ رکھا جاتا اور محرم کے دنوں میں پھر انہیں تعزیوں کی مرصع کاری کر کے گشت کرایا جاتا اور پھر اسی مسجد میں واپس لا کر رکھ دیا جاتا، گویا ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ تعزیہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے، وہ

---

[1] "فیوضِ قاسمیہ" مجموعہ مکاتیب حضرت نانوتوی ص ۵ و ۶

مسلمان ہی کیا جو تعزیہ داری نہ کرے، اگر کوئی مسجد میں تعزیہ رکھنے پر نکیر کرے تو خود سنی مسلمان اس کے دشمن ہو جاتے تھے، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے جب شیعی اثرات کو مٹانے کی مہم شروع کی تو سب سے پہلے آپ کو دیوبند میں اپنے عزیز و اقارب سے تعزیہ کے مسئلہ میں ٹکر لینے کی نوبت آئی۔

دیوبند میں ایک بزرگ حاجی محمد یٰسین عرف دیوان جی تھے، وہ دیوبند کے معزز اور سربرآوردہ افراد میں سے تھے، وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور حضرت گنگوہیؒ ردِّ بدعت میں بہت متشدد تھے، یہی اثر ان سے بیعت کرنے

لہ سرخیل علمائے دیوبند، عالم بے مثال، محدثِ بے نظیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اپنے وقت کے امام اور علماء و صلحاء کے مقتدیٰ و مرشدِ کامل، رد بدعت اور تحریک دعوت و اصلاح کے امیر کارواں تھے آپ کی ولادت گنگوہ میں ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق مئی ۱۸۲۹ء میں اپنی نانیہال میں ہوئی، آپ کا وادیہال ایبڈ ضلع سہارنپور میں تھا، ابتدائی تعلیم گنگوہ اور رام پور میں ہوئی۔ اس کے بعد آپ دہلی گئے اور استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی سے علم و فن کی اکثر کتابیں پڑھیں اور بعض کتابیں مفتی صدر الدین خان آزردہ سے بھی پڑھیں علم حدیث کی زیادہ کتابیں شیخ عبد الغنی دہلوی اور بعض کتابیں شیخ احمد سعید ابن ابو سعید العمری دہلوی سے پڑھیں سلوک و طریقت کی تعلیم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی سے حاصل کی اور ان سے بیعت ہو کر خلیفہ مجاز ہوئے، غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت نے آپ پر جرم بغاوت عائد کر کے گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا اور گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیئے گئے، چھ ماہ مظفر نگر کی جیل میں رہے، لیکن انگریزی عدالت جرم ثابت نہ کر سکی اس لیے بری کر دیئے گئے۔ آپ نے درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا، ابتداءً جملہ علوم و فنون کی کتابیں پڑھاتے رہے لیکن تیسرے حج سے واپس ہوئے تو آپ نے صرف درسِ حدیث کو اپنے لیے خاص کر لیا اور صحاحِ ستہ کا درس دیتے رہے، اصلاح قلوب و تزکیۂ باطن میں مصروف رہے آپ نے متعدد حج کیے اور وہاں کے اہل علم سے استفادہ کیا، انتہائی عابد و زاہد تھے ذکر و فکر کے معمولات مقرر تھے اسی کے مطابق روز و شب گذارتے تھے، رد و دفض رد بدعت میں انتہائی سخت تھے، مسلمانوں میں رائج تمام مشرکانہ رسوم خلافِ شرع عقائد، تیجہ چہلم، نذر نیاز چڑھاوا فاتحہ میلاد عرس قبر پرستی تعزیہ داری غرضیکہ جتنی مشرکانہ رسمیں اور عقیدے (باقی اگلے صفحہ پر)

والوں میں بھی تھا، دیوان جی بعد میں حضرت نانوتوی سے بھی بیعت ہوگئے، ان کے یہاں کی تعزیہ داری مشہور تھی یعنی بڑی شان و شوکت سے تعزیہ داری کی جاتی تھی اور شاید دیوان جی حافظ احمد صاحب ابن حضرت نانوتوی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سسرالی رشتہ داروں میں سے تھے جب ان بزرگوں سے ان کا رشتۂ عقیدت استوار ہوا تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس رسم تعزیہ داری کو یہاں سے ختم کرکے رہوں گا، دیوان جی کی مسجد محل کی مسجد کہلاتی تھی، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اپنے زمانہ میں اسی مسجد میں نمازیں پڑھا کرتے تھے، اس مسجد میں تعزیہ رکھا جاتا تھا اور اسی مسجد سے اُٹھتا تھا، تعزیہ اٹھانے والے سب کے سب سُنّی تھے، شاید ہی اس محلہ میں ایک دو گھر شیعوں کے رہے ہوں، اصلاح کا آغاز اسی مسجد سے ہوا۔

دیوان جی نے اعلان کردیا کہ اس سال مسجد سے تعزیہ نہیں اُٹھایا جائے گا، یہ اعلان بجلی بن کر گرا، شیعوں کی بات تو الگ رہی، خود سنّی مسلمانوں میں برہمی پیدا ہوگئی، محلہ کے شیوخ بگڑ گئے، اور کہا کہ سر قلم ہوجائیں گے مگر تعزیہ اٹھے گا اور ضرور اُٹھے گا، مگر شیوخ محلہ کی برہمی کے باوجود دیوان جی کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی اور انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر تعزیہ گذرا تو میری لاش پر سے گذرے گا، یہ یاد رہے کہ تعزیہ داری ختم کرنے والے چند افراد کے خلاف

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اسلامی معاشرہ میں سرایت کیے ہوئے تھے ان کے خلاف ان کے فتوے پورے ملک میں شائع و ذائع تھے، ان خرافات کی تردید میں سخت لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور عملاً بھی اپنے تلامذہ کو اس کے خلاف کہنے اور لکھنے کا حکم دیتے رہتے تھے، آپ کے خلفاء حجاز میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری جیسے جلیل القدر علماء و صلحاء شامل ہیں، آپ کے جاں نثار شاگرد مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی عرصہ دراز تک آپ کی خدمت میں رہے اور درس ترمذی اور درس بخاری کی تقریریں نوٹ کرتے رہے انہیں افادات پر مشتمل "الکوکب الدری" اور "لامع الدراری" شائع کی گئیں۔ آپ کی دوسری کتابوں میں تصفیۃ القلوب امداد السلوک، ہدایۃ الشیعہ، زبدۃ المناسک، ہدایۃ المعتدی اور سبیل الرشاد ہیں، آپ کی وفات جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ مطابق مارچ ۱۹۰۵ء میں ہوئی اور گنگوہ کی سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں تفصیل کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر جلد ۸ اور تذکرۃ الرشید مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔

پورے قصبہ دیوبند کے تمام مسلمان ایک محاذ بنا کر کھڑے ہو گئے اور سب کے سب اہلِ سنّت والجماعت کہے جانے والے لوگ تھے، شاید ہی ان میں دو ایک شیعہ رہے ہوں، شیعیت کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا تھا، حضرت نانوتوی کو مسلمانوں کے اشتعال اور تعزیہ نکالنے کی ضد کو سن کر یہ احساس ہوا کہ اس مشرکانہ رسم کو مٹانے کے لیے قربانی کی ضرورت ہے، اور خود میدان میں آ گئے۔

آپ نے دیوبند کے بہت سے سربرآوردہ لوگوں کی مجلس میں اعلان کیا کہ تعزیہ اُٹھانے والے سن لیں کہ دیوان جی کی لاش کے ساتھ قاسم کی لاش پر سے بھی تعزیہ کو گذارا جا سکتا ہے، جب تک دونوں زندہ رہیں گے تعزیہ نہیں نکالا جا سکتا۔ حضرت نانوتوی کا یہ اعلان رائیگاں نہیں گیا، جب عام لوگوں کو اس کی خبر ملی تو شیوخ تو اپنی اُنانیت میں ڈوبے رہے، لیکن دیوبند میں اہلِ حرفہ کی بھی ایک بڑی طاقت اور جماعت تھی جو حضرت نانوتوی کے مقام و مرتبہ سے واقف تھی، پیشہ ور برادریوں نے مشترکہ طور پر یہ اعلان کر دیا کہ اگر شیوخ نے تعزیہ اٹھانے میں ان بزرگوں کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک کیا تو ہم متحدہ طور پر شیوخ کا پوری قوت سے مقابلہ کریں گے۔

ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں ناز و نعم میں پلے ہوئے نازک اندام شیوخ مقابلہ میں شاید ناکام ہی ہو جاتے، اس لیے شیوخ میں خود اختلاف پڑ گیا، کچھ لوگ حضرت نانوتوی کی حمایت میں کھل کر سامنے آ گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعزیہ داری کی حمایت کرنے والوں کے حوصلے پست ہو گئے، اور پھر کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس مسجد سے تعزیہ اٹھانے کے لیے آئے، اور یہ مشرکانہ طرزِ عمل ختم ہوا، جب قصبہ کے دوسرے سنی مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ علماءِ حق اس مشرکانہ رسم تعزیہ داری کے مخالف ہیں تو انہوں نے بھی اپنے اپنے محلوں کی مسجدوں سے تعزیوں کے ڈھانچے نکال کر باہر پھینک دیئے۔ اس طرح دیوبند کی عام مسجدوں میں تعزیوں کے رکھنے اور وہاں سے اٹھانے کی رسمِ بد کا خاتمہ ہو گیا اور جو لوگ اپنے کو اہلِ سنت کہتے تھے انہوں نے تعزیہ داری سے توبہ کی اور صحیح معنیٰ میں وہ اہلِ سنت والجماعت کے مسلک پر آ گئے اور یہ یقین کر لیا کہ یہ سب رذائل[1]

---

[1] سوانح قاسمی جلد دوم مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۷۵، ۷۶، ۷۷

کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں تھیں جن میں ہم گرفتار تھے۔

راہ کی دشواریاں :- صرف اسی ایک واقعہ سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ شیعیت کے کتنے مہلک جراثیم اسلامی معاشرے میں سرایت کیے ہوئے تھے کہ تعزیہ داری جو بُت پرستی اور مشرکانہ طور وطریق کا سب سے کھلا ہوا مظہر تھا اس کو روکنے کے لیے اکابر علماء حق کو سر کی بازی لگانی پڑتی تھی، اس رسم تعزیہ داری کے پیچھے کیسے کیسے عقیدے ان کے دل و دماغ میں پیوست کر دیئے گئے تھے، نہیں کہا جا سکتا، تعزیہ اُٹھا لینا، عشرۂ محرم میں سوگ منانا، ماتم کرنا، مرثیوں کی مجلسوں میں شریک ہونا، حضرت معاویہ اور یزید کو بُرا بھلا کہنا، سب وشتم کرنا، خلفاء راشدین کو غاصب سمجھنا، حضرت علی کو وصی رسول ماننا، ان کے رتبے کو تمام صحابہ سے بلند و بالا جاننا، حضرت علی کا دنیا میں دوبارہ آنا، اور کار و بارِ نبوت میں شریک ہونا، قرآن کا بڑا حصہ صرف ان کے پاس ہونا وغیرہ وغیرہ فاسد خیالات وعقائد جو شیعوں کے مذہب کی بنیاد ہیں ان میں سے کتنے عقیدے شیعوں نے نفسیاتی سرنج سے اہل سنت والجماعت مسلمانوں کی مذہبی رگوں میں داخل کر دیئے تھے اس کی مکمل نشان دہی نہیں کی جا سکتی اگر تعزیوں کے پیچھے فاسد عقیدوں کی یہ شدّت نہ ہوتی تو لکڑیوں اور بانس کی کھپچیوں اور کاغذ کے ان کھلونوں کو دریا بُرد کر دینے میں ایک توحید پرست مسلمان کو کتنی دیر لگتی لیکن دیوبند کا پورا قصبہ مشتعل ہو جاتا ہے اور محاذ بنا کر تعزیہ داری کی حمایت میں سنّی مسلمان لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، اگر اس کے پیچھے مسلمانوں کے دلوں میں شیعی عقائد کے جراثیم نہیں ہوتے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

سید احمد رائے بریلوی، مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی نے سو سال پیشتر جب اصلاحی دورہ کیا تھا اور دہلی سے کلکتہ تک بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں سے جن بدعات خرافات، مشرکانہ رسم ورواج کو مٹایا اس میں سرفہرست اور سب سے نمایاں یہ تعزیہ داری تھی، ہر آبادی میں چاہے وہاں شیعہ کا ایک گھر بھی نہ ہو وہاں درجنوں تعزیہ کے چبوترے اور بنے بنائے تعزیہ گھروں اور مسجدوں میں رکھے ہوئے ضرور ہوتے تھے اور جب ان کو بتایا گیا کہ یہ مشرکانہ رسم ہے، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو ایک ایک دن میں آبادی کے

اندر بنے ہوئے درجنوں تعزیہ کے چبوترے کھود دیئے گئے اور تعزیوں کو نذر آتش کیا گیا اور کہیں کہیں تو اتنی بڑی تعداد میں تعزیہ تھے کہ جب ان کی لکڑیوں کو توڑ پھوڑ کر اکٹھا کیا گیا تو ان لکڑیوں سے پانچ پانچ سو آدمیوں کے لیے کھانا تیار کیا گیا، تعزیوں کی لکڑیوں کا اتنا بڑا بڑا انبار جمع ہو گیا تھا، سید صاحب کی سوانح میں اس رسم بد کے مٹانے کا بڑا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ لیکن سو سال بعد پھر وہی لعنت مسلمانوں میں عود کر آئی تھی اسی کا ایک نمونہ دیوبند کا یہ قصبہ تھا۔

کمک فراہم کی جاتی رہی :- اتنے بڑے ملک میں چند علماء حق کا ہر جگہ جا کر اس کے خلاف محاذ آرائی کرنا ممکن نہ تھا، پھر ابھی دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی مکتبۂ فکر کے اور دوسرے مدارس سے علماء و فضلاء کی اتنی بڑی تعداد فارغ ہو کر باہر نہیں آئی تھی کہ یہ فوج محاذِ جنگ سنبھال لیتی، ابھی اس جماعت کے وجود پذیر ہونے میں کچھ برسوں کا انتظار تھا جس سے خداوندِ قدوس کو مستقبل میں اپنے دین کا کام لینا تھا وہ بیسویں صدی کے آغاز میں جد و جہد کے میدان میں صف آرا ہوئی، البتہ اکابر علماء حق کی نگاہیں اس طرف لگی ہوئی تھیں، اپنی تقریروں میں تحریروں میں رَدِّ روافض کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن یہ علمی بحثیں تھیں جس کو تعلیم یافتہ طبقہ ہی سمجھ سکتا تھا عوام کی رسائی ان کتابوں کے مضامین تک نہیں تھی، اور عقیدہ کی خرابی عوام میں تھی اور وہی تعزیہ داری کی لعنت میں زیادہ گرفتار بھی تھے اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں سے اس لعنت کو مٹانے کے لیے ابھی برسوں کا انتظار باقی تھا، علماء حق نے جن مدارس کو قائم کیا تھا اس کے نتائج سامنے آنے میں ابھی دیر تھی، دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارن پور، جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد، میرٹھ مظفر نگر، مشرقی اضلاع میں اعظم گڈھ اور دور دراز علاقوں کے مدارس خاموشی کے ساتھ دینی تعلیم کے فروغ میں لگے ہوئے تھے اور ہر سال ملک میں اور اسلامی معاشرے میں اپنے ادارے کے فضلاء کو تیار کر کے بھیجتے رہے یہاں تک کہ پورے ملک میں جب علماء حق "حزب اللہ" بن کر ہر طرف پھیل گئے تب کہیں جا کر تعزیہ داری اور شیعی اثرات کے خلاف عمومی جنگ چھیڑی گئی اور کامیابی کی منزل کو پہونچی، ابتداءً انیسویں صدی کے آخر تک چند اکابر علماء شیعہ مجتہدین کے

زہریلے پروپیگنڈہ کی روک تھام میں لگے رہے۔

مولانا خلیل احمد محدّث سہارنپوری[1]:- مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو حضرت نانوتوی کے بعد سب سے پہلے عملی جدوجہد کے میدان میں آنا پڑا، آپ جس زمانہ میں ریاست بہاول پور میں بسلسلہ تدریس مقیم تھے، وہیں رد بدعت کے ساتھ ردِّ شیعیت کی جانب بھی توجہ کرنے کی ضرورت پیش آگئی، واقعہ یہ ہوا کہ شیعوں کے ایک مجتہد سید فرزند حسین نے ایک کتاب لکھی جس میں اپنی فطرت کے مطابق خلفاء ثلثہ اور صحابہ کرام پر طعن و تشنیع سے کام لیا تھا اور مسئلۂ خلافت پر بحث کی تھی، مجتہد صاحب کا مقصد صرف پروپیگنڈہ کرنا تھا اس لیے انہوں نے اپنے اس رسالہ کو علماء حق کے پاس خصوصیت سے بھیجا، بعض علماء نے اس کے جواب میں رسالے اور کتابچے بھی لکھے، اس

---

[1] مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ہندوستان کے مشہور علماء میں سے ہیں۔ آپ کی ولادت صفر ۱۲۶۹ھ مطابق نومبر ۱۸۵۲ء میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی، آپ کا بچپن اپنے وطن انبیٹھہ ضلع سہارنپور میں گذرا، آپ کے خاص استاد آپ کے ماموں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند ہیں، دوسرے اساتذہ میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں آپ نے سند فراغت حاصل کی، بھوپال، سکندر آباد، بہاول پور، بریلی، دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم دی، آخر میں دار العلوم دیوبند میں نائب صدر مدرس بنا کر بلائے گئے، کچھ دنوں بعد مظاہر علوم منتقل ہو گئے اور تا زندگی اسی سے وابستہ رہے سید العارفین مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت تھے اور آپ کے خلیفہ مجاز بھی ہیں، عرصہ دراز تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ ردِّ بدعت اور ردِّ روافض میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ کا اہم ترین کارنامہ ابوداؤد کی شرح بذل المجہود ہے پہلے یہ تقریباً پانچ جلدوں میں اور اب خوب صورت ٹائپ میں دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ رد بدعت و ردِّ روافض میں آپ کی کئی کتابیں ہیں براہین قاطعہ، المہند رد بدعت میں مطرقۃ الکرامہ اور ہدایات الرشید رد شیعیت میں مشہور کتابیں ہیں۔ آخر میں مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے۔ وہیں آپ کی وفات ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ ستمبر ۱۹۲۷ء میں ہوئی اور جنۃ البقیع میں مدفون ہوئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر ج ۸ تذکرۃ الخلیل مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اور حیات خلیل مصنفہ مولانا محمد ثانی حسنی۔

کے جواب میں فرزند حسین صاحب نے اور زیادہ گرم دوسرا رسالہ لکھا اور علماء اہل سنت کے جواب کا رد کیا، یہی جواب الجواب مولانا خلیل احمد صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور اصرار کیا گیا کہ اس کا مسکت جواب دیدیا جائے، آپ اسی زمانہ میں وطن آرہے تھے، فرزند حسین صاحب کا وہ رسالہ بھی اپنے ساتھ لائے اور اپنے شیخ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں لے کر گئے تو آپ نے مولانا موصوف کو اس کا جواب لکھنے کی تاکید فرمائی اس لیے پورے جوش و خروش کے ساتھ شیعہ کتب کا مطالعہ کیا اور اس کا جواب لکھنا شروع کیا، اسی دوران ایک اور واقعہ ہوگیا

سید فرزند حسین صاحب زبان دراز مجتہد تھے اور علماء حق سے الجھنے کا مزاج رکھتے تھے وہ لدھیانہ (پنجاب) پہونچے اور وہیں مولانا مشتاق احمد صاحب[1] انبیٹھوی نے ان کو مناظرہ کا چیلنج کردیا اور پھر بڑا معرکۃ الآراء مناظرہ ہوا، مناظرہ میں مجتہد صاحب کو ایسی ذلت آمیز شکست ہوئی کہ ان کی زبان بند ہوگئی اور ان کی شکست کی خبر ہر طرف پھیل گئی اور رسوائی ہوئی، انہوں نے اب تک جو کچھ بھی تقریریں کی تھیں، کتابیں لکھ کر اپنے مذہب کا پروپیگنڈا کیا تھا وہ سب ہوا میں اڑ گیا، ان کا وزن از خود گھٹ گیا اور لوگوں کو علی رؤس الاشہاد ان کے مبلغ علم کا پتہ چل گیا مولانا خلیل احمد صاحب نے جب یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ایسے شخص کی ہفوات کا جواب دینے سے کیا حاصل؟ جس کی جہالت کا راز فاش ہوچکا تھا اور اس کی تحریر کا وزن گھٹ چکا تھا، آپ نے اب تک جتنا لکھا تھا وہیں قلم روک دیا اور اس کو فعل عبث

---

[1] مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی بن مخدوم بخش بن نوازش علی حنفی انصاری کی ولادت انبیٹھہ ضلع سہارن پور میں ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں ہوئی، مولانا سعادت علی سہارنپوری، مولانا سدید الدین دہلوی، مولانا سید محمد علی چاندپوری اور مشہور ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری آپ کے اساتذہ ہیں، حدیث قاری علیم الرحمن ابن محمد بانی پتی سے پڑھی، آپ کی کئی کتابیں ہیں، زیادہ تر آپ کی کتابیں غیر مقلدین کے رد میں ہیں۔ ان کی دو کتابیں قادیانیوں کے رد میں بھی ہیں المعراج الجسمانی فی الرد علی القادیانی، تبشیر الاصفیاء فی اثبات حیات الانبیاء ہیں۔

آپ کی وفات محرم ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔

سمجھا، اس کی اطلاع حضرت گنگوہی کو پہونچی تو آپ نے مولانا خلیل احمد صاحب کو لکھا:۔

"جس کام کی ابتدا نیک نیتی کے ساتھ بغرض حمایتِ اسلام کی گئی، اس کا انجام بخیر ہے، اس تحریر کو پورا کر دینا ہی مناسب ہے۔"

اس مکتوب کا ذکر مولانا خلیل احمد صاحب نے اپنی کتاب کے شروع میں کیا ہے، اس خط کے بعد آپ نے پوری دلچسپی سے کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ سات آٹھ ماہ میں یہ کتاب مکمل ہوئی جو پونے نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، ردِ شیعیت میں اب تک اتنی مدلل اور مفصل کتاب کم ہی لکھی گئی ہے، اسی زمانہ میں شائع ہوئی کتاب کا نام "ہدایات الرشید الی افحام العنید" ہے، اسی کتاب سے آپ نے ردِ شیعیت میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور پھر آپ نے مجمعِ عام میں روافض سے معرکۃ الآرا مناظرے کیے، انہیں مناظروں میں سے امروہہ کا مناظرہ ہے جس میں متکلم امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی[1] تھے،

---

[1] مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی جو امام اہلِ سنت کے نام سے رد روافض کے سلسلہ میں مشہور ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۷۶ء کو قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم فتح پور ہنسوہ میں حاصل کی پھر لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ کی خدمت میں پہونچ گئے، بقیہ کتب درسیہ سب انھیں سے پڑھیں ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۸ھ تک آپ اپنے استاذ سے وابستہ رہے، حکیم عبدالولی سے طب پڑھی مگر اس کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا، مولانا محمد علی مونگیری نے آپ کو ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس بلالیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد اس سے ترکِ تعلق کرلیا اور دہلی چلے گئے، اسی زمانہ میں لکھنؤ اور مضافاتِ لکھنؤ میں ایک شیعہ مولوی مقبول احمد نے علی الاعلان تبرا کی مجلسیں پڑھنا اور سنیوں کو مناظرے کا چیلنج دینا شروع کر دیا، مولانا عین القضاۃ نے شیعوں کے دفاع کے لیے آپ کو دہلی سے لکھنؤ بلالیا پھر آپ نے دشمنانِ صحابہ کے خلاف اپنے آپ کو وقف کر دیا، تصنیف و تالیف بحث و مناظرہ، تحریر و تقریر میں مشغول ہونے کے علاوہ ایک اخبار "النجم" ہفتہ وار جاری کیا اور ردِ شیعیت میں اس کثرت سے لکھا کہ پوری دنیائے اسلام میں اس کی مثال نہیں ملتی، شیعہ مجتہدین سے درجنوں مناظرے کیے، آپ کی علمی یادگاروں میں ترجمہ قرآن، ترجمہ اسد الغابہ، ترجمہ ازالۃ الخفاء، ترجمہ انصاف ترجمہ فقہ اکبر ترجمہ تطہیر الجنان، ترجمہ شمائل ترمذی، نفحہ عنبریہ، سیرت خلفاء راشدین، علم الفقہ، سیرت خیر البریہ، سیرت الحبیب الشفیع، (باقی بر صفحہ آئندہ)

مطرقۃ الکرامۃ:۔ جب شیعوں کی نایاب کتابیں ہدایات الرشید کی تسوید کے وقت مولانا سہارن پوری کی دسترس میں آئیں تو ذہن از خود شیعیت کی تردید کی طرف مائل ہوگیا اور آپ نے ردبدعت کے ساتھ ردشیعیت کو بھی اپنی زندگی کا مشن بنالیا، اسی سلسلہ کی دوسری کڑی آپ کی کتاب "مطرقۃ الکرامۃ ہے، علمارحق میں سے کچھ لوگ رَدِّ شیعیت میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن شیعوں کی بنیادی اور اہم کتابوں سے ناواقف تھے، دوسرے یہ کہ ان کی کتابیں کمیاب بھی تھیں اس لیے وہ شیعوں سے مباحثہ میں صرف مدافعانہ پہلو اختیار کرنے پر مجبور تھے، اقدام کرنے کے لیے ان کی کتابوں کا مطالعہ چاہیئے اور یہی بات حاصل نہیں تھی، اس لیے ان کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

مولوی امیر علی بریلوی جو مولوی احمد رضا خان بریلوی کے خاندانی مذہب سے وابستہ تھے ان کو بعض شیعوں سے مباحثہ کی نوبت آئی تو ان کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے علمار کے پاس شیعوں کے ان اعتراضات کے جواب کے لیے توجہ کی تو انہوں نے بہانے کیے، کسی نے معذرت کردی کسی نے کہا کہ اس کے لیے ایک ہزار روپیہ کا بندوبست کیجیے، ان کی کتابیں خریدی جائیں اور مطالعہ کی جائیں تو جواب دیا جا سکتا ہے۔ عاجز آکر مولوی امیر علی بادلِ ناخواستہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے جو ان دنوں بریلی کے ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے، انہوں نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا تو مولانا نے اس میں حمایتِ اسلام کا ایک پہلو دیکھ کر جواب کی حامی بھری اور پھر آپ نے اپنے قیامِ بریلی کے زمانہ میں "مطرقۃ الکرامۃ" ردشیعیت میں تحریر فرمائی تاکہ شیعوں کے پوست کندہ عقائد کو واشگاف لفظوں میں بیان کردیا جائے اور ان سے مباحثہ کرنے والوں کے سامنے روشنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) موسویہ، القول المحکم، آیات محکمات، قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی، تحریف کی خانہ ساز حقیقت کا جواب، تنبیہ الحائرین، ابوالائمہ کی تعلیم، تحقیق آل واہلِ بیت، تفسیر آیاتِ قرآنیہ۔

آپ کی وفات، ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی محلہ چکنڈی چپشاہ میں دفن ہوئے، تفصیل کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر جلد ۸ و مقدمہ تفسیر آیاتِ خلافت شائع کردہ لاہور۔

رہے، کتاب ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے جو پہلی جلد کے طور پر شائع ہوئی ہے، اس کی تکمیل کے بعد آپ بریلی سے دارالعلوم دیوبند نائب مدرس ہو کر تشریف لائے، اس لیے دوسری جلد کی نوبت نہیں آئی۔

غور و فکر کی راہیں بدل رہی ہیں:- حضرت نانوتوی کے بہت سے مکتوبات چھوٹے چھوٹے رسالوں میں شائع کیے گئے جو علم و معرفت کا خزانہ ہیں، ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہیں اور اپنے شکوک و شبہات کو دور کرنے کی ان کے سینوں میں تڑپ پیدا ہونے لگی ہے ایسے لوگ اپنے اشکالات لکھ کر حضرت نانوتوی کے پاس بھیجتے ہیں تاکہ آپ کے علمی جواب سے طمانیت قلب حاصل کریں، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زوالِ حکومت کے بعد جب شیعی حکومت کی سخت گیریوں کا خوف دلوں سے نکل گیا تو وہ لوگ جو اپنی جاگیر اور زمینداریوں کی حفاظت کے خیال سے شیعیت کا اظہار کرنے لگے تھے شیعوں کے دورِ عروج کے زوال کے بعد ان کا ضمیر ان کو ملامت کرنے لگا چونکہ ان کا دل کلی طور پر شیعوں کے سارے زہر کو ہضم نہیں کر سکا تھا اس لیے ان پر شیعیت کا رنگ گہرا نہیں تھا وہ اکثر حضرت نانوتوی سے استفسار کرتے تھے، ایسے لوگوں کو آپ نے مدلل جوابات دیئے ہیں مثلاً ایک صاحب نے شیعوں کے کفر و ایمان کے بارے میں سوال کیا، آپ نے ان کو تفصیلی جواب دیا، اس جواب کا ایک ٹکڑا یہ تھا کہ:-

شیعہ و خوارج و غیرہم و اہل بدعت واہواء نہ مؤمن اند نہ کافر، و ہم مؤمن اند و ہم کافر، الغرض قسم دیگر اند۔	شیعہ و خوارج اور اہل بدعت وغیرہ نہ مومن ہیں نہ کافر، اور مؤمن بھی ہیں اور کافر بھی، الغرض وہ ایک دوسری ہی قسم ہیں۔

آپ نے اس اجمال کی تفصیل بھی پیش کی ہے اور تحریر فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے گروہ میں سے اس لیے نہیں ہیں کہ وہ قرآن و حدیث کے تابع اور متبع کتاب و سنت نہیں ہیں، اور کافروں کے گروہ میں سے اس لیے نہیں ہیں کہ وہ توحید و رسالت کے منکر نہیں ہیں

اور نہ قرآن وحدیث کو جھٹلاتے ہیں، اس لحاظ سے کہ وہ کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے ہیں اور ان کے دل میں بھی ہے، روزہ نماز حج زکوٰۃ وغیرہ احکام اسلامی بجالاتے ہیں، ان اسلامی اعمال وافعال کے ساتھ ان کے باطل عقائد نفسانی خواہشات کی اتباع ان کی دین کی راہوں میں کجی پیدا کرتی ہے[1]

مرزا قاسم بیگ کے نام ایک خط:- مولانا نانوتوی کا ایک خط مرزا قاسم علی بیگ کے نام ہے جس میں شیعوں کے بعض فرسودہ اعتراضات کا آپ نے جواب دیا ہے، اصل خط فارسی میں ہے، میں اس کے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں کیونکہ خط بہت طویل ہے، آپ لکھتے ہیں:-

"..... جو سوالات آپ نے تحریر فرمائے ہیں شیعوں کو سیکڑوں بار دندان شکن جوابات سنّیوں کی طرف سے دیئے جا چکے ہیں مگر آفریں ہے ان کی حیا پر کہ جواب الجواب کا جواب ہے اور پھر وہی پرانی بات زبان پر لاتے ہیں، ان کی مثال ویسی ہی ہے کہ بے شرم کمزور گالیاں بکتا ہے، اور طاقتور اس کو گھونسے رسید کرتا ہے تھپڑ اور جوتے لگاتا ہے مگر پھر وہی گالیاں بکتا ہے اسی وجہ سے میرا دل نہیں چاہتا کہ اس کے جواب میں خامہ فرسائی کروں اور خواہ مخواہ وقت ضائع کروں، مگر یہ سوچ کر کہ آپ کا یہ پہلا خط ہے اگر جواب نہ دوں تو کیا کروں،

"ذوالفقار" کے متعلق شیعوں کے خود تراشیدہ افسانے ہیں جو کچھ بھی اس کے متعلق وہ بیان کرتے ہیں سب غلط ہیں، اس کی اصل حقیقت بس اتنی سمجھنی چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے صحابہ کے جمِ غفیر نے بیعت کی اور کار وبارِ خلافت اور بیت المال کی حفاظت اور اوقاف کی دیکھ بھال کو انھوں نے اپنا

---

[1] فیوضِ قاسمیہ ص ۱ و ۲

فرض منصبی جانا چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو اپنا خلیفہ پہلے ہی سمجھ رکھا تھا اس لیے انھیں کے سامنے آپ نے اپنے تمام ترکے کو وقف فرما دیا تھا تاکہ وفات کے بعد کوئی الجھن نہ ہو اور حقیقتِ حال سے ناواقفیت کی وجہ سے اس کا کوئی دوسرا انتظام کرنے لگیں، اسی لیے آپ نے جو کچھ فرمایا حضرت ابوبکرؓ کے سامنے فرمایا کہ نَحْنُ مَعَاشِرَ الانبیاء، لا نورث، ما ترکناہ صدقۃ، ہم جو کچھ چھوڑ کر جائیں وہ صدقہ ہوگا نہ کہ میراث، یعنی خدا کی راہ میں جس کو مناسب سمجھیں دے دیں۔ اسی کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آراضی کو ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت کے نان نفقہ کے لیے خاص کر دیا اور اشیاء منقولہ کو بطور تبرک لوگوں میں تقسیم کر دیا، انھیں میں سے چند چیزیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھی حصہ میں آئیں، اس میں وہ تلوار بھی تھی جس کو ذوالفقار کہتے ہیں، حضرت زین العابدین تک اس تلوار کا پہونچنا کتب حدیث سے بظنِ غالب معلوم ہوتا ہے آپ کی وفات کے بعد وہ کس کے ہاتھ میں گئی؟ اس کا علم نہیں، شاید کسی نے بغرض تبرک مانگا ہو اور آپ نے ان کو دے دی ہو، واللہ اعلم۔ معتبر کتابوں سے صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شیعہ جو کہتے ہیں وہ سب بے اصل ہے۔"

شیعوں نے ایک بے اصل بات یہ بھی مشہور کر رکھی تھی کہ اصحاب ثلثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم اہلِ بیت کی شفاعت کے بغیر نہیں بخشے جائیں گے، اس کے جواب میں حضرت نانوتوی نے اپنے اسی خط میں تحریر فرمایا کہ:-

"احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ فیض ترجمان سے اصحاب ثلثہ نے جنت کی بشارت پائی ہے۔ جس کو اللہ کے رسول نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی ہو اس کو دوسروں سے شفاعت کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے علاوہ خداوند قدوس نے قرآن پاک کے متعدد مقامات میں ان کی دین میں استقامت، دین کے سلسلہ میں ان کے عظیم الشان کارنامے

اوران کی قربانیوں کی مدح فرمائی ہے جو اہلِ بیت میں سے سوائے بعض افراد کے دوسرے کو یہ شرف حاصل نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ بعض دوسرے شرف ان کو حاصل ہیں۔ ایسی صورت میں کسی مسلمان کو یہ تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ صحابۂ کرام بالخصوص اصحابِ ثلثہ اہلِ بیت کی شفاعت کے محتاج ہونگے اس طرح کے خیالات شیعوں کی مَن گھڑت باتیں ہیں کیونکہ وہ حدیث و قرآن سے بے خبر ہیں، اور اپنی عقل کی نارسائی سے ایک گڈھے سے نکل کر دوسری گھاٹی میں گرتے رہتے ہیں، سورۂ توبہ کی آیت ہے :۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّھُمْ فِیْھَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ خَالِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ..... خداوندِ قدوس کے اس قدر وعدوں کے باوجود اگر اہلِ بیت کی شفاعت کی ضرورت صحابۂ کرام بالخصوص اصحابِ ثلثہ کو ہے تو اس وعدے کا حاصل یہ ہوگا کہ معاذ اللہ قول و قرار اور عہد و پیمانِ الٰہی کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے اور اہلِ بیت کی قدرت و طاقت خدا کی قدرت و طاقت پر قیامت کے دن غالب ہوگی، اسی لیے اصحابِ ثلثہ کو اہلِ بیت کی شفاعت کی ضرورت پڑیگی نعوذ باللہ من امثال ہذہ العقائد الباطلۃ .....''

روافض کا ایک بڑا الزام تینوں خلفا۔ راشدین پر یہ بھی ہے کہ ان حضرات نے حضرت فاطمہ رضؓ کو فدک نہ دے کر ان کی حق تلفی کی ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت فاطمہ رضؓ نے اس کا مطالبہ بھی کیا تھا، اس مسئلہ پر حضرت نانوتوی اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

''..... حضرت فاطمہ رضؓ کی حق تلفی اس وقت متصوّر ہوسکتی ہے جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مُردہ بے جان تصوّر کریں، اور حیاتِ نبوی کو نہ تسلیم

کریں، یہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مستند دلائل سے ثابت ہے، اس طرح کے خیالات وہی لوگ رکھتے ہیں جو حضورؐ کی قدر و منزلت کو نہیں سمجھتے ہیں، شیعوں کی بدعقیدگی اس حد کو پہونچ چکی ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ بدعقیدگی رکھنے لگے ہیں۔ حضورؐ اب بھی زندہ ہیں اور اسی جسمِ اطہر کے ساتھ جو مسلمانوں کی آنکھوں کا نور ہے..... جب حیاتِ نبوی ثابت ہے تو میراث کا کیا سوال؟ اسی وجہ سے ازواجِ مطہرات کا نکاح بھی حرام ہے کسی شخص کی زندگی میں نہ اس کے مال میں میراث جاری ہوسکتی ہے اور نہ اس کی بیوی سے دوسرے کو نکاح کرنا جائز ہے۔" [1]

مراسمِ تعزیہ داری وغیرہ شریعت کی نظر میں:۔ اب تک میں نے آپ کے سامنے شیعوں سے جو علمی مناقشے چلتے تھے اس کی ایک جھلک پیش کی ہے، جس کا تعلق عام طور پر اہلِ علم سے ہے چونکہ شیعی عقائد کے جراثیم اتنے عام تھے کہ جو لوگ صحیح العقیدہ تھے شیعوں کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے ان کے دلوں میں بھی کھٹک پیدا ہوگئی، جیسے ذہن و فکر میں کانٹا چبھ کر رہ گیا ہو، اس لیے ان کے ذہنوں کو پہلے صاف کرنا ضروری تھا، لیکن ہمارے علماء کا اصل مقصد دعوت و اصلاح تھا اور ان لوگوں کو راہِ راست پر لانا تھا جو خاندانی اعتبار سے صحیح العقیدہ تھے، لیکن حالات اور ماحول کے اثر سے ان کے عقائد ان مشرکانہ مراسم تعزیہ داری سے داغدار ہوگئے تھے یہ یقین تھا کہ ایسے لوگوں کو جب دین کی صحیح تعلیمات و روایات کو بتایا جائے گا تو اپنی پرانی غلطیوں سے ان کو توبہ کی توفیق ہوگی، ورنہ شیعہ مناظرین کو اکھاڑے میں شکست دیتے رہنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، کیونکہ ان کو اپنی گمراہی کا احساس بھی ہوجائے تب بھی ان کا راہِ راست پر آنا ممکن نہیں تھا، اس لیے عوام سے براہِ راست رابطہ کرنے کی کوشش ضروری تھی۔

---

[1] فیوضِ قاسمیہ مجموعہ مکاتب حضرت نانوتوی ص ۱۱ و ۱۲ و ۱۳

اس سلسلہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دارالافتاء کی راہ سے ٹھوس اور نتیجہ خیز اصلاح کا کام شروع کیا اور سینکڑوں استفتاء کا جواب جو مختلف گوشوں سے تعزیہ داری اور اس سے متعلق مراسم اور طور طریق کے بارے میں آتے تھے اور لوگ اصل شریعت کا حکم صحیح جاننا چاہتے تھے آپ ان کے فیصلہ کن اور دو ٹوک جوابات حدیث و قرآن کی روشنی میں دیتے اور ان مراسم میں ملوث لوگوں کے دلوں میں بدعقیدگی کا جو چور بیٹھا ہوا تھا اس کو نکالنے کے لیے آپ نے بیشتر اوقات سخت سے سخت الفاظ استعمال کیے بالکل اسی طرح جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کا اعلان فرمایا تو آپ نے شراب کے ساتھ شراب کے برتنوں کے استعمال کی بھی سختی سے ممانعت فرمادی تھی کہ ان کو دوسری ضرورتوں میں بھی استعمال نہیں کرسکتے، تاکہ شراب کی طرف ان کا ذہن کسی بھی حال میں منتقل نہ ہوسکے، جب معاشرہ سے شراب کا اثر پوری طرح ختم ہوگیا تو برتنوں کے استعمال کی اجازت مرحمت فرمائی، حضرت گنگوہی نے عوام کے ذہنوں کو پڑھ کر ٹھیک ان کے ذہن کے اندر جھانک کر اس ایمانی کمزوری کو محسوس کیا جو ایک عرصہ تک شیعی مراسم کی ادائیگی کی وجہ سے پیدا ہوچکی تھی آپ کا لب لہجہ سخت اور گرم رہتا تھا تاکہ ان مشرکانہ رجحانات، خیالات اور عقائد سے ان کے دل و دماغ جتنی جلد صاف ہوجائیں، بہتر ہے۔

علماء حق نے پورے ہندوستان میں تقریر و وعظ کی مجلسوں میں ان مشرکانہ طرز عمل کے خلاف شعلہ بار تقریریں کیں، شیعوں کے پوست کندہ عقائد کو واشگاف لفظوں میں بیان کیا اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ تعزیہ داری، نوحہ و ماتم، مرثیہ خوانی، سبیل لگانا، شربت، کھچڑا وغیرہ یہ سب گمراہ شیعوں کا طریقہ ہے، مسلمانوں کو اس سے دور رہنا چاہیئے، مسلسل تقریر اور وعظوں کے بعد جب لوگوں نے سنجیدگی سے اس پہلو پر سوچنا شروع کیا تو علماء حق سے مسائل پوچھنے شروع کیے اور تشفی چاہی تب علماء حق نے دارالافتاء کے ذریعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کو صحیح مسئلے بتائے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی جو سرخیل علماء دیوبند تھے اور اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ

میں اپنے دَور میں امتیازی خصوصیات کے مالک تھے، ان کے پاس جتنے فتوے اس سلسلہ میں آئے اور جس طرح جوابات دیئے گئے اس کے چند نمونے میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں :۔

استفتاء:۔ تعزیوں کے ساتھ بہ نیت تماشا غیر اعتقاد سے جانا کیسا ہے؟ زید کہتا ہے کہ زیارت کرنا تعزیوں کا اچھا ہے جیسے خانۂ کعبہ کا نقشہ لاتے ہیں اور اس کی زیارت کرتے ہیں، ایسے ہی یہ بھی ایک مکان کا نقشہ ہے اس کی زیارت میں کچھ نقصان نہیں، مسئلہ کیا ہے؟

فتویٰ:۔ تعزیہ بُت ہے، کعبہ کا نقشہ مثل نقشہ مکان کے ہے، اس کی کوئی پرستش نہیں کرتا، اگر اس کی پرستش کرے گا تو بھی کفر ہو جائیگا[1]

استفتاء:۔ یوم عاشورہ کو یوم شہادتِ حسین گمان کرنا، احکام ماتم و نوحہ و گریہ وزاری و بے قراری کے برپا کرنا، گھر گھر مجالس شہادت منعقد کرنا، واعظین کو ان ایام میں شہادت نامہ بیان کرنا ایصالِ ثواب و صدقات کرنا اور تعیین آب بھی مثل شربت پینے؟ کچھڑا ہر غنی و فقیر کو لینا اور تبرک جاننا کیسا ہے؟

فتویٰ:۔ (۱) ذکر شہادت کا ایام عشرہ میں کرنا بہ مشابہت روافض کے منع ہے، ماتم و نوحہ حرام ہے، خلاف روایات بیان کرنا سب ابواب میں حرام ہے تقسیم صدقات بہ تخصیص ان ایام میں کرنا اگر یہ جانتا ہے کہ آج ہی زیادہ ثواب ہے تو بدعتِ ضلالۃ ہے، علیٰ ہذا کسی طعام کی تخصیص کسی یوم کے ساتھ کرنا لغو ہے[2]۔

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ کامل شائع کردہ گلستان کتاب گھر دیوبند ص ۶۶

[2] حوالہ مذکور ص ۳۹

(۲) محرم میں ذکر شہادت حسین کرنا اگرچہ بہ روایاتِ صحیحہ ہو، یا سبیل لگانا شربت پلانا، سبیل و شربت میں چندہ دینا، یا دودھ پلانا، سب ناروا اور شبہ روافض کی وجہ سے حرام ہے۔[1]

مراسم تعزیہ داری سے متعلق اصل کتاب میں بہت سے سوالات و جوابات ہیں۔ میں نے صرف بطور نمونہ یہ تین جوابات آپ کے سامنے پیش کیے کہ جب ان فاسد عقائد کا علاج شروع کیا گیا تو کیسا پوسٹ مارٹم کیا گیا، آپ ان جوابات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ شریعت کے مسائل بیان کرنے میں کسی طرح کی لچک علماء حق کے لب و لہجہ میں کہیں نہیں تھی،

رَدِّ روافض کی لگن:- حضرت گنگوہی کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی کا نام لینا از بس ضروری ہے، آپ کو نوجوانی ہی سے جب آپ بہاول پور میں مدرس تھے، شیعوں سے سابقہ پڑ چکا تھا، اس لیے ردّ شیعیت کا آپ کے دل میں شدید جذبہ موجزن تھا اور ردِّ شیعیت میں صرف کتابیں لکھ کر آپ نے کام ختم نہیں کر دیا بلکہ شیعہ مناظرین کو فسادِ عقیدہ پھیلانے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے اور ان کا منہ بند کرنے کی جد و جہد فرماتے، آپ نے امروہہ ضلع مراد آباد میں شیعوں کے مجتہد اعظم کو میدانِ مناظرہ میں پکڑا تو آپ نے اس وقت تک اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی جب تک کہ اپنی موجودگی میں امام اہل سنت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کو متکلم بنا کر کھڑا نہیں کر دیا اور پے در پے سوالات اور شیعی مذہب کے پوست کندہ عقائد کا پوسٹمارٹم کر کے شیعوں کو آتنا رسوا نہیں کر دیا کہ وہ امروہہ چھوڑ کر راتوں رات چلے جائیں جب وہ فرار ہو گئے تب آپ امروہہ سے ہٹے، حالانکہ اسی دوران حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا دہلی میں انتقال ہو جاتا ہے، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اسی روز امروہہ سے جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے دیوبند جاتے ہیں اور مولانا خلیل احمد صاحب جن کے حضرت شیخ الہند سے گوناگوں تعلقات تھے اس کے باوجود محض اس لیے امروہہ

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۹

سے نہیں ہٹے کہ شیعہ مناظرین کو غلط پروپیگنڈہ کا موقعہ مل جائے گا، اس جوش و جذبہ سے آپ نے شیعیت کا مقابلہ کیا۔

امام اہلِ سنت :- شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی "تحفۂ اثنا عشریہ" کے بعد جس شخص نے شیعہ اور روافض کے عقائد اور ان کے مذہب کے پوست کندہ حالات منظرِ عام پر پیش کیے اور ان کی وہ تصویر اسلامی دنیا کے سامنے پیش کردی جو ان کی مذہبی کتابوں میں چھپی ہوئی تھی اور شیعی مذہب کی علم و تحقیق کی بنیاد پر مکمل اور بھرپور تردید کی اور دنیا کے سامنے ان کی نقاب نوچ کر پھینک دی جو انہوں نے اسلام کا مکھوٹا اوڑھ رکھا تھا وہ امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور صاحب مجددی لکھنوی کی ذاتِ گرامی تھی۔

شاہ صاحب نے اپنی کتاب لکھ کر دنیائے شیعیت میں زلزلہ ڈال دیا، ان کے مذہب کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا اور وہ تمام بنیاد کے پتھر اکھیڑ کر رکھ دیئے جن پر روافض کے مذہب کی پوری عمارت کھڑی تھی، یہ دنیائے شیعیت کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا اس لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ان تمام بنیادی پتھروں کو جمع کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جو شاہ صاحب کے فولادی ہاتھوں نے اکھیڑ دیئے تھے، تحفۂ اثنا عشریہ کے جواب میں پے در پے اور مسلسل کتابوں کی تصنیف سے ان کی بے چینی اور اضطراب کا صاف پتہ چلتا ہے، میرے علم میں تحفۂ اثنا عشریہ کے جواب میں شیعوں کی طرف سے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں :-

تحفۂ اثنا عشریہ کے بابِ نبوت کے جواب میں "صوارم الالٰہیات"۔ باب المعاد کی تردید میں "حسام الاسلام"۔ باب الولاء والبراء کی تردید میں "احیاء السنۃ"، "ذوالفقار" اور ایک رسالہ "غیبت امام مہدی"۔ یہ پانچوں کتابیں "تحفۂ اثنا عشریہ" کے مختلف ابواب کے جواب میں شیعوں کے مشہور مجتہد سید دلدار علی بن محمد معین حسینی نصیر آبادی نے لکھی ہیں، ان کے صاحبزادے محمد بن دلدار علی نصیر آبادی نے تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں کتاب البوارق، طعن الرماح، الصمصام القاطع، ثمرۃ الخلافۃ، البرق الخاطف

الضربۃ الحیدریہ فی الرد علی الشوکۃ العمریہ، سُتّم الفار تصنیف فرمائیں، اتنی کتابوں کے باوجود یہ یقین نہیں حاصل ہو رہا تھا کہ تحفہ اثنا عشریہ کا جواب ہوگیا، اس لیے دوسرے شیعوں نے بھی جواب میں زور لگایا۔ مرزا محمد بن عنایت احمد شیعی دہلوی نے کتاب النزہۃ، "تنبیہ اہل الکمال والانصاف واختلال رجال اہل الخلاف" لکھیں، تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں مفتی محمد قلی خاں کنتوری نے السیف الناصری، تقلیب المکائد، برہان العادۃ، تشئید المطاعن، مصارع الافہام تحریر فرمائی، اس طرح مفتی قلی خاں نے اپنی پوری زندگی تحفہ کے جواب میں صرف کردی مگر اہلِ انصاف کا اب بھی یہی فیصلہ تھا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، خود شیعوں کو بھی اپنی ناکامی کا احساس تھا، اس کتاب سے جو کاری زخم شیعوں کے مذہب کو لگا تھا وہ معمولی مرہم پٹی سے مندمل ہونے والا نہیں تھا، مزید یہ کہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے شیعیت کے جسم کو اور بھی چھلنی کردیا اور ان کے پرانے زخم پھر رسنے لگے۔

پھر بُرے دن آگئے:۔ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے مشہور تبرّا باز مولوی مقبول احمد سے مباحثہ کرکے جب ردِّ شیعیت کی مہم کا آغاز کیا تو آگے چل کر انہوں نے ان کے بڑے بڑے مجتہدین کی طلاقتِ لسانی فراموش کرادی اور سوالات کے ایسے مضبوط شکنجوں میں ان کو کسا کہ وہ تلملانے کے سوا اس سے نجات کی ان کے پاس کوئی صورت نہیں تھی امام اہلِ سنت نے شیعوں کی شہ رگ کو چٹکیوں میں پکڑلیا اور ان کی ہی کتابوں سے ثابت کیا کہ شیعوں کا ایمان قرآنِ پاک پر نہیں ہے، اور اس کے ثبوت میں شیعوں کی کتابوں سے اتنے دلائل فراہم کیے اور ان کے علماء کی ایسی تشریحات پیش کیں جن کی تکذیب ان کے بس کی بات نہیں تھی، اور جب "ایمان بالقرآن" ثابت نہیں کرتے تو ان کے مذہب کی ساری عمارت ہی زمین بوس ہوجاتی ہے، آپ نے شیعوں کی مستند اور معتبر کتابوں سے اپنا دعویٰ ثابت کردیا اور اس کا نتیجہ بھی نکال دیا کہ جب ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ختم نبوت پر بھی ایمان نہیں ہے، انھیں دونوں باتوں کا وہ ظاہری طور پر اقرار کرکے اپنے کو مسلمانوں کی فہرست میں شامل ہونے کے وہ حقدار بنے ہوئے ہیں، اسی لیے وہ کبھی کھلے بندان باتوں

سے انکار نہیں کرتے کیونکہ ان میں سے کسی بات کا وہ صراحتاً انکار کر دیتے ہیں تو اُمت مسلمہ متفقہ طور پر جس طرح قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر مسلمانوں کی فہرست سے خارج کر دیا اور اسلام کو محفوظ کر لیا، اسی طرح شیعوں کو بھی غیر مسلم اقلیت کی فہرست میں داخل کر کے ان سے نجات حاصل کر لیتی، اسی لیے کوئی بھی شیعہ مجتہد ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتا، جبکہ ان کی کتابوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ایمان قرآن پر نہیں ہے۔ مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل سے ثابت کر کے کہ قرآن پر ایمان نہیں تو ان سے جواب طلب کیا کہ وہ بتائیں کہ اسلام میں ان کے لیے کوئی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے۔

امام اہل سنت کی خصوصیات:۔ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب نے تقریباً آدھی صدی تک دنیائے شیعیت میں زلزلہ ڈالے رکھا، ہندوستان کے گوشے گوشے یعنی پنجاب، بمبئی، اتر پردیش کے اضلاع اور دوسرے صوبوں میں شیعوں سے اَن گنت مناظرے کیے اور ہر جگہ انہوں نے صداقت وحقانیت کا پرچم لہرایا اور ہر بار شیعہ اپنے عیوب کھلوا کر رسوا ہوتا رہا، ان کامیاب مناظروں میں سب سے اہم کردار شیعوں کی ان نایاب اور کمیاب کتابوں کے ذریعہ ادا کیا گیا جو امام اہل سنت نے حاصل کر لی تھیں، جن کتابوں کو وہ چوری کے مال کی طرح اہل علم سے چھپاتے رہتے تھے آپ ان کا تفصیلی مطالعہ کر چکے تھے، شیعہ روایات اور ان کے بنیادی عقائد سے خوب واقف ہو چکے تھے، اس لیے ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'' والی بات ہو گئی۔

آپ امام اہل سنت کی کتابیں پڑھیں گے تو شیعوں کی ان تمام بنیادی کتابوں کے حوالے بقید جلد وصفحہ ملتے چلے جائیں گے جن کو وہ قرآن وحدیث کی طرح اہمیت دیتے ہیں اسی لیے وہ ہر مناظرہ میں شیعوں پر ایسی گرفت کرتے تھے کہ ان کو مجال انکار نہیں رہتی تھی، اس لیے آپ سے مناظرہ کرتے ہوئے وہ کتراتے تھے، سرسری مطالعہ کے بعد میں نے امام اہل سنت کی بعض تحریروں میں شیعوں کی جن اہم کتابوں کے نام پائے ہیں وہ یہ ہیں:۔ الاحتجاج مصنفہ علامہ طبرسی، کسی کی کتاب الرجال، علامہ باقر مجلسی کی حق الیقین، حیات القلوب، تحفۃ الزائرین، جلاء العیون، قاضی نوراللہ شوستری کی مجالس المومنین، احقاق الحق، علامہ محمد تقی

کی روضۃ المتقین، علامہ خلیل قزوینی کی صافی شرح کافی، علامہ محسن کاشی کی تفسیر صافی، علامہ طبرسی کی مجمع البیان ابن مسلم کی شرح نہج البلاغۃ، نہج البلاغۃ اصول کافی، فروع کافی، تنقیح رجال کشی من لایحضرہ الفقیہ، روضہ کافی، اساس الاصول، اللامع الہتون ترجمہ جلاء العیون، تنقیح المقال، حملہ حیدری، علامہ علی طہرانی کی توضیح المقال وغیرہ وغیرہ۔ یہ فہرست امام اہل سنت کے صرف دو چھوٹے چھوٹے رسالوں کی مدد سے بنائی گئی ہے۔

اسی طرح آپ نے ردِ شیعیت پر ہزاروں صفحات اور سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں، وہ تمام شیعوں کی نایاب اور کمیاب کتابوں کے حوالوں سے بھری ہوئی ہیں، شیعوں کی بہت سی کتابیں ایسی بھی آپ کے مطالعہ میں رہیں جن کے نسخے ہندوستان کی لائبریریوں میں نایاب ہیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کی ہر تحریر، مضمون اور کتاب ردِ شیعیت میں مسکت، ناقابلِ تردید ہوتی رہیں۔

امام اہل سنت کا دوسرا بڑا کارنامہ ہفتہ وار "النجم" کی اشاعت ہے، یہ اخبار ردِ روافض میں شاہکار بن کر رہا، اس کا ہر شمارہ اہل سنت والجماعت مسلمانوں سے زیادہ شیعوں کو پڑھنے پر مجبور کرتا تھا، کبھی اس میں سطحی بحثیں نہیں دی جاتی تھیں اس کے علمی وتحقیقی مضامین کا ایک معیار تھا بالخصوص وہ مضامین جو امام اہل سنت کے ہوتے تھے تحقیق وتفتیش کا حق ادا کرنے کے بعد سپردِ قلم کیے جاتے تھے، اس کا صرف ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے شیعوں کے بارہ امام ہیں اسی لیے ان کو فرقہ اثنا عشری کہا جاتا ہے، اماموں کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ نبی کی طرح معصوم ہوتے ہیں۔ اسی عصمتِ ائمہ کے مسئلہ پر ایک مضمون "النجم" میں پوری تحقیق وتدقیق کے بعد شائع کیا گیا تو ایک معزز شیعہ سید مصطفےٰ حسین جو اس وقت گونڈہ میں سپرنٹنڈنٹ آف وارڈس تھے ایک مضمون شائع کرایا جس میں انہوں نے علماء شیعہ کو خطاب کرکے لکھا کہ ہمارے مذہب کی ساری بنیاد ہی "عصمتِ امام" کے عقیدہ پر ہے اور اگر ہم عصمتِ ائمہ کو ثابت نہیں کرسکے تو ہم کو یہ مذہب ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور پھر انہوں نے شیعوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر دو ماہ کے اندر "النجم" کی بحث عصمت کا تسلی بخش جواب اور ناقابلِ تردید دلیل نہیں

دی گئی تو میں خود سنّی ہو جاؤں گا۔"

اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ "النجم" کی آواز میں کتنی تاثیر تھی، خود امام اہل سنت نے شیعوں سے آدھی صدی تک مناظرے کرنے کے ساتھ ردِ شیعیت میں سیکڑوں کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے اور آپ کی ہر کتاب ناقابلِ تردید اور آپ کا ہر رسالہ اپنے ٹھوس حقائق مستند حوالہ جات کی وجہ سے شیعوں کے حلق کا کانٹا بن جاتا تھا، ایک مختصر سا رسالہ "قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی" اپنی نوعیت کا بے مثال رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں آپ نے کتبِ شیعہ کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو میدانِ کربلا میں شہید کرنے والے خود یہی شیعہ ہیں اور قتل کرنے کے بعد خود ماتم کا ڈھونگ رچاتے ہیں شیعوں نے آج تک اس رسالہ کی تردید میں کوئی قابلِ توجہ جواب نہیں دیا۔

آیاتِ خلافت کی تفسیر کا ایک مجموعہ ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے جو لاہور سے شائع کیا گیا ہے، امام اہل سنت کے صاحبزادے مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی بڑے صاحبِ علم اور وسیع المطالعہ اور مکائدِ شیعہ سے خوب واقف تھے، والد کی معیت میں شیعوں سے مناظروں میں شریک ہونے کی وجہ سے خود بہترین مناظر بن گئے۔ امام اہل سنت کے حادثہ وفات کے بعد ایک عرصہ تک آپ نے ان کے منصب کو سنبھالا، جہاں بھی شیعوں نے اُودھم مچائی بلا تکلف وہاں پہونچ گئے اور مناظروں میں ان کو ذلت آفریں شکستیں دیں، ردِ شیعیت پر ان کی تقریریں بڑی مدلل اور مفصل ہوتی تھیں، افسوس کہ ۱۹۷۳ء میں وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، امام اہل سنت نے ردِ شیعیت ہی کے جذبے سے لکھنؤ میں دارالمبلغین قائم کیا تھا جس نے بہت سے واعظ و مناظر پیدا کیے،

امام اہل سنت کی تصانیف :- مولانا موصوف نے بلاشبہ پچیسوں ہزار صفحات ردِ شیعیت میں تحریر فرمائے، مستقل کتابوں اور رسالوں کی تعداد بھی کافی ہے، بعض تصانیف کے نام اسی کتاب کے ایک حاشیہ میں دیدیئے گئے ہیں، کچھ دوسری کتابوں کے نام درج ذیل ہیں :-

سیرتِ خلفاء راشدین، موسویہ، القول المحکم، آیاتِ محکمات، قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی،

تحریف کی خانہ ساز حقیقت کا جواب، تنبیہ الحائرین، ابوالائمہ کی تعلیم، تحقیق آل واہل بیت، نصرتِ غیبیہ، قاطع اللسان، شرح حدیثِ ثقلین، مقدمہ جائس، مذہب شیعہ کے دو سو سائل علٰحدہ علٰحدہ رسائل کی شکل میں، تفسیرِ آیاتِ قرآنیہ، الگ الگ رسالوں کی صورت میں مناظروں کی روداد یں، تقریروں کے مجموعے، اخباری مضامین اور چھوٹے چھوٹے رسائل کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔

مناظرے :۔ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے شیعوں کے مشاہیر علماء سے بہت سے معرکۃ الآراء مناظرے کیے، ان سارے مناظروں کی اجمالی کیفیت بھی لکھی جائے تو ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ مناظرے چونکہ اپنی کوئی خاص افادیت نہیں رکھتے، اس لیے اس کی تفصیل بھی بے سود ہے۔ ہندوستان میں شیعوں، رافضیوں، عیسائیوں آریوں اور قادیانیوں سے علماء حق کے ان گنت مناظرے ہوئے لیکن کبھی کسی بدمذہب نے لاجواب ہو کر بھی دین حق قبول نہیں کیا۔ ان مذاہب باطلہ کے مناظرین کی حیثیت آج کل کی عدالتوں میں پیشہ ور وکیلوں سے زیادہ نہیں تھی وکیل مقدمات جیت بھی جاتا ہے اور ہار بھی جاتا ہے، اس ہار جیت سے وکیل کو ذاتی طور پر کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس کو اپنی فیس پوری ملنی چاہیئے، کچھ یہی حال فرقِ باطلہ کے وکیلوں کا بھی ہے وہ اپنی ہر شکست کو فتح سمجھتے ہیں اور علماء حق کے اعلان سے پہلے ان کا چھپا ہوا پوسٹر موجود رہتا ہے جس میں ان کی فتح کا شاندار لفظوں میں تذکرہ ہوتا ہے چاہے وہ مناظرے میں لاجواب ہو کر راتوں رات فرار کر جائیں لیکن فتح کا پوسٹر اسی کی طرف سے شائع ہوگا۔

عوام اگرچہ ان مناظروں میں پوری دلچسپی سے شریک ہوتے ہیں ان کے جذبات مشتعل رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف گرم گرم باتیں بھی کرتے ہیں لیکن یہ عوام بھی جس فرقہ سے وابستہ رہتے ہیں ان کے مناظر کی زبان بند ہو جائے علماء حق کا کوئی جواب نہ دے سکے پھر بھی عوام اس کی حمایت سے ہاتھ نہیں کھینچتے بلکہ اور اُلٹے ان کو ضد پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے باطل عقیدہ پر اور مضبوطی سے جم جاتے ہیں۔ شاید ہی ایک دو مثالیں ایسی مل جائیں کہ فرقِ باطلہ کے مناظر کی شکست کے بعد اس فرقہ کا کوئی آدمی اپنے عقیدہ سے

توبہ کرے اور راہِ حق اختیار کرے، انھیں اسباب کی وجہ سے مناظروں کی افادیت ہمیشہ مشکوک رہی ہے لیکن اس کے باوجود مناظرے ہوتے رہے اور علمارِ حق کو بھی میدانِ مناظرہ میں آنا پڑا، حالانکہ علمارِ حق کے لیے یہ تضیعِ اوقات کا حکم رکھتا ہے، ان کا مشن عوام کی اصلاح ہے اور جب وہ براہِ راست عوام کے درمیان جائیں گے تبھی اصلاح ہو سکے گی اور ہندوستان میں دعوت و تبلیغ اور اصلاح کی جو مہم کامیاب ہوئی وہ مناظروں کی وجہ سے نہیں بلکہ علمارِ حق کے عوامی خطاب اور تقریروں سے کتابچوں سے، چھوٹے چھوٹے رسالوں سے، انفرادی افہام و تفہیم سے، مناظروں کی یہ افادیت کبھی ظاہر نہیں ہوئی، اس کے باوجود علمارِ حق نے مناظروں میں اپنا قیمتی وقت کیوں لگایا؟ یہ حالات کی مجبوری تھی اور ماحول کا دباؤ، اس کے بغیر اس مشن کی کامیابی دشوار ہو رہی تھی جس میں قدرت نے ان کو لگایا تھا، جب وہ ہندوستانی مسلمانوں میں رائج بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد و خیالات کی اصلاح کے لیے میدان میں آئے اور بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے حدیث و قرآن کی لائی ہوئی روشنی رکھی اور عوام نے اس روشنی میں دینِ حق کی راہ پالی تو وہ لوگ جو ان بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج کی حمایت سے عوام میں عزت و اقتدار کے مالک تھے اور اس سے ان کے ذاتی مفاد وابستہ تھے، انہوں نے دیکھا کہ ان کے پاؤں تلے سے زمین سرکتی جا رہی ہے تو انہوں نے عوام کو ورغلانا شروع کر دیا اور جھوٹی سچی دلیلیں دے کر عوام کو سمجھایا کہ تم جس رسم و رواج پر عمل کر رہے ہو یہی اسلام کی تعلیمات و روایات کی منشا ہے یہی دینِ حق کی صحیح راہ ہے اور جو لوگ اس کے خلاف کہتے ہیں وہ حدیث و قرآن کے خلاف کہتے ہیں، میں ان کو چیلنج کرتا ہوں اور ان سے ان مسئلوں پر مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔

علمارِ سو عوام کو دھوکے اور فریب کے ذریعہ ان کو ان کی غلطیوں پر جمے رہنے کی تلقین کرتے تھے صحیح اور سچی تعلیمات اور اللہ و رسول کی مستند باتوں کو اپنی نفسانی اغراض کے تحت جھٹلاتے تھے اور عوام کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے علمارِ حق کو مناظروں کی دعوت بڑی بلند آہنگی سے دیتے تھے اور چیلنج کرتے تھے اس لیے عوام کو ان کی باتوں پر یقین سا ہونے لگتا تھا اس لیے علمارِ حق کو محض جذبۂ اصلاح سے مجبور ہو کر مناظروں کی راہ اختیار کرنی پڑی۔

مناظروں کی رُوداد:- درجنوں مناظرے امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے ہندوستان کے مختلف خطوں میں شیعہ مجتہدین سے کیے اور کامیاب مناظرے کیے، مجتہدین کو جواب دہی میں پسینہ آجاتا تھا ان کو اپنا مسلمان ہی ثابت کرنا مشکل ہو جاتا تھا، آپ شیعوں ہی کی کتابوں سے ثابت کر دیتے تھے کہ ان تصریحات کی موجودگی میں تمہارا مسلمان ہونا ممکن نہیں تمہارا قرآن کے محرف ہونے کا عقیدہ ہے، قرآن کے ناقص ہونے کا عقیدہ ہے قرآن جمع کرنے والوں پر تم کو اعتماد نہیں اس لیے موجودہ قرآن پر تمہارا ایمان نہیں اور جب قرآن پر عقیدہ نہیں ہوگا تو اسی سے رسول کی رسالت ثابت ہوتی ہے اس لیے تمہارا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی عقیدہ نہیں اور یہ سب باتیں وہ اپنی طرف سے نہیں شیعوں کی کتابوں اور مستند حوالوں سے کہتے تھے جس کو غلط کہنے کی کسی مجتہد میں ہمت نہیں تھی۔ ان تصریحات کی روشنی میں امام اہل سنت جو نتیجہ برآمد کرتے تھے اس سے بھی کسی انصاف پسند کا انکار کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے شیعہ مجتہدین لاجواب ہو کر رہ جاتے تھے، لیکن برابر شکست کھانے کے بعد عوام کے دباؤ سے ان کو اسٹیج پر آنا پڑتا تھا اور ذلت و رسوائی اُٹھانی پڑتی تھی، چونکہ سارے مناظروں کی داستان یکساں ہے، البتہ موضوع بدلتے رہے ہیں لیکن ہر ایک کا انجام اور نتیجہ ایک ہے، اس لیے میں نے آپ کے مناظروں کی تفصیل لکھ کر کتاب کی ضخامت بڑھانے کو مناسب نہیں سمجھا۔

تحریری سرمایہ:- شیعی جراثیم سے عام مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے امام اہل سنت نے جو تحریری سرمایہ چھوڑا، ان کتابوں اور رسالوں نے آپ کے مشن کو آپ کے بعد بھی زندہ رکھا، اس کی افادیت و ضرورت بڑھتی رہی اور آج بھی وہ سرمایہ ہمارے ہاتھوں میں ہے، اس تحریری مواد اور شیعوں کی کتابوں کے ہزاروں صفحات پڑھ کر جو ان کے مذہب کی اصلی تصویروں کے مرقعے پیش کر دیئے ہیں اس نے اصلاح و تبلیغ کا بہترین کام کیا اور وہ لوگ جو مراسم تعزیہ داری یا حسن و حسین کے غم و ماتم، نوحہ و مرثیہ، شربت و سبیل کے لیے دِلوں میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور ان کو اپنے بارے میں سنی العقیدہ ہونے کا بھی احساس تھا، اور صحیح عقیدہ رکھتے ہوئے بھی شیعی مراسم سے بعض توہمات کے زیر اثر ان کے پابند تھے یا

عملی طور پر شریک ہوتے تھے ایسے تمام لوگوں کے لیے امام اہل سنت کی کتابیں نسخۂ شفا ثابت ہوئیں، ان مراسم کی تہہ میں جو دین وایمان کی تباہی و بربادی مضمر تھی امام اہل سنت کی کتابوں نے اس کو کھول کھول کر سمجھا دیا، اور شیعیت کے جراثیم سے مسلمانوں کے قلوب کو پاک صاف بنانے میں مولانا مرحوم کی کتابوں نے کلیدی رول ادا کیا اور ہزاروں لاکھوں نے ان کتابوں اور رسالوں سے مذہب کی اصلیت اور اس کی روح کو سمجھا اور ان مشرکانہ مراسم سے توبہ کی، اور آج ان سے کوسوں دور ہیں۔

مدح صحابہ یا قدح صحابہ:۔ لکھنؤ صدیوں سے شیعہ مذہب کا مرکز رہا ہے، کئی سو سالوں تک شیعوں کی حکومت پورے کروفر کے ساتھ رہی، یہیں شیعیت نے نشاۃ ثانیہ پائی یہیں "پنجتن پاک" کے نام لکھنا بھی ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی ممنوع تھا، یہیں برملا تبرا (قدح صحابہ) ہوتا رہا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پتلے جلائے جاتے رہے، لیکن لکھنؤ کی سرزمین میں اہل سنت والجماعت مسلمانوں کو یہ حق کبھی خوش دلی سے نہیں دیا گیا کہ صحابۂ کرام بالخصوص خلفاء ثلثہ کی مدح وستائش میں کوئی لفظ برملا کہہ سکیں، جلسہ وجلوس صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں مدح وتوصیف کے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی جبکہ شہر میں اہل سنت والجماعت مسلمانوں کی تعداد دو ثلث تھی، اور شیعوں کی تعداد ایک ثلث سے زیادہ کبھی نہیں رہی لیکن اپنے اثر ورسوخ سے جو اُن کو عرصۂ دراز سے حاصل تھا، لکھنؤ کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں بھی مسلمان مدح صحابہ نہیں کرسکتے تھے، شیعوں کے دورِ عروج میں تو اس حق کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، لیکن انگریزوں کے دورِ حکمرانی میں بھی پون صدی تک مسلمان اپنے اس حق سے محروم تھے بلکہ طاقت کے زور سے ان کو محروم رکھا گیا تھا اور ۱۹۳۰ء تک پوری سختی کے ساتھ پابندی رہی، جب یہ جبر وظلم ناقابلِ برداشت ہوگیا تو ۱۹۳۸ء میں دوسری بار مدحِ صحابہ پر پابندی کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوا اور لوگ لکھنؤ کی سڑکوں پر مدح صحابہ پڑھنے کے جرم میں گرفتار ہوتے رہے اور جیلوں میں بند کیے جاتے رہے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے خود لکھنؤ پہونچ کر اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے پر لوگوں کو آمادہ کیا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری

امیر شریعت پنجاب حضرت مدنی کے ہمرکاب تھے، ان حضرات نے حکومت کو للکارا اور اعلان کیا کہ مدح صحابہ مسلمانوں کا مذہبی حق ہے، ہم اپنے اس مذہبی حق سے دست بردار نہیں ہو سکتے، حکومت نقض امن کے نام پر ہمارے مذہبی حق میں مداخلت کرتی ہے اس لیے ہم لکھنؤ کی سڑکوں پر اس حکم کی خلاف ورزی کریں گے، ہم اپنے مذہب کے ایک ضروری حصہ سے دست بردار نہیں ہو سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں آدمی جیلوں میں بند ہو گئے، یہ کانگریسی وزارتوں کا زمانہ تھا اس پر بھی شیعوں کا اثر تھا، حکومت کچھ جھکی، کچھ شرائط کے ساتھ اس حق کو تسلیم بھی کیا مگر بعد میں حکومت نے اپنے عہد کی خود پابندی نہیں کی اور مختلف بہانوں سے مدح صحابہ پر آج بھی پابندی عائد ہے اور مسلمان اپنے اس حق سے محروم ہے۔

علماء کا مقصد اصلاح تھا:۔ جب کوئی مذہبی فرقہ وجود میں آجاتا ہے تو اس کا مٹانا تاریخی عوامل کے زیر اثر ناممکن ہو جاتا ہے چاہے وہ مذہب کتنا ہی خلاف عقل ہو، اس عقیدہ کے ماننے والوں کو سمجھا کر راہ راست پر لانا انتہائی دقت طلب کام ہے، انبیاء کرام کو اس راہ میں سخت ترین منزلوں سے گذرنا پڑا ہے، پھر بھی کبھی کامیابی ملی اور کبھی نہیں ملی، ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں میں سیکڑوں فرقے وجود میں آئے اور اب تک پیدا ہوتے جا رہے ہیں، آخری فرقوں میں قادیانیوں اور اہل قرآن کا فرقہ اسی ہندوستان میں پیدا ہوا۔ ان میں ہر ایک کا وجود آج بھی ہے سوائے اس کے کہ حالات و ماحول نے کسی فرقہ کو صفحۂ ارضی سے مٹا دیا ہو تو مٹا دیا ہو، ورنہ سارے فرقے کسی نہ کسی حال میں آج بھی باقی ہیں، شیعوں کا فرقہ تو بہت ہی قدیم ہے اس لیے ان کو اسلام کی صحیح تعلیمات سمجھا کر بدل دیا جائے یہ ناممکن ہے، البتہ وہ لوگ جو اس فرقہ میں سے نہیں ہیں لیکن اس فرقہ سے متاثر ہیں، اور اس کے عقائد کے مہلک جراثیم ان مسلمانوں کے عقائد میں سرایت کر گئے ہیں تو ان کا علاج نسبتاً آسان ہے۔

شیعہ فرقہ تو ابتداء اسلام میں حالات کے زیر اثر وجود میں آیا اور جس دور میں وجود میں آیا اس وقت اس میں فساد عقیدہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی اس میں طاقت و حکومت کی حرص بڑھتی گئی، دنیاوی اقتدار کی بھوک حد سے فزوں ہوتی چلی

گئی، حکومت پر قبضہ و اختیار حاصل کرنے کے لیے انہوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے، وہیں سے ان کے عقیدوں میں انسانی ذہنوں کے تخلیق کردہ خیالات کی چھاپ آتی چلی گئی اور دوسری تیسری صدی میں اس کی کئی شاخیں دائرۂ اسلام سے بھی باہر چلی گئیں، شیعہ فرقہ میں بتدریج گمراہیاں بڑھتی رہیں، اور شیعہ کم اور روافض زیادہ ہوگئے، یہی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، ابتدائی دور کے شیعوں کے مقابلہ میں بعد کے دور کے روافض بتدریج اسلام کے بنیادی عقیدوں سے دُور ہوتے چلے گئے۔

اس لیے اس دَور میں ان کے غلط عقیدوں کو ایک لاکھ بار بھی غلط اور ضلالت و گمراہی ثابت کر دیا جائے لیکن ان کو ان کے عقیدوں سے منحرف کرنا ناممکن ہو چکا ہے، لیکن دوسرے لوگ جو اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں لیکن شیعی جذبات و رجحانات اور خیالات ان کی پوری مذہبی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں ان کی اصلاح ممکن تھی۔

ہمارے علماء نے انھیں کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور ان کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے آگاہ کر کے ان کو اسلام کی صحیح راہ پر لانے کی جدوجہد کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل ہوتی رہی اور وہ تمام سعید روحیں جو غلط فہمی کی بناء پر شیعی پروپیگنڈہ کا شکار تھیں اور جو لوگ تعزیہ پرستی جیسے مشرکانہ عمل میں مبتلا ہوگئے تھے ان کو اس زہر کا تریاق فراہم کیا گیا، البتہ شیعوں کی زبان بندی کے لیے ان سے مناظرے بھی جاری رکھے گئے اور یہ محض اس لیے تاکہ اصلاح پانے والوں کو دوبارہ گمراہ کرنے کا ان کو موقعہ نہ ملے۔

اصلاحی مہم کی کامیابی:- دارالعلوم دیوبند کے بعد ملک کے بیشتر علاقوں میں دیوبندی مکتبۂ فکر کے مدارس کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا اور ان مدارس اسلامیہ کی کارگذاری پر پچاس برس گذر گئے، اس طویل مدت میں متحدہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں حدودِ افغانستان سے لے کر جاوا سماترا، اکیاب، برما، اور رنگون و ملیشیا تک دیوبندی مکتبۂ فکر کے ہزاروں علماء مدارس سے سندِ فراغت لے کر نکلنے کے بعد دعوت و اصلاح کے عظیم مقصد کو لے کر عوام تک پہونچ گئے، بڑے بڑے اجتماعات اور جلسے ہونے لگے، مناظروں کا بھی سلسلہ جاری تھا، علماء کے بیانات اور مسلسل تقریروں کو سن کر عوام بھی اپنے

طور طریق اور طرزِ عمل پر نظر کرنے لگے، حق و باطل کے درمیان تمیز پیدا کرنے کی ان میں صلاحیت برابر بڑھتی چلی گئی، چھوٹی بڑی کتابیں، رسالے، مذہبی اخبار بڑی تعداد میں شائع کیے جانے لگے اور ہر قابلِ ذکر آبادی میں ردِّ بدعت کا لٹریچر بڑی تعداد میں پہونچنے لگا، اس طرح مسلمانوں کی ہر آبادی میں دعوت و اصلاح کا پیغام پہونچ گیا، اس لیے کم پڑھے لکھے لوگ بھی چھوٹے چھوٹے رسالوں اور کتابوں سے استفادہ کرکے اپنے اعمال اور عقائد کا محاسبہ کرنے لگے، علماء کی مسلسل تقریروں نے ان کے ذہنوں کی اور بھی صفائی کی، پھر جتنی سعید روحیں تھیں وہ بہت جلد متأثر ہوئیں، ان کو مشرکانہ طور طریقوں اور ہندوانہ رسم و رواج اور شیعوں کے مراسم تعزیہ داری وغیرہ کو ترک کرنے میں اب ان کو کوئی تأمل نہیں رہا، ایسا بہت ہوا کہ ایک دو جلسوں کے بعد مسلمانوں کی آبادی کی آبادی بدعات و خرافات، تعزیہ پرستی وغیرہ کی لعنتوں سے دُور ہوگئی

دیوبندی مکتبۂ فکر سے وابستہ جماعت جو بحمداللہ پورے متحدہ ہندوستان میں غالب اکثریت رکھتی ہے اس نے یک لخت تعزیہ داری کی لعنت کو اپنی جماعت سے اپنی آبادی سے دُور کردیا اور اب ان کو تماشائی کی حیثیت سے بھی تعزیوں کے میلے میں شریک ہونا گوارا نہیں رہا، اور جب تعزیوں کا ظاہری و مادی بُت اُنہوں نے چکنا چور کردیا تو شیعی عقائد کے جو جراثیم ان کی مذہبی زندگی میں گھس آئے تھے وہ از خود اپنی موت آپ مرگئے، آپ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کا دورہ کریں اور باریک بینی سے عوام کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ حقیقت صاف طور پر نظر آجائے گی کہ دیوبندی مکتبۂ فکر سے وابستہ کہیں کی بھی آبادی تعزیہ داری کی لعنت میں گرفتار نہیں ہے، ہاں یہ ضرور [illegible] میں اب بھی ایک طبقہ ہے جو اپنے کو اہل سنت والجماعت بڑی بلند آواز میں کہتا ہے [illegible] اس لعنت میں گرفتار ہے وہ رضاخانیوں کی جماعت ہے، تعزیوں کی لعنت اب بھی ان کے کندھوں پر سوار ہے، وہی شیعوں کی خیمہ برداری کرتے ہیں وہی تعزیے بناتے اور اُٹھاتے ہیں، وہی مرثیہ پڑھتے ہیں وہی ماتم کرتے ہیں، وہی ڈھول تاشے پیٹتے ہیں۔ علماء حق اس فرقہ سے اس لعنت کو دُور کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کرسکے، چونکہ ان کی زندگی خود سیکڑوں بدعات و خرافات میں گھری ہوئی ہے اس لیے مشرکانہ رسم و رواج اور

کھیل تماشوں سے ان کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اور وہ بلا جھجک ان گمراہیوں کو قبول کر لیتے ہیں اور اس فرقہ کے علماء بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کے زیر قیادت جماعت ان خرافات میں گرفتار رہے، علماء حق کی بجد وجہد سے پورے ہندوستان میں غیر شیعہ سے مراسم تعزیہ داری کی لعنت کو ختم کرانے میں کامیابی بفضلہ تعالیٰ حاصل ہوگئی، اگر غیر شیعہ میں کہیں یہ لعنت آپ کو نظر آئے تو آپ سمجھ لیجئے کہ ان کا قبلۂ عقیدت بریلی ہے اور وہ جماعت رضاخانی جماعت ہے۔

باب (۱۲)

بدعات وخرافات

اور مشرکانہ رسم ورواج

بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسم ورواج

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام جب ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچا تو یہاں کی قدیم تہذیب وتمدن، رسم ورواج، طور وطریق، رہن سہن، بود وباش، ذہن ومزاج اور مذہبی تعلیمات وروایات پر اس نے زبردست اثر ڈالا، اگر غیر مسلم معاشرہ کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے اور بعد کی ان کی مذہبی وسماجی زندگیوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ یہاں کی غیر مسلم اقوام پر مسلمانوں کی تہذیب کا غیر محسوس طور پر اثر پڑا، مجلسی آداب، سماجی ماحول، تہذیب وتمدن، رسم ورواج غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی پر اسلامی تہذیب کی چھاپ نظر آئے گی، اور پھر وہ دور بھی آیا کہ خالص اسلامی معاشرہ میں رائج مسلمانوں کے اصطلاحی الفاظ اور جملے تک غیر مسلموں کی زبانوں پر چڑھ گئے اور تھوڑی بہت ملاقات اور گفتگو کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ میں نے ایک مسلمان سے گفتگو کی ہے یا میرا مخاطب کوئی غیر مسلم تھا؟ اس طرح غیر مسلموں نے اپنی مذہبی زندگی اور سماجی رسم ورواج میں بھی اسلامی اثرات قبول کیے اور آج تک وہ اثرات کسی نہ کسی حد تک قائم ہیں۔

ہندو تہذیب کے اثرات:- لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہے اور ناقابلِ انکار حقیقت کہ ہندو تہذیب نے بھی مسلم تہذیب ومعاشرہ کو کم متاثر نہیں کیا ہے اور وہ اثرات مسلم سوسائٹی میں اس طرح پیوست ہوکر رہ گئے ہیں کہ آج یہ احساس بھی مٹ گیا کہ یہ رسم ورواج اور طور وطریق اسلامی معاشرہ میں غیر مسلموں سے آئے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں میں بہت سی خرافات و بدعات، رسم و رواج، قبر پرستی، عرس بزرگانِ دین کی قبروں پر میلے ٹھیلے، قوالیاں، راگ باجے، مردوں اور عورتوں کی مخلوط مزارات پر حاضری، طوائفوں کا گانا بجانا، منتیں مانگنا، نذر و نیاز چڑھانا، تیجہ چہلم، شادی بیاہ کی رسمیں، اسلامی معاشرہ میں ذات پات، نسل و خون کا امتیاز، اونچ نیچ، درجہ بندی، شرافت و رذالت کا معیار خون اور نسب ناموں پر دار و مدار کا ہونا، برہمن چھتری، ویش اور شودر کی طرح مسلمانوں میں تقسیم اور شرافت کا معیار اور پھر پوری سختی کے ساتھ پابندی اور دوسرے سیکڑوں طور و طریق، رسم و رواج مسلم معاشرہ میں ہندو تہذیب و تمدن، قومی و مذہبی روایات اور رسم و رواج سے براہِ راست آئے ہیں اور آج پورا مسلم معاشرہ اسی طرح کے غیر اسلامی ڈھانچوں پر کھڑا ہے۔

قبر پرستی کا رجحان:۔ تیرہویں صدی میں یہ غیر اسلامی ذہن و مزاج پوری طاقت سے کام کر رہا تھا، بدقسمتی سے اسی صدی میں مسلمان اپنے آٹھ سو سالہ اقتدار سے بھی محروم ہو گیا اور اس محرومی اور یاس و قنوطیت کی بہتات نے مسلمانوں کو بڑی حد تک احساس کمتری میں مبتلا کر دیا، مظلومیت و بے چارگی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا، مستقبل پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، دل و دماغ کی افسردگی نے اُمید و بیم کی دُنیا کو تاریک سے تاریک تر بنا دیا اور کہیں سے بھی اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی، حاکمانہ اقتدار غیر معین مدت کے لیے مسلمانوں سے رخصت ہو گیا، سماجی زندگی میں عزت و وقار کو ہر ہر قدم پر ٹھیس لگتی تھی، غیرت و خودداری کو اسلام دشمن طاقتیں پامال کرنے پر ہمہ وقت کوشاں تھیں، انگریزی قوم کا خوف عفریت بن کر ان کے دل و دماغ پر چھا چکا تھا، برادرانِ وطن کی طوطا چشمی نے بتا یا کہ ہم ہمیشہ چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار رہے ہیں، مسلمانوں کا نیر اقبال غروب ہو چکا ہے، اب مغرب سے ایک نیا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہا ہے اس لیے ہمارا قبلۂ عبادت بدل چکا ہے۔ اس گلا گھونٹ دینے والے ماحول سے عوام الناس، زر پرست صوفیا اور علماء سُو نے فرار اختیار کیا تو اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے مزارات پر ٹوٹ پڑے اور اس مادی

دنیا کے سارے مسائل کو قبرستان کے شہرِ خموشاں میں بیٹھ کر حل کرنا شروع کر دیا، اب تک دنیاوی عظمت و اقتدار ہاتھوں سے نکلا تھا، اب دین و مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کو دیوالیہ بنا دینے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

بہادر شاہ ظفر سلطنتِ مغلیہ کے آخری بادشاہ کے زمانہ میں کچھ تو شیعوں کے اثر سے اور کچھ دنیا پرست علماء سوء اور مصنوعی صوفیوں اور پیروں کی مفاد پرستی اور زر طلبی کی وجہ سے غیر اسلامی بدعات و خرافات کو جزوِ ایمان بنا لیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب مشہور مصلح سید احمد رائے بریلوی اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی ان خرافات کو اسلامی معاشرہ سے مٹانے کے لیے جد و جہد کے میدان میں آئے تو ان کو کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ کیسی کیسی سازشوں کے شکار ہوئے ؟

بدعات کا لامتناہی سلسلہ :- قبر پرستی کا چلن اتنا بڑھ چکا تھا اور اس طرح مُردہ پرستی دِل و دماغ میں رچ بس چکی تھی کہ اسلامی معاشرہ میں قمری مہینوں کے نام مسلمان عورتوں میں جو مروّج تھے وہ سب انھیں خرافات کی نشان دہی کرتے ہیں جن بزرگوں کے عرس جس مہینہ میں پڑتے ہیں ان مہینوں کو انھیں بزرگوں کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، غرضیکہ پورا مسلم معاشرہ مُردہ پرستی کے جنگل میں گم ہو کر رہ گیا، فاتحہ، تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں، سہ ماہی ششماہی، برسی، نذر و نیاز، عرس، بی بی کی صحنک، بوعلی شاہ قلندر کی سہ منی، شیخ سدّو کا بکرا، غازی میاں کا مُرغا، شاہ عبدالحق کا توشہ، بڑے پیر کی گیارہویں، شاہ معین الدین کی چھٹی، قبروں پر چادریں، پھول بتاشہ، مسجدوں میں گاتے بجاتے طاق بھرائی، قبروں پر چراغ جلانا، چڑھاوے کی منّت ماننا، شبِ برات کا حلوہ، امام جعفر کا کونڈہ، ربیع الاول کا جشنِ میلاد النبیؐ، اللہ اکبر کی جگہ یا رسول یا غوث کا نعرہ، محفلِ میلاد، ہر محفلِ میلاد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا عقیدہ، دورانِ میلاد قیام، بزرگوں اور اولیاء اللہ کو ہر وقت ہر جگہ حاضر و ناظر جاننا اور ماننا، تعزیہ بنانا، مالیدہ چڑھانا، عورتوں کا تعزیوں کی زیارت کے لیے جانا، تعزیوں کو پنکھا جھلنا، ڈھول تاشوں کے ساتھ تعزیوں

کو گشت کرانا، امام باڑوں اور چوک کے جھگڑوں کو جہاد سمجھنا، امام حسین کے نام کی سبیل لگانا وغیرہ وغیرہ۔ یہی عام مسلمانوں کی داخلی و خارجی زندگی کے مظاہر تھے، ہندوستان کا مسلمان انھیں خرافات و بدعات کو حاصلِ ایمان سمجھتا تھا اور انھیں اسلام دشمن اور عقیدہ توحید کے علی الرغم توہمات میں گھرا ہوا تھا۔

عرسوں کے میلوں اور ہنگاموں میں عورتوں اور مردوں کا مخلوط اجتماع، بے حجابی کے ساتھ مردوں کے ساتھ دوش بدوش عقیدت کا مظاہرہ کرنا، صاحب قبر کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھ کر ان سے براہ راست مانگنا اور حاجت روائی کی درخواست کرنا، ان کو مختار کل اور خدا کی خدائی میں شریک سمجھنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اجمیر کے سات عرسوں میں شرکت ایک حج کے برابر ہے، اس طرح کے سیکڑوں مشرکانہ عقائد اَن پڑھ مسلمانوں کے دلوں میں پیوست کر دیئے گئے تھے اور بے شمار بدعات کو کارِ ثواب سمجھ کر انجام دیا جاتا تھا، پورا معاشرہ انھیں گمراہیوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔

اصلاح کا کام کتنا خطرناک تھا؟:- تیرھویں صدی میں اس کے خلاف سب سے طاقتور آواز حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بلند ہوئی، لیکن علماء سوء اور زر پرست صوفیاء نے اس آواز کو اپنی موت سمجھا اور ہر ممکن کوشش کی کہ یہ زبان کاٹ لی جائے اور وہ گلا گھونٹ دیا جائے جس سے حقانیت کی یہ آواز نکلتی ہے، انگریزی ریذیڈنٹ کو درخواست دے کر مولانا شہید دہلوی کے وعظ پر پابندی لگوائی گئی، بادشاہ سے شکایت کر کے مولانا اسمٰعیل صاحب کی طرف سے بدگمان کیا گیا، بعض منہ پھٹ شاہی بیگمات لال قلعہ سے شکایت کر کے ان کو ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی، اور جب کسی طرح یہ آواز بند نہیں ہوئی اور مزید یہ کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے جب بستی نظام الدین دہلی میں ہونے والے عرس کے موقعہ پر ان خرافات کے خلاف تقریر فرمائی تو ان کو قتل کرنے کی سازش کی گئی اور جب آپ جامع مسجد دہلی میں تقریر کر رہے تھے تو ایک شخص نے تلوار سے آپ پر وار کیا، اتفاق امر حضرت شاہ صاحب تو بچ گئے لیکن پاس بیٹھے ہوئے دوسرے

بزرگ پر وہ تلوار پڑی۔

اور جب اس مہم میں کامیابی نہیں ہوئی تو راجہ رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب کے ایک ساختہ پرداختہ شخص غلام رسول سے مدد چاہی گئی جس کی مسلمان بیٹی رنجیت سنگھ سکھ راجہ سے بیاہی ہوئی تھی اس نے پنجاب کے دو نوجوانوں کو مولانا اسمٰعیل شہید کے قتل کے لیئے بھیجا، یہ دونوں نوجوان آپ کی تلاش میں مسجد فتحپوری پہونچے تو مئی کا مہینہ تھا اور دوپہر کا وقت جبکہ سورج سر پر تھا، آپ تپتے ہوئے پتھر کے فرش پر ننگے پاؤں چہل قدمی کر رہے تھے دونوں نوجوانوں نے جوتے اتار کر جب فرش پر قدم رکھا تو جلتے ہوئے پتھروں پر قدم رکھتے ہی ایسا محسوس کیا جیسے انہوں نے دہکتے ہوئے انگاروں پر قدم رکھ دیا ہو، دوسری طرف وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب پوری طمانینت کے ساتھ چہل قدمی کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر ان کے دلوں کی دنیا پلٹ گئی اور اپنے ارادہ پر ندامت محسوس کی، دونوں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی ندامت کے ساتھ اپنے ارادہ سے آپ کو آگاہ کیا اور صدق دل سے توبہ کر کے شاہ صاحب کے فداکاروں میں شامل ہو گئے۔

آپ ان واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں رائج یہ بدعات و خرافات ان کی دینی زندگی میں کس طرح رچ بس گئی تھیں اور ان کے خلاف کسی مصلح کا آواز اٹھانا کتنا خطرناک تھا؟ گویا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔

بدعات کے کچھ مناظر:۔ ان بدعات و خرافات کی مسلم معاشرہ میں دخل اندازی کی تاریخ بھی حیرت ناک ہے اور توہم پرستی کا شاہ کار بھی، اس کی مثال میں عرس کے موقعہ پر کہیں کہیں "گاگر شریف" کا بھی رواج ہے، اس کے اٹھانے کا منظر عجیب مضحکہ خیز ہے اور کسی طرح مسلمانوں کی مذہبی ذہن و مزاج سے میل نہیں کھاتا لیکن یہ رسم جس عقیدت و احترام کے ساتھ منائی جاتی ہے اس کا ایک منظر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

"سلون ضلع رائے بریلی میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی ایک مشہور خانقاہ ہے، یہاں گیارھویں صدی ہجری میں شاہ پیر محمد (متوفی ۱۰۹۹ھ) جو شاہ

عبدالکریم مانک پوری کے ممتاز خلیفہ تھے قیام اختیار کیا، ان کی اولاد میں بڑے بڑے صاحب علم اور صاحب سلسلہ بزرگ گذرے ہیں جن میں شاہ محمد اشرف خاص طور پر نامور اور ممتاز تھے، مشہور مصلح و بزرگ سید احمد رائے بریلوی جب سلون گئے تو شاہ کریم عطار صاحب سجادہ نشین تھے، اتفاق سے ان کے دادا شاہ محمد اشرف کے عرس کا زمانہ تھا، اس خاندان میں عرس کے موقع پر علاوہ دوسرے کاموں کے "گاگر" اٹھانے کی رسم بھی مدت سے چلی آرہی تھی، مانک پور اور سلون دونوں جگہ دستور تھا کہ سجادہ نشین کو راگھڑا سر پر اٹھا کر لاتے اور ان کی تبعیت میں دوسرے مریدین و خدام بھی کورے گھڑے سروں پر رکھے ہوئے چلتے اور ساتھ ساتھ قوالی بھی ہوتی رہتی۔

اس رسم کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ اور کون سا دینی داعیہ پیدا ہوا؟ دین و شریعت کے کن تقاضوں کے پیش نظر سیکڑوں نورانی صورتوں والے لوگ ایک قطار میں سروں پر مٹی کے گھڑے رکھے ہوئے گانے، باجے، ڈھولک اور ہارمونیم کے ساتھ سڑکوں سے گذرتے تھے؟ اس کی تاریخ کے سلسلہ میں جو بتایا گیا اُسے مولف "سیرت سید احمد شہید" ہمیں سناتے ہیں:۔

"گاگر کی رسم حضرت شاہ حسام الحق مانک پوری کے شیخ حضرت شاہ نورالحق پنڈوی (متوفی ۸۱۸ھ) کی یادگار ہے، روایت ہے کہ ایک بار حضرت شاہ نورالحق محفل سماع میں شریک تھے، خادم نے اطلاع دی کہ پانی ختم ہو گیا ہے، اس وقت پانی کی تلاش میں آپ بذات خود اُٹھے، آپ کے ساتھ ساری محفل اٹھی اور قریب کے تالاب سے گاگروں میں بھر کر واپس آئے، حضرت شاہ حسام الحق نے اس واقعہ کی یادگار میں یہ رسم جاری کی، چنانچہ سلون اور مانک پور کی خانقاہوں میں یہ رسم اب تک جاری ہے، گاگر اُٹھاتے وقت قوالی ہوتی ہے، سلون کی خانقاہ سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ایک تالاب ہے اس سے پانی بھرا جاتا ہے، تعظیماً گاگر کو سر پر

رکھتے ہیں، وسط میں سجادہ نشین ہوتے ہیں، جن کے اردگرد معتقدین و مریدین گاگر اٹھائے ہوئے ساتھ ہوتے ہیں۔" [1]

یہ ان لوگوں کا طرز عمل ہے جو دوسروں کے تزکیۂ باطن، دینی شعور اور اسلامی تعلیمات و روایات کے تقاضوں کو جاری کرنے والے سمجھے جاتے ہیں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر اللہ کی راہ سے بھٹکے ہوئے بندوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے نقش قدم پر چلانے کی ذمہ داری اور منصب سنبھالے ہوئے ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ اس گدی کے مالک ہوتے آئے ہیں، حال یہ ہے کہ وہ دین کو تماشا بنائے ہوئے ہیں، اپنا دین اور اپنی شریعت کی ٹکسال میں بیٹھ کر نفسانیت کے کھوٹے سکے ڈھال کر ان کو رائج الوقت بنا کر اسلام کے زرِ خالص کو بے وقعت اور کم قیمت بناتے ہیں۔

گاگر کی یہ رسم ان خانقاہوں میں جیسا کہ معلوم ہوا عرصہ سے جاری ہے اور ان خانقاہوں کے مشائخ بلا حجت اور بلا کسی نکیر کے شریعت کے ایک مسلمہ اصول کی طرح اس کی پابندی کرتے ہیں حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مشرکانہ رسم اور بدعات و خرافات میں سے ہے لیکن ذاتی مفاد اس کو ترک کرنے پر تیار نہیں ہونے دیتا، کیونکہ زرطلبی کے سارے راستے بند ہو جائیں گے، دین غارت ہوتا ہے اس کا غم نہیں، شریعت مٹی میں ملائی جا رہی ہے اس کی پروا نہیں، لیکن دنیاوی مفاد کو ادنیٰ ٹھیس لگ جائے یہ منظور نہیں، جیسا کہ اسی سلون کے سجادہ نشین صاحب نے سید احمد صاحب سے تنہائی میں بتایا، "سیرت سید احمد" کے مرتب لکھتے ہیں کہ سجادہ نشین صاحب نے سید احمد صاحب سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا وعدہ کیا تب سید صاحب ان کے پاس پہونچے۔

اسی گفتگو میں شاہ صاحب نے اعتراف کیا کہ ان اعمال و بدعات کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، ان کا درجہ رسوم کا ہے جو مشائخ کے زمانے سے چلی آ رہی ہیں، آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ان کے ترک کرنے

---

[1] "سیرت سید احمد" مولفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ج ۱ ص ۱۸۲

کی توفیق عطا فرمائے۔" [1]

حریص صوفیاء:۔ چالاک لوگوں نے پیری مریدی کو ذریعۂ معاش بنالیا تھا بلکہ دین فروشی کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دے لیا تھا، مؤلف "سیرت سید احمد شہید" سید صاحب کے سفر بنارس کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ہم کو بتاتے ہیں کہ:۔

"بنارس کے محلہ لبہر (شیشہ گنج) میں مسلمانوں کے ایک پیر صاحب تھے انہوں نے سید صاحب کے بنارس میں آنے اور لوگوں کے رجوع ہونے کا حال سنا تو ایک رنگین رومال اور کچھ مٹھائی کے الائچی دانے اپنے خادم کے ہاتھ سید صاحب کو بھیجے، اس خادم نے سید صاحب سے آکر کہا کہ ہمارے پیر و مرشد نے یہ تبرک آپ کو بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ جو آپ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں مفید نہ ہوگا، یہ تمام لوگ ہمارے مریدین ہیں اور یہاں کا دستور آپ کو معلوم نہیں، اگر آپ کچھ فتوحات حاصل کرنے آئے ہیں تو ہم سے آکر ملاقات کریں، پھر ہم اس کی جو تدبیر بتائیں وہ عمل میں لائیں، تب کچھ حاصل ہوگا۔ ورنہ آپ مختار ہیں۔

یہ سن کر مولوی وحید الدین صاحب نے سید صاحب سے اجازت لی کہ وہ پیر صاحب کے پاس جائیں، سید صاحب نے اجازت دے دی مولوی وحید الدین صاحب سادہ غریبوں کا لباس پہن کر اور کئی آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر ان کے مکان پر گئے، اور ان سے ملاقات کی، انہوں نے پوچھا آپ ہی اس شہر میں تشریف لائے ہیں اور لوگوں سے بیعت لیتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا کہ وہ ہمارے پیر و مرشد ہیں، ہم تو ان کے ادنیٰ مریدوں میں ہیں، لوگوں سے آپ کے اخلاقِ حمیدہ سن کر آپ کی ملاقات کو آئے ہیں۔ مولوی وحید الدین کا کمالِ باطنی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" ج ۱ ص ۱۸۳

پیر صاحب کو سید صاحب کی خدمت میں جا کر ملاقات کا شوق ہوا اور اگلے روز صبح کو وہ سید صاحب کی خدمت میں تشریف لائے، سید صاحب نے ان کو بہت عزت و احترام سے بٹھایا اور عافیت مزاج پوچھی، انہوں نے کہا کہ آپ کو اور آپ کے آدمیوں کو دیکھا اور ان کی گفتگو سنی تو سمجھے کہ یہ لوگ تو اور ہی قسم کے ہیں، انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ حضرت والا! ہماری تو وجہ معاش یہ ہے کہ تمام مریدوں کے یہاں ششماہی مقرر ہے کوئی ایک روپیہ کوئی دو روپیہ کوئی کم کوئی زیادہ دیتا ہے اور یہ لوگ پیشہ ور ہیں، ان سے پنج وقتی نماز کہاں ہو سکتی ہے اسی کی معافی میں یہ ہم کو چھٹے مہینے مقدار کے موافق کچھ زر نقد نذر کرتے ہیں، مگر رمضان کے روزوں کی ہم ان کو بہت تاکید کرتے ہیں اس میں جو کوئی عذر کرتا ہے کہ ہم حقہ پیتے ہیں یا کوئی نشہ کھاتے ہیں ہم سے روزہ سے نہیں رہا جاتا تو ہم ان سے اس ششماہی کے سوا کچھ اور زر نقدی یا دو چار دعوتیں ٹھہرا کر کے ان کو معاف کر دیتے ہیں، یہ ہم لوگوں کے گذران کی صورت ہے، اگر آپ کو کچھ فتوحات منظور ہو تو اس کی یہ راہ ہے جو ہم نے بیان کی، آگے آپ کو اختیار ہے۔"[1]

عوام کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے جعلی پیروں اور مصنوعی صوفیاء کا ایک لمبا سلسلہ تھا جو پنجاب سے لے کر بنگال تک ان پڑھ عوام کو اپنی چراگاہ سمجھتا تھا، چند پیسوں کے عوض نماز یہ معاف کر دیں، دو چار دعوتیں کھا کر مریدوں کا روزہ یہ معاف کر دیں، غرضیکہ دین کی خدمت کے نام پر دین فروشی کو پیشہ بنا رکھا تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے دوسرا طریقہ کار اختیار کر رکھا تھا، ان کا بھی مقصد جلب منفعت اور زر طلبی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

عرسوں کی دھوم دھام:۔ ہندوستان میں تبلیغ کی غرض سے آنے والے اللہ والوں اور بزرگوں کی تعداد بے شمار ہے

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" ج اول ص ۱۸۵ و ۱۸۶

اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں دین انھیں کی بدولت پھیلا ہے، ان بزرگوں نے اپنی اپنی سرگرمیوں کا مرکز ہندوستان کو بنایا، دعوت وتبلیغ کے فرائض اَدا کرتے ہوئے یہیں کی سرزمین میں آسودۂ خاک ہوگئے، ان کے عقیدت مندوں نے ان کی یادگار کے طور پر ان کی قبروں کو پختہ بنا دیا، کسی حاکمِ وقت کی نگاہ اس کی طرف منعطف ہوگئی تو اس نے ان پر قبّے بنوا دیئے، عوام کی مرجعیت دیکھ کر ان کی احاطہ بندی کرادی، کمرے بنوا دیئے، ان قبروں کو سجانے اور سنوارنے میں لاکھوں روپے لگا دیئے اور ان پر زمینیں وقف کردیں، آمدنی کا معقول ذریعہ پیدا ہوگیا تو ان پر خاندانی مجاوروں نے قبضہ کرکے ان قبروں کو مالِ تجارت بنا دیا، عرس اور میلوں کو رواج دیا، اس طرح فاتحہ، نذر ونیاز اور چڑھاؤں کے اجر وثواب کے افسانے گڑھ کر عوام میں پھیلائے اور ان ناموں سے ہزاروں روپے آنے لگے، بہت سے خاندان ان آمدنیوں پر پُرتعیش زندگی گذارنے لگے۔

ہندوستان کے گوشے گوشے میں یہ مزارات ہیں، کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا نہیں جہاں ایسی قبریں نہ ہوں جہاں چادریں نہ چڑھائی جاتی ہوں، عرسوں اور قوالیوں کی دھوم دھام نہ ہوتی ہو، ان عرسوں کی حیثیت بالکل میلوں جیسی ہوتی ہے جیسے ہندوؤں کے میلے ہوتے ہیں، وہی دوکانداروں کی بھیڑ بھاڑ، ہر طرح کی دلچسپیوں کے پروگرام، ناچ رنگ مشاعرے، کھیل تماشے، بچوں کے جھولے، مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماع، قوالوں کی کئی کئی پارٹیاں ہوتی ہیں، آپس میں مقابلے ہوتے ہیں کیونکہ شادی بیاہ کی تقریبات سے کہیں زیادہ یہاں ان کو آمدنی ہوتی ہے اسی لیے مشہور قوالوں کے گروہ اپنی ریشمی شیروانیوں اور زرکار پگڑیوں، ہارمونیم، طبلہ اور ڈھولک کے ساتھ دورانِ عرس موجود رہتے ہیں اور بڑے دھوم دھام اور عقیدت واحترام کے مظاہروں کے ساتھ قبروں کو غسل دیا جاتا ہے، عرق کیوڑہ، عرقِ گلاب سے ان کو دھویا جاتا ہے اور اس غسالہ پانی کو دوبارہ بوتلوں میں بھر کر بطورِ تبرک معتقدین اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں، قبر کو غسل دینے کے بعد نئی ریشمی کامدار اور بیش قیمت چادر چڑھائی جاتی ہے اور پھولوں سے قبر کو ڈھانک

دیا جاتا ہے۔

آج بھی یہ منظر ایام عرس میں اجمیر شریف، کلیر شریف، دہلی، لکھنؤ، بہرائچ، دیوبند، دیوہ شریف، بریلی شریف، کچھوچھہ شریف، گنگوہ شریف وغیرہ وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہمیں اجمیر شریف کے عرس کا حال اور چشم دید منظر ایک شاہد نے دکھایا ہے جو ہم آپ کے سامنے انھیں کے لفظوں میں پیش کرتے ہیں :۔

> ..... راستہ میں ایک اور تماشہ نظر آیا، عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد مخمل اور دوسرے زریں کپڑوں کی چادریں تانے ہوئے تھی، ان چادروں کے نیچے عورتیں تھیں، چادروں کے کناروں کو مرد تھامے ہوئے تھے، آگے آگے قوالوں کی پارٹیاں ہارمونیم، طبلہ اور ڈھولک کی تال پر گاتے ہوئے مزارِ مقدس پر چڑھانے کے لیے درگاہ کی جانب عالمِ بے خودی میں بڑھ رہے تھے، ایک چادر کو پکڑنے کے لیے سیکڑوں ہاتھ بیک وقت بلند ہوتے تھے اور اس کو صرف مَس کرنے کے لیے بلا امتیاز عورت، مرد ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ اس چادر کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے اور جن لوگوں کو اس کا موقعہ نہیں ملتا تھا صرف اپنا ہاتھ چادر کی جانب بڑھا کر اپنے ہاتھ کو چوم لیتے تھے اور برکت و سعادت حاصل کر لیتے تھے، ان چادروں کی وہی حیثیت تھی جو خانہ کعبہ میں حجرِ اسود کی ہے، اس جاہ و جلال اور عظمت و احترام اور کھیل تماشے کے ساتھ چند قدموں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے ہوتا تھا اور چادر مزار پر چڑھتی تھی۔ [1]

ایک سیّاح نے کیا دیکھا؟:۔ ہندوستان کے مختلف مزارات کی سیر و زیارت کے بعد ایک سیّاح پورے ملک کے ذہن و مزاج کی عکاسی کرتا ہے اور ہم کو اپنے مشاہدات سناتا ہے :۔

---

[1] "مزاروں کی جھلکیاں" ص ۶۴

"قبروں پر میلے ہیں، گانا بجانا ہے اور کھیل تماشے ہیں، طواف اور سجدے ہیں، مجاورت اور مراقبے ہیں، مزاروں سے حاجت مندوں کی عرضیاں بندھی ہوئی ہیں، وہاں آکر مرادیں مانگی جاتی ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں، گاگر، پنکھے اور صندل کے جلوس نکلتے ہیں، کوئی قبر پر ماتھا ٹیک کر طویل عرض و معروض کر رہا ہے، کسی نے بارہ دری کے ستون کو تھام رکھا ہے اور صاحب مزار کی دُہائی دے رہا ہے، کوئی دروازے کے پاس جہاں دھمال صاحب رقص فرما رہے ہیں ہاتھ باندھے کھڑا ہے اور صاحب مزار کے جلال و جبروت کے خوف سے اندر حاضر ہونے کی ہمت نہیں کرتا، مجاور مزار کے چراغوں کی راکھ زائرین کو چٹا رہا ہے اور نذرانے وصول کر رہا ہے، عقیدت مندوں کے سروں پر مور کے پنکھوں کو گھمایا، گلے میں کلاوا باندھا، چند الائچی دانے ہاتھ پر دھرے اور مٹھی گرم کر لی، سجادہ نشین صاحب مندروں کے مہنتوں کی طرح چڑھاوے وصول کرتے ہیں اور راوی ان کے لیے چین ہی چین لکھتا ہے[1]"

اجمیر کے عرس کا ایک اور منظر:- اجمیر کے عرس کا ایک منظر آپ دیکھ چکے ہیں، اب ایک دوسرا منظر بھی آپ اسی چشمدید گواہ کی زبان سے سنیے، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ:-

"حجرے کی ایک جانب عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، عجیب حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا، کچھ لوگ (مزار) کی جالیوں کو پکڑ کر رو رہے ہیں، کوئی سسک رہا ہے، کوئی قبر کا طواف کر رہا ہے، کچھ لوگ عجب والہانہ انداز میں التجائیں پیش کر رہے ہیں، میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جالی پکڑے سسکیاں بھر رہا تھا اور کہتا تھا کہ خواجہ! غریب نواز!! داتا!!! میں نے لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے، مجھے پہلا انعام دلوا دیجئے، یہ آپ کے بس کی بات ہے[2]"

---

[1] و [2] "مزاروں کی جھلکیاں ص ۶۴ و ۶۹

ایک منظر اور دیکھئے :- اجمیر ہی میں ناراگڈھ پہاڑی پر حضرت سید حسین خنگ سوار کا مزار ہے خواجہ اجمیری کے عرس کے ساتھ ساتھ اس پہاڑی پر بھی بہار آجاتی ہے، یہاں بھی عرس کی چہل پہل رہتی ہے، ایک سیاح ہم کو اس پہاڑی والے عرس کا ایک منظر دکھاتا ہے :-

"روضے میں داخل ہونے کے بعد زائرین بے اختیار سجدوں میں گرجاتے ہیں، مرادیں مانگتے ہیں، عورتوں کی تعداد نسبتاً مردوں سے زیادہ ہے، اُنھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا، عالم بے خودی میں سب کچھ ہو رہا تھا، نذر نیاز اور نذرانے کے پیسے وصول ہو رہے تھے، چادریں چڑھ رہی تھیں۔" [1]

گھوڑے ہم سے آگے نکل گئے :- بزرگوں کی قبروں پر حاضری کا بہت سا منظر دیکھا، یہیں ایک گھوڑا بھی معہود بنا ہوا سو رہا ہے، وہی سیاح یہ حیرت ناک انکشاف کر رہا ہے وہ کہتا ہے :-

"..... مزار کے سامنے ایک اور قبر تھی جس پر چادر چڑھی ہوئی تھی، یہ میراں صاحب کے گھوڑے کی قبر تھی، بزرگوں کے مزاروں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہی قابلِ عبرت اور حیرت انگیز تھا، مگر یہاں گھوڑے کے مزار پر ان سے بھی زیادہ عجیب حرکتیں ہو رہی تھیں، اس پر لوگ چنے کے نذرانے چڑھا رہے تھے اور قبر پر سجدے کر رہے تھے۔" [2]

آیئے ایک منظر حضرت علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کا کلیر شریف میں دیکھتے چلیں کیونکہ یہ بھی ہندوستان کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ کلیر شریف رُڑکی ضلع سہارنپور سے کچھ فاصلہ پر ہے، زائرین کے اظہارِ عقیدت کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے :-

"میں دیوار میں بنی جالیوں سے زائرین کی کیفیات دیکھ رہا تھا، لوگ

---

[1] مزاروں کی جھلکیاں ص ۴۷، [2] حوالہ مذکور ص ۴۷

پھول، لوبان، صندل، عود وغیرہ کا چڑھاوا چڑھا رہے تھے اور مزار پر بے تحاشا گر جاتے تھے، چادر کو بوسہ دیتے، آنکھوں سے لگاتے اور اپنی پیشانی رگڑتے تھے، جو لوگ سجدہ سے گریز کرتے تھے، ان کی گردنیں پکڑ کر مجاور جھکا دیتے تھے، ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی، مزار کی جالیوں میں حاجت برآری کی عرضیاں لٹک رہی تھیں، اور چھلے کے کپڑے بندھے ہوئے تھے، دروازہ پر ایک مجاور مٹھائیوں اور پھولوں کا ایک بڑا طباق لیے بیٹھا تھا جو اندر داخل ہوتے وقت ہر زائر کے ہاتھوں نذر میں لے جانے والی مٹھائیاں اور پھول ان کے ہاتھ سے لے کر اس طباق میں اُلٹ دیتا تھا اور زائر کے نکلنے کے وقت بطور تبرک ان میں سے کچھ دیتا تھا، اور نذرانے کے پیسے وصول کر لیتا تھا، مزار سے نکلتے ہوئے راستہ میں دیکھا کہ قوالوں اور گویوں کی ٹولیاں قطار در قطار بڑی بڑی ڈھولکیں لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور گلے پھاڑ پھاڑ کر گا رہے ہیں اور ڈھولک پیٹتے ہوئے روپے وصول کر رہے ہیں۔" [1]

یہ صورتِ حال چند مخصوص مقامات ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ پورا ملک اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ہندوستان کا کون سا ضلع تھا جس میں ایسی قبریں نہ ہوں جن پر چادریں نہ چڑھتی ہوں، میلے نہ لگتے ہوں، عورتوں اور مردوں کا جمِ غفیر نہ اکٹھا ہوتا ہو عرس کے ساتھ سارے لوازمات پوری دھوم دھام سے نہ پورے کیے جاتے ہوں۔

اصل مجرم علمائے سُوء:- مذکورۂ بالا تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کے اَن پڑھ عوام کو علمائے سُوء اور زر پرست صوفیاء اور سجادہ نشینوں نے کس راستہ پر لگا دیا تھا، یہ عقیدے، یہ خیالات، یہ جذبات عوام کے ذہنوں کی پیداوار نہیں تھے، یہ ہنگامہ آرائیاں ان کی اپنی ایجاد کردہ نہیں تھیں، کیونکہ

---

[1] "مزاروں کی جھلکیاں ص ۵۱ و ۵۲

ان تمام کاموں میں ہر ہر قدم پر احمقانہ حرکات اور جہالت کا مظاہرہ ہونے کے باوجود ان میں یکسانیت اور ترتیب و سلیقہ ہے اور ہر جگہ ایک مخصوص طریقۂ کار ہے جس کا لحاظ ان پڑھ اور جاہل ہونے کے باوجود بھی ہر شخص کرتا ہے۔

ان حقیقتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پڑھے لکھے طبقہ نے یہ طریقۂ کار ان کو سمجھایا ہے، علمار سوء نے ان مزاروں کی اہمیت اور بزرگانِ دین کے غیر محدود خدائی اختیارات، ان کی قبروں کی عظمت اور ان کے جاہ و جلال کا ان کے دلوں پر سکہ بٹھایا ہے، قبروں کی تعظیم کا یہ خاص ڈھنگ، ان پر حاضری کا طریقہ، ان سے مانگنے اور درخواست کرنے کا سلیقہ، مزار سے پلٹنے کا انداز، نذر و نیاز، فاتحہ اور چڑھاوے کے رسوم و آداب، یہ سب کچھ ان کو انھیں علمار سوء اور زر پرست صوفیار نے سکھائے اور بتائے ہیں، اور ذہن نشین کرائے ہیں، اس لیے اصل مجرم یہی علمار سوء ہیں۔

علاج آسان نہیں:۔ ان لوگوں نے ابتداءً ارباب اقتدار کے چشم و ابرو کے اشاروں پر اپنی زندگی کا نقشہ مرتب کیا، پھر ان کے جذبات و خیالات حتیٰ کہ ان کے لہو و لعب کے کاموں کو بھی حدیث و قرآن کے حوالوں سے جائز بتاتے رہے، آیاتِ قرآنی اور روایات کو توڑ مروڑ کر اپنے ہوائے نفس کے سانچے میں ڈھالتے رہے، ضعیف و موضوع روایتوں اور اسرائیلیات کے ذریعہ بہت سے اسلامی مسائل کی شکلیں بگاڑ دیں۔ یہ ساری داستان ہم کو اسلامی تاریخ سناتی ہے، عصرِ حاضر کے علمار سوء نے چھوٹے چھوٹے رسالوں سے لے کر بڑی بڑی کتابوں بلکہ قرآن کی تفسیروں میں بھی انہوں نے خلافِ شرع لٹریچر اتنا بھر دیا کہ جو بات کسی جاہل کے منہ سے نکل جائے چاہے وہ کتنی ہی غیر اسلامی کیوں نہ ہو اس کی تائید و تصویب میں بہ آسانی پچاسوں علمار سوء کی تحریریں وہ پیش کر سکتا ہے، یہی رسالے اور کتابیں لوگوں کا مرجع ہیں چوں کہ ان تحریروں میں قرآن و حدیث کا نام بار بار آتا ہے اس لیے لوگوں کو اس بات کا پورا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ قرآن و حدیث کے خلاف نہیں اور جو شخص خلافِ شرع کام کو عین دین سمجھ کر کرتا ہے اس سے اس کو روک دینا کوئی آسان کام ہے؟ یہی وجہ ہے

کہ ایسے گمراہ لوگوں کو آسانی سے راہِ مستقیم پر نہیں لایا جا سکتا، کیونکہ وہ ساری خرافات کو دین اور کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں، ان کے علماء نے ان کو یہی بتایا ہے۔

قبروں کی تجارت:۔ انھیں مفاد پرست صوفیاء اور علماء سُوء نے ان بزرگوں کو خدائی اختیارات کا شائبہ پیدا کرنے والے ناموں سے مشہور کیا پیر دستگیر، مشکل کشا، خواجہ غریب نواز، غوث بندہ نواز، گنج بخش، مولا دستگیر اور دوسرے اسی طرح کے نام جو ان شخصیتوں کو اس کائنات میں مختارِ کل اور متصرف ہونے کا پتہ دیتے ہیں، ان ناموں کی شہرت نے ان کی قبروں کو بتدریج مرجعِ خلائق بنا دیا اور لوگ اطرافِ ملک سے جوق در جوق آنے لگے، اس مرجعیت سے دنیاوی منافع اٹھانے والے از خود پیدا ہوتے چلے گئے، قبروں پر زائرین کی بھیڑ نے حریص اور دین فروش لالچی انسانوں کو جلبِ زر اور دنیاوی منفعت حاصل کرنے کے لیے اُکسایا اور وہ ان قبروں پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے اور آپس میں منصب تقسیم کر لیے۔ کوئی خادم کوئی جاروب کش بن گیا، اور کوئی مجاور اور سجادہ نشین اور جانے کیا کیا، ہر ایک کے حقوق، فرائض، ذمہ داریاں اور منافع میں حصہ مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح قبروں کی تجارت بڑے پیمانے پر کمپنی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اقبال نے کبھی کہا تھا ؎

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

سنا جاتا ہے کہ اجمیر میں عرس کے موقعہ پر کئی لاکھ کی آمدنی ہوتی ہے، ان قبروں کے مجاوروں اور سجادہ نشینوں کو حق ہوتا ہے کہ وہ ہر سیّاح اور زائر سے نذرانہ نیاز و فاتحہ کے نام پر کچھ نہ کچھ وصول کر لیں، اور اگر وہ کچھ نہیں دیتا ہے تو اُسے دھکّے دے کر یا وہابی کہہ کر اور ناپاک سمجھ کر رُسوا اور ذلیل کرنے میں وہ کوئی کوتاہی نہیں کرتے، اس طرح ان قبروں کی تجارت سے وابستہ لوگ اس علاقہ کے خوش حال اور مالداروں میں شمار ہونے لگتے ہیں اور ان کے لڑکے اور لڑکیاں شہزادوں اور شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے رہن سہن خوراک پوشاک کا معیار بہت بلند ہو جاتا ہے۔

بدعات و خرافات کی وبا دینِ الٰہی کے موجد مغل بادشاہ اکبر کے دور سے بڑے

پیمانے پر پھیلی، ہندو تہذیب اور مذہبی رسم و رواج کا دخل مسلم معاشرہ میں اسی کے دور سے شروع ہوگیا تھا اور ضمیر فروش علماء سوء اکبر بادشاہ کی جاری کردہ ساری خرافات کو حق اور درست ثابت کرتے رہے، اس کے بعد اس کے جانشینوں نے سوائے اورنگ زیب کے اس غلط رجحان پر کبھی بندش نہیں لگائی، ان لوگوں کو جنگی فتوحات اور اقتدار کی لڑائی سے فرصت ہی نہیں تھی اور اسلام کی نشر و اشاعت سے ان کو کبھی کوئی سروکار ہی نہیں رہا۔ یہ تو اللہ کے برگزیدہ بندوں نے تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیئے اور لاکھوں بھٹکے ہوئے لوگوں کو اسلام کی راہِ مستقیم پر لگایا اور وہ اپنے ان عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے عوام میں مقبول و محترم ہوگئے اور ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے غلو عقیدت کی بنا پر ان کی قبروں کو پختہ بنا دیا اور پھر ان پر پختہ عمارت کھڑی کر کے بلند و بالا گنبد بنوا دیئے، مسلم بادشاہوں نے ان قبروں پر بڑی جائدادیں وقف کر کے زر پرست صوفیاء اور دنیا کے حریص علماء سوء کی ان اوقاف کی آمدنی پر رال ٹپک پڑی اور پھر ہر قبر ایک خاص خاندان کی ملکیت میں آگئی اور مختلف طرح کی آمدنیوں کے ذرائع پیدا ہوتے چلے گئے، مشہور مزارات کی شہرت ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں ہزاروں قبروں کو مرجع خلائق اور مرکز عوام بنا کر ان پر عرس اور سالانہ میلہ کی شکل دے دی، اس طرح پورا ہندوستان اس مشرکانہ طرزِ عمل کا شکار ہوگیا اور ان پڑھ عوام کے دلوں میں یہ عقیدہ مستحکم کر دیا گیا کہ خدا سے مانگنے کے بجائے ان بزرگوں سے مانگنے میں کامیابی کی توقع زیادہ ہے، اس لیے وہ اپنی مشکلات کے حل کے لیے اجمیر، کلیر، دیوہ، بہرائچ، کچھوچھہ اور دوسرے مقامات پر حاجت برآری کے لیے جانے لگے اور غیر مسلموں کی طرح یاتراؤں کا ایک سلسلہ چل پڑا اور ایک ایک عرس میں لاکھوں انسان جمع ہونے لگے اور وہ تمام حرکات اور خرافات ہونے لگیں جو ہندوؤں کے میلوں اور اشنانوں کے موقعہ پر ہوتی ہیں، عورتوں اور مردوں کا اژدحام ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر تقریبات عرس میں شرکت، عورتوں کا جن بھوت اور چڑیل کے زیر اثر لمبے لمبے بالوں کو کھول کر کپڑوں سے بے پروا ہو کر جھومنا، اور اس کو قبروں کی برکت سمجھنا، ہارمونیم اور ڈھولک کے ساتھ مختلف شہروں سے نچنیوں اور گوئیوں کا ہجوم، طوائفوں کی حاضری،

بتوں کی طرح قبروں پر چڑھاوے، اگربتی، لوبان، گلاب، کیوڑہ، پھول اور ریشمی چادروں کی بھینٹ صاحب قبر کے نام پر جانوروں کو چھوڑنا، خدا کے نام کے بجائے ان کے ناموں پر ذبح کرنا، وہ کونسا مشرکانہ عمل تھا جو غیر مسلم اپنے مندروں اور تیرتھ استھانوں پر دیوی دیوتاؤں کے ساتھ کرتے ہیں ان عرسوں میں نہیں کیا جاتا تھا، البتہ اس تقریب کے تمام ارکان کے نام اسلامی رکھ دیئے گئے تاکہ اس کے پردے میں شرک کی غلاظت چھپ جائے۔

مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی جو تصویر کشی کی گئی ہے عمومی طور پر پورے ہندوستان کے اَن پڑھ عوام کا یہی حال تھا، ان مشرکانہ اعمال و عقائد کی تائید کے لیے علماء سوء اور زر پرست صوفیاء کا پورا ایک گروہ بلکہ پورا ایک فرقہ تھا جو لوگ ان مشرکانہ اعمال و عقائد کی مخالفت میں کچھ کہتے تھے تو جاہل اور اَن پڑھ عوام کو یہ مصنوعی پیر اور بہروپ بدلے ہوئے یہ صوفیاء اور سجادہ نشین بھڑکا کر ان پر حملہ کرا دیتے تھے اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے تھے، اور ان کو خود ہی کافر و مشرک قرار دے کر عوام سے ان کا رشتہ کاٹ دینے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے تاکہ مستقبل میں وہ ہمارے اس دنیاوی کاروبار اور آمدنیوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں

ہندوستان کے غیر تعلیمیافتہ مسلمانوں میں یہ خرافات و بدعات عام ہو چکی تھیں، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ ان کو خلافِ اسلام سمجھنا تو درکنار اور دُور کی بات تھی بلکہ اس کو عینِ دین اور موجبِ اَجر و ثواب سمجھتے تھے، اس لیے اس کی مخالفت کرنے والوں پر حملہ کرنے، ان کو رسوا اور ذلیل کرنے، ان کو سب و شتم کرنے کو اپنے جوشِ ایمانی اور مذہبی جذبے کے اظہار کا حق سمجھتے تھے۔ تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے آغاز میں یہی بددینی پورے شباب پر تھی، علماء حق کی محفلوں میں شاذ و نادر ہی تھا وہ اپنے کو بے دست و پا سمجھتے تھے، ان حالات کو دیکھ کر وہ خون کے آنسو روتے تھے لیکن ان کے خلاف جہاد کرنے کے ذرائع ان کے پاس نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے انھیں حالات میں دیوبند میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، اور ہندوستان کے مختلف خطوں میں انھیں علماء کے متبعین نے مدارس اسلامیہ قائم کر کے دینی تعلیم کو عام کرنے کی مہم شروع کی اور چودھویں صدی جب شروع ہوتی ہے تو پورے ہندوستان میں علماء حق کی ایک مضبوط جماعت وجود میں آچکی تھی اور پھر اس نے ان تمام مشرکانہ عقائد اور بدعات و خرافات کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا، اس ایمان افروز داستان کی تفصیل آگے ملاحظہ فرمایئے:۔

باب (۱۳)

بدعات اور مشرکانہ رسم و رواج کے خلاف جہاد

بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج کے پس پشت کوئی مذہبی گروہ یا فرقہ نہیں تھا جیسا کہ آپ اب تک پڑھتے آئے ہیں۔ ان خلافِ شرع باتوں کا مسلمانوں میں رواج درحقیقت ہندوستان کے ماحول کا اثر اور مسلم معاشرہ کا از خود پیدا کردہ تھا، اور غیر محسوس طور پر یہ تبدیلی ہوتی چلی گئی اور مسلمانوں کو یہ پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ بے خیالی و بیخودی میں اسلام کی شاہراہ سے کس خارزار وادی میں آ گئے۔ ہندوستان میں مسلمان اپنے دورِ حکومت و اقتدار میں بھی اقلیت ہی میں تھا ان کی تعداد ذو ڈھائی کروڑ تھی، آخری دور میں ان کی تعداد چار کروڑ کے قریب ہو گئی تھی، بقیہ سارا ہندوستان اپنی ایک مخصوص تہذیب و تمدن، روایات، رسم و رواج، ذات پات، اونچ نیچ اور باقاعدہ اس کے قاعدے اور ضابطے رکھتا تھا، اور پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخلوط و مشترک آبادیاں تھیں، ہر ایک دوسرے کی تقریبات میں شرکت بھی کرتا تھا۔

مسلمانوں نے ہندوستان کو جب اپنا وطن بنایا تو ابتدائی دور کے بعد جو سندھ اور ملتان کے اطراف میں گذرا جب ان کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو وہ لاہور تک آئے یہ پانچویں صدی کا آغاز تھا لیکن جب ان کے گھوڑوں نے اتر پردیش اور بہار تک کی زمین کو روند ڈالا تو مسلمان فاتحین نے دہلی اور آگرہ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو مسلمان ہندوستان کے مختلف خطوں

میں پھیل گئے، اور پھر مسلمانوں کا مذہب تبلیغی مذہب ہے اس لیے ہمیشہ مظلوم اور ستم رسیدہ اور جور و استبداد کی چکی میں پسے ہوئے طبقے کے لوگ اسلام قبول کرتے رہے اور وہ مسلم معاشرہ میں شامل ہوگئے، یہ فطری بات ہے کہ کوئی بھی قوم جب دوسرا مذہب قبول کرتی ہے تو قدرتی طور پر اس کے سابقہ عقائد و خیالات جو اس کے دل و دماغ میں پیوست تھے اس کی ہلکی سی چھاپ اس کے دل و دماغ پر کچھ عرصہ تک رہتی ہے، اگرچہ اس کا ظاہر تو اسلامی سانچے میں ضرور ڈھل جاتا ہے لیکن بہت سے رسم و رواج جو حالتِ کفر میں اس کی زندگی میں جاری و ساری تھے، اس کی گھریلو زندگی میں اس کی ہلکی سی جھلک باقی رہ جاتی ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ اس کے اثرات دل و دماغ کے کسی کونے میں چپکے رہ جاتے ہیں، اس طرح مسلم معاشرہ میں غیر محسوس طور پر بہت سے غیر اسلامی رسوم، طور طریقے اور خیالات و جذبات اور توہمات داخل ہوگئے، بعد میں یہی غلط رجحانات مسلم معاشرے کا عام مزاج بن گئے، اور مسلمانوں کی آبادی کی آبادی ان رسم و رواج کی اس طرح پابند ہوگئی کہ اس کا ترک کرنا اس کے لیے دشوار ہوگیا اور کچھ دنوں کے بعد کچھ لوگوں نے اس میں تھوڑی بہت ترمیم کرکے اس کو مذہب کا رنگ دے دیا۔

اسلامی معاشرہ پر ہندو تہذیب اور مذہب کے جو اثرات پڑے ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور بڑی باریک بینی اور ژرف نگاہی سے ان رسوم اور رواج کی نشان دہی کی گئی جو مسلم معاشرہ میں ہندو سماج سے آئیں، بطور مثال ہندو معاشرہ میں بیوہ کی شادی نہیں ہوسکتی، ایک زمانہ مسلمانوں کا بھی ایسا تھا کہ جس طرح ہندو معاشرہ میں بیواؤں کی شادی ناممکن تھی مسلمانوں کے یہاں بھی بیواؤں کی شادی پر کوئی تیار اور آمادہ نہیں ہوتا تھا اس کو بہت معیوب نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ صرف ایک مثال ہے، ایسے ہی سیکڑوں خیالات ہیں جو اسلامی معاشرہ میں ہندو سماج سے آئے بالخصوص شادی بیاہ، غمی اور میت کے رسوم کا بڑا حصہ ہندوانہ رسم و رواج کی دین ہے اور مسلمانوں میں یہ رسم و رواج اس طرح رائج ہیں گویا یہ اسلام کی روایات ہیں، اگر ان کے خلاف مہم شروع کی جائے اور اس کے ترک پر اصرار کیا جائے تو عوام اصلاح کرنے والوں کا ناطقہ بند کردیں گے۔

اصلاح کی پہلی مہم :- مسلم معاشرہ سے ان مشرکانہ رسم و رواج اور عقائد و خیالات دور کرنے اور مسلم معاشرہ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی پہلی باضابطہ اور بڑی مہم حضرت سید احمد شہید اور ان کے دو جلیل القدر مریدین مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحیؒ نے چلائی اور ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کا دورہ کیا جہاں مسلم آبادی ہے اور جن مقامات کی اصلاح سے دوسرے مقامات کے مسلمانوں پر اچھے اثرات مرتب ہو سکتے تھے، سید احمد شہید کے سیرت نگار نے بڑی تفصیل سے اس اصلاحی مہم کو اپنی کتاب میں پیش کیا ہے[1]

یہ تحریک اصلاح انیسویں صدی کے پہلے ثلث ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (مئی ۱۸۳۱ء) کو سید صاحب کی شہادت کے بعد ختم ہو جاتی ہے، یہ سید صاحب اور ان کے رفقاء کی مہم کا آخری دن تھا، بالاکوٹ کے میدان جہاد میں اصلاح کی یہ پُرخلوص اور پُرجوش آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، خدا کے ان مخلص بندوں نے اصلاح و تبلیغ کی وہ مہم جو گاؤں گاؤں لوگوں کو بیعت کر کے لوگوں سے بدعات و خرافات کے ترک کرنے کا عہد لے کر ہندوستان کے ایک بہت بڑے خطے میں چلائی تھی، اس کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت جس نے مسجدوں میں گھوڑے گدھے بندھوائے تھے، اس علاقہ کو دارالاسلام بنایا جائے، لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور بالاکوٹ کی پتھریلی سرزمین میں سید صاحب اور ان کے رفقاء نے خاک و خون میں تڑپ کر جان جاں آفریں کو سپرد کر کے خدا سے جو اُن کا عہد تھا اس کو پورا کر دیا کہ خدایا تیرے دین کی سربلندی کے لیے اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ بہا دوں گا۔ اور انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

اصلاحی مہم کا ایک سرسری جائزہ :- سید صاحب، مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحیؒ صاحب نے مسلم

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" رائے بریلوی مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور پونے بارہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے مجلس تحقیقات و نشریات لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

معاشرہ کے اصلاح کی جو مؤثر مہم چلائی اس کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے تاکہ آپ اندازہ کرسکیں کہ کس طرح غیر اسلامی عقائد وخیالات اور مشرکانہ رسم ورواج مسلم معاشرہ پر چھائے ہوئے تھے اور کس طرح پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، اس تفصیل سے آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ راہ سے بھٹکے ہوئے ان لوگوں کے پس پشت کوئی جماعتی نظام، گروہ یا فرقہ نہیں تھا جیسا کہ بعد کے دور میں ایک مکتبۂ فکر کے لوگ ان بدعات وخرافات کی پشت پناہی کرتے ہیں، بلکہ عوام جہالت اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی وجہ سے ان غیر اسلامی عقائد وخیالات، رسم ورواج اور توہمات میں مبتلا تھے، سید صاحب کا تبلیغی سفر جب ہوا اس کی سب سے پہلی منزل ایک غیر مشہور قصبہ دھئی تھا، وہاں کی آبادی نے سید صاحب کے ہاتھوں پر بیعت کرلی، اس کے بعد سید صاحب نے جو کچھ فرمایا اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ ان میں کیا کیا مشرکانہ رسوم رائج تھیں، آپ نے بیعت کے بعد وہاں کے لوگوں سے فرمایا:-

"بھائیو! بیعت کرنے کا حاصل یہ ہے کہ تم جو کچھ شرک وبدعت کرتے ہو، تعزیہ بناتے ہو، نشان کھڑے کرتے ہو، پیروں اور شہیدوں کی قبریں پوجتے ہو، ان کی نذر ونیاز مانتے ہو، ان سب کاموں کو چھوڑ دو اور سوائے خدا کے کسی کو نفع وضرر کا مالک نہ جانو، اور اپنا حاجت روا نہ مانو، اگر یہ شرک وبدعت کروگے تو فقط بیعت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"[1]

مصنفِ کتاب نے یہ بھی بتایا کہ یہ نصیحت رائیگاں نہیں گئی، بہت سے لوگوں نے اسی وقت اپنے تعزیئے کے چبوترے کھود ڈالے، نشانوں اور پنجوں کی جو کچھ چاندی تھی لاکر آپ کو نذر کی کہ آپ اس کو اہلِ قافلہ کے مصرف میں لائیں۔

موضع ڈگڈگی میں تعزیوں کے چبوترے بہت تھے، یہاں لوگوں نے رات کے اندھیرے میں پھاوڑے اور کدالیں لے کر تمام چبوترے کھود ڈالے، پنجوں اور نشانوں کی

---

[1] سیرت سید احمد شہید، ج ۱ ص ۲۶۵

چاندی جو دو سو روپے وزن کی تھی آپ کی نذر کی، ایک بڑا پکا تعزیہ دار تھا اور بہت پیسے خرچ کر کے تعزیہ کا چبوترا بہت شاندار بنوایا تھا، بیعت کے بعد اُسے کھودنے کی اجازت دی تو سیّد صاحب نے اپنے ہاتھوں میں پھاوڑا لے کر اُسے کھودنا شروع کیا تو حاضرین نے آگے بڑھ کر سید صاحب کے ہاتھ سے پھاوڑا لے کر چبوترے کو کھود کر زمین کے برابر کر دیا۔[1]

اُوجھئی کے مقام پر اطراف و جوانب کے ڈھائی تین سو مسلمان جمع تھے، سید صاحب کے خلیفہ لال محمد صاحب نے ان کو بیعت کرانے کے بعد ان کے حالات بیان کیے کہ ان کی اس دیار میں چوراسی بستیاں ہیں، یہ صرف نام کے مسلمان ہیں مگر سب کام ہندوؤں کے کرتے ہیں، بُت بھی پوجتے ہیں، ہولی، دیوالی بھی کرتے ہیں، پھول اور پیتل کے برتن میں ہندوؤں کی طرح کھانا پکاتے ہیں، اسلام سے محض بے خبر ہیں، آپ نے بیعت کے بعد شیخ لعل محمد کو اپنا خلیفہ بنایا اور ان کی اصلاح پر ان کو متعین کیا۔[2]

موضع اسرولی کے مسلمان ہندوؤں کی سی پوشاک پہنتے تھے اور ان کے سارے برتن بھی ہندوؤں جیسے تھے لیکن تعزیہ داری وغیرہ البتہ اس گاؤں میں زور شور سے ہوتی تھی سید صاحب کے دستِ راست مولانا عبدالحیٔ صاحب کی تقریر ہوئی اور شرک و بدعت، تعزیہ داری، قبر پرستی اور پیروں اور بزرگوں کی نذر و منت کی برائی بیان کی، یہ سن کر بستی والوں نے اسی وقت تعزیوں کے چبوترے کھود کر برابر کر دیئے، عَلَم اور پنجے توڑ پھوڑ کر بانس تو جلا دیئے ان کے کپڑے اور چاندی قافلہ والوں کے خرچ کے فنڈ میں دیدیئے، بالکل یہی حال چھپری کے مسلمانوں کا تھا، مرزا پور کے مسلمانوں میں بھی یہی خرافات تھیں، جب سید صاحب وہاں پہونچے تو بہت سے مسلمانوں نے بیعت کر لی، بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج سے ان کے دلوں میں اتنی نفرت بیٹھی کہ وہاں کے رئیس محمد خاں نے اپنی برادری میں یہ قانون جاری کر دیا کہ:-

"اگر کوئی شخص کسی کے تعزیئے میں شریک ہوا، اور تحقیق ہو جائے تو

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" ج ۱ ص ۲۶۶ [2] حوالۂ مذکور ص ۲۶۹

برادری کی دعوت کے واسطے پچیس روپیہ جرمانہ اور جو عشرۂ محرم میں کھچڑا پکوائے یا شربت کرے، اس سے گیارہ روپیہ جرمانہ، اور جو کسی کا تعزیہ دیکھنے جائے اس کے جرمانے میں ایک طالب علم کو ایک مہینہ اپنے گھر کھانا کھلائے اور جس کی ایک وقت کی نماز قضا ہو جائے اس کو تیس زیر بند لگائے جائیں۔"[1]

سید صاحب، مولانا اسمٰعیل شہید صاحب اور مولانا عبدالحیؒ صاحب اپنے اصلاحی قافلہ کے ساتھ بنارس تشریف لائے، راج گھاٹ پر لال عبداللہ اور بھولا چابک سوار بڑے ذی عزت اور نامدار اور وہاں تمام اہل بدعت کے سرگروہ اور سردار تھے، انہوں نے ان حضرات کی دعوت کی، مولانا عبدالحیؒ صاحب نے وعظ کہا اور بدعات و خرافات سے توبہ کرنے پر آمادہ کیا، تقریر کے بعد حاضرین نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور دوسرے دن اہل قافلہ کی دعوت کی، اس کا نقشہ مصنف نے یہ کھینچا ہے:-

"انہوں نے کئی سو تعزیے توڑ کر ان کے کاغذ اور لکڑیوں کے انبار لگا دیئے تھے، آپ کو وہاں لے جا کر دکھایا اور عرض کیا کہ یہ آپ کی دعوت کا کھانا پکانے کا ایندھن ہے، دونوں وقت یہی لکڑیاں جلائی جائیں گی۔"[2]

بنارس کے دین محمد صاحب نے آپ کی مع قافلہ کے دعوت کی اور اپنے گھر لے گئے، گھر کے تمام لوگ بیعت ہوئے، سیّد صاحب نے دیکھا کہ اس گھر کے طاقوں میں طرح طرح کی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں، کہیں آدمیوں کی شکل کی اور کہیں جانوروں کی، ایک پختہ اینٹوں کا بڑا سا چبوترہ تھا، سیّد صاحب نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو دین محمد صاحب نے بتایا کہ یہ چبوترہ عورتوں نے تعزیہ رکھنے کے لیے بنوایا ہے اور ایک چبوترہ باہر امام باڑے میں مردوں نے بنوایا ہے۔ آپ نے ان سے فرمایا:-

"تمام مورتوں کو جو طاقوں میں ہیں، توڑ ڈالو، اور چبوتروں کو کھود کر زمین کے برابر کر دو۔"[3]

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" ج ۱ ص ۲۸۳ [2] و [3] حوالہ مذکور ص ۲۹۴

تھوڑی ہی دیر میں حکم کی تعمیل کر دی گئی، تمام مورتیاں توڑ دی گئیں، اندر اور باہر کے دونوں چبوترے کھود کر زمین کے برابر کر دیئے گئے، بنارس میں اور کیا کیا بدعات و خرافات تھیں؟ ایک صاحب اللہ رکھو تھے، انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ:۔

"حضرت! بیعت تو ہم سب نے آپ کے ہاتھ پر کر لی مگر کتنی باتیں ہمارے یہاں ہیں، جب وہ دور ہوں، تب ہم لوگ پورے طور پر مسلمان ہوں، آپ نے فرمایا، وہ کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ایک تو ہم لوگ اپنے گھرانے میں شادی بیاہ نہیں کر سکتے، ہندوؤں کی طرح عیب جانتے ہیں، دوسرے عورتیں پردہ نہیں کرتیں، تیسرے ہمارے شہر میں نوچندی جمعرات کا میلہ ہوتا ہے تمام عورت مرد، ہندو مسلمان ہزار ہا جمع ہوتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں۔ اس نوچندی میں لباس و پوشاک کا ایسا اہتمام ہوتا ہے کہ عیدین میں اس کا چوتھائی بھی نہیں ہوتا، سید صاحب نے تمام مجمع کو سمجھایا، نصیحتیں فرمائیں اور سب سے عہد لیا کہ وہ ان خرافات کو نہیں کریں گے اور گھروں میں تعزیوں کے چبوترے توڑ کر مسجد بنائیں گے، تب آپ نے ایک کو اصلاح کا ذمہ دار بنایا اور ان کی دعوت قبول کی۔"[1]

جب سید صاحب اپنے اس تبلیغی سفر میں کلکتہ پہونچے ہیں تو وہاں آپ نے کچھ دنوں قیام فرمایا وہیں نواکھالی (بنگال) سے چالیس پچاس آدمی آئے اور انہوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، اس کے بعد ڈھاکہ سے کچھ لوگ آئے، اس دن مولانا عبدالحیٔ صاحب کا وعظ تھا، انہوں نے سنا تو کہا کہ:۔

"ہم لوگ تو جانتے تھے کہ تعزیہ بنانا، نشان کھڑے کرنا، پیروں شہیدوں کی نذر ماننا، ان سے مرادیں مانگنا، شادی غمی میں طرح طرح کی خرافات کرنا یہی دین داروں کے کام ہیں، اب وعظ سننے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سب

---

[1] سیرت سید احمد شہید ج ۱ ص ۲۹۵ و ۲۹۶

بُرے کام ہیں اور ان کا کرنے والا مشرک اور بد دین ہے، ہم لوگ آج تک غلطی میں پڑے تھے۔"[1]

اور سب کے سب آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور آئندہ کے لیے ان مشرکانہ خیالات سے توبہ کی، اسی قیام کے زمانہ میں چاٹگام سے کچھ لوگ سید صاحب کی شہرت سن کر بیعت ہونے کی غرض سے کلکتہ آئے اور انہوں نے چاٹگام کی مذہبی حالت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ:-

"ہمارے یہاں دستور ہے کہ عورتیں ہر روز ہندوؤں کی طرح برتن مانجھتی ہیں اور گوبر سے لیپ کر اور چوکا دے کر کھانا پکاتی ہیں، مجال نہیں کہ ان کے چوکے میں دوسرا شخص چلا جائے، جب کھانا تیار ہوا تب کھانے والے آئے اور اپنی اپنی تھالی اور رکابی دھو کر چوکے کے قریب لائے اور الگ الگ بیٹھے، بعض ننگے سر، بعض سر میں کچھ کپڑا باندھ کر پھر پکانے والی نے جو کھانا ان کے برتن میں الگ سے رکھ کر دیا وہ انہوں نے کھا لیا اور جو کھانا برتن میں بچ رہا اس کو انھوں نے رسم کے مطابق ایک جگہ ڈال دیا اور اس برتن کو راکھ سے دھو مانجھ کر چوکے میں رکھ دیا، یہ رسم ہمارے یہاں بہت برسوں سے چلی آتی ہے۔ ایک دستور ہمارے یہاں یہ بھی ہے کہ جو لوگ دونوں عیدوں کے تہوار کرتے ہیں وہ اپنے کو بڑا مسلمان جانتے ہیں اور بعض لوگ عیدین اور محرم بھی کرتے ہیں ہولی اور دیوالی اور دسہرا بھی کرتے ہیں، بھوانی کی پوجا بھی کرتے ہیں، پیروں، شہیدوں کی نذر نیاز بھی کرتے ہیں اور ایک رسم یہ بھی ہمارے بزرگوں سے چلی آتی ہے کہ عورتوں سے نکاح بھی کرتے ہیں اور بے نکاح بھی عورتیں گھر میں ڈال لیتے ہیں اور ان سے جو لڑکے پیدا ہوتے ہیں ان کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔"[2]

---

[1] سیرت سید احمد شہید ج ۱ ص ۳۲۲ [2] حوالہ مذکور ج ۱ ص ۳۲۳

آپ نے چاٹگام سے آنے والوں کو بیعت کیا اور کچھ دنوں اپنے قافلہ میں رکھ کر تربیت فرمائی اور جب ان کی اصلاح مکمل ہوگئی تب ان کو خلافت دے کر ان کے وطن بھیج دیا اور ہدایت دی کہ وہ تمام مشرکانہ رسم و رواج کو مٹانے کی تا زندگی کوشش کریں، اور کسی تکلیف و ایذا پر پریشان نہ ہوں اور صبر کرنا، اللہ اور اس کے رسول کا حکم بتاتے رہنا، ان شاء اللہ سب کی اصلاح ہوجائے گی۔

بدعات کا ایک تجزیہ :- میں نے بدعات و خرافات کے خلاف عملی جد و جہد کی ایک ہلکی سی جھلک آپ کے سامنے پیش کی ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان قوم ہر طرف ہر علاقے میں، ہر شہر اور گاؤں میں پائی جاتی تھی، لیکن ان کے ظاہر و باطن میں اسلامی تعلیمات کا اثر برائے نام تھا، اور قوم جن خرافات میں مبتلا تھی ان کی سب سے کڑی اور کراری زد اسلام کے عقیدۂ توحید پر پڑتی تھی جو اسلام کی اصل الاصول ہے جتنی بھی بدعات اور رسوم کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام میں قدرِ مشترک کے طور پر ایک چیز ہر ایک سے جھلکتی ہے کہ وہ خدا کے وجود کے قائل یقیناً رہے ہوں گے لیکن مسلمان کہلانے والی قوم نے خدا کی وحدانیت، اس کی عظمت، اس کی خالقیت و مالکیت اور اس کی معبودیت کا تصور بھی فراموش کر دیا تھا اور خدا کی عظمت و ہیبت کا خیال بھی ان کے ذہنوں سے مٹ چکا تھا، اور مشرکین عرب کی طرح کہ وہ خدا کے قائل ضرور تھے لیکن ان کا خدا اس کائنات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا، بارش کوئی دیوتا برساتا ہے، اولاد کوئی دوسرا دیتا ہے، مصیبتیں اور بیماریاں کوئی اور دیتا ہے، شفا اور بیماریوں سے نجات کوئی اور دیتا ہے خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں سمجھتے تھے، ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہن میں خدا کے مالک و مختار ہونے کا تصور نہیں رہ گیا تھا، ماسوا اللہ بہت سی چیزوں کو مالک و مختار تسلیم کر لیا گیا تھا، مسلمان کہلانے والی قوم اپنی حاجتوں کو قبروں پر، پیروں، شہیدوں کے سامنے پیش کرتی تھی، خدا کے سامنے اس کو جھکنے کی، اس سے مانگنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی، مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ تعزیہ بنالیں گے، نشان گاڑ لیں گے، پیر اور شہید کی نیاز فاتحہ کر لیں گے، ہماری ساری مشکلات حل ہوجائیں گی،

خدا کے سامنے ہمیں ہاتھ پھیلانے کی نعوذ باللہ ضرورت ہی کیا ہے، یہی شرک ان تمام بدعات کی تہ میں چھپا ہوا ہے اسی لیے جب اصلاح کرنے والوں نے ان گمراہ لوگوں کو تقریروں اور وعظوں میں سمجھایا اور اللہ کو ان کی ہدایت منظور ہوئی تو بہت جلد اسلامی عقیدے قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے، اور پچھلی گمراہیوں کو اپنی جہالت اور ناواقفیت کے سبب سے سمجھا اور ان کو ان خرافات سے توبہ کی توفیق ہوئی۔

چونکہ مختلف علاقوں میں مختلف طرح کی بدعات اور مشرکانہ رسوم تھیں اس لیے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ عوام کسی خاص فرقہ اور گروہ سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ہر جگہ کے حالات اور ماحول سے متأثر ہو کر، اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی بنا پر یہ گمراہیاں ان میں از خود آگئی تھیں اور جب ان کی اصلاح کی گئی تو اصلاح کی آواز مؤثر ثابت ہوئی اور اُن کو کوئی ورغلانے والا نہیں پیدا ہوا۔

اصلاح کا سلسلہ در سلسلہ:۔ سید صاحب اور ان کے رفقاء کے سامنے ایک عظیم پروگرام تھا اس لیے وہ اندرونِ ملک اصلاح کی رَو پیدا کر کے میدانِ جہاد کی طرف کوچ کر گئے اور پھر ان علاقوں میں لَوٹ کر دوبارہ آنے اور اصلاح کے اس پروگرام کو اور وسیع کرنے کا موقع نہیں ملا، کیوں کہ سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید دونوں حضرات میدانِ جہاد میں شہید ہو گئے، اور خدا کے سامنے سُرخ رُو ہو گئے، اس کے بعد علماء حق نے اصلاح کی اس مہم کو آگے بڑھانے اور جاری رکھنے کے لیے اپنی جد وجہد کا آغاز کیا یہ انیسویں صدی کا آخری زمانہ تھا، دار العلوم دیوبند اور دوسرے مدارس قائم ہو چکے تھے، علماء حق کی تنظیم کا آغاز ہو چکا تھا اور جلیل القدر علماء جد وجہد کے میدان میں آگئے تھے ان میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارن پوری، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری جیسے لوگوں نے ان مشرکانہ عقیدوں اور رسم ورواج کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا، اور اپنے پیش رَوَوں بزرگوں کے مشن کو آگے بڑھایا۔

معاشرہ میں چوں کہ ایسے توہمات اور خیالات جڑ پکڑ چکے تھے جو شرک کی سرحدوں کو

چھوڑ رہے تھے اس لیے ردِّ بدعت میں وہ تشدد سے کام لیتے تھے، کیونکہ یہ جسمِ اسلام کا ایک ناسور تھا جس کا آپریشن زیادہ گہرا اور بڑا کرنا تھا، یہی وجہ ہے کہ سید احمد شہید کے رفیقِ خاص مولانا اسمٰعیل شہید جو خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ تھے، جس خاندان نے ہندوستان میں علمِ حدیث کی دولت کو عام کیا، جس خاندان کا ہر مرد عالم بے مثیل تھا، ایسے بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں مولانا اسمٰعیل شہید کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اور ان کو شیخ بھی سید احمد صاحب جیسا مصلح ملا، اس لیے مولانا اسمٰعیل شہید کا جذبہ اصلاح مشرکانہ رسوم و عقائد کے لیے شمشیر برّاں بن گیا۔ اور جو کچھ اس دور میں اصلاح ہوئی وہ اسی قوتِ بیان کی وجہ سے ہوئی ورنہ دنیا دار پیروں نے تو جاہل عوام کو اپنی چراگاہ بنا رکھا تھا، بعد کے مصلحین نے بھی اپنا رویہ ردِّ بدعت اور مشرکانہ رسم و رواج کے خلاف انتہائی متشددانہ رکھا، کیونکہ پانی اب سر سے اونچا ہو چکا تھا اس کے علاج کا اب صرف یہی طریقہ تھا۔

خانوادۂ ولی اللّٰہی کے علمی جانشین:- سیّد صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی کے میدانِ جنگ میں شہید ہونے کے بعد اندرونِ ملک مغل حکومت کا دائرہ سمٹ کر دہلی شہر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد وہ کسر بھی پوری ہو گئی اور لال قلعہ پر انگریزوں کے اقتدار کا جھنڈا لہرانے لگا اور انگریز نے جوش و خروش کے ساتھ تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کی مہم میں لگ گئے، حکومت تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی، اب اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ داری صرف علماء کے کندھوں پر رہ گئی تھی کہ وہ ہندوستان میں اسلام کو باقی رکھنے کے سلسلہ میں کتنی قربانیاں دے سکتے ہیں؟ علماء حق سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے اور انھوں نے سیلاب کا رُخ موڑ دیا اور عیسائیت کو اپنے منبع و مخرج میں سمٹ جانا پڑا، علماء حق کی ساری توانائیاں اس دور میں خارجی دشمنوں کی مدافعت میں صرف ہونے لگیں اور داخلی خرابیوں کو دُور کرنے کی مہم مولانا اسمٰعیل شہید اور سیّد صاحب نے جو چلائی تھی اس دوران بند ہو گئی، کیوں کہ حالات نے اس کی فرصت ہی نہیں دی اور پھر چند سالوں کے بعد عیسائیت کے طوفان سے ملّت کے سفینہ کو محفوظ

نکال لائے تو انہوں نے اس طرف پھر توجہ کی، اور خاندانِ ولی اللّٰہی کے علمی سلسلہ سے ایسے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا تاریخی کردار انجام دیا جن کے سربراہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی تھے۔

منصوبہ بند علاج کی تدبیریں: مسلمانوں میں عقیدوں کی جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور دوسری قوموں سے متاثر ہو کر مسلم معاشرہ میں جو بہت سی بدعقیدگیاں گھس آئی تھیں اس کی بنیادی وجہ مسلم عوام میں تعلیم کی کمی، دینی معلومات کا فقدان اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت تھی اس لیے خاندانِ ولی اللّٰہی کے علمی جانشینوں نے اس کے علاج کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اُسے بھی بنیادی ہونا چاہیئے، عقیدوں کی ان خرابیوں کا علاج اسلامی تعلیم کا فروغ، دینی معلومات کو ہر خاص و عام تک پہونچانا ہے، جب دین کی صحیح معلومات حاصل ہو جائیں گی ہر علاقہ، ہر شہر اور گاؤں میں دینی تعلیم سے واقف لوگ پیدا ہو جائیں گے تو وہ ساری بدعقیدگیاں از خود دور ہونا شروع ہو جائیں گی جو مسلم سماج کی دینی زندگی کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں، اس لیے اکابرِ ملت نے دینی مدارس کے قیام کو منصوبہ بند طریقہ سے جاری کرنے کو وقت کی سب سے پہلی اور سب سے اہم ضرورت سمجھا ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی اور اس کے چھ ماہ بعد سہارنپور میں مظاہر علوم کا قیام عمل میں آیا پھر انھیں بزرگوں نے مراد آباد میں جامعہ قاسمیہ قائم کیا اور خورجہ ضلع علی گڈھ اور بریلی میں بھی انھیں حضرات نے دینی مدرسے جاری کیے اور کچھ برسوں بعد دار العلوم دیوبند اور دوسرے مدارس کے اولین فضلاء نے اتر پردیش، بہار، بنگال میں بہت سے دینی مدرسے کھولے پھر بتدریج ایک ایک ضلع میں کئی کئی مرکزی اسلامی مدرسے وجود میں آگئے، مدرسوں کا نظام اور طریقہ اس نہج پر رکھا گیا کہ ہر سطح کے لوگ ان مدارس سے استفادہ کر سکیں اور ہر قوم اور برادری کے لیے لوگوں کے لیے دینی تعلیم حاصل کرنا آسان بنا دیا گیا جبکہ پہلے ایسا نہیں تھا، دینی تعلیم کی اس مہم کو آگے بڑھانے والے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، اور

دوسرے حضرات ہیں۔

قدیم اسلامی مدارس:۔ مغل دورِ حکومت میں ۱۸۵۷ء تک دینی تعلیم کا نظام یہ تھا کہ جاگیردار اور رؤسا اپنی ریاست اور جاگیر میں چند علماء کو بلا کر ایک مدرسہ جاری کر دیتے تھے اور اس مدرسہ پر کچھ گاؤں وقف کر دیتے تھے اسی کی آمدنی سے یہ مدارس چلتے تھے۔ مینڈھ ضلع علی گڈھ، شہر جونپور، ریاست رام پور، اور حیدر آباد وغیرہ میں اسی طرح کے مدارس تھے یا علماء اپنی اپنی جگہوں پر بعض شوقین طلبہ کو پڑھا دیتے تھے، ان مدارس میں وہی طلبہ جا سکتے تھے جو اپنا بار خود اٹھا سکتے تھے، کھانے پینے سے لے کر رہائش تک کا مسئلہ ان کو خود حل کرنا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ خوش حال گھرانے ہی کے افراد ان مدارس سے مستفید ہو سکتے تھے، اسی لیے دینی تعلیم عام نہیں ہو رہی تھی، کسی کسی شہر میں کوئی قابلِ ذکر عالم پیدا ہو جاتا تھا، عوام تک دینی تعلیم پہونچنے کی کوئی سبیل نہیں تھی، گاؤں، قصبات اور شہروں میں اپنی اپنی معاش کی فکر میں اُلجھے ہوئے مسلمان ان دینی سرچشموں تک پہونچ نہیں پاتے تھے اور وہ محروم رہ جاتے تھے۔

علماء حق نے جدید نظام کے ساتھ ان مدرسوں کو جاری کیا تو اس کا فیض شہروں سے گذر کر دور افتادہ گاؤں تک پہونچ گیا اور دینی تعلیم کا نور محلوں اور کوٹھیوں سے آگے بڑھکر جھونپڑیوں تک پہونچ گیا اور ہر قابلِ ذکر آبادی میں صاحبِ علم اور صاحب درس و افتاء افراد پیدا ہوتے چلے گئے، جنہوں نے عوام کی جہالت کی تاریکیوں میں علم کی روشنی پھیلائی جس روشنی میں انہوں نے اپنے معاشرے اور اپنی زندگی کی ان آلودگیوں کو دیکھا جن سے ان کی دینی زندگی کا دامن ملوث تھا، دین کی حقیقت کو جانا، اسلام کے عقیدۂ توحید اور اس کے عملی تقاضوں کو سمجھا تو ان میں از خود تبدیلی شروع ہوئی اور بدعات و خرافات سوکھے پتوں کی طرح ان کی نئی زندگی کے سرسبز و شاداب درختوں سے جھڑ کر ختم ہونی شروع ہو گئیں اور بغیر کسی ہنگامہ، جلسہ، جلوس، مناظرہ و مباحثہ کے اسلامی معاشرہ اپنی ان بیماریوں سے نجات پانے لگا جس میں وہ ایک عرصہ سے جہالت اور دینی تعلیم سے ناواقفیت کی بنا پر مبتلا تھا اور دین اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ نمایاں ہونے لگا، جو مصلحینِ اُمت

کے دلوں کی تمنا تھی، اپنی جد وجہد کے مفید نتیجے ان کے سامنے آنے لگے۔

تزکیۂ قلوب :- جو لوگ اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہوئے اور نئی زندگی نخلِ اسلام کی صحیح تعلیمات کے سایہ میں شروع کی تو ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ دین و شریعت کے تقاضوں پر پورے طور پر عمل پیرا ہوں تو قدرتی طور پر ان کو ایسے بزرگوں کی تلاش ہوئی جو ان کو دین و شریعت کے تقاضوں سے آشنا کریں، عبادت و ریاضت اور اسلامی معاشرہ میں دینی انقلاب کے طریقوں اور راہوں کو سمجھیں، اور جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کو سدھارنے کے ساتھ اپنے خاندان، اہلِ محلہ اور اپنی آبادی کے لوگوں کو دین کی صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ ایسے تمام لوگوں نے خانقاہ رشیدیہ گنگوہ، خانقاہ رائے پور، خانقاہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا سید محمد علی مونگیری، خانقاہ حسینیہ ٹانڈہ، جیسی خانقاہوں اور بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ہاتھوں پر خلوصِ دل سے توبہ کی اور ان سے مسلسل تعلیم لے کر اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھال دیا، اب ان کے چہروں سے تقدس و پاکیزگی کا نور جھلکنے لگا، ان کو نمازوں میں لذت محسوس ہونے لگی، دین کے کاموں کے لیے وہ اپنے اوقات فارغ کرنے لگے، قرآن کی تلاوت کا ایمان افروز کیف و سرور حاصل ہونے لگا، اس طرح کایا پلٹ گئی اور انہوں نے اپنی اصلاح کے بعد دوسرے بہت سے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی اور ہدایت کا ذریعہ بن گئے ع

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے

بزرگوں اور اللہ والوں کی ایک نگاہِ اثر آفریں نے ہزاروں کی زندگیاں بدل دیں اور ان لوگوں کو تقویٰ و طہارت کا لذت آشنا بنا دیا، دین کی تڑپ، شعائرِ اسلامی کی لگن، پورے معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈوبا ہوا دیکھنا ان کے دلوں کی تمنا بن گئی، اس طرح دینی مدارس اور اہل اللہ کی خانقاہوں نے مل کر اصلاح کا ایک پرجوش سلسلہ شروع کیا اور اس کے بہترین نتائج بھی سامنے آتے چلے گئے، ان مدارس سے نکلے ہوئے علماء اور ان خانقاہوں سے تربیت پائے ہوئے اشخاص جب لوٹ کر اپنے اپنے علاقوں میں گئے اور انہوں نے اپنا دینی فریضہ ادا

ادا کرنا شروع کیا تو کامیابی نے ان کے قدم چومے، رحمت کے فرشتوں نے ان کی راہیں آسان کردیں اور ہر قابلِ ذکر آبادی میں دینداروں اور دین و شریعت کے تقاضوں کو سمجھنے والوں، اور ان پر عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد نمایاں ہونے لگی، اور از خود ان کے گھروں سے وہ تمام بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد رخصت ہوگئے۔

اصلاح کا دوسرا مرکز دارالافتاء:۔ عمل عوام کا قبروں پر حاضری دینا تھا، دلوں کا ایمان کے لیے سب سے زیادہ خطرناک طرز حال تو خدا جانتا ہے لیکن عام طور پر ان پڑھ اور دینی عقائد سے ناآشنا لوگ ہی قبروں پر حاضری دیتے ہیں اور عرسوں کے میلوں میں شریک ہوتے ہیں، بلا استثناء وہ سب کے سب صاحب قبر کو حاجت روا اور مختارِ کل سمجھتے ہیں، اور براہِ راست اپنی مرادیں صاحب قبر سے مانگتے ہیں، انھیں بزرگوں کو، قبروں پر حاضر ہوکر خطاب کرتے ہیں اور انھیں سے سوال کرتے ہیں، انھیں کے نام پر منت مانتے ہیں، اور مراد کی تکمیل پر ان کی قبروں پر ریشمی چادریں چڑھاتے ہیں، قبر پر آکر ان کے ذہنوں میں خدا کا تصور پسِ منظر میں چلا جاتا ہے، صاحب قبر کو سجدہ کرتے ہیں، نذرانہ پیش کرتے ہیں، پھولوں کا دونا، اس میں کچھ شیرینی لے کر قبروں پر رکھنا، کچھ نقدی ایک مقفل بکس میں ڈالنا، اُلٹے قدموں سے واپس ہونا قبروں کو چومنا، بوسہ دینا، قبر کو ہاتھوں سے مَس کرنا، یہ سب کچھ روز کا مشاہدہ ہے، آپ ہندوستان کی بڑی بڑی درگاہوں میں جب جائیں گے تو دیکھیں گے کہ مزار کی طرف جانے والے راستے پر پھولوں، بتاشوں اور الائچی دانوں، خوشبویات کے دوکانداروں کی قطاریں ہیں، قبروں پر حاضری دینے والوں کی خریداری اور پتوں کے دونوں میں پھول اور الائچی دانے اور بتاشے ہاتھوں میں لے کر جس انداز سے وہ مزار کی طرف چلتے ہیں اگر آپ نے بنارس کے گھاٹوں پر واقع مندروں پر یاتریوں کو پھول مالائیں چڑھاتے ہوئے دیکھا ہوگا تو آپ ان درگاہوں کے مناظر کو بہتر طور پر سمجھ جائیں گے، بس ہو بہو وہی منظر ان مزاروں پر زائرین کی حاضری کا آپ سمجھ لیں، نہ طور طریقے میں آپ فرق محسوس کریں گے اور نہ جذباتِ عقیدت میں، یاتری جو عقیدہ اپنے دیوی دیوتاؤں کے

متعلق رکھتے ہیں بالکل وہی اعتقاد وعقیدہ قبروں پر جانے والے یہ جاہل اوران پڑھ زائرین بھی رکھتے ہیں، کیونکہ جب ان سے گفتگو کیجئے تو وہ اپنے اس عقیدے کا انتہائی جذباتی انداز میں اظہار کریں گے، اور یہ قطعاً ایک مشرکانہ طرزِ عمل ہے۔

علمار حق نے اس ذہن ومزاج اور مشرکانہ طرزِ عمل کے خلاف جہاد انیسویں صدی کے آخر سے شروع کیا کیونکہ ہم ۱۸۹۲ء سے مسلسل ان فتووں کو پاتے ہیں جو ان علمار کے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں موجود ہیں، مشرکانہ رسم ورواج اور بدعات وخرافات کے رد میں امام العارفین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری عزیمت سے کام لیا، اسلام کی تعلیمات کے بیان، اسلامی عقیدہ کے اظہار، ان رسوم اور مشرکانہ عقائد کے خلاف اعلانِ حق واظہارِ حقیقت میں کسی طرح کی نرمی نہیں اختیار کی، اورانہوں نے قرآن وحدیث کی تصریحات کی روشنی میں دوٹوک فیصلے دیئے ہیں، میں صرف انھیں کے فتاویٰ سے چند اقتباسات اور جواب بطورِ نمونہ پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ ان خرافات کو مسلمانوں کے ذہن وفکر اور معاشرے سے مٹانے کے لیے ان کے دل میں کتنا شدید جذبہ تھا، چوں کہ حضرت گنگوہی علمار دیوبند بلکہ علمار ہند کے استاذِ حدیث بھی ہیں اور پیر ومرشد بھی، اس لیے ان کی رائے، ان کا طرزِ عمل اوران کے فتاویٰ تمام علمار دیوبند کے لیے نظیر اور مثال ہیں اور بلا استثنار ہر ایک اپنے دل میں ان خرافات کے مٹانے کے سلسلہ میں وہی شدید جذبہ رکھتا ہے جو حضرت گنگوہی کے ان فتاویٰ میں موجود ہے، اوران کے الفاظ جس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

استفتار اور فتویٰ کے چند نمونے:- جب علمار دیوبند نے اصلاح کی مہم کا آغاز کیا اور ملک کے کونے کونے میں پہونچ کران خرافات کے خلاف تقریریں کیں تو سعید روحیں ان کی جانب متوجہ ہوئیں اور دین وشریعت کے حکموں کو جاننے اوران پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تو صحیح اسلامی عقیدوں کے جاننے کی فکر ہوئی اور حضرات اکابر علمار اور مدارسِ اسلامیہ کے دارالافتار میں سوالات آنے کا سلسلہ شروع ہوا ابتداءً یہ استفتار زیادہ حضرت گنگوہی

کے پاس آتے رہے کیونکہ اس زمانہ میں وہی جماعت علماء دیوبند کے سرخیل اور استاذ الاساتذہ تھے، آپ کے جوابات مختصر اور جامع ہوتے تھے چونکہ مستفتی کو صرف شریعت کا اصل حکم معلوم کرنا تھا، دلائل کی اس کو ضرورت نہیں تھی اس لیے حضرت گنگوہی کا فتویٰ درحقیقت صرف شریعت کا حکم بتا دیتا تھا اس لیے آپ کو ان میں حوالوں کی تفصیل نہیں ملے گی کیونکہ سائل کو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چند جوابات ملاحظہ فرمائیں:۔

سوال:۔ قبر پر جانا اور اس کو بوسہ دینا درست ہے یا نہیں؟

جواب:۔ قبر کو بوسہ دینا حرام ہے، کہ یہ عبادت اہل کتاب کی ہے یعنی یہود و نصاریٰ کی[1]

سوال:۔ اہل قبور سے دعا کرنا کیسا ہے؟

جواب:۔ قبور سے اس طرح دعا کرنا کہ اے صاحب قبر اس طرح میرا کام کردے تو یہ تو حرام ہے اور شرک بالاتفاق ہے۔ اور یہ کہ تم میرے واسطے دعا کرو تو اس باب میں اختلاف ہے، منکرین سماع اس کو لغو اور ناجائز کہتے ہیں اور مجوزین سماع (موتی) جائز جانتے ہیں بندہ مختلف فیہا مسائل میں فیصلہ نہیں کرتا، لیکن احوط کو اختیار کرتا ہوں[2]

سوال:۔ ربیع الاول میں کونڈا، عشرۂ محرم میں کھچڑا، اور صحنک حضرت فاطمہ، گیارہویں اور توشہ اور سہ منی بوعلی قلندر کے جانا مذکورہ بالا طعام کی تخصیص اور ایام کی تعیین کہ اس کے خلاف ہرگز نہ ہوں بدعت اور حرام ہیں یا نہیں اور اس قسم کے طعام کا کھانا مکروہ ہے یا حرام؟

جواب:۔ یہ تعینات بدعت ضلالہ ہیں، اور طعام میں اگر نیت ایصال ثواب کی ہے تو طعام مباح اور صدقہ ہے اور جو بنام ان اکابر کے ہے تو داخل ما اھل بہ لغیر اللہ میں ہے اور حرام ہے اور ایسے عقائد فاسدہ موجب کفر کے ہیں، ان افعال کو کفر ہی کہنا چاہیئے، مگر مسلم کے فعل کی تاویل لازم ہے[3] واللہ اعلم

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ کامل شائع کردہ گلستان کتاب گھر دیوبند ص ۶۹ [2] حوالہ مذکور ص ۱۱۱ [3] حوالہ مذکور ص ۱۳۸

سُوال:۔ پیران پیر کی گیارہویں اور تبارک ورجبی کا کرنا کیسا ہے؟ درست ہے یا نہیں؟

جواب:۔ تبارک اور رجبی بدعت ہیں، ان کی کوئی اصل شرع میں نہیں اور ایصالِ ثواب بروح حضرتِ اقدس قدس سرہٗ درست ہے اور تعیین تاریخ کہ پس وپیش کرے بدعت ہے۔ [1]

سُوال:۔ تیجہ کی رسم، میت کے بعد تیسرے دن قل پڑھنا چند ملایان اور اقربا واحباب کو جمع کرکے سورۂ مُلک اور تین قل اور آیت مفلحون تک اور ماکان محمد ابا احد الخ پڑھ کر ہاتھ اٹھا کر ارواح اموات کو ثواب پہونچانا اور اس سے فارغ ہوکر ملایان کو کسی قدر غلہ دینا ثابت ہے یا نہیں ہے؟

جواب:۔ تیسرے دن کا مجمع میت کے واسطے اولاً مشابہت ہنود کی، ان کے یہاں تیجہ ضروری رسم جاری ہے حرام ہوگا، بسبب مشابہت کے قال علیہ السلام من تشبہ بقوم فھو منھم ثانیاً تقرر کرنا تیسرے دن کا، یہ خود بدعت ہے، اس کی کچھ اصل شرع میں نہیں۔ ثالثاً جو کچھ ملا اکھٹے مل کر پڑھتے ہیں بطمع فلوس پڑھتے ہیں کہ ورثہ میت بھی جانتے ہیں کہ مُلّا کو اس قدر دینا ہے اور ضروری جانتے ہیں چنانچہ معین ہے اور ملا بھی جانتے ہیں کہ ہم کو یہ ملے گا کیونکہ معین ومقرر ہے جو کچھ ملاؤں کو دیا جاتا ہے وہ اجرت ان کے پڑھانے کی ہے اور جو پڑھائی کہ اُجرت پر ہوتی ہے اس کا ثواب نہ پڑھنے والے کو ملتا ہے اور نہ مُردے کو۔ لہٰذا یہ فعل ان کا باطل اور لینا دینا دونوں حرام اور موجب ثواب کا نہیں بلکہ گناہ ہے، مُردوں کو اس کا ثواب نہیں ہوتا ہے اور دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ [2]

مروّجہ میلاد:۔ میلاد کے نام سے ایک تقریب دھوم دھام سے ہوتی ہے، سال میں ایک دوبار اپنے گھروں پر لوگ کرتے ہیں اور یہ بالعموم منتوں کے

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ کامل شائع کردہ گلستان کتاب گھر دیوبند ص ۱۳۹ [2] حوالہ مذکورۂ بالا ص ۱۶۵

پورا ہونے پر کی جاتی ہے، اس کے اپنے کچھ مخصوص طریقے ہیں، کچھ اصول اور ضابطے ہیں، ٹھیک اسی نہج پر یہ میلاد ہوتے ہیں اس کے متعلق بہت سے علماء کا ایک فتویٰ شائع ہوا جس پر دستخط کرنے والوں میں محمد طیب مکی صدر مدرس مدرسہ عالیہ رام پور، قاضی ومفتی لطف اللہ قاضی ریاست رام پور، مولانا محمد گل مہتمم مدرسہ امدادیہ مراد آباد، مولوی عبدالوہاب صاحب استاذ مدرسہ امدادیہ مولانا محمد قاسم علی صاحب امام ومفتی شہر مراد آباد وغیرہ کے اسماء گرامی شامل ہیں، اس کی تصدیق میں حضرت گنگوہی نے تحریر فرمایا:۔

"مجلس مولود مروجہ بدعت ہے بوجہ خلط امور مکروہہ کے مکروہ تحریمہ ہے اور قیام بھی بوجہ خصوصیت کے بدعت ہے اور امرد لڑکوں کا پڑھنا راگ میں اندیشہ ہیجان فتنہ کے مکروہ ہے، فاتحہ مروجہ بدعت ہے معہذا مشابہت بہ فعل ہنود ہے اور تشبہ غیر قوم کے ساتھ منع ہے، ایصال ثواب بدون اس ہیئت کے درست ہے، سوئم، دہم، چہلم جملہ رسوم ہنود کی ہیں، اس تخصیص ایام میں مشابہت ہوتی ہے اور تخصیص ایام کی خود بدعت ہے اگرچہ اصل ایصال ثواب بدون کسی تخصیص ومشابہت کے درست ہے"[1]

اہل قبور سے استمداد:۔ اہل قبور سے استمداد کے سلسلہ میں ایک استفتاء مرتب کیا گیا اور اس کو مولانا عبداللہ بن محمد میر غنی حنفی مفتی مکہ مکرمہ کی خدمت میں جواب کے لیے بھیجا گیا تو انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا الاستعانۃ بالانبیاء والاولیاء مطلوبۃ الا انہا لم تشرع فی المواضع المذکورۃ یعنی انبیاء اور اولیاء کے واسطہ سے دعا کی جاسکتی ہے لیکن قبروں پر حاضر ہوکر دعا کرنا مشروع نہیں ہے۔ اس پر مفتی مکہ کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس مُلّا محمود صاحب اور مولانا محمود حسن صاحب مولانا ہدایت علی صاحب مرادآبادی، مولانا محمد صدیق صاحب استاذ مدرسہ شاہی مراد آباد، مولانا احتشام الدین مراد آبادی، مولانا

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۱۶۶ و ۱۶۷

قاضی محی الدین احمد قاضی حال ریاست بھوپال اور مفتی لطف اللہ کے دستخط ہیں، ان میں سے بعض اکابر کی مہروں پر جو سنہ لکھے ہوئے ہیں وہ ۱۲۹۲ھ سنہ ۱۳۹۷ھ اور ۱۲۹۸ھ تحریر ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قیام دارالعلوم کے تقریباً پندرہ، بیس برس بعد کا یہ فتویٰ ہے، جواب اجمالی اور تشریح طلب تھا اس لیے جب تصدیق کے لیے یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کے پاس بھیجا گیا تو فتویٰ کی تصویب و تصدیق کے بعد وضاحت کر دی گئی کہ استمداد تین قسم کا ہے ایک یہ کہ اہل قبور سے مدد چاہے، اسی کو سب فقہاء نے ناجائز لکھا ہے دوسرے یہ کہ کہے اے فلاں خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ میرا فلاں کام پورا ہو جائے، اس کا دارومدار مسئلہ سماع موتیٰ پر ہے جو اس کے قائل ہیں ان کے نزدیک درست ہے دوسروں کے نزدیک ناجائز، انبیاء اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں، تیسرے یہ کہ دعا مانگے کہ الٰہی بہ حرمت فلاں میرا کام پورا کر دے یہ بالاتفاق جائز ہے[1]

عرسوں میں جانا:- مجموعہ فتاویٰ میں حاشیہ پر ایک فتویٰ کو نقل کیا گیا ہے اور اس کی تائید حضرت گنگوہی نے بھی فرمائی ہے۔ فتویٰ کی عبارت یہ ہے:

"..... منجملہ ان کے ان بزرگوں کی قبروں کی زیارت کا قصد ہے، دُور دراز مقامات سے سفر کی مشقتیں برداشت کر کے راہ میں ہر طرح کی پریشانیاں اُٹھا کر مزارات پر جاتے ہیں، لیکن یہ طرزِ عمل ان کو شرک کی ظلمات کی طرف لے جاتا ہے اور ناراضگیٔ خدا کے جنگل میں پہونچاتا ہے، عوام اس سفر کو سفر حج کی طرح یا اس سے بہتر جانتے ہیں اور احرام کی صورت اختیار کرتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی اپنے اوپر قیود عائد کر لیتے ہیں اور پورے سفر میں اس کی رعایت کرتے ہیں۔ حاصل یہ کہ صاف باطن والوں کو اگرچہ اہل اللہ کی قبور کی طرف سفر کرنے سے تھوڑا بہت نفع بھی پہونچتا ہے لیکن عام مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہونچاتا ہے کہ خارج از بیان ہے لہٰذا جملہ خاص و عام

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۵۸ و ۵۹

کولازم ہے کہ اس امر سے بالکل اعراض کرکے اس کو نسیاً منسیاً کردیں۔"[1]

آخری چہارشنبہ:۔ ماہِ صفر میں آخری چہارشنبہ بھی بہت سے مقامات پر دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، اور اس کے بارے میں عوام میں کیا کیا مشہور ہے مجھے اس کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے، لیکن حضرت گنگوہی کے جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام میں کوئی بے بنیاد اور غلط روایت پھیلی ہوئی تھی، آپ نے استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا کہ:۔

"آخری چہارشنبہ کی کوئی اصل نہیں، بلکہ اس دن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدتِ مرض واقع ہوئی تھی تو یہودیوں نے خوشی منائی تھی، اب جاہل ہندیوں میں رائج ہوگئی، نعوذ باللہ۔"[2]

یارسول اللہ پکارنا:۔ اسلامی فتوحات کی تاریخ میں ہر طرف آپ کو نعرۂ تکبیر کا ولولہ انگیز سنائی دے گا، جس نعرے سے ایوانِ باطل میں زلزلہ پڑجاتا تھا، غرور و پندار کی پیشانیوں کو مسلمانوں کی ظفرمندی کے قدموں پر جھکنا پڑا، لیکن اب کچھ دنوں سے جلسہ و جلوس میں یارسول اللہ بلکہ اب تو یاغوث کا نعرہ سنائی دینے لگا، یہ نعرہ اس عقیدہ کے اظہار کے لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، جو عقیدہ مسلمانوں کا خداوندِ قدوس کے بارے میں ہے، حضرت گنگوہی سے سوال کیا گیا تو آپ نے اس کا تفصیلی جواب دیا اور اصل مسئلہ کی وضاحت فرمائی:۔

"جب انبیاء علیہم السلام کو علمِ غیب نہیں تو یارسول اللہ کہنا بھی ناجائز ہوگا، اگر یہ عقیدہ کرکے کہے کہ علمِ غیب کی وجہ سے دور سے سنتے ہیں تو خود کفر ہے اور جو یہ عقیدہ نہیں تو کفر نہیں۔ البتہ اگر اس کلمہ کو درود شریف کے ضمن میں کہے اور یہ عقیدہ کرے کہ ملائکہ اس درود

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۱۸۳ حاشیہ [2] حوالہ مذکورہ ۱۶۹

شریف کو آپ کے پیش عرض کرتے ہیں تو درست ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ملائکہ درود بندۂ مؤمن آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں اور ایک صنف ملائکہ اسی خدمت پر ہیں۔" [1]

شبخون شروع کر دیا گیا:۔ ردبدعت کے سلسلہ میں علمار حق کا لب ولہجہ اس طرح سخت تھا کیونکہ بدعات میں غلو ان کو شرک کی حدوں تک پہونچا دیتا تھا اس لیے ہر تقریر وتحریر میں پوری طاقت سے اس کی تردید کی جاتی رہی اور شریعت کے احکام صاف صاف اور کھول کھول کر بیان کیے جاتے رہے، اصلاح کی یہ تحریک پورے ملک میں چل پڑی اور سعید طبیعتیں اصلاح پذیر ہونے لگیں، بدعات وخرافات کی حقیقتوں اور شناعتوں کو سمجھ کر عوام نے ان سے توبہ کی تو ایسے کچھ افراد جن کے مفاد پر اس اصلاح کی وجہ سے زد پڑتی تھی انہوں نے بڑی اذیت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی جارہی ہے تو انہوں نے اپنی چراگاہ کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔

انہوں نے دیکھا کہ علمار حق کا جو گروہ عوام کی اصلاح کے لیے میدان میں آیا ہے قرآن وحدیث میں غور وفکر اور تفسیر وتشریح ان کا شب وروز کا مشغلہ ہے، ان کی نگاہیں مسائل میں بہت گہرائی تک جاتی ہیں، ان کے دلائل ناقابل شکست ہیں جن کو وہ بدعات وخرافات کہتے ہیں ان کے لیے وہ قرآن واحادیث کی تعلیمات کی کسوٹی پر پرکھ کر دکھا دیتے ہیں اور اپنے مدعا کو ثابت کر دیتے ہیں۔

اس لیے علمار سوء نے مسلم معاشرہ میں ان بدعات وخرافات کو باقی رکھنے کے لیے اس کی مدافعت نہیں کی اور ابتداءً علمار حق کے مقابلہ میں وہ یہ نہ کہہ سکے کہ جن کو آپ بدعات وخرافات کہتے ہیں یا جن کو مشرکانہ خیالات وعقائد سے تعبیر کرتے ہیں وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہیں کیونکہ ان کا خلاف شرع ہونا اتنا واضح تھا کہ اس پر پردہ

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۶۲

ڈالنا ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے انہوں نے بدعات وخرافات کی حمایت کے بجائے ان شخصیتوں کو خود نشانہ بنانا شروع کر دیا جو اُن کو مٹانے کے لیے میدان میں آئے تھے تاکہ جب ان شخصیتوں کو بدنام کر دیا جائے گا تو ان کی آواز خود ہی بے وزن اور غیر مؤثر ہو جائے گی اور ہماری پیری مریدی کی دکان چلتی رہے گی۔

رَدِّ بدعت کی ابتدائی بنیادی کتابیں:۔

اہلِ بدعت نے علماء حق کو شکست دینے کے لیے کون سا حربہ اختیار کیا؟ یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا پہلے آپ علماء حق کے ان کارناموں سے واقف ہو جائیں جو انہوں نے ردِ بدعت کے لیے بنیادی طور پر کیا اور جو کتابیں اس موضوع پر پہلے پہل لکھ کر بدعات وخرافات کی جڑوں پر کلہاڑی چلائی گئی تاکہ سارا پس منظر آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائے جس کو بنیاد بنا کر اہلِ ہوا و ہوس نے مسلمانوں کے دین وایمان پر شبخون مارنے کا آغاز کیا۔

چونکہ قبر پرستی اور اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری اور اُن سے مرادیں مانگنے اور ان کی قبروں پر سجدہ کرنے پر جس چیز نے عوام کو آمادہ کیا وہ ہے ان کے دلوں کا عقیدۂ توحید اور اس کے عملی تقاضوں سے خالی ہونا۔

سجدوں کے لائق صرف خدائے واحد کی ذات ہے، وہی کسی کو زندگی دیتا ہے کسی کو موت، کسی کو بے اولاد رکھتا ہے، کسی کو اولاد والا بناتا ہے، کسی کو مالدار بناتا ہے کسی کو غریب ومفلس، وہ کسی کو دینا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو دینے سے روک نہیں سکتی اور جس کو وہ نہ دینا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے نہیں دے سکتی توحید کا یہ تصور ہی ان کے دلوں سے رخصت ہو چکا تھا۔ اور جب تک کوئی مسلمان عقیدۂ توحید پر کامل ایمان نہیں رکھتا ہے اور خدا کی خدائی میں غیر اللہ کو شریک سمجھتا ہے اور شریک بناتا ہے تو اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں، بدعات وخرافات کی تہہ میں یہی بدعقیدگی نفوذ کیے ہوئے تھی، اس لیے عام مسلمانوں کے دلوں میں خدا کی وحدانیت اس کے مالکِ کل اور قادرِ مطلق ہونے کا پختہ یقین پیدا کرنا، ماسوا اللہ کے آستانوں سے ہٹا کر خدائے واحد

کے آستانے پر سروں کو جھکا دینا مصلحینِ اُمت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اور اہم فریضہ تھا، اور جن باتوں سے اس عقیدۂ توحید پر زد پڑتی ہے ان سے سختی کے ساتھ روک دینا ایک مصلح کے لیے انتہائی ضروری تھا جس طرح حالتِ مرض میں بعض چیزوں کے کھانے کو سختی سے منع کیا جاتا ہے تاکہ بیماری میں اضافہ نہ ہو، اسی طرح اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کو عوام کے دلوں میں پیوست کر دینا وقت کا سب سے بڑا فریضہ تھا، اس مقصد کے لیے عربی، فارسی کے بجائے اُردو زبان کو استعمال کیا گیا تاکہ معمولی نوشت وخواند کے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں اور خود نہ پڑھ سکیں تو اپنے کسی پڑھنے والے سے پڑھوا کر سمجھ سکیں، اکابر اُمت نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں، انھیں کتابوں میں "تحذیر الناس" مصنفہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند۔ "حفظ الایمان" مولفہ حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ "براہینِ قاطعہ" مصنفہ مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری کے نام شامل ہیں۔

ان کتابوں کی تصنیف کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمان بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد سے دور ہو کر دین کی صحیح تعلیم کو سمجھے، اور اپنی طرف سے دین میں ایجادات کر کے اس کو مذہبی امور کی شکل نہ دیدے، خدائے واحد پر اس کا یقین اور رسول کی رسالت پر اتنا پختہ ایمان ہو جائے کہ وہ اپنے ہر کام کو خدا و رسول کے فرمان کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنی عملی زندگی میں لے آئے، مذکورہ بالا کتابوں کا مقصدِ تصنیف یہی تھا اور اسی نیک مقصد کے تحت یہ کتابیں وجود میں آئیں۔

وہابیت کا الزام لگایا گیا:۔ شرک کو اسلام کہنے کی، بدعات وخرافات کو اصلِ ایمان بتانے کی تو ان میں ہمت و جرأت نہیں تھی، مصنوعی پیروں اور علماء سوء کو اپنی اس جاگیر کو بچانا بھی ضروری تھا، اس لیے دین کیا ہے؟ بددینی کیا ہے؟ خدا کے یہاں ہمارے ان اعمال کی کیا سزا و جزا ہوگی، وہ ان پہلوؤں پر گفتگو کرنا ہی حماقت سمجھتے تھے، انھوں نے جنگ کا رُخ بدل دیا اور خود آگے بڑھ کر علماء حق پر پہلے ہی حملہ کر دیا تاکہ وہ اپنی مدافعت میں لگ جائیں اور بدعات

وخرافات کے خلاف جو محاذ آرائی کر رکھی ہے وہ مورچہ خالی ہو جائے۔ اور وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے، انہوں نے عیار دنیا داروں اور ضمیر فروشوں کا طریقہ کار اختیار کیا اور عوام الناس سے کہا کہ یہ تعزیوں کا چبوترہ کھودنے والے، نشان اور پنجوں کو آگ میں جھونکنے والوں، بزرگوں اور اولیاء اللہ سے مرادیں مانگنے پر روک لگانے والے، عرس اور میلاد اور قبروں پر چراغاں کرنے پر پابندی عائد کرنے والے کون ہیں؟ کیسے لوگ ہیں؟ تم ان کو نہیں پہچانتے، ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ وہابی ہیں، سب کے سب کافر ہیں، واجب القتل ہیں، خود مسلمان نہیں ہیں، دوسروں کو مسلمان بنانے نکلے ہیں اور پھر گلے اور پھیپھڑے کی پوری قوت سے کہنا شروع کیا، یہ خدا کو جھوٹا کہتے ہیں، رسول کو بڑا بھائی کہتے ہیں، حضورؐ کے علم غیب کو زید، عمر، بکر کے علم کی طرح بتاتے ہیں، لوگو! ان دھوکہ بازوں سے ہوشیار رہو، یہ خود کافر ہیں اور جو ان کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے، یہ عبدالوہاب نجدی کے پیروکار ہیں جو گنبد خضریٰ کو ڈھانے کے لیے نکلا تھا، وہ خود کافر تھا، اس کے پیروکار بھی کافر ہیں۔

چبایا ہوا لقمہ چبا رہے ہیں:۔

پولیس کی وردی پہن کر ڈاکہ ڈالنے والوں نے پولیس کو آتا ہوا دیکھا تو خود ہی شور مچانے لگے کہ ڈاکو آرہے ہیں، ڈاکو آرہے ہیں، لوگوں کا جان و مال بچانے والی پولیس مار کھا گئی، وردی پوش ڈاکو مال و متاع لے کر چمپت ہو گئے، کچھ یہی حال علماء سوء اور مصنوعی پیروں نے علماء حق کے ساتھ کیا، اصلاح کے لیے جدوجہد کرنے والے بزرگوں کو وہابی کہنا شروع کیا اور انگریزوں کا چبا کر تھوکا ہوا لقمہ خود چبانے لگے۔

اصلاح کا یہ مشن لے کر اٹھنے والے علماء ہندوستان میں اسلام کو اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے اس لیے وہ مسلم معاشرہ کو جہاں وہ بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج سے پاک کر کے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے وہیں اسلام کی بقا و تحفظ کے لیے ہندوستان پر انگریزی حکومت کو عذاب سمجھتے تھے اور ہندوستان کی سرزمین کو انگریزوں کے ناپاک قدموں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے اور پھر

اسی جذبے سے سرشار ہوکر انہوں نے جہاد کیا، بہت سے لوگوں نے اس راہ میں اپنی جانیں بھی دے دیں، ان کا خون رائیگاں نہیں گیا، برطانوی حکومت کا تختِ اقتدار جب تک وہ لوگ معرکۂ کارزار میں صف بستہ تھے ہمیشہ کانپتا اور تھرتھراتا رہا، ان مجاہدینِ اسلام کی طاقت کو توڑنے کے لیے اور ہندوستان میں ان کو بدنام کرنے کے لیے سب سے پہلے انگریزوں نے سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید کے خلاف وہابی ہونے کا پروپیگنڈہ شروع کیا، تاکہ ہندوستان میں اتنا بدنام کردیا جائے کہ ہندوستان سے جو ان کو کمک ملتی ہے وہ بند ہوجائے اور جب وہ بے سہارا ہوجائیں تو انگریزی حکومت ان پر قابو حاصل کرکے ان کے وجود کو مٹادے،

جب بدعات وخرافات کے خلاف علماءِ حق نے اعلانِ جہاد کیا تو دین فروشوں نے ان کے خلاف بھی وہی انگریزوں کا حربہ استعمال کیا اور ان کا چبایا ہوا لقمہ یہ بھی چبانے لگے اور ان لوگوں نے بھی ان کو چیخ چیخ کر وہابی کہنا شروع کردیا جو اصلحین کی تحریکِ اصلاح سے اپنے مستقبل کے بارے میں اندیشہ میں مبتلا ہوگئے تھے کیونکہ ان کی دین فروشی کا راز طشت از بام ہوتا جارہا تھا۔

انگریزی پروپیگنڈہ کی مہم:- مسلمان مجاہدینِ آزادی کو ملک میں بدنام کرنے کے لیے انگریزوں نے ان کو وہابی کہنا شروع کیا اور اس کے لیے انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے والے عبدالوہاب نجدی کی تحریک سے متاثر ہوکر ہندوستان میں وہابی تحریک کو پھیلانا چاہتے ہیں، مندرجہ ذیل کتابیں اسی جھوٹے الزام کو سچ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے لکھیں:-

۱۔ بدوز اینڈ وہابیز، مصنفہ برک ہرڈس
۲۔ ہسٹری آف وہابیز، مصنفہ برایخ بریف
۳۔ پولٹیکل مشن ٹو نجد، مصنفہ سر لیوس پیلس
۴۔ مسلمس ان انڈیا، مصنفہ ڈبلو، ڈبلو ہنٹر
۵۔ سنٹرل اینڈ ایسٹرن عربیا، مصنفہ پیل گریو

۶۔ امام اینڈ سید آف عمان۔ مصنفہ دی آر بیڈ جرس
۷۔ پیلگریج ٹو نجد۔ مصنفہ لیڈی انس پلنٹس
۸۔ فیوچر آف اسلام۔ مصنفہ، پلنٹس

ان تمام کتابوں میں سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کے جھنڈے کے نیچے جو علماء و صلحاء کی فوج تھی، ان مجاہدینِ اسلام کو وہابی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو سرحد پر انگریزوں سے جنگ کر رہے تھے ان کا اس پروپیگنڈے سے مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ان مجاہدین کو بددین اور گمراہ سمجھنے لگیں گے تو اندرونِ ملک سے رقم، ہتھیار اور فوجی آدمی جو ملتے ہیں وہ بند ہو جائیں گے اور مجاہدین اپنے مورچے پر بے سہارا ہو جائیں گے پھر ان کی طاقت کو توڑنا آسان ہو جائے گا، انگریزوں کی سازش رائیگاں نہیں گئی اور ہندوستان میں مستقل ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے انگریزوں کے چبائے ہوئے لقمہ کو جگالی لے لے کر چبانا شروع کر دیا اور اللہ کے ان مقدس بندوں کو وہابی کہنا شروع کر دیا جو اسلام کو مشرکانہ عقائد و خیالات سے پاک صاف کر کے مسلمانوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلانا چاہتے تھے اور ان کے دلوں میں خدا کی وحدانیت کا راسخ عقیدہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور ماسوا اللہ کے آگے جھکنے اور ان کو سجدہ کر کے شرک میں مبتلا ہونے سے روکنا چاہتے تھے، صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا شرار الخلق شرار العلماء۔

علماءِ سُو میدان میں:۔ مصنوعی پیروں، زر پرست سجادہ نشینوں اور علماءِ سُو نے مصلحین کے خلاف ایک مہم چھیڑ دی اور ان مخلصین کی تحریک اصلاح کی تائید کے بجائے ان کو بدنام کر کے مسلم معاشرہ کو ان گندگیوں میں لپٹا ہوا چھوڑے رکھنا چاہتے تھے کیونکہ اس سے ان کا مستقبل وابستہ تھا،

سید احمد شہید جو اس تحریکِ اصلاح کے سرخیل تھے، مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی داماد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کے دست و بازو تھے، سید صاحب نے کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، مولانا عبدالحیؒ صاحب کو خدا نے زبان میں

تاثیر دی تھی، ایک تقریر میں اس طرح راہِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ پر لے آنے کی ان میں صلاحیت تھی کہ ان کی تقریر کے بعد پچاسوں اور سیکڑوں تعزیئے اور نشان توڑ پھوڑ کر جلا دیئے جاتے تعزیوں کے چبوترے راتوں رات کھود کر برابر کر دیئے جاتے اس لیئے موصوف نے ہمیشہ وعظ کے ذریعہ اصلاح کا کام کیا اور کوئی کتاب نہیں لکھی، مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے زبان و بیان کی بھی بے مثال قوت دی تھی اور آپ کے ہاتھوں میں خار اشگاف قلم بھی دیا تھا، اس لیے انہوں نے ردِّ بدعت میں کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں، علماء سوء کو ان دونوں بزرگوں کو بدنام کرنے کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آیا تو وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی ذات کو بدنام کرنے پر تُل گئے اور سب سے پہلے انھیں کی کتابوں میں تحریف کر کے ان کو کافر بنانے کی مہم شروع کی اور ان کے قلم میں جتنی طاقت تھی مولانا اسمٰعیل شہید کو کافر بنانے میں صرف کر دی۔

پھر ان کے جانشینوں کی طرف متوجہ ہوئے جنہوں نے انھیں بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر بدعات و خرافات کے خلاف اپنی جد وجہد شروع کی تھی ان میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا خلیل احمد صاحب محدّث سہارن پوری کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا اور اُن گنت فتوے اور کتابچے ان مقربانِ بارگاہِ خداوندی کو کافر ثابت کرنے کے سلسلہ میں لکھے اور شائع کیے انہوں نے سمجھ لیا کہ ان بزرگوں کو کافر ثابت کر کے اسلام کا کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا اور پورا ملک جو اپنی جہالت کی وجہ سے مشرکانہ توہمات و خیالات کے جال میں پھنسا ہوا تھا اس کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی، ان کو نہ اس کی پہلے پروا تھی نہ بعد میں، ان کا مقصد تو صرف علماء حق کی طاقت کو کمزور کرنا تھا جو ان برائیوں کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں، مگر قدرت کو اصلاحِ اُمت منظور تھی، یہ حق پرست جماعت اپنی مہم میں لگی رہی اور کامیاب ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ لا تزال من اُمتی امۃ قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتی امر اللہ (متفق علیہ، رواہ البخاری و مسلم)

بدعات وخرافات کی تائید میں پہلی آواز

۱۸۵۷ء کے بعد علماء حق ردِ عیسائیت اور دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کے فتنوں کے مقابلہ میں مصروف تھے، شاہ جہاں پور کے میلہ خدا شناسی سے رڑکی کے آریہ سماجی محاذ تک ان کا حملہ جاری تھا، یہ تو خارجی حملوں سے اسلام کو بچانے کی جد وجہد تھی، داخلی فتنوں سے بھی یہ حضرات غافل نہیں تھے، مشرکانہ عقائد وبدعات نے جسد ملت کو دیمک کی طرح چاٹ ڈالا تھا اس طرح علماء حق سہ رخی جنگ میں مصروف تھے، یہ مسلمانوں کی بدنصیبی اور ادبار کا زمانہ تھا حکومت جاچکی تھی اور انگریز جیسا طاقتور دشمن مسلمانوں کو مٹا دینے اور اس کے دماغ سے اولوالعزمی اور پندارِ حکومت اور احساسِ برتری کے جذبات پر ہتھوڑے برسا رہا تھا ان نامساعد حالات میں علماء حق سر ہتھیلیوں پر رکھ کر اسلام کی حفاظت کے لیے جدوجہد کے میدان میں موجود تھے اور علماء سُو اور مصنوعی پیروں نے صورتِ حال اور بگاڑ رکھی تھی وہ مسلمانوں کے نذر ونیاز فاتحہ میلاد قبر پرستی اور عرس کی ہنگامہ آرائیوں میں مصروف رکھ کر ان کے دلوں سے خوفِ خدا نکال رکھا تھا، پیروں اور شہیدوں اور اولیاء اللہ کی قبروں پر ان کی پیشانی کو جھکانے کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، ایک طرف مولانا محمد قاسم نانوتوی میدانِ مناظرہ میں شیروں کی طرح گرج رہے تھے اور ادیانِ باطلہ کے نمائندوں کو للکار رہے تھے، دوسری طرف مولانا رشید احمد گنگوہی جسد ملت کی داخلی بیماریوں کے علاج میں مصروف تھے کہ اسی درمیان ان علماء حق اور مصلحینِ اُمت کے خلاف فتنہ کھڑا کر دیا اور بدعات کی تائید میں پہلی آواز رام پور ضلع سہارنپور کے مولوی عبدالسمیع رام پوری کی بلند ہوئی اور "انوارِ ساطعہ" کے نام سے ایک کتاب ۱۳۰۳ھ مطابق

لہ مولوی عبدالسمیع رام پوری۔ رام پور منہاران ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے مفتی صدرالدین آزردہ کے شاگردوں میں سے تھے اور فنِ شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے، بدعاتِ مروجہ کی تائید میں ان کی سب سے پہلے یہی کتاب "انوارِ ساطعہ" شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی اس کے علاوہ (باقی برصفحہ آئندہ)

۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی۔

مسلم معاشرہ میں جو بدعات وخرافات رائج تھیں اس کتاب میں ان کے لیے دلیلیں فراہم کی گئی تھیں، نذر، نیاز، فاتحہ، میلاد، قیام، تیجہ چالیسواں، اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں، مُردوں سے استمداد، غائبانہ اولیاء اللہ اور انبیاء کو پکارنا، خاص خاص مہینوں اور تاریخوں میں گھر کے مُردوں کا گھروں میں آنا، نیاز فاتحہ کا انتظار کرنا، یہ اور اس طرح کے اور بھی دوسرے خیالات کے لیے شرعی دلیلیں فراہم کرنے کی کوشش کی گئی، ان دلائل کا کیا وزن تھا؟ کیا اُن سے یہ تمام مروجہ رسمیں ثابت ہوتی ہیں یا نہیں؟ اس سے ان کو غرض نہیں تھی، عوام کے فاسد عقیدوں کے لیے انہوں نے ایک بنیاد مہیا کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی، وہ کتاب طبع ہوئی اور ایک حلقہ میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔

براہینِ قاطعہ:۔ شعبان ۱۳۰۳ھ میں مولانا خلیل احمد سہارن پوری کو یہ کتاب "انوارِ ساطعہ" ملی، آپ ان دنوں ریاست بہاول پور میں سلسلہ مدرسی مقیم تھے، ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں اس کے رد میں آپ نے "براہینِ قاطعہ" تحریر فرمائی، اور چھپ کر شائع ہوگئی، چونکہ اب تک ایسے لوگ سامنے نہیں آئے تھے جو عوام میں رائج بدعتوں کو شریعت کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کریں، یہ پہلی کوشش تھی کہ بدعتوں کا شریعت سے ثبوت پیش کیا گیا تھا، اصلاح کی جدوجہد کرنے والوں اور اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنے والوں کے لیے فطری طور پر یہ جسارت زہر گداز ثابت ہوئی کہ اب لوگوں میں یہ جرأت ہوگئی کہ غیر شرعی باتوں کو شریعت کا لباس پہنانے لگے ہیں اس لیے قدرتی طور پر "انوارِ ساطعہ" کے جواب میں مولانا موصوف کا لب ولہجہ سخت ہوگیا اور "براہین قاطعہ" مبتدعین کی صفوں میں اسی طرح کی تیز وتند سمجھی گئی جیسی مولانا اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کا ایک نعتیہ دیوان بھی ہے۔ خیالات وعقائد ان کے وہی تھے جو بریلی اور بدایوں کے مولویوں کے تھے اس کتاب نے دوسرے علماء سوء کو راستہ دکھایا، یہ مہم بریلی پہونچ کر عروج پر آگئی۔

کتاب میں مروجہ طریقہ میلاد اور نیاز و فاتحہ کی جو شکلیں رائج تھیں ان کی حدیث و قرآن کی روشنی میں گرم لب و لہجہ کے ساتھ تردید کی گئی تھی، علماء سوء اور زر پرست پیروں نے اس کتاب کو بڑے غم و غصہ کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے بعض افراد ذاتی انتقام پر اتر آئے اور انھوں نے چاہا کہ مصنف کا وجود ہی ختم کر دیا جائے اور اس کے لیے انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو دنیا دار عیار قسم کے لوگ استعمال کرتے ہیں، اس مقصد کے لیے انہوں نے نواب صاحب بہاول پور کو استعمال کیا اور امکانی حد تک ان کے مزاج کو مولانا موصوف کے خلاف بھڑکا کر برہم کر دیا اور ان کو آمادہ کیا کہ بہاول پور میں مولانا موصوف کو بلوا کر مناظرہ کرا دیا جائے۔

مصنوعی پیر کی سازش:۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پور میں تھے کہ ریاست بہاول پور کی طرف سے آپ کو مناظرہ کے لیے بلایا گیا، اس مناظرہ کے پس منظر میں جو جذبات کام کر رہے تھے، آپ پہلے ان سے واقف ہو جائیں تو اس مناظرہ کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں گے۔

ریاست بہاول پور کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر سید چراغ شاہ تھے جو بدعتی بھی تھے اور تعزیہ پرست بھی، مولانا خلیل احمد صاحب جس مدرسہ میں استاد تھے وہ مدرسہ بھی انھیں کے تحت تھا، وہ مذہبی مباحث میں بھی دلچسپی لیتے تھے اور شیعی رجحان کے تحت اہل سنت پر اعتراض کرتے تھے، وہ مولانا موصوف سے کبھی کبھی بحث بھی کر لیتے تھے، مولانا کے سخت جواب سے وہ آپ سے بغض اور کینہ رکھنے لگے تھے اس لیے آپ نے وزیر اعظم کے توسط سے اپنے مدرسہ کو اس کی ماتحتی سے نکلوا لیا تھا، ڈائرکٹر صاحب ہی ریاست کے چیف جج بھی تھے، ان کے پیر صاحب نے اپنے ایک مرید کی بیوی کو ناجائز طور پر اپنے گھر میں ڈال لیا تھا اور ان پر مقدمہ تھا، پیر صاحب نے مولانا خلیل احمد صاحب سے اپنے موافق ایک رپورٹ لکھوانی چاہی، آپ نے انکار کر دیا کہ یہ مذہب کا معاملہ ہے، شرع جو کچھ کہتی ہے میں وہی لکھوں گا۔ اس کی وجہ سے وہ پیر صاحب بھی مولانا مرحوم سے انتقام کے لیے پر تولنے لگے، انھیں حالات میں نواب صاحب کو ورغلایا گیا کہ مولانا خلیل احمد کے

عقائد فاسدہ ہیں ان کو بلا کر ان سے مناظرہ کرایا جائے، تاکہ حق و باطل ظاہر ہو جائے،

مناظرہ بہاول پور:- فضا میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے مولوی غلام دستگیر قصوری جو بہاول پور میں رہتے تھے، انہوں نے مولانا خلیل احمد صاحب کی عدم موجودگی میں ایک فتویٰ شائع کیا جس میں کہا گیا کہ:-

"خلیل احمد اور اس کے ہم عقیدہ اہل سنت سے نہیں، فرقہ وہابیہ اسمٰعیلیہ کے سخت بے ادبوں سے ہیں جن سے ہندوستان وغیرہ میں غیر مقلد اور نیچری شاخیں نکلی ہیں، اہل اسلام اہل سنت والجماعت کو اُن سے اجتناب واجب ہے۔"[1]

"تذکرۃ الخلیل" کے مصنف مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے صورتِ حال پر مزید روشنی ڈالی ہے، انہوں نے مستند حوالوں سے بتایا ہے کہ نواب بہاول پور کو باور کرا دیا گیا تھا کہ مولانا خلیل احمد صاحب بدعقیدہ اور کافر ہیں، ان کا جو عقیدہ ہے وہ سراسر کفر ہے، نواب صاحب کان کے کچے ٹھہرے، انہوں نے ان باتوں پر یقین کر لیا اور مولانا موصوف کو بُلانے کے لیے حکمنامہ سہارن پور بھیج دیا، مولانا نے اس کو بسر و چشم منظور کر لیا اور مولانا محمود حسن دیوبندی (شیخ الہند) مولانا صدیق احمد انبیٹھوی مولانا عبدالحق اور مولانا محمد مراد صاحب کے ہمراہ بہاول پور کے لیے روانہ ہو گئے، دورانِ سفر بتانے والوں نے بتایا کہ نواب صاحب کو علماء سوء اور مصنوعی پیروں نے بھر رکھا ہے اور انہوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ایسے مولویوں کو توپ سے اُڑا دیا جائے، ان حضرات کو بھی اس کی خبر ملی لیکن دین کی راہ میں یہ مراحل آتے ہی رہتے ہیں، ان دھمکیوں سے بے نیاز ہو کر آپ اپنے رفقاء کے ساتھ بہاول پور پہونچ گئے اور نواب صاحب کو اطلاع بھیجی کہ بندہ مناظرہ کے لیے حاضر ہو گیا ہے۔

---

[1] "تذکرۃ الخلیل" مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۲۱۸

۱۰ جون ۱۸۸۹ء سے چار دنوں تک تحریری و تقریری مناظرہ ہوا، مولانا موصوف کی کتاب "براہین قاطعہ" کی عبارتوں سے آپ کے عقیدہ پر بحث کی گئی، علمارحق نے جتنے مُسکت جوابات احادیث و قرآن کی روشنی میں دیئے وہ سب حدیث و قرآن کے غائر مطالعہ کا نتیجہ تھے، مخالفین کے لیے احادیث و قرآن کی ان گہرائیوں تک پہونچنے کے لیے ان کے پاس اتنا علم ہی کہاں تھا؟ مرعوبیت کا یہ عالم ہوا کہ مناظرہ تو تحریری شروع ہوا لیکن جب تحریر میں ان کے مبلغ علم کی قلعی کھلنے لگی تو انہوں نے تقریری مناظرہ کے لیے مجبور کیا، تقریری مناظرہ میں مبتدعین کی بے علمی اور کم فہمی کا راز علیٰ رؤس الاشہاد اور مجمع عام میں کھلنے لگا، تعلیم یافتہ جو شخص بھی مجلس مناظرہ میں تھا علمارحق کے زورِ استدلال کا قائل ہوگیا، اسی زمانہ میں ایک اخبار "نظام الملک" مرادآباد نے مناظرہ بہاول پور کی مکمل رپورٹ شائع کی تھی، میں تذکرۃ الخلیل سے اس کا ایک مختصر سا اقتباس آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے صورتِ حال پر واضح روشنی پڑتی ہے اخبار لکھتا ہے کہ:۔

> مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی نے بتایا کہ جب تحریری مناظرہ کے لیے ہمارے پاس سوالات آئے تو ہم نے اپک ایک سوال بانٹ لیا، اعلمیت کا مسئلہ میرے حصہ میں آیا، جس وقت ہمارے جوابات گئے اور فریق ثانی کے مولویوں نے دیکھا تو ہم نے وہیں کے معتبر آدمیوں سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ جوابات بہت زور کے اور کافی شافی ہیں، لہٰذا مناظرہ کا رُخ بدلنا اور تحریری کو تقریری بنانا چاہیئے، کہ رعبِ حکومت مانع تکلم ہو، اور تقریری میں بھی صرف امکانِ کذب کو لیا جائے کہ اس میں گنجائش ہے اور عوام کے بھڑکنے کا بھی اچھا موقع ہے، چنانچہ ۱۸ جون سہ شنبہ کو اسی کوٹھی پر اراکین سلطنت اور خواص ملک جمع ہوئے اور غلام دستگیر نے اپنی بلا بیچارے سلطان محمود کے سر ڈال دی کہ صبح سے بارہ بجے تک مولانا خلیل احمد صاحب کی وہ شیرانہ گفتگو ہوئی جس کو سن کر سارے حکام، وکیل،

بیرسٹر بھی دنگ رہ گئے۔[1]

علمارِ حق کے علم و فضل کا اعتراف اور ان کی حقانیت و صداقت پر یقین ان لوگوں کو بھی حاصل ہوگیا جو غیر جانبدار اور انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور فریقِ مخالف تو ان کے دلائل و براہین کے سامنے طفلِ مکتب ثابت ہوا، اہلِ حق کا غلبہ علیٰ رؤس الاشہاد حاضرینِ مناظرہ نے دیکھ لیا۔ مبتدعین کی ہمتیں چھوٹ گئیں، نواب صاحب کے غصہ کا پارہ نیچے اتر آیا اور علمارِ حق کو اڑا دینے والی توپ کا دہانہ برف سے زیادہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

اِصلاح کا سلسلہ جاری رہا:۔ بہاولپور کے مناظرہ میں اگرچہ حق واضح ہو کر رہا لیکن ملک میں بتدریج ایک ایسی فضا بنتی جارہی تھی کہ اصلاح کا کام دشوار سے دشوار تر ہوتا جارہا تھا، انگریزوں نے پہلے دور کے مصلحین پر جو وہابی ہونے کا اتہام لگا دیا تھا اس کا اتنے بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ جو لوگ تھوڑے بہت پڑھے لکھے تھے ان کو بھی اس فرضی اتہام کی خبر تھی، اتفاق سے جن لوگوں پر وہابیت کا الزام لگایا جارہا تھا وہی اس ملک میں اصلاحِ اُمت، رَدِّ بدعات کی مہم چلانے والے تھے، علمار سوئے انگریزوں کے الزام کو اپنا لیا اور یہ الزام ان کے ہاتھوں میں پہونچ کر زہر میں بجھا ہوا خنجر بن گیا اور سب سے پہلے مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی رح کی ذات پر اس کی دھار کی تیزی آزمائی گئی اور آپ کی رَدِّ بدعت کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" کو بہانہ بنایا گیا، لیکن اس نے اجتماعی مہم کی شکل نہیں اختیار کی تھی اس لیے بعد کے علمارِ حق نے اصلاح کا کام کئی راہوں سے جاری کر رکھا تھا، ان راہوں میں سے ایک راہ مدارسِ اسلامیہ کے قیام کی تھی، دارالعلوم دیوبند کے قیام کے چھ سال بعد بریلی میں بھی ایک دینی مدرسہ "مصباح التہذیب" کے نام سے ۱۲۸۹ھ میں قائم کیا گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب بریلی شہر میں بسلسلہ ملازمت علمارِ حق کی چھوٹی سی جماعت قیام پذیر تھی۔ مولانا احسن[2] صاحب

---

[1] تذکرۃ الخلیل مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۲۲۱۔ [2] مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا مملوک علی نانوتوی کے بھائی حافظ لطف علی کے صاحبزادے ہیں اور مولانا مظہر علی نانوتوی کے حقیقی بھائی جو بانی (باقی بر صفحہ آئندہ)

نانوتوی بریلی کالج میں استاذ تھے۔ حضرت شیخ الہند کے والد مولانا ذوالفقار علی[1] دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس بھی ان دنوں بریلی میں تھے، مولانا محمد منیر[2] نانوتوی، مولانا محمد یعقوب[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مظاہر علوم سہارنپور تھے، دہلی کالج میں اپنے چچا مولانا مملوک علی سے درسیات کی تکمیل کی ۱۸۵۷ء کی تحریک میں عملاً شریک ہوئے، مختلف مقامات پر درس و تدریس کا کام کیا، اسی سلسلہ میں بریلی میں قیام پذیر تھے، حافظ قرآن بھی تھے اور بہترین واعظ بھی، تفسیر قرآن سے بھی دلچسپی تھی اور علم حدیث سے بھی مناسبت تھی، امام غزالی کی احیاء العلوم کا ترجمہ کیا تھا۔ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں انتقال فرمایا۔

[1] مولانا ذوالفقار علی دیوبندی عالم فاضل اور ادیب تھے مشہور عالم شخصیت حضرت شیخ الہند محمود حسن صاحب دیوبندی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و بانی تحریک ریشمی رومال کے والد ماجد تھے، عربی ادب کی کئی کتابوں کی شرح کی اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، دارالعلوم دیوبند کے قیام میں آپ کا بڑا حصہ تھا، آپ دینی انسپکٹر آف مدارس تھے اسی سلسلہ میں بریلی میں قیام پذیر تھے ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۴ء) میں انتقال فرمایا۔ [2] مولانا محمد منیر نانوتوی حافظ لطف علی نانوتوی کے صاحبزادہ اور استاذ الکل مولانا مملوک علی کے بھتیجے تھے اور بانی مظاہر علوم سہارنپور مولانا مظہر علی نانوتوی کے حقیقی بھائی تھے ۱۲۴۷ھ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، ساری تعلیم اپنے چچا مولانا مملوک علی سے حاصل کی۔ غدر ۱۸۵۷ء کی تحریک کے نمایاں حصہ لینے والوں میں سے ہیں۔ شاملی کے محاذ پر دست بدست انگریزی فوج سے جنگ کی۔ بعد میں بریلی میں ملازمت اختیار کرلی اور وہیں اقامت گزیں رہے، آپ دارالعلوم دیوبند کے دو سال مہتمم بھی رہے اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔ [3] مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔ آپ استاذ الکل مولانا مملوک علی نانوتوی کے صاحبزادے اور مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری کے حقیقی ماموں تھے علم و فضل زہد و تصوف ورع و تقویٰ میں مثالی تھے جذب و سلوک کا غلبہ تھا علم فقہ و حدیث میں کمال حاصل تھا۔ ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، دہلی کالج میں اپنے والد محترم سے درسیات کی تکمیل کی، دہلی اور اجمیر میں درس و تدریس کا کام کیا ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو آپ اس کے سب سے پہلے صدر مدرس بنائے گئے اور پورے انیس ۱۹ سال مسلسل آپ اس عہدہ پر قائم رہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی آپ ہی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی تھانوی مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ ماہ صفر ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) میں انتقال فرمایا۔

صاحب نانوتوی، مولانا فضل الرحمٰن صاحب[1] دیوبندی وغیرہ بریلی شہر میں سکونت پذیر تھے، انھیں حضرات کی وجہ سے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب[2] نانوتوی مباحثہ چاندپور ضلع شاہجہانپور سے واپسی میں بریلی گئے تھے اور مولانا محمد احسن نانوتوی کے یہاں ٹھہرے تھے، انھیں دونوں حضرات نے بریلی شہر کے عمائدین اور معززین کے صلاح ومشورہ سے ۱۲۸۹ھ میں ایک دینی مدرسہ کی داغ بیل ڈالی جس کا نام "مصباح التہذیب" رکھا گیا، مدرسہ روز افزوں ترقی پر تھا، شہر میں اس کی دو شاخیں مزید کھول دی گئیں۔ مدرسہ کا اجرا مولوی نقی علی خاں[3] والد مولوی احمد رضا خاں کو گراں گذرا اور انہوں نے مدرسہ کی مخالفت شروع کر دی اور اس کے جواب میں انہوں نے خود ایک مدرسہ "مدرسہ اہل سنت" کے نام سے قائم کر دیا اور مدرسہ

---

[1] مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی۔ آپ علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ الاسلام پاکستان، مفتی اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی مفتی دار العلوم دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دار العلوم دیوبند کے والد محترم تھے۔ آپ کا پورا خاندان علم وفضل سے آراستہ تھا، ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

[2] مولانا محمد قاسم نانوتوی، آپ کی ذات کسی مصنف کے تعارف کی محتاج نہیں، کاروان علم وعمل کے سالار حجۃ اللہ فی الارض قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی استاذ الکل مولانا مملوک علی نانوتوی کے ممتاز وبے مثال شاگردوں میں ہیں۔ امام العارفین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے رفیق خاص علم و لیاقت، ذہانت وذکاوت، نکتہ رسی، نکتہ آفرینی، سادگی ومتانت، زہد وعبادت میں ممتاز، ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا مملوک علی سے درسیات کی تکمیل کی، حدیث حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلوی سے پڑھی، حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے بیعت اور اجازت وخلافت حاصل تھی، ضلاء دار العلوم دیوبند آپ ہی کے نام نامی کی طرف نسبت کر کے اپنے کو قاسمی لکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، ۱۸۵۷ء کی تحریک میں انگریزی فوج سے دست بدست جنگ کی، وارنٹ جاری ہوا، مگر گرفتار نہیں ہوئے، دار العلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں ۴۹ سال کی عمر میں ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

[3] آپ مولوی رضا علی خان بریلوی کے صاحبزادے تھے ۱۲۴۶ھ میں بریلی میں پیدا ہوئے شاہ آل رسول مارہروی سے بیعت تھے ۱۲۹۷ھ میں انتقال کیا، ان کی دو کتابوں سرور القلوب اور جواہر البیان کا پتہ چلتا ہے۔

مصباح التہذیب کے خلاف شہر میں ایسا طوفان کھڑا کیا کہ مدرسہ ہی ٹوٹ گیا۔

دوبارہ مدرسہ قائم کیا گیا:۔ اس کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی نے دوسرا مدرسہ "مصباح العلوم" کے نام سے کھولا اور اس کا سرپرست حافظ محمد جعفر خاں بریلوی کو بنایا جو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت گنگوہی کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے، حافظ صاحب کی خانقاہ رشیدیہ گنگوہ میں حاضری ہوتی رہتی تھی اس لیے آپ نے مدرسہ کی طرف پوری توجہ کی اور پھر یہ مدرسہ ترقی کرتا رہا، کچھ دنوں بعد مشہور کتاب براہین قاطعہ کے مصنف مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری بریلی کے اسی مدرسہ میں استاذ بن کر آئے اور دو سال یہاں قیام پذیر رہے اور اس کے بعد دار العلوم دیوبند میں مدرس دوم کی جگہ خالی ہوئی تو آپ وہاں بلا لیے گئے

مولانا سہارن پوری کے قیام بریلی کے دوران آپ کی تصنیف "براہین قاطعہ" کو لے کر بریلی میں فضا خراب کی جاتی رہی اور اس فتنہ کے پھیلانے میں مولوی احمد رضا خاں صاحب کے والد محترم مولوی نقی علی خاں صاحب پیش پیش تھے، اسی مسئلہ کو لے کر بریلی میں دو گروہ بنانے کی انھوں نے ابتدا کی

بدعات کی حمایت میں ایک فرقہ وجود میں آگیا:۔ اب تک بدعات اور رسم و رواج اور خلاف شرع عقیدوں کے پس پشت کوئی جماعت، کوئی گروہ یا کوئی مستقل فرقہ نہیں تھا لیکن بتدریج وہ ایک فرقہ کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا، مولوی نقی علی خاں بریلوی نے اپنے شہر میں اس کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ان علماء کا مقصد واحد مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی کی وہابیت اور ان کی کتابوں "صراط مستقیم" اور "تقویۃ الایمان" کو بنیاد بنا کر ان پر کفر کا اتہام تھا، جن خلاف شرع خرافات کی علماء حق تردید کرتے تھے اور ان کے خلاف شرع ہونے کو بیان کرتے تھے، ان مسئلوں کو یہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے، اس گروہ کا صرف ایک کام تھا کہ اصلاحی مہم کے جتنے نمایاں اور ممتاز ترین علماء تھے ان پر کفر کا اتہام لگا کر ان کو ملک میں رسوا کیا جائے، چنانچہ اس وقت تک جتنے کتابچے اور رسالے لکھے جاتے اور شائع کیے جاتے تھے ان میں مولانا اسمٰعیل شہید

دہلوی، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، شارح ابوداؤد مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی سہانپوری صدر الاساتذہ مظاہر علوم سہارنپور اور ان کے بعد حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے کفر کو ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، اس سلسلہ میں ان کی کتابوں میں ہر طرح کی تحریف کرکے ان کی عبارتوں میں تغیر و تبدل کرکے اس میں کفر کے احتمالات پیدا کرنے کی سازشیں شب و روز ہوتی تھیں، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ رسم و رواج کی، قبر پرستی اور عرسوں کی، نذر نیاز، فاتحہ میلاد کی مخالفت کرنے والوں کی ذات کو نشانہ بنا کر اتنا متہم کر دیا جائے کہ عوام میں اشتعال اور ان سے نفرت و دوری پیدا ہو جائے۔ پھر ان کی یہ اصلاحی مہم از خود اپنی موت آپ مر جائے گی۔

آپ اس دور کی ان تمام کتابوں، رسالوں اور فتوؤں کا جائزہ لیں تو ہر ایک میں یہی جذبہ صاف نظر آئے گا، ان کی ساری جد و جہد یہ تھی کہ اس جھوٹے الزام کو اتنی بار دہراؤ اور اس زور شور کے ساتھ کہو کہ سچ بن جائے، عوام کے ذہن میں ان کی طرف سے کم سے کم اتنی بدگمانی ضرور پیدا ہو جائے کہ ان کی باتوں کو نہ سنیں ان کے قریب نہ جائیں۔

لیکن ان تمام مخالفانہ جد و جہد، شب و روز کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود سعید روحیں اصلاح قبول کرتی جا رہی تھیں، ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں صراط مستقیم پر چلنے والے پیدا ہوتے جا رہے تھے، ان بدعات و خرافات سے توبہ کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور علماء حق کے قائم کردہ دینی مدارس میں طلباء کے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا گیا، وعظ و پند کا سلسلہ بھی چل رہا تھا، خانقاہوں سے تزکیۂ نفوس و اصلاح عقائد کا کام بھی ہوتا رہا۔

تکفیر کی منصوبہ بند مہم :- مولوی نقی علی خاں نے بریلی میں دو گروہ پیدا کرکے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا ابھی تک اس کا اثر دوسرے شہروں پر نہیں تھا یہ کام ۱۳۰۶ھ سے ۱۳۰۸ھ تک کے زمانہ میں ہوا، اس وقت تک ان کے صاحبزادے مولوی احمد رضا خاں صاحب کا کوئی نام

نہیں جانتا تھا لیکن وہ اپنے والد صاحب کی سرگرمیوں کو ان کی مہم کو بہ نظر غائر دیکھ رہے تھے اور اپنے ذہن میں مستقبل میں کام کرنے کا ایک نقشہ مرتب کر رہے تھے اور وہ اس تکفیری مہم کو نقطۂ عروج تک پہونچانا چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے ان کے ذہن میں ایک مرتب اسکیم تھی انہوں نے اپنی تکفیری مہم کا آغاز ایک رسالہ "المعتمد المستند" سنہ ۱۳۲۰ھ میں لکھ کر کیا، اس رسالہ میں انہوں نے علماء حق کو انکار ختم نبوت، تکذیب رب العزت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص و اہانت کا الزام لگا کر ان کی قطعی تکفیر کی تھی، لیکن بریلی کے باہر ابھی ان کو کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے ان کے رسالہ کا کسی نے کوئی اثر نہیں لیا، اور جس پذیرائی کی ان کو توقع تھی وہ ان کے رسالہ کو نہ حاصل ہو سکی،

دیارِ رسولؐ کے علماء کو فریب :- مولوی احمد رضا[1] خاں صاحب کا پہلا وار کارگر نہ ہو سکا تو انہوں نے دین و دیانت

---

[1] مولوی احمد رضا خان بریلوی کے والد محترم کا نام مولوی نقی علی خان بریلوی تھا، آپ کی ولادت ۱۰ شوال سنہ ۱۲۷۲ھ مطابق سنہ ۱۸۵۶ء ماہ جون میں بریلی شہر میں ہوئی آپ کی ساری تعلیم گھر پر اپنے والد کے پاس ہوئی اور ۱۴ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۸۶ھ میں وہ درسیات سے فارغ ہو گئے۔ سید آلِ رسول حسینی مارہروی سے بیعت ہوئے، اور خلیفہ مجاز ہوئے، آپ کی زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ مسلمانوں کی تکفیر تھا، مدرسہ فیض عام کان پور میں مختلف الخیال علماء کا اجتماع سنہ ۱۳۱۱ھ میں ہوا جس میں وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر علماء کے مابین اتحاد اور تعلیمی نظام کی اصلاح پر غور کیا گیا اور ندوۃ العلماء نام کی تنظیم قائم کی گئی۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب اس اجلاس میں شریک تھے، اس اجلاس سے واپس جانے کے بعد اس کی مخالفت میں ایک رسالہ "تحفۂ الحنفیہ لمعارضۃ ندوۃ العلماء" کے نام سے لکھا اور اس کا بھرپور رد کیا، اس کے بعد ندوۃ العلماء کی مخالفت میں چھوٹے چھوٹے سیکڑوں رسالے لکھ ڈالے اور ندوۃ العلماء کی مذمت میں پورا زورِ قلم صرف کر دیا پھر ایک رسالہ "الجام السنہ لاہل الفتنہ" کے نام سے لکھا اور آخر میں ندوۃ العلماء کی مخالفت میں ایک استفتاء مرتب کر کے اس پر علماء حرمین سے توثیق کرائی اور سنہ ۱۳۱۷ھ میں اس کو "فتاوے الحرمین برجف ندوۃ المین" کے نام سے شائع کیا پھر اس کے بعد ان کی تکفیری مہم پر شباب آگیا اور ملک کے کسی بھی مشہور عالم کو نہیں بخشا، صفر سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔

سب کو بالائے طاق رکھا اور تن تنہا خلوت میں بیٹھ کر ایک ایمان سوز منصوبہ بنایا اور اتنی رازداری برتی کہ کسی کو اس کی سُن گُن تک نہیں ملی، اس واسطے کہ اس منصوبہ کا بنیادی عنصر بڑا ہی دل دہلا دینے والا اور مسلمانوں میں اشتعال کی آگ بھڑکا دینے والا تھا، خانہ کعبہ اور گنبد خضریٰ کے سایہ میں سازش، فریب، غلط بیانی اور اللہ کے بہت سے مقرب بندوں کے ایمان کو قتل کرنے کے دلی جذبے کی تکمیل کے لیے ریشہ دوانیاں کرنی تھیں، اصل راز کھلنے سے پہلے علماء حرم مکہ اور علماء حرم نبوی کو فریب کے جال میں لاکر ان کی زبان اور قلم سے ایسے خیالات کا اظہار کرانا تھا کہ راز کھلنے کے بعد سوائے دستِ تاسف ملنے کے اور فریب دینے والے کو بددعائیں دینے کے اور کوئی حاصل نہ رہ جائے۔

اسلام کی تاریخ میں صرف دو بار علماء حرم کے ساتھ یہ فریب کاری کی گئی اور ان کو دھوکے میں رکھ کر اسلام کے مخلص فداکاروں کو، سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کے لیے مرمٹنے والوں کو، اپنا سر ہتھیلیوں پر رکھ کر اسلام کی حفاظت کرنے والے اللہ کے مخلص بندوں کو شرک و کفر کی کند چھری سے اس طرح ذبح کرایا گیا کہ اس کے درد و غم سے لاکھوں اور کروڑوں ایمان والوں کی آنکھوں سے خون کے آنسو اُبل پڑے۔

عصر حاضر کی تاریخ کا پہلا واقعہ تو وہ ہے جب لارڈ ولسن نے مکہ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کرا کے مکہ و مدینہ میں غارت گری کرائی اور حرم نبوی اور کعبۃ اللہ کی حرمت کو پامال کرایا تو دنیائے اسلام کے زخموں پر پھایہ رکھنے کے لیے انگریزوں نے اپنے ایک زرخرید خان بہادر کے ذریعہ ترکوں کے کافر و مشرک ہونے کا فتویٰ لکھوایا اور علماء حرمین شریفین سے دستخط کرائے، یہ کارنامہ بھی بدقسمت ہندوستان ہی کے ایک بدبخت انسان کے ذریعہ انجام دیا گیا۔

عصر حاضر کی تاریخ کا دوسرا واقعہ مولوی احمد رضا خان صاحب نے انجام دیا، تاریخ کے یہ دونوں واقعات اس بات کی بدترین مثالیں ہیں کہ دنیا والوں نے یقین کر لیا کہ جب بھی اسلام کے خلاف کوئی اقدام کرنا ہو تو مسلمان نام کی قوم سے ہی بالخصوص ہندوستان کی سرزمین سے بہت سے ضمیر فروش انسان مل سکتے ہیں اور مسمریزم کے معمول کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک تیز چھری دے کر بیک وقت ہزاروں لاکھوں کے ایمان کو قتل کرایا جا سکتا ہے۔

مکہ و مدینہ میں ریشہ دوانیاں :- ۱۳۲۴ھ میں مولوی احمد رضا خاں صاحب نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں میں پیوندکاری کی، اور مختلف مقامات کی عبارتوں کو لے کر ایک مربوط عبارت بنائی اور اردو کتابوں کی عبارتوں کا خود عربی میں ترجمہ کیا اور اس کو کفر آمیز بنایا اور اپنے ہاتھ کی اس صنعت اور کاریگری کے نمونے کو لے کر حجاز گئے اور وہاں کے علماء کو بتایا کہ ہندوستان میں کچھ علماء اس طرح کے عقیدے رکھتے ہیں جو ہمارے اس استفتاء میں ہیں اور وہ پورے ہندوستان میں اس بدعقیدگی کو پھیلا کر مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں، اسی استفتاء میں مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی شامل کر لیا کہ پنجاب کے مسیلمہ کذاب کے عقائد کے ساتھ علماء دیوبند کو شامل کر دینے کی وجہ سے فریب کاری کا وار خالی نہیں جا سکتا، حرمین شریفین کے بہت سے علماء نے مولوی احمد رضا خان صاحب کے اس مرتب کردہ استفتاء پر لکھ دیا کہ جو لوگ رسالہ میں مندرجہ عقائد رکھتے ہوں وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہیں۔

لہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ہندوستان کے جلیل القدر اور مشہور علماء میں سے ہیں، آپ کی ولادت تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ماہ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں ہوئی۔ آپ کی بیشتر تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولانا محمود صاحب اور مولانا سید احمد دہلوی شامل ہیں، آپ حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی سے بیعت ہیں اور آپ کے خلیفہ مجاز آپ کے مسترشدین کی تعداد ہزاروں میں ہے جلیل القدر علماء آپ کے خلفاء مجازین میں شامل ہیں۔ ابتداءً جامع العلوم کان پور میں درس و تدریس کا کام کیا بعد میں تدریسی زندگی ترک کر کے خانقاہ امدادیہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ آپ کے فتاویٰ کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے تقریباً آٹھ سو چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں ترجمہ قرآن اور تفسیر بیان القرآن اردو میں آپ کی مشہور کتابیں ہیں، رد بدعت میں بہت متشدد تھے۔ بیاسی سال کی عمر میں ماہ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق جولائی ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا اور تھانہ بھون میں آسودۂ خواب ہیں تفصیلی حالات کے لیے دیکھئے نزہۃ الخواطر جلد ۸ "اشرف السوانح" از خواجہ عزیز الحسن مجذوب اور "حکیم الامۃ" مرتبہ عبدالماجد دریا آبادی۔

اس استفتاء کو لے کر وہ ہندوستان آئے اور اس کو "حسام الحرمین" کے نام سے شائع کر دیا اور ہندوستان کے باشندوں پر ثابت کر دیا کہ ابھی جعلسازی کرنے میں ہندوستان کی سرزمین بنجر نہیں ہوئی ہے، ایک گمنام اور معمولی آدمی بھی علماء مکہ و مدینہ کو بے وقوف بنا سکتا ہے ان کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کر کے اپنا کام نکال سکتا ہے، مرزا غلام احمد قادیانی بے وقوف تھا جس نے ڈائرکٹ نبوت کا دعوی کر کے اپنی اُمت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا اہلِ حق کو موقعہ دے دیا اور اس پر اسلام کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، بریلی کے ایک شخص نے لاکھوں آدمیوں کو کفر و ارتداد سے متہم کر کے "مجدد مأۃ حاضرۃ" کا سنہری تاج حاصل کر کے اپنی اُمت سے صحابہ کرام کی طرح "رضی اللہ عنہ" کا اعزاز و افتخار پالیا۔

تلوار ہاتھ میں آگئی:- "حسام الحرمین" کی اشاعت کا مقصد صرف یہ تھا کہ جو لوگ خدا کے آستانے سے ہٹ کر غیر اللہ کے آستانوں پر سجدہ کرتے ہیں اور اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا حاجت روا کہتے ہیں ان کے دلوں میں خدا کی عظمت اور اس کے جاہ و جلال کا پختہ یقین پیدا کیا جائے، خدا کی خدائی میں وہ دوسروں کو شریک کر کے مشرکوں جیسا طرزِ عمل اختیار کر کے گمراہ ہو رہے ہیں ان کو صراطِ مستقیم پر لا کر خدائے واحد کے آستانے پر جھکا دیا جائے، انھیں لوگوں کے راستہ میں سنگِ گراں پیدا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی اصلاحی مہم میں ناکام ہو جائیں اور اسلام کو ہندوستانی مسلمانوں میں جو صحیح خدوخال کے ساتھ جاری و ساری دیکھنے کا خواب دیکھتے ہیں ان کا یہ خواب چکنا چور ہو جائے اور جو لوگ عوام کی اس جہالت و ناواقفیت سے تھوڑے سے مادی منافع حاصل کرتے ہیں، وہ محفوظ ہو جائے، حسام الحرمین کا مصنف اور ان کے ہم نوا مسلمانوں کی اس بدعقیدگی کو صحیح اسلامی تعلیمات تصور کرتے تھے، تو اس کی تائید اور اس کے شرعی دلائل تلاش کر کے عوام کو اپنے اپنے طرزِ عمل پر قائم رکھنے کی کوئی مثبت جد و جہد کرتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کو بریلی کے اس محلہ سے باہر اس وقت تک کوئی جانتا بھی نہیں تھا، ان کی دینی خدمات اور اسلام کو سربلند رکھنے کا کوئی کارنامہ تو بہت دور کی بات ہے، شاید وہ ہندوستانی

مسلمانوں کی ان گمراہیوں کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے تھے اس لیے اس صورتِ حال کے لیے اب تک انہوں نے ایک حرف نہیں کہا تھا اور کافرگری کو اپنا مشغلہ بنایا اور ناپاک مقصد کے لیے بھی وہ طریقہ اختیار کیا جو اخلاقی اعتبار سے پست ترین طریقہ تھا، اسلامی نقطہ نگاہ کو ملحوظ رکھنا جوشِ انتقام میں ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا، اس لیے اس کا کوئی سوال ہی نہیں۔

اہلِ بدعت کا ایک فرقہ بن گیا:۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بدعت کا کوئی مذہب نہیں تھا اسی لیے ہر علاقہ میں مختلف طرح کی بدعتیں رائج تھیں اسی لیے بدعات و خرافات کو کسی فرقہ کی اجتماعی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن مولوی احمد رضا خان صاحب نے بدعات و خرافات کی اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا، ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد میں مبتلا لوگوں کو ایک رشتہ میں پرو کر ان کو ایک فرقہ کی شکل دیدی اور انہوں نے بعد میں اس فرقہ بندی کو قائم رکھنے کے لیے بڑی جدوجہد کی، اس فرقہ کی تشکیل میں سب سے بڑا اور اہم کردار ان کی "کافرگری" کی مہم نے انجام دیا، ہندوستان میں شاید ہی کچھ اللہ والے بچ گئے ہوں جو ان کے وار سے محفوظ رہ گئے ہوں، اسلامی ہند کے تمام مشاہیر علماء، صوفیاء، اولیاء اللہ، مجاہدینِ آزادی، اسلامی مدارس کے علماء و اساتذہ محدث و فقیہہ، مفتی و مصلح، قومی و ملی رہنما، مصنف اور اہلِ قلم جنہوں نے ملت کے لیے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیں، ان کے نزدیک کوئی مسلمان نہیں رہ گیا،

تفریق اور اشتعال:۔ "حسام الحرمین" کو خوب شہرت دی گئی، ملک کے گوشے گوشے میں بھیجی گئی، جو لوگ بدعات و خرافات میں مبتلا تھے اور معذرت کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ یہ رسم ہمارے بزرگوں سے چلی آرہی ہے وجدنا علیہ اٰباءنا ولو کانوا فی ضلال مبین، اس کے علاوہ ان کے پاس ان خرافات میں دین و شریعت کی کوئی تائید یا دلیل نہیں تھی، آباؤ اجداد سے ان کے گھرانوں میں جو رسم و رواج چلے آرہے تھے اس کے ترک پر وہ آمادہ نہیں تھے جب

ان لوگوں کے پاس حسام الحرمین کی زہر میں بجھی ہوئی تلوار پہونچ گئی تو انہوں نے اب ان تمام لوگوں کے خلاف انتہائی بے دردی سے اس کو استعمال کرنا شروع کر دیا جو ان بدعات و خرافات کی مذمت میں ایک لفظ بھی مونہہ سے نکال دیتا تھا، اپنی بدعقیدگی پر اب ان کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی، اس کتاب سے ان کا جواز تو نہیں ملا لیکن اصلاح کرنے والوں کا منہ بند کر دینا ہی ان کے نزدیک بدعات و خرافات پر قائم رہنے کے لیے واحد طریقہ رہ گیا، شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں تفریق و اشتعال بڑھنے لگا بہت سے مقامات پر ہنگامہ و فساد تک کی نوبت آگئی اور ہر جگہ کچھ لوگ حسام الحرمین کو لے کر علماء حق کو کافر و مشرک ہونے کا پروپیگنڈہ کرنے کے لیے میدان میں آگئے اور انہوں نے فضا میں سخت تناؤ اور اشتعال پیدا کر دیا اور اہل حق کو حقیقت واقعہ جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ اتفاق تھا کہ جن دنوں مولوی احمد رضا خاں صاحب علماء حرمین کی فریب دہی میں مصروف تھے، شیخ الاسلام مولانا سید حسین[1] احمد شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند، مدینہ طیبہ میں مقیم تھے اور انہوں نے جب ایک

---

[1] شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علماء ہند، ہندوستان کے چوٹی کے علماء و مشائخ میں سے تھے، محدث بالغ نظر، مرشد کامل اور علم و فضل، زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت موضع اُناؤ میں ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ (ستمبر ۱۸۷۹ء) کو ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد ساری تعلیم دار العلوم دیوبند میں حاصل کی، آپ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے انتہائی معتمد اور مخصوص شاگرد تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہوئے اور خلیفہ مجاز بھی۔ آپ کے والد محترم سید حبیب اللہ ٹانڈوی جو حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے مرید تھے۔ ہندوستان سے ان کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی اور اپنی آل اولاد کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، آپ بھی ان کے ہمراہ مدینہ منورہ گئے مگر ہجرت کی نیت نہیں کی، حرم نبوی میں تقریباً سولہ سترہ سال تک آپ نے درس دیا، اسی وجہ سے آپ کو مدنی کہا جاتا ہے۔ حضرت شیخ الہند کے ساتھ ریشمی رومال کی تحریک میں مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے جہاں برطانوی حکومت کے قیدی بن کر ساڑھے تین سال گذارے۔ رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند کے ساتھ ہندوستان آگئے۔ ایک سال کلکتہ میں مولانا آزاد کے قائم کردہ مدرسہ میں شیخ الحدیث رہے، اسی زمانہ میں کراچی میں حکومت کے خلاف ایک تجویز پیش کرنے پر مقدمہ چلا اور دو سال کے لیے (باقی اگلے صفحہ پر)

جھوٹا استفتاء کا جواب حاصل کرنے کی سازش کو سنا تو اکثر علماء حرم سے مل کر ان کو صورتِ حال بتائی تو ان حضرات نے اظہارِ ندامت و افسوس کیا، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، اس لیے حضرت مدنی نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کی اس غیر اسلامی جسارت پر اور اس کی تفصیلی کیفیت پر مستقل ایک رسالہ "الشہاب الثاقب" تحریر فرمایا اور وہ تمام پوست کندہ حالات بیان فرمائے جن میں یہ استفتاء حاصل کیا گیا اور فتوی کی حقیقت کھول کر واضح کر دی۔

اظہارِ حقیقت کا ہر طریقہ اختیار کیا گیا:۔ جن لوگوں کو ہدفِ ملامت بنایا گیا اور ان پر مشقِ ستم کی گئی ان کو زہد و تقویٰ، علم و فضل، اخلاص و دیانت نے ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیا تھا، وہ خود پسندی سے دور اور انانیت کے کبھی شکار نہیں ہوئے، انہوں نے دین و دیانت کا تقاضا سمجھا کہ صحیح صورتِ حال دنیا کے سامنے پیش کر دی جائے اور یہی انہوں نے کیا اور مسلسل کیا، جتنے غلط اور جھوٹے عقائد ان کی طرف منسوب کیے گئے تھے ان سے انہوں نے انکار کیا اور بڑی وضاحت سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کوئی اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہے تو ہم بھی اس کو کافر کہتے ہیں اور وہ یقیناً دین سے خارج ہے، حاشا و کلا اس طرح کا کوئی عقیدہ نہ ہمارا ہے اور نہ ہمارے ذہن میں آسکتا ہے اور نہ ہماری کتابوں کی کسی عبارت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سابرمتی جیل بھیج دیئے گئے، رہائی کے بعد آپ سلہٹ کے ایک مدرسہ میں شیخ الحدیث بن کر رہے علامہ کشمیری جب دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہو کر ڈابھیل چلے گئے تو آپ کو سلہٹ سے بلا کر دار العلوم دیوبند کا صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بنا دیا گیا انگریزی حکومت کے سخت مخالفوں میں سے تھے، کانگریس کے رکن تھے اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ۱۹۴۲ء میں حکومت نے گرفتار کر کے مراد آباد میں مقدمہ چلایا اور ساڑھے تین سال کے لیے نینی جیل الہ آباد بھیج دیا۔ آزادی وطن کے بعد آپ نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور خالص دینی امور کے لیے اپنے کو وقف کر دیا۔ آپ کے مسترشدین کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ بہت سے جلیل القدر علماء آپ کے خلفاء مجازین میں شامل ہیں۔ دیوبند میں مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو راہی ملکِ بقاء ہو گئے، مزار قاسمی کے پاس آسودۂ خواب ہیں۔

سے اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے، یہ ہم پر صرف افترا ہے، بہتان ہے اور جھوٹ ہے، اس سلسلہ میں "السحاب المدرار"، "قطع الوتین" اور "تزکیۃ الخواطر"، "بسط البنان"، "توضیح البیان" جیسی متعدد کتابیں اور رسالے لکھے گئے اور شائع کیے گئے، لیکن یہ آواز نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی، علماء حق نے جتنی ہی برأت کی، صفائی دی، الزامات سے انکار کیا، اتہامات کے جھوٹے ہونے کو واضح کیا، اتنا ہی ہر جلسہ میں، اپنے ہر رسالہ میں علماء دیوبند کے کافر ہونے کا اعلان اور بعض بزرگوں کے ستر ستر وجوہ سے کافر ثابت کرنے کی مہم شروع کر دی گئی، یہ کفر سازی اور کافر گری وہاں جا کر تمام ہوئی کہ جو ان لوگوں کو کافر نہ کہے اور نہ سمجھے وہ خود کافر ہو جائے گا، اور جب بہت بعد میں انہوں نے اپنی بلیک لسٹ میں سے کچھ بزرگوں کے بارے میں لکھا کہ احتیاط کا تقاضا ہے کہ ان کو کافر نہ کہا جائے گا، تو اہل علم نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کے دونوں قضیوں کو ملا کر ایک نیا نتیجہ نکالا۔ پہلا قضیہ یہ تھا کہ مولوی اسمٰعیل ستر وجوہ سے کافر ہے، دوسرا قضیہ یہ تھا کہ جو اُن کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے اور بعد میں خود مولوی احمد رضا خاں صاحب ہی نے کہا کہ احتیاط یہ ہے کہ ان کو کافر نہ کہا جائے یعنی مولوی احمد رضا خاں صاحب ان کو کافر نہیں کہتے، نتیجہ ظاہر ہے کہ خود کافر ہو گئے۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا، اسی کو کہتے ہیں۔

ملک میں دو محاذ:- مسلمانوں میں کھلم کھلا دو محاذ بن گئے، ایک طرف علماء حق کے ماننے والے، بدعات و خرافات، مشرکانہ رسوم سے نفرت کرنے والے اور دوسری طرف نذر نیاز، فاتحہ میلاد، عرس اور قوالی کے حمایتی، یہ تقسیم گاؤں گاؤں پھیل گئی، دونوں طرف کے علماء اپنے اپنے مسلک کی تائید میں تقریریں کرتے، ایک دوسرے کو چیلنج کرتے اور بات مباحثہ و مناظرہ اور مجادلہ تک پہونچ جاتی، اس صورت حال میں اصلاح کا کام دشوار ضرور ہو گیا لیکن بہر حال یہ کام کئی راہوں سے ہوتا رہا، علماء دیوبند کے کچھ ذہین و فطین اور مجاہدانہ جذبات رکھنے والے علماء نے نئی صورت حال سے نمٹنے کا تہیہ کر لیا اور انہوں نے مولوی احمد رضا خان صاحب کے گروہ کو جواب رضاخانی فرقہ کہا جانے لگا تھا تعاقب کیا اور ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مجمع عام

میں ان کو لائے، ان سے مناظرے کیے، ان کے عقائد کا پوسٹ مارٹم کرتے، ان کے الزامات کے مسکت جوابات دیتے اور ان کی زبانیں بند کر دیتے، اس سلسلہ میں جن لوگوں نے احقاقِ حق کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور بعض بعض اپنی جانیں خطرات میں ڈال کر رضاخانی گروہ کو میدانِ مناظرہ میں خاموش کیا، ایسے علماء کی فہرست میں چند ممتاز نام یہ ہیں مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی، مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہاں پوری، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی استاذ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد، مولانا نور محمد صاحب ٹانڈوی فاضل مظاہر علوم سہارنپور، مولانا عبداللطیف صاحب عثمانی صدر المدرسین مدرسہ مفتاح العلوم مئو، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا ارشاد احمد صاحب فیض آبادی کے اسمار گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان حضرات کو جب بھی کہیں بلایا گیا، یا صورتِ حال کا علم ہوا تو از خود پہونچے اور ہر طرح کے حالات میں انہوں نے احقاقِ حق کا فریضہ پوری جرأتِ ایمانی کے ساتھ ادا کیا، اور ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں انہوں نے پہونچ کر کفر کا الزام عائد کرنے والوں کا مناظروں میں منہ بند نہیں کیا اور خود رضاخانی فرقہ کی گمراہیوں اور بدعقیدگیوں کو کھول کھول کر ان سے سوالات کر کے ان کے سارے رازِ درون علی رؤس الاشہاد بیان کیے جن کے جوابات یا صفائی کے لیے فریقِ مخالف کے پاس کوئی موقعہ نہیں چھوڑا۔

حسام الحرمین کی اشاعت کے بعد:- حسام الحرمین میں جس طرح کے جھوٹے الزامات اور بے بنیاد اتہامات علماءِ حق پر عائد کیے گئے تھے اس کی وجہ سے اہلِ حق میں سخت بے چینی اور اشتعال تھا اس لیے قدرتی طور پر جو لوگ اس پُر فریب داستان سے واقف نہیں تھے، طمانیت قلب کے لیے تحقیقِ حال کرتے تھے، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ براہِ راست دارالافتاء سے بھی اس سلسلہ میں استفسار کیا جاتا رہا، مثلاً ایک اسی طرح

کے سوال کے جواب میں مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:۔

"علماء دیوبند کی متبرک اور مقبول جماعت کو کافر و مرتد لکھنے والے نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے، اس کے جواب میں تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے فصبرٌ جمیل واللہ المستعان علیٰ ما تصفون، صبر ہی بن آوے اور اللہ ہی سے فریاد ہے وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون اور عنقریب جان لیں گے ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ بیٹھتے ہیں۔ اگر کسی کو ان حضرات کی کسی خاص عبارت کے متعلق شبہ ہے یا ان لوگوں کے ورغلانے سے پیدا ہو جائے تو اس کا مفصل جواب رسائل میں مذکور ہے ان کو دیکھا جائے تو انشاء اللہ آفتاب کی طرح روشن ہو جائیگا کہ ان حضرات پر جو کچھ الزامات لگائے گئے ہیں وہ سب بدفہمی کا نتیجہ ہیں یا افتراء و بہتان ہیں۔"[1]

مفتی محمد شفیع صاحب ایک دوسرے موقعہ پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی عبارات پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:۔

حضرات علماء دیوبند اکابر سے لے کر اصاغر تک اپنی تمام تصانیف اور تقریر و تحریر میں ہمیشہ اس کا اعلان کرتے رہے کہ ہمارے عقائد وہی ہیں جو کہ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ دین کے رہے ہیں، تمام علماء حنفیہ رحمہم اللہ کے عقائد میں کوئی عقیدہ ان کے مخالف نہیں اور یہی سبق دارالعلوم دیوبند میں طلباء کو دیا جاتا ہے اور وہی کتب عقائد اہل سنت والجماعت کی پڑھائی جاتی ہیں اور جس کسی نے اس کے خلاف ہماری طرف منسوب کیا ہے یا ہماری عبارتوں میں تحریف کر کے اس پر الزام کیا ہے وہ سب

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم مطبوعہ کراچی ج ۲ ص ۹۴

افترا محض ہے، ہم اور ہمارے اکابر اس سے بری ہیں"۔ [1]

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری پر یہ الزام لگایا تھا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ شیطان کے علم کو (معاذ اللہ) حضورؐ کے علم سے زیادہ مانتے ہیں، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی پر یہ اتہام تھا کہ وہ حضور پاک کے علم کو (معاذ اللہ) جانوروں کے علم کے برابر کہتے ہیں۔ مولانا خلیل احمد صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ میں نقل کی ہے :-

> مولوی احمد رضا خاں صاحب نے جو بندہ پر الزام لگایا ہے بالکل بے اصل ہے اور لغو ہے، میں اور میرے اساتذہ ایسے شخص کو کافر، مرتد اور ملعون کہتے ہیں جو کہ شیطان علیہ اللعن کو کیا بلکہ کسی مخلوق کو بھی جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم میں زیادہ کہے، غرض خاں صاحب بریلوی نے محض اتہام اور کذب خالص بندہ کی طرف منسوب کیا ہے، مجھ کو تو مدت العمر اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ شیطان تو کیا کوئی ولی اور فرشتہ بھی آپ کے علوم کی برابری کر سکے چہ جائیکہ علم میں زیادہ ہو، یہ عقیدہ جو خاں صاحب نے بندہ کی جانب منسوب کیا ہے اس کا مطالبہ خاں صاحب سے روزِ جزا ہوگا، میں اس سے بالکل بری ہوں اور پاک وکفیٰ باللہ شہیدا اور اس پر خدا گواہ ہے۔ [2] (حررہٗ خلیل احمد عفا اللہ عنہ)

اسی بحث کے سلسلہ میں مولانا محمد مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کو ایک خط لکھا جس کے جواب میں حضرت تھانوی نے مولانا موصوف کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا :-

> آپ کے خط کے جواب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ خبیث مضمون میں نے کسی کتاب میں نہیں لکھا اور لکھنا تو درکنار میرے قلب میں اس مضمون

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم مطبوعہ کراچی ج ۲ ص ۸۴۔ [2] حوالہ بالا

کا خطرہ نہیں گذرا۔

۲۔ میری کسی عبارت سے یہ مضمون لازم نہیں آتا۔

۳۔ جو شخص ایسا عقیدہ رکھے یا بلا اعتقاد صراحتًا یا اشارۃً یہ بات کہے میں اس کو خارج از اسلام سمجھتا ہوں، میرا اور میرے سب بزرگوں کا عقیدہ آپ کے افضل المخلوقات فی جمیع الکمالات العلمیہ والعملیہ ہونے کے باب میں یہ ہے کہ، بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر۔[1]

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی پر ختم نبوت کے انکار کا جھوٹا الزام لگایا گیا تھا آپ نے استفسار کرنے والوں کے جوابات دیئے ہیں، ایک جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"خاتمیت زمانی اپنا دین و ایمان ہے، ناحق تہمت کا البتہ کوئی علاج[2] نہیں"

حضرت سید العارفین مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر خدا تعالیٰ کے جھوٹ بولنے کی تہمت لگائی گئی تھی، جو بالکل بے بنیاد اور خلاف حقیقت بات تھی اور کہیں بھی یہ عبارت نہیں ہے، فتاویٰ رشیدیہ طبع ہو چکی ہے، اس میں یہ عبارت ہے:۔

"امکان کذب کا یہ معنی کہ مثلاً فرعون پر ادخال نار کی وعید ہے۔ مگر ادخال جنت فرعون پر بھی قادر ہے اگرچہ ہرگز اس کو جنت نہ دے گا، اور یہی مسئلہ مبحوث اس وقت میں ہے، بندہ کے جملہ احباب یہی کہتے ہیں اس کو اعدا نے دوسری طرح پر بیان کیا ہوگا، اس قدرت اور عدم ایقاع کو امکان ذاتی ممتنع بالغیر سے تعبیر کرتے ہیں، رشید احمد عفی عنہ۔[3]

راز کھل جاتا ہے:۔ حسام الحرمین کی اشاعت کے بعد مسلسل وضاحت کی گئی علماء دیوبند کے صریح عقائد کا اظہار کیا گیا، جن لوگوں نے الزامات

---

[1] فتاویٰ دار العلوم مطبوعہ کراچی ج ۲ ص ۴۸ و ۴۹۔ [2] جوابات محذورات ص ۳۹ بحوالہ رسالہ الرشید لاہور دار العلوم دیوبند نمبر ۴۵۔ [3] فتاویٰ رشیدیہ مطبوعہ دہلی ۱۳۴۸ھ ج ۱ ص ۱۱ و ۱۲

عائد کیے گئے تھے اور تہمتیں لگائی گئی تھیں ان میں سے جو زندہ تھے اور اس وقت موجود تھے انہوں نے ان تمام عقائد سے اپنی برات کا کھلے بندا ظہار کیا بلکہ ایسا عقیدہ رکھنے والے کو انہوں نے خود کافر کہا مگر ان مخلصین کے سارے بیانات رضاخانی جماعت کے اہل علم پڑھتے رہے پھر بھی ان کے دلوں میں ذرا بھی خوف خدا پیدا نہیں ہوا اور چپ چاپ ان کو سنتے رہے بات وہی ہوئی کہ بین بجتی رہی اور بھینس بیٹھی جگالی کرتی رہی۔

سب سے اہم اور واضح جوابات وہ ہیں جو علمار دیوبند نے علمار حجاز کے سوال کے جواب میں تحریر کیے ہیں، بات یہ ہے کہ جعلسازی زیادہ دنوں تک چھپی نہیں رہ سکتی ہے، ذہین سے ذہین آدمی بھی دھوکہ اور فریب کا شکار ہو سکتا ہے لیکن وہ بہت جلد اپنی فریب خوردگی کا احساس کر لیتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے اس لیے مذمت دھوکہ اور فریب دینے والے کی کی جا سکتی ہے، فریب کا شکار ہونے والوں کی نہیں، علمار حجاز بھی تھوڑے ہی دنوں بعد سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ دھوکہ اور فریب کیا گیا ہے۔

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے جو اسکیم بنائی تھی اس کے مطابق ہر کام کمال احتیاط اور انتہائی رازداری کے ساتھ اپنے وقت پر ہوتا چلا گیا، جوں ہی افشار راز کا وقت آیا وہ حدود حجاز سے باہر ہو گئے، ان کی ہندوستان واپسی کے بعد حرمین شریفین بالخصوص مدینہ منورہ میں جب علمار آپس میں ایک دوسرے سے ملے اور اپنی ان تصدیقوں کا ذکر کیا جو انہوں نے ایک ہندوستانی عالم کے استفتار پر کی تھیں، جن کو حقائق کا علم ہو چکا تھا انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ اس شخص نے بیان عقائد کے سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیا ہے اور متعدد علمار کے کانوں تک فریب دہی کی یہ بات پہونچی تو ان کو دین و دیانت کے تقاضوں نے مجبور کیا کہ وہ صحیح صورت حال معلوم کریں، اس کے لیے کئی علمار نے پیش قدمی کی، مولوی احمد رضا خان صاحب نے حسام الحرمین میں ان حضرات کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اور ان کے دلوں میں بغض و نفرت پیدا کرنے کے لیے زبان سے جو کچھ کہا تھا ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر ان حضرات نے ۲۶ سوالات مرتب کیے اور علمار دیوبند کے پاس ہندوستان بھیجا کہ وہ ان سوالات کے جوابات تحریر کریں۔

یہاں سے مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری نے ان سوالات کے مفصل جوابات تحریر فرمائے، اس تحریر پر اس دور کے اکابر علماء دیوبند نے تصدیقات لکھیں اور تائید میں اپنے دستخط کیے، یہ تحریر علماء حرمین کے پاس بھیج دی گئی اور دوسرے اسلامی ممالک میں مصر و شام کے علماء و اہل فتویٰ کے پاس بھیجی گئی، جس کی ان تمام علماء نے بھی تصدیق و تائید فرمائی اور لکھا کہ یہی عقیدے اہل سنت والجماعت کے ہیں اور ان میں کوئی عقیدہ اہل سنت والجماعت کے خلاف نہیں ہے۔

بعد میں یہ سوالات وجوابات، ہندوستان اور حرمین شریفین اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے علماء کرام کی تصدیقات اسی زمانہ میں اُردو ترجمہ کے ساتھ ایک ضخیم رسالہ کی صورت میں "التصدیقات لدفع التلبیسات" کے نام سے شائع کر دی گئی تھیں، پھر اس وقت سے اب تک بار بار یہ رسالہ چھپتا رہا اور پورے ملک میں بھیجا جاتا رہا، اس کے بعد اس آگ کو بجھ جانا چاہیئے تھا جو حسام الحرمین نے لگائی تھی، لیکن چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر بھی اس کے وجود سے کوئی انکار کر دے تو اس کا کیا علاج ہے؟

ایک محاذ بنتا چلا گیا:۔ حسام الحرمین کی اشاعت کا مقصد علماء حق کے اثر کو کم کرنا تھا ان کے مواعظ سے متاثر ہو کر مشرکانہ عقائد سے لوگ توبہ کرتے اور دین و شریعت کی صحیح راہوں پر گامزن ہو جاتے تھے، اسی اثر اور تاثیر کو ختم کرنا منظور تھا حالانکہ پہلے جب عوام کو سمجھایا جاتا تھا کہ تم جن لغویات میں مبتلا ہو، قرآن و حدیث کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے اور گناہ ہے تو ان کے دلوں میں خوف پیدا ہوتا تھا اور وہ عذاب آخرت کے ڈر سے ان نصیحتوں کو قبول کرتے تھے، لیکن اب عوام کو ایسے لوگ مل گئے تھے جو ان کے آباؤ اجداد کی تمام رسوم کو بحال رکھنے اور ان کو شریعت کا لباس پہنانے لگے تو ان کو سہارا مل گیا، اب وہ اپنی خرافات کو برا سمجھنے کے بجائے کارِ ثواب سمجھنے لگے اس لیے ان کو بدعات و خرافات پر جمے رہنے کا حوصلہ ملا، ایسے تمام لوگوں نے ہر جگہ اپنا ایک محاذ بنا لیا اور ہر شہر، قصبہ اور گاؤں کے مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا، ایک طرف وہ لوگ تھے جو دین و شریعت کے احکام، اسلامی

تعلیمات و روایات کی روشنی میں بدعات و خرافات سے تائب ہو کر صراطِ مستقیم پر گامزن تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اپنے آبا و اجداد کی متوارث گمراہیوں میں مبتلا تھے، ان پر وہ اور مضبوطی سے جم گئے، وہ اپنے مکتبہ فکر کے علماء کو بلا کر اشتعال انگیز تقریریں کرانے لگے اور علماء حق کی شان میں ناروا نازیبا الفاظ بلکہ دشنام طرازیوں میں بھی ان کو کوئی باک نہیں تھا، یہ فضا پورے ملک میں بن گئی، ہر جگہ اشتعال اور تناؤ، ایک دوسرے سے علیحدگی اور قطع تعلقات کا سلسلہ چل پڑا۔

علماءِ حق میدانِ عمل میں:۔ حسام الحرمین کا پردہ فاش کرنے اور بے شمار رسالوں اور کتابوں میں اظہارِ واقعہ اور الزام لگائے گئے عقائد سے اظہارِ برأت کے بعد بھی رضا خانی چیخ چیخ کر ان کو دُہراتے تھے تو فضلاء دیوبند اور علماء حق کی جماعت جدوجہد کے میدان میں آئی اور تُرکی بہ تُرکی جواب دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

وہ ردِ بدعات میں معرکۃ الآراء تقریریں کرتے اور ان تمام خرافات کی تردید قرآن و حدیث کی روشنی میں بھرپور طریقہ سے کرتے جو اہلِ بدعت میں جاری و ساری تھیں، نیاز، فاتحہ، میلاد قیام، عرس، قوالی، چادر، گاگر، قبر پرستی وغیرہ عنوانات پر ایسی زلزلہ افگن تقریریں کرتے کہ رضا خانی فرقہ تھرا جاتا تھا، دلائل و براہین قرآن و حدیث کی تشریحات اور مسئلہ کی تحقیق میں دقیق علمی بحثوں کو سُن کر ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں، لیکن اس طبقہ میں کچھ ایسے مولوی بھی پیدا ہو گئے تھے جن کو نہ اپنی بے علمی پر ندامت ہوتی اور نہ شکست پر شرمندگی، انہوں نے اپنا لب و لہجہ اور بھی تیز کر دیا اور علماء حق کے لیے دشنام طرازیوں کی ایک پوری ڈکشنری مرتب کر ڈالی، ایسے گندے، گھناؤنے الفاظ اور اس طرح کی فحش گالیاں جن کو زبان پر لانا بھی ممکن نہ تھا بے تکلف ایجاد کرتے تاکہ عوام میں اشتعال ہو، علماء حق نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو یہ فیصلہ کیا کہ ان کو گھیر گھیر کر مجمع عام میں اُن سے گفتگو کی جائے اور سوال و جواب کر کے ان کے مبلغِ علم کا عوام کو پتہ دے دیا جائے، اس مقصد کے لیے علماء حق میں مناظرین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا اور اس نے انتہائی خطرناک حالات

میں بھی احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا فرض پوری دیانتداری سے انجام دیا۔

اہلِ بدعت کا مرکز بریلی :- پنجاب میں قادیان مرزا غلام احمد قادیانی مدعی نبوت کی وجہ سے مشہور ہوگیا اور اہلِ اسلام کی نگاہوں میں سب سے مبغوض شہر بن گیا۔ اہلِ بدعت کی جماعت کی آواز اور تائید بریلی سے اُٹھی، اور وہیں "کافرگری" کا فتنہ پیدا ہوا، اس لیے بریلی کو مرکزیت حاصل ہوگئی، وہیں ان کا سب سے پہلا مدرسہ جامعہ رضویہ قائم ہوا،

مناظرے ہی مناظرے :- میں جس دور کی تفصیل پیش کر رہا ہوں وہ مناظروں کا دور تھا، ہندوستان کے گوشے گوشے میں مباحثہ، مناظرہ، مجادلہ آئے دن ہوتا رہتا تھا، پورا ملک "دیوبندی بریلی" کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا، ہر طرف ایک شور، ایک ہنگامہ، جھگڑے فسادات، باہمی لڑائیاں، فتح و شکست کے بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر چسپاں نظر آتے رہے، اگر ان تمام مناظروں کے حالات جمع کیے جائیں تو اس کی تفصیل کے لیے کئی جلدوں کی کتاب کی ضرورت ہوگی لیکن وہ بے نتیجہ ہوگی، کیونکہ ہر مناظرہ کی داستان یکساں اور ہر مناظرہ کا انجام ایک طرح کا تھا، اس لیے میں نے قصداً مناظروں کی تفصیل دینے سے احتراز کیا ہے صرف دو مناظرے بطور مثال آپ کے سامنے پیش کروں گا وہ بھی صرف اس لیے کہ آپ مناظروں کے ماحول کو سمجھ جائیں، اور آپ یہ جان لیں کہ دینِ حق کا قافلہ کیسی کیسی پُرخار وادیوں سے گذر کر آج اپنی منزل پر پہونچا ہے۔

اُس دور کے نوجوان فضلاء دارالعلوم میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان"، کو خدا نے علم و فضل کے ساتھ جرأت حق اور شجاعتِ ایمانی کا بھرپور حصہ دے رکھا تھا، آپ رضاخانی لٹریچر کا بڑا گہرا مطالعہ کر چکے تھے، علماء حق پر جو اتہامات لگائے جاتے تھے اس کی تردید اور مسائلِ حقہ کے سلسلے میں حدیث و قرآن کے اتنے حوالے نوکِ زبان پر تھے کہ سامعین حیرت زدہ رہ جاتے تھے، طلاقتِ لسانی اور منطقی اندازِ گفتگو فریقِ مخالف کو زچ کر کے رکھ دیتا تھا، قدرت نے ان کو ہر طرح کے گندے الفاظ اور مخالف کے اشتعال انگیز

بیان اور دُشنام طرازیوں کے باوجود ضبط و تحمل کا وافر حصہ دے رکھا تھا، اس لیے جب مخالف لاجواب ہوکر اَوْل فَوْل اور مغلظات بکنے لگتا تھا تو آپ مشتعل ہونے کے بجائے اس کی اس حرکتِ مذبوحی اور بوکھلاہٹ پر صرف مسکرا دیتے تھے اور یہ مسکراہٹ دیکھ کر فریقِ مخالف اپنے ہوش و حواس پر قابو نہیں رکھتا تھا اور ایسی ایسی حماقتیں کر جاتا تھا کہ حاضرین پر کھل جاتا تھا کہ ان کا علم اب ساتھ چھوڑ چکا ہے صرف بدزبانی سے کام لینا چاہتے ہیں۔

مولانا موصوف کی ان خصوصیات نے ردِ بدعت کے مقابلہ میں ان کو ایک بے مثال شخصیت کی شکل میں عوامی اسٹیج پر پہونچایا تھا، انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اور اپنی قدرتی صلاحیتوں کا بہت بڑا سرمایہ ردِ بدعت اور ان سے مناظروں میں صرف فرمایا۔ ہندوستان کے کسی گوشے میں فریقِ مخالف کا کوئی بھی مولوی ہو اور مقامِ مناظرہ کے حالات چاہے کتنے ہی مخدوش ہوں صرف ایک ٹیلی گرام سے اطلاع مناظرہ میں شرکت کی ضمانت ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی تو اتنی عجلت کے ساتھ پہونچ جاتے تھے کہ فریقِ مخالف حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔

مناظرہ اَدْرِی (ضلع اعظم گڈھ):- ہندوستان کے چند بڑے اور اہم مناظروں میں قصبہ ادری ضلع اعظم گڈھ کا مناظرہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے، اس مناظرہ میں اہلِ بدعت کو شکستِ فاش دینے میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سنبھلی مدیر "الفرقان" کا سب سے بڑا ہاتھ تھا، چونکہ یہ مناظرہ ہی اعظم گڈھ جیسے مردم خیز ضلع میں اہلِ بدعت اور اہلِ حق کے درمیان فیصلہ کن ثابت ہوا، اور اہلِ حق کے گروہ سے اہلِ بدعت کو الگ کیا گیا اور وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ کا اعلان علماءِ حق نے اپنی تقریروں میں کیا اس لیے اس مناظرہ کے پسِ منظر پر ہلکی سی روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ اس دَور میں عوام مذہبی اُمور میں کس طرح ایک دوسرے میں مخلوط تھے اور حق و باطل میں تمیز مشکل تھی۔ اس کی ایک واضح تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کے دَورِ اصلاح میں جس طرح کی بدعات و خرافات کا تذکرہ آپ نے اسی کتاب میں پڑھا ہے بالکل وہی بدعات و خرافات یہاں بھی رائج تھیں قصبہ کا ہر فرد ان تمام خرافات کو جزءِ ایمان اور ان کو اصلِ دین سمجھ کر پورے خلوص سے انجام دیتا

تھا، تعزیوں کے جلوس میں لہرا لہرا کر مرثیہ پڑھنا، ماتم کرنا، سینہ کوبی کرنا، ڈھول، تاشے پیٹنا، اور ان کاموں کو اسلامی شعار تصور کرنا، میلاد میں مولود طیش، مولودِ سعدی، مولود مجیدی جیسی کتابوں کی فرضی روایتوں کو پڑھنا اور مجلسِ میلاد میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر یقین رکھنا اور کھڑے ہو کر پورے جوش و خروش سے "یا نبی سلام علیکَ، یا حبیب سلام علیکَ" والی نظم پڑھنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر جاننا، تعزیوں پر چڑھانے کے لیے خاص طور سے مالیدہ بنانا، شب برات میں کئی طرح کے حلوے بنانا ہر گھر کا مذہبی لازمی فریضہ تھا، پورے قصبہ کی طرف سے کبھی کبھی بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوتا تھا جس کے اخراجات کے لیے ہر شخص چندہ میں شریک ہوتا تھا، کوئی صاحب گا گا کر وعظ کہتے تھے اور طوطی ہند کے نام سے ہمارے یہاں مشہور تھے وہ اور انہیں کی طرح اور میلاد خواں بلائے جاتے تھے۔

۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں جو جلسہ ہوا، اس کے مقررین میں اہلِ بدعت کی دو بڑی شخصیتیں آئیں۔ ایک مولوی نعیم الدین صاحب مرادآبادی صاحب کنز الایمان اور دوسرے مولوی حشمت علی صاحب پیلی بھیتی، اجلاس کی کئی نشستیں ہوئیں۔ پہلے اجلاس میں مولوی حشمت علی صاحب نے علماء دیوبند کے کفر و ارتداد کو بڑے جوش و خروش سے بیان کیا اور حسام الحرمین کے فتووں کا ذکر کیا۔

اس اجلاس میں مولانا محمد امین صاحب اوروی مرحوم موجود تھے، مولانا موصوف فاضل دیوبند، علامہ انور شاہ صاحب کشمیری کے شاگرد اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہم سبق تھے، انہوں نے کھڑے ہو کر مولوی حشمت علی صاحب کو مخاطب کر کے دورانِ تقریر میں کہا کہ "ان باتوں کا آپ کو جواب دیا جائے گا"۔ صرف ایک جملہ نے مجمع میں اشتعال پیدا کر دیا، موصوف کو گھیر لیا گیا، بڑی مشکلوں سے نجات پا کر محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو اور مشہور مناظر مولانا عبد اللطیف صاحب نعمانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال بتائی، وہیں سے فوراً مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو ٹیلی گرام کیا گیا، مولانا موصوف فوراً چل پڑے اور دوسرے

دن مولانا نعمانی کے ہمراہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی اور ان کے ہمراہ بہت سے پرجوش مسلمان آدری اس وقت پہونچے جب دن کا اجلاس چل رہا تھا اور اسٹیج پر مولوی حشمت علی صاحب تقریر کر رہے تھے۔

مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی اپنی جرأتِ حق اور بے باکی گفتار کے لیے پورے ضلع میں مشہور تھے اپنے کچھ آدمیوں کو ہمراہ لے کر جلسہ گاہ میں پہونچ گئے اور اسٹیج پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ مجھے بھی کچھ کہنا ہے، اس وقت اسٹیج پر مولوی نعیم الدین صاحب مرادآبادی بیٹھے ہوئے تھے اور مولوی حشمت علی صاحب تقریر کر رہے تھے، وہ چپ ہو گئے تو پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا، اسٹیج سے ایک نوجوان مولوی نے کہا کہ بغیر صدر کی اجازت کے آپ کو بولنے کا کوئی حق نہیں، آپ نے کڑک کر پوچھا کون صدر ہے؟ صدر نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اس جلسہ میں کسی دوسرے کو بولنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، آپ نے فرمایا کہ اگر آپ یہاں میری بات نہیں سنتے تو ہم کوٹ کی مسجد میں بعد نماز ظہر ان تمام باتوں کا جواب دیں گے جو جلسہ میں کہی گئی ہیں آپ سب اس میں شریک ہوں اور میں ان تمام علماء کو جو اسٹیج پر ہیں ان کو مناظرہ کا چیلنج دیتا ہوں، اگر بغیر مناظرہ کے قصبہ سے چلے گئے تو ان کا فرار سمجھا جائے گا، یہ گرم گرم الفاظ آپ نے مخالفین کے مشتعل مجمع میں کہے اور چلے آئے جبکہ فساد کا زبردست اندیشہ پیدا ہو چکا تھا لیکن موصوف بلا جھجک اپنی بات کہہ کر اپنے آدمیوں کے ساتھ قیامگاہ پر آ گئے۔

مولوی نعیم الدین صاحب کا فرار:- قصبہ میں یوسف زئی نسل کے خان برادری کے لوگ بھی بستے ہیں انہوں نے مولانا موصوف کے چیلنج کو اپنے وقار کا سوال بنا لیا اور تہیہ کر لیا کہ یہ مناظرہ ہونا چاہیے، مولوی نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے کہا کہ مجھے مرادآباد پہونچنا ضروری ہے، اس لیے بارہ بجے کی ٹرین سے میں جاؤں گا، ان لوگوں نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی کہ آپ کے چلے جانے سے ہماری رسوائی ہوگی آپ کو رکنا ہوگا، لیکن وہ بضد رہے اور ٹرین کے وقت اسٹیشن پہونچ گئے، ٹرین آئی اور سوار ہو کر سکون کی سانس لی،

مولوی حشمت علی صاحب کو روک لیا گیا، پھر ایک باغ میں بالمقابل دو اسٹیج بنائے گئے اور بیچ میں صدر کی کرسی رکھی گئی اور قصبہ کی ایک معزز شخصیت مولانا عصمت اللہ صاحب ادروی مرحوم کی صدارت میں متنازع فیہ مسائل پر تین دنوں تک مسلسل مناظرہ چلتا رہا ادری اس زمانہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، وہ آدمیوں کا جنگل بن گیا ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، پورا ضلع اُمڈ آیا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے مہذب اور شریفانہ طرز گفتگو اور سنجیدہ مدلل انداز بیان نے نفسیاتی اثر ڈالا اور سنجیدہ طبقہ متاثر ہوا، مولوی حشمت علی صاحب کے جھنجلائے ہوئے انداز بیان اور غیر سنجیدہ طرز گفتگو نے عوام کو بھی بددل کر دیا جو مسائل کی گہرائیوں سے واقف نہیں تھے انہوں نے بھی دل میں فیصلہ کر لیا کہ حق کس طرف ہے، کئی سوالات علماء حق کی طرف سے ایسے ہوئے جن کا جواب مولوی حشمت علی صاحب کے پاس نہیں تھے جس کی وجہ سے وہ بار بار موضوع سے ہٹ کر واہی تباہی گفتگو کرنے لگتے اور تلخ و ترش لب و لہجہ اختیار کرنے لگے تھے، جس کا اثر عوام و خواص پر ان کے خلاف جاتا تھا، تیسرے دن مولوی حشمت علی صاحب نے اپنے ہم نواؤں سے کہا کہ اب مناظرہ بند کرا دیا جائے تو بہتر ہوگا انہوں نے حلقہ کے تھانے دار سے مل کر اس کو آمادہ کر لیا، اس نے نقض امن کا اندیشہ بتلا کر مناظرہ بند کرا دیا۔

حق و باطل کے درمیان حدِّ فاصل :-

اس مناظرہ کا اثر پورے ضلع اعظم گڈھ پر پڑا اور ضلع کی اکثریت جو اب تک بدعات و خرافات کے سیلاب میں بہی جا رہی تھی اس کے سامنے حق روشن ہو کر آگیا علماء حق کی تقریروں کو سن کر ان کو یقین کامل ہو گیا کہ حق علماء دیوبند کے ساتھ ہے پھر پورے ضلع کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں انقلاب آگیا اور ضلع کی مسلم اکثریت نے تمام بدعتوں کو اپنی زندگی کے ایک ایک گوشہ سے نکال پھینکا، پھر علماء نے پورے ضلع میں عظیم الشان دینی مدارس ہر قابل ذکر شہر اور قصبہ حتی کہ گاؤں میں بھی جاری کر دیئے اور جو پہلے سے قائم تھے ان کو ترقی دی اور ان کے دائرۂ کار کو پھیلایا اور بڑھایا، یہ مدارس اہل حق کا قلعہ بن کر پوری جرأت اور پوری شان کے ساتھ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ

ادا کر رہے ہیں، ہزاروں فضلاء دیوبند و سہارنپور وغیرہ آبادی آبادی میں پھیل گئے ہیں، ضلع میں کچھ مسلمانوں کی تعداد ضرور ایسی ہے جو اپنے آباء و اجداد کے رسم و رواج کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے اور آج تک ان کے پاس حق کی روشنی نہیں پہونچ سکی ہے لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرًا۔

مناظرہ بریلی:۔ میں نے بطور مثال صرف ایک مناظرہ کا ذکر کیا جبکہ درجنوں علماء حق ہندوستان کے کونے کونے میں سیکڑوں کی تعداد میں مناظرے کیے اور ہر جگہ جاکر باطل کو للکارا ہے کیونکہ جہاں کی بھی روداد مناظرہ آپ پڑھیں گے تو وہی "حسام الحرمین" کا سبق دُہراتے سنائی دیں گے اور جب علماء حق ان کا دلائل و براہین سے رد کردیں گے تو پھر وہ دوبارہ وسہ بارہ انھیں کو دُہرائیں گے، علمی مسائل اور دقیق علمی بحثوں اور مشرکانہ رسم و رواج کے جواز و عدم جواز کی بحث وہ نہیں آنے دیتے تھے کیونکہ اس کے لیے علم کی ضرورت اور دقیق علمی مباحث کو سمجھنے کے لیے جب صلاحیت و استعداد اور ذہانت و ذکاوت کی ضرورت تھی وہی دولت ان کے پاس نہیں تھی، اس لیے میں ان تمام مناظروں کی نشان دہی کو غیر ضروری سمجھتا ہوں جو مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی، مولانا ابوالوفاء صاحب شاہ جہاں پوری، علامہ نور محمد صاحب ٹانڈوی، مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی، مولانا اسعد اللہ صاحب مظاہری، مولانا ارشاد احمد صاحب فیض آبادی، مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی (اعظم گڈھ) اور دوسرے اکابر نے مختلف شہروں میں کیے ہیں، میں صرف رضاخانیت کے قلعہ اور مولوی احمد رضا خاں صاحب کے گھر کے ایک مناظرہ کی مختصر روداد سنا کر یہ بے کیف کہانی ختم کردینا چاہتا ہوں، اسی سے آپ یہ سمجھ جائیں گے کہ فریق مخالف جب فرار کی کوئی سبیل نہیں پاتے تھے تو کیسی اوچھی حرکتیں کرتے تھے، اس زیر بحث مناظرہ کے انجام سے آپ سمجھ جائیں گے، بریلی کے اس مناظرہ میں علماء حق کا نمائندہ ایک پچیس سالہ جوان ہے جس کا نام مولانا محمد منظور نعمانی ہے اور بفضلہ تعالیٰ ابھی حیات ہیں۔

مناظرے کی راہ کیوں اختیار کی؟:- مولانا موصوف نے اس فتنۂ تکفیر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اپنے ایک تحریری بیان "فیصلہ کن مناظرہ" نامی رسالہ میں لکھا ہے، یہ بیان اس وقت انہوں نے قلمبند کیا تھا جب لاہور میں ایک ایسی مجلس مناظرہ منعقد کیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا جس کے حکم ڈاکٹر اقبال، علامہ اصغر روحی اور شیخ صادق حسین بیرسٹر ایٹ لا میں بیرسٹر منتخب کیے گئے تھے تاکہ یہ تحریر ثالث کے سامنے پیش کردی جائے، مگر اہل بدعت نے بہانے بنا کر اس مناظرہ سے فرار اختیار کیا، بعد میں اسی تحریری بیان کو "فیصلہ کن مناظرہ" کے عنوان سے آپ نے شائع کرایا۔ مولانا موصوف اس بیان میں لکھتے ہیں:-

"اس عاجز راقم السطور نے اسی سال دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث ختم کیا تھا اور حسن اتفاق سمجھئے یا سوء اتفاق کہ میرے وطن سنبھل اور اور قرب وجوار میں اس وقت اس فتنے کے شعلے بھڑک رہے تھے، حالات کا تقاضا بھی تھا اور جوانی کے جوش کو بھی اس میں ضرور کچھ دخل تھا کہ اس آگ کو بجھانے اور اس کے لگانے والوں کا آخری حد تک مقابلہ اور تعاقب کرنے کا فیصلہ کرلیا، پھر قریباً دس سال تک اپنے دوسرے کاموں درس وتصنیف کے ساتھ یہ شغل بھی سرگرمی سے جاری رہا اور یہاں بغیر کسی تواضع اور انکسار کے اس کا ذکر کردینا ہی مصلحت ہے کہ اپنے نزدیک کوئی کسر باقی نہیں رکھی، جہاں ضرورت معلوم ہوئی وہاں خود پہونچ کر اور گھیر گھیر کر تکفیر کے ان علمبرداروں سے مناظرے کیے اور ان کے دعوؤں کی تردید میں چھوٹے بڑے مستقل رسائل بھی لکھے جن کی تعداد چالیس پچاس سے کم نہ ہوگی بلکہ اب سے اکیس سال پہلے ۱۳۵۳ھ میں جب الفرقان جاری ہوا تھا تو اس کا خاص موضوع اس وقت اسی فتنہ کا مقابلہ تھا۔"[1]

---

[1] "فیصلہ کن مناظرہ" مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی ص ۲۲ و ۲۳

دل میں اُمنڈتے ہوئے انھیں جذبات نے ان کو یہ جرأت بخشی کہ انہوں نے بریلی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کرلیا، اور بریلی پہونچ گئے، ان کا "الفرقان" بھی یہیں سے نکلنے لگا، اور اہل بدعت کو ان کے قلعہ میں شکست دینے کا جو عزم تھا اس کا بھی وقت آہی گیا،

جامعہ رضویہ بریلی میں مناظرہ:- مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا رضا خانی جماعت سے مناظرہ، ان کے اپنے قلعہ جامعہ رضویہ بریلی میں ۲۰ محرم ۱۳۵۴ھ سے ۲۳ محرم ۱۳۵۴ھ تک چار دن مسلسل چلتا رہا، رضا خانیوں کی طرف مناظر مولوی سردار احمد خاں گورداسپوری تھے جو جامعہ رضویہ بریلی کے صدر مدرس تھے۔

یہ مناظرہ ان حالات میں ہو رہا تھا جب تین ماہ سے مولوی حامد رضا خاں صاحب خلیفہ مولوی احمد رضا خاں صاحب اور مولانا منظور نعمانی کے درمیان تحریری مناظرہ چل رہا تھا اور مولانا نعمانی نے اعلان کیا تھا کہ اگر میرے سوالات کے جوابات تین ماہ کے اندر مجھے نہیں ملے تو ان کی شکست کا اعلان کر دیا جائے گا، اس دوران پورے شہر میں علمار حق کے خلاف نفرت اور غم وغصہ کی فضا بنائی جاتی رہی، بریلی شہر کے ایک تاجر لکھنؤ میں رہتے تھے، ان کے بھائی مولانا نعمانی کے قریب ہوگئے اور انہوں نے بدعات وخرافات سے توبہ کرلی تو تاجر بھائی سے کہا گیا کہ تم اپنے بھائی سے قطع تعلق کرلو کیونکہ مولوی اشرف علی تھانوی کافر ہے وہ اس کو مسلمان سمجھتا ہے، ایسے شخص کا نکاح باطل ہوجاتا ہے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے اس لیے ان کا وہابیوں کے پاس جانا، ان کی تقریریں سننا سب گناہ کا کام ہے، اور یہ بار بار ان کے حلقے میں دُہرایا جاتا تھا اس لیے بریلی کے عوام علمار حق سے دور رہتے اور ان کے خلاف ان کے دلوں میں غم وغصہ بھرا ہوا تھا، اس کے باوجود مولانا نعمانی نے حامد رضا خاں کو مناظرہ کی دعوت دے دی لیکن انہوں نے خود مناظر بننے کی ہمت نہیں کی اور اپنے مدرسہ کے صدر مدرس مولوی سردار احمد خاں گورداس پوری کو مناظرہ کے لیے تیار کیا

اور مقام مناظرہ خود ان کا مرکز جامعہ رضویہ بریلی قرار پایا، جبکہ حالات کے لحاظ سے ان کے قلعہ میں گھسنا خلاف مصلحت تھا لیکن ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

دین کا جوش، علمائے حق کی حمایت دین و شریعت کی حفاظت کا جذبہ جب کسی دل میں شعلہ جوالہ بن جاتا ہے تو اس کے نزدیک مصلحت اندیشی اور عاقبت بینی پادر ہوا ہو جاتی ہے اور ایسا مؤمن کامل خطرات کی پروا نہیں کرتا، مولانا نعمانی نے بلا جھجک جامعہ رضویہ جانا تسلیم کر لیا۔

موضوع مناظرہ:۔ مولانا نعمانی نے ہر چند چاہا کہ ان کے منتخب کردہ موضوع "عبارت حفظ الایمان" کے علاوہ بھی کچھ موضوع رکھے جائیں مگر فریق مخالف اس کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوا، اس لیے دائرہ گفتگو اسی موضوع پر محدود رہا، چاروں دن تک یہ مناظرہ چلتا رہا، ہر سوال کا مسکت جواب دے کر جب ان پر سوال قائم کر دیا تو اس کے جواب سے دامن بچانے کی کوشش شروع ہو جاتی، پورے ایک سو دس صفحات کی روداد اور چاروں دن کے سوال و جواب اور تقریریں دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اہل بدعت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ حدیث و قرآن سے دلائل دیتے رہیے اور اپنے مدعا کو ناقابل تردید بنا کر پیش کر دیجیے مگر اُسے کبھی خاطر میں نہیں لائیے اور جب وہ کھڑے ہوں گے تو پھر یہی فرمائیں گے کہ آپ میری بات کا جواب نہیں دیتے، پھر اعتراض سن لیجیے، اور حفظ الایمان کی درجنوں بار سنائی ہوئی عبارت پھر پڑھنا شروع کر دیں گے اور کچھ طعنہ و تشنیع اور کچھ طنز کی باتیں کہہ کر عوام کو ہنسانے کی کوشش کریں گے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس علم نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے یہاں تک کہ جب علماء دقیق علمی بحثیں اٹھاتے ہیں تو شاید اُن میں ان کے سمجھنے کی بھی صلاحیت و استعداد نہیں ہوتی یا دوسری صورت یہ ہے کہ ان کا دل تو ان دلائل کو قبول کر لیتا ہے لیکن زبان سے اقرار کرنے میں ذلت و رسوائی محسوس ہوتی ہے اس لیے صداقت و دیانتداری کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال کر صرف ہوائے نفس پر عمل کرتے ہیں اور جب علماء حق کوئی

ایسی گرفت کرتے ہیں جن کا انھیں دو ٹوک جواب دینا ہے اور اس جواب میں ان کو اپنی ہوا خیزی یقینی نظر آتی ہے تو کوشش کرتے ہیں کہ کوئی بہانہ ہاتھ آجائے تو عوام کو ورغلا کر دنگا فساد کرا دیا جائے، اس کے ثبوت میں بریلی کے اس مناظرے کے آخری دن کی کاروائی پیش کی جاتی ہے، رضاخانی مذہب کے مناظر مولوی سردار احمد گورداسپوری کی آخری تقریر یہ ہے:۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ، آپ حضرات نے دیکھ لیا کہ مولوی منظور صاحب نے اقرار کر لیا کہ چونکہ مجھ کو فاتحہ کا حلوا نہیں ملتا اس لیے میں کم بخت ہوں، معلوم ہوا کہ جس کو فاتحہ کا حلوا نہ ملے وہ کم بخت ہوتا ہے، اب تو مولوی منظور صاحب نے اپنے کم بخت ہونے کا اقرار کر لیا، درحقیقت جو فاتحہ کے حلوے سے محروم ہے وہ سب کم بخت ہیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ قادیانیوں کی طرح آیتیں پڑھ پڑھ کر مسلمانوں کو دھوکا مت دیجئے، مجھے بتلایئے کہ "حفظ الایمان" کی وہ ملعون عبارت کس آیت کا ترجمہ ہے۔[1]

مولانا نعمانی کا جواب باصواب:۔ مولانا نعمانی نے فرمایا کہ عبارت کا مطلب چار دنوں سے مسلسل آپ کو بتا رہا ہوں اور پھر آپ نے قرآن کی ایک آیت پیش کر کے مسئلہ کو واضح کیا اور اس کے بعد آپ نے مولوی سردار احمد خاں کے طنز کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"بے شک مجھ کو چڑھاوے کا حلوا نہیں ملتا، اور آپ کے اصول پر میں کم بخت ہی ہوں، آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو چڑھاوے کا حلوہ ملتا ہے..... مگر خدا کی قسم جس قدر آپ کو اپنے حلوے پراٹھے پر، بالائی اور فیرینی پر، گوشت بھری کچوریوں پر اور سوڈے کی بوتل پر ناز ہے اس سے بدرجہا زیادہ مجھے اپنی فاقہ کشی پر ناز ہے کیونکہ وہ میرے آقا صلی اللہ

---

[1] فتح بریلی کا دل کش نظارہ ص ۱۰۷

علیہ وسلم کی سنت ہے، میں بھی بھوکا رہتا ہوں میرے آقا بھی بھوکے رہتے تھے، خدا میرا حشر انھیں کے ساتھ کرے۔[1]

تنگ آمد بہ جنگ آمد:- مولانا نعمانی کی تقریر یہیں تک پہونچی تھی کہ رضا خانی جماعت کے صدر مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کھڑے ہوگئے اور شور مچانا شروع کر دیا کہ توبہ کرو توبہ کرو، حضورؐ کو بھوکا کہدیا، تم مرتد ہوگئے، تم واجب القتل ہو،

علماء حق کی طرف سے صدر حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی تھے انہوں نے ان کے صدر کی نیت کو سمجھ لیا کہ وہ فساد کرانا چاہتے ہیں تو ان سے گرم لہجہ میں کہا، آپ صدر ہیں اپنی ذمہ داری کو محسوس کیجئے، ورنہ کوئی ہنگامہ ہوگا تو اس کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی، مگر اس سرزنش اور تنبیہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، اس کے بعد کا واقعہ رُوداد مناظرہ کے مرتّب مولانا رفاقت حسین صاحب فاروقی مقیم بریلی کی زبان سے سماعت فرمایئے وہ بتاتے ہیں کہ:-

> مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی یہ کارروائی وقتی نہیں تھی بلکہ کسی خاص سازش اور باہمی مشورہ کے تحت تھی، کہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی کے اس انتباہ کے بعد بھی وہ باز نہیں آئے بلکہ اب ان کے ساتھ ان کا سارا پلیٹ فارم کھڑا ہوگیا، اور سب نے یہی شور مچانا شروع کر دیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوکا کہہ دیا، تم مرتد ہوگئے، تم واجب القتل ہو، ابھی توبہ کرو، جب رضا خانی پلیٹ فارم سے سب نے یہی آواز بلند کی تو رضا خانی غنڈوں کے ایک جتھے نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور آپ کے رفقاء پر حملہ کرنا چاہا لیکن اہل سنت کی ایک کثیر جماعت نے جیسے ہی صورت حال کو نازک ہوتے دیکھا، اپنے علماء

---

[1] فتح بریلی کا دلکش نظارہ ص ۱۰۸

کرام کو ایک زبردست حصار میں لے لیا اور اسی حفاظت کے ساتھ مقام مناظرہ سے باہر لائے، اور رضاخانیوں نے اس طرح ہنگامہ و فساد برپا کرکے مناظرہ ختم کردیا۔ [1]

فریق مخالف کی یہ حرکت مذبوحی دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ "تنگ آمد بہ جنگ آمد" جب شکنجہ میں کسے گئے تو اس سے نجات کی یہی صورت اختیار کی گئی، رضاخانی صدر کا جملہ ان کی پوری سازش کو بے نقاب کرتا ہے، اس کا مقصد مولانا نعمانی کے قتل پر لوگوں کو انگیز کرنا تھا، اسی لیے وہ بار بار واجب القتل کے لفظ کو دُہرا رہا تھا، مگر خدا کو ابھی اُن سے دین کا بہت کام لینا تھا اس لیے دشمن کچھ نہ کرسکے، ع

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی ترست

بے نتیجہ داستان:۔ پندرہ بیس برسوں تک مناظروں کی خوب گرم بازاری رہی لیکن نتیجہ کے لحاظ سے یہ تضییع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں تھا، کیونکہ ہر جگہ مناظرہ کا انجام فتنہ و فساد ہوتا یا درپردہ پولیس سے سازباز کرکے وہ مناظرہ بند کرانے میں کامیاب ہوجاتے اور فتح کا پوسٹر پہلے سے چھپا ہوا رکھا رہتا تھا اُسے پورے ملک کے رضاخانی مرکزوں میں بھیج دیا جاتا تھا، ان مناظروں کا صرف ایک فائدہ تھا کہ جو لوگ بدعات و خرافات میں مبتلا تھے اور لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی پابندی کرتے تھے، لیکن وہ مخلص تھے، صحیح راہ کی طلب ان کے دلوں میں موجود تھی اور وہ جب علماء حق کی بحثوں کو سنتے اور ان خرافات کے خلاف شرع ہونے کا ان کے دلوں میں یقین پیدا ہوجاتا تھا وہ صراطِ مستقیم پر آجاتے تھے، مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا فرقہ بندی کے حصار سے نکلنا بہت آسان نہیں تھا مناظروں سے کہیں زیادہ انفرادی افہام و تفہیم اور خالص دینی وعظوں سے جو ذہنی انقلاب پیدا ہوتا تھا وہ مناظروں سے کبھی نہیں پیدا ہوا اسی لیے مناظروں کی اس کہانی کو میں بے نتیجہ کہتا ہوں ورنہ

---

[1] فتح بریلی کا دلکش نظارہ ص ۱۰۹

صرف مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دامت برکاتہم، مولانا ابوالوفاء صاحب شاہ جہاں پوری مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا نور محمد ٹانڈوی اور مولانا محمد اسمٰعیل کے ہی مناظروں کی روداد اور حالات لکھے جائیں تو کئی جلدوں کی کتاب تیار ہو جائے اور سوائے تکرارِ مضامین کے اور کچھ حاصل بھی نہیں ہوگا۔

مناظروں کے علاوہ رَدِّ بدعت پر اُن گنت کتابیں لکھی گئیں جن کی پوری فہرست مرتب کرنی بھی ممکن نہیں، ایک ایک لکھنے والے کی درجنوں کتابیں ہیں، صرف مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی چالیس پچاس کتابوں سے کم نہیں ہیں، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کی تصانیف کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ مولانا نور محمد ٹانڈوی کے دلِ چسپ رسالوں کی تعداد بھی قابلِ ذکر ہے جو رَدِّ بدعت کے سلسلہ میں اپنے طنز و مزاح اور ظریفانہ اندازِ بیان کی وجہ سے خاصے کی چیز ہے، دوسرے اہلِ قلم بھی آج تک برابر رضاخانیت پر لکھتے جا رہے ہیں، ادھر دس سالوں میں اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اس تھوڑی مدت میں اتنا لٹریچر جمع کر دیا گیا کہ اس سے پہلے ابتدائی دَور میں اتنی تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہوں گی۔

اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، چوں کہ بدعت کی حمایت میں ایک پورا فرقہ وجود میں آچکا ہے جس کو عرفِ عام میں رضاخانی کہا جاتا ہے اس لیے بدعات و خرافات کو دین سمجھ کر اور کارِ ثواب مان کر اختیار کرنے والوں کی اجتماعی اصلاح ممکن نہیں، ان کے اپنے مدارس ہیں، ان میں ہر طرح کے کارکن تیار کیے جاتے ہیں جو اُن علاقوں میں کام کرتے ہیں جہاں جہالت ہے، دین سے بے خبری ہے اور وہ وہاں جاکر ان بدعتوں کو دین کا سرٹیفکٹ دے دیتے ہیں خود بھی ان کے سارے رسم و رواج میں شریک ہوتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد سے چلے آرہے طور طریقوں اور رسم و رواج پر قائم رہیں، اسی میں ان کے کارکنوں کی بھی زندگی ہے اور ان کے علماء کے لیے بہترین چراگاہ بھی، قبر پرستی، عرس، میلے ٹھیلے، چادر گاگر، قوّالی، مزارات پر ہجوم کا یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک دینی تعلیم گھر گھر تک نہیں پہونچ جاتی ہے۔

ان بدعات وخرافات کو مٹانے کے لیے سب سے اہم کردار علماء حق کے قائم کردہ مدارس ہی انجام دے سکتے ہیں، خدا کے فضل سے ہر سال ہزار ڈیڑھ ہزار فضلا ہمارے مدارس سے سندِ فضیلت لے کر نکلتے ہیں وہ اسی ہندوستان کے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں رہتے ہیں وہ اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اصلاحی مشن کو کم وبیش جاری رکھیں گے تو ایک دن وہ ضرور آئے گا جب اسلام کو دینِ خالص کی شکل میں ہندوستان کی سرزمین میں پھلنے پھولنے کا موقعہ آئے گا۔ وما ذالك على الله بعزيز۔

باب (۱۴)

دعوت و تبلیغ

دعوت و تبلیغ

جب خرافات کو دین کی سند دے دی جائے اور بدعات کو اہل علم کی حمایت و تائید حاصل ہو جائے تو اُن کا مٹانا ایک مشکل کام بن جاتا ہے، عدالتوں میں اپنے جھوٹے سے جھوٹے مقدمہ میں فیس دے کر ایک وکیل کر لیجئے، وہ عدالت میں مقدمہ کی سچائی پر سالہا سال بحث کرتا رہے گا، شہادتیں پیش کریگا گواہیاں دلوائے گا، اور حلف نامہ داخل کرے گا اور کبھی بھی ایسی غلطی نہیں کرے گا کہ اس جھوٹے مقدمہ کے کسی ایک پہلو پر بھی غیر واقعیت کا اعتراف کرے، تا آنکہ عدالت اپنے تدبر و فراست سے کام لے کر اس کے خلاف فیصلہ کر دے، وکیل خوب جانتا ہے کہ مقدمہ جھوٹا ہے اور جھوٹا سمجھ کر سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اس کو فیس مل چکی ہے، وہ حق نمک ادا کرتا ہے۔

کچھ یہی حال علماء حق کی تکفیر کرنے والوں اور "حسام الحرمین" کے فتووں کو شہرت دینے والوں کا تھا، علماء حق اس کے جواب میں بلا مبالغہ اب تک ہزاروں کتابیں، رسالے اور کتابچے لکھ چکے ہیں اور ہزاروں جلسوں اور اجتماعات میں حقیقتِ واقعہ کو کھول کھول کر بیان کر کے فریب کا پردہ چاک کر چکے ہیں، جن فاسد عقائد کا الزام لگایا گیا اس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا بلکہ اس طرح کے عقیدے رکھنے والوں کو خود بھی خارج از اسلام کہا، لیکن ان تمام باتوں کا رضا خانی جماعت نے کوئی اثر نہیں لیا اور ستر برس سے رٹے ہوئے طوطے کی طرح سے تم کافر ہو، تم کافر ہو، اپنے پھیپھڑے اور

گلے کی پوری طاقت سے چیخ چیخ کر کہتے چلے آرہے ہیں، نہ دنیا میں ان کو رسوائی کا ڈر، نہ عذاب آخرت کا ان کو خوف، یہاں تک کہ ان کو کافر گری کا ہسٹریا ہوگیا اور ہندوستان کے تمام ممتاز علماء، مصنفین، زعماء، رہنما، اداروں کے سربراہ، تمام مذہبی وسیاسی جماعتوں کے ارکان، شیوخ حدیث ومشائخ کو کافر بنا ڈالا "تجانب اہل السنۃ" جو لاہور کے حزب احناف کے رکن مولوی ابوالطاہر محمد طیب صاحب نے مرتب کی ہے اور مولوی حشمت علی صاحب نے اس کی تصدیق کی ہے اس میں کافروں کی مردم شماری کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بسنے والا کوئی مسلمان کافروں کی اس فہرست میں درج ہونے سے نہ رہ جائے، شاید دین کو انہوں نے ایک مذاق سمجھ رکھا ہے اور جو زبان پر آئے اسے بک دینے پر مؤاخذہ کرنے والا کوئی خدا نہیں ہے۔

اصلاح کی دوسری راہیں:- اس صورت حال نے علماء حق کو اس یقین کرنے پر مجبور کر دیا کہ بحث ومناظرہ کی راہ سے ان کی اصلاح اب ناممکن ہوچکی ہے، سوئے ہوئے کو جگایا جاسکتا ہے، جو سونے والوں کی طرح آنکھیں بند کیے پڑا ہے اس کو جگانا مشکل ہے اس لیے اکابر علماء نے اس طریقہ کار کی بے اثری کو دیکھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اصلاح وتبلیغ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے انہوں نے دوسری راہیں اختیار کیں، ان میں سے دو راہیں پورے یقین واعتماد کے ساتھ منزل تک پہونچانے والی سمجھی گئیں، ایک تو عوام سے جہالت کو دور کرنا اور ان کو زیادہ سے زیادہ دینی تعلیم دینا، اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی ہر قابل ذکر آبادی میں دینی تعلیم کے لیے مدرسہ کھولا، دینی تعلیم کے نصاب بنائے، نصاب کی کتابیں لکھیں، پرائمری درجات سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک دین وشریعت کی صحیح تعلیم دینے کا التزام کیا، یہ کام اگرچہ ایک صدی سے جاری ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے اب بھی ناکافی تھا اس لیے آزادی کے بعد سے اس کام میں اور تیزی پیدا کردی گئی اور آج صرف اتر پردیش اور صوبہ بہار میں کچھ کم وبیش ایک ہزار مدارس دینیہ اور مکاتب

اسلامیہ دینی تعلیم کے فروغ میں لگے ہوئے ہیں، دوسرے صوبوں میں بھی کام ہو رہا ہے لاکھوں قوم کے بچے دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، بڑے بڑے مدارس میں دورۂ حدیث جاری کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا اور اندازہ یہ ہے کہ صرف اتر پردیش کے بڑے مدارس سے تقریباً ایک ہزار فضلاء ہر سال مدارسِ اسلامیہ سے سندِ فضیلت لے کر نکل رہے ہیں اور بلا مبالغہ ان دینی مدارس پر قوم کروڑوں روپے سالانہ خرچ کر رہی ہے، اس جدوجہد سے ہر قابلِ ذکر آبادی میں اہلِ علم اور دین سے صحیح واقفیت رکھنے والے پیدا ہوتے جا رہے ہیں اور اب ان کی اتنی بڑی تعداد اصلاح کے کام میں لگی ہوئی ہے کہ ان کی فہرست مرتب کرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے، پورے ہندوستان میں علماء حق کی جدوجہد سے چھوٹے بڑے جتنے مدارس و مکاتب کھولے گئے ہیں اب تک ان کی کوئی جامع فہرست تیار نہیں ہو سکی ہے اس کے علاوہ پاکستان میں علماء حق کے تین بڑے اور مرکزی مدارس کے علاوہ بہت سے دینی مدرسے دبستانِ دیوبند کے قابلِ احترام علماء کی نگرانی میں کھولے گئے اور کامیابی کی منزلیں طے کر رہے ہیں اور دینی تعلیم کے لیے علماء حق کے جاری کردہ انھیں دینی مدارس پر اعتماد کیا جاتا ہے کچھ ایسا ہی حال بنگلہ دیش کا ہے، متحدہ ہندوستان میں علماء حق نے جتنے قلعے اسلام کی حفاظت کے لیے بنائے تھے تقسیم ملک کے بعد ہر جگہ ان اسلامی قلعوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے، اور آج ان تینوں ملکوں میں علماء حق کی جدوجہد کا ثمرہ دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہے اور خدا نے ان کو جو مقبولیت و عظمت اور ان کی زبانوں میں تاثیر دی ہے اس کے نتیجہ میں بڑے سے بڑے مسائل کو حل کر لیتے ہیں اور اہم سے اہم تحریک کو منزل تک پہونچا دیتے ہیں، اس کی تازہ مثال پاکستان میں قادیانی فرقہ کو "غیر مسلم اقلیت" قرار دینے کی تحریک صرف دبستانِ دیوبند کے علماء کی قیادت میں منزلِ مقصود تک پہونچی۔

اصلاح کا دوسرا طریقہ:۔ اصلاح کا دوسرا طریقہ کار براہ راست عام مسلمانوں تک پہونچ کر فرداً فرداً انتہائی تواضع اور انکسار کے ساتھ ان سے دین کی راہوں پر لگ جانے کی درخواست کرنا، کلمہ سکھانا، نماز کا پابند

بنانا، اللہ کی راہ میں وقت اور مال خرچ کرنے کا ان میں حوصلہ پیدا کرنا، یہی کام دبستانِ دیوبند کی ایک مقدس جماعت انجام دے رہی ہے جس کو عام مسلمانوں کی زبان میں تبلیغی جماعت کہا جاتا ہے۔

تبلیغی جماعت کے کارناموں کی داستان بڑی ایمان افروز ہے، کس طرح اس کی تشکیل ہوئی؟ کن حالات میں اس نے دین و ملت کی خدمات انجام دیں؟ اور کیسے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے اس کا تفصیلی علم ہی ہر انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کام کا آغاز کتنے خلوص، کتنی للّٰہیت، دل کے کتنے سوز و گداز اور کتنی دین کی تڑپ اور اضطراب کے ساتھ کیا گیا، یہی اس جماعت کے خلوص، نیک نیتی، اللہ کے نزدیک اس کے کاموں کی مقبولیت کی دلیل ہے، اس کے اثرات و نتائج بتاتے ہیں کہ خدا نے اس جماعت کو اپنے دین کو پھیلانے کے لیے خاص طور سے منتخب کرلیا ہے اس کے دائرۂ کار کی وسعت کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ خدا نے اس جماعت کو بطورِ خاص دین کی اشاعت کے کاموں میں لگایا ہے اور راستے کی مشکلات کو دُور کرنے اور غیبی سہولتیں فراہم کرنے کا فیصلہ قضا و قدر نے کرلیا ہے۔

دعوت و تبلیغ کا یہ مقدس کام بستی نظام الدین دہلی کی ایک چھوٹی سی مسجد بنگلہ والی مسجد سے اس کا آغاز ایک انتہائی کمزور جسم والا انسان کرتا ہے اور چند سالوں میں وہ اُسے اتنی طاقتور بنا دیتا ہے کہ اس کے عزم و ارادے کے سامنے ہندوستان کی فضا تنگ ثابت ہونے لگی، اس کی پرواز کے لیے اور بھی وسعتوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی، خدا نے اس کے بانیوں کی نیک نیتی اور خلوص کو دیکھ کر اپنی شفقتوں، عنایتوں اور رحمتوں کا دروازہ ان پر کھول دیا اور ان کو ان علاقوں تک پہونچا دیا جہاں پچاس سال پہلے ان کے طائرِ فکر کی بھی پرواز ممکن نہ تھی، یہ روح پرور اور ایمان افروز داستان تفصیل چاہتی ہے، اس جماعت کے محیر العقول کارناموں کا تقاضا ہے کہ اس کی تاریخ کو ایمان و یقین کی اس فضا میں سُنا جائے جو ہر مسلمان کے دل میں جاگزین رہنی چاہیئے اس لیے آیئے اور میرے ساتھ بستی نظام الدین دہلی کی اس چھوٹی سی مسجد بنگلہ والی مسجد چلیے، جہاں اللہ کا وہ

مقرب ومحبوب بندہ دین وشریعت کی ترویج کے لیے بنائے گئے خاکہ میں اپنے خونِ جگر سے رنگ بھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی :- یہ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے اس خانوادۂ علم وفضل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے یہاں کئی پشتوں سے علم وفضل چلا آرہا ہے اور اس خاندان میں مشاہیر علماء پیدا ہوئے جن کا تذکروں میں بڑا شاندار ذکر آتا ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحب مظاہر علوم سہارن پور سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری کے مشورے سے بستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی کی بنگلہ والی مسجد میں خدمتِ دین کے لیے دنیاوی علائق سے کٹ کر بیٹھ گئے، غربت وفلاکت ساتھ ساتھ قیام پذیر تھی، دین کا درد ملت کی بقاء کے لیے اضطراب اور بے چینی یہی سرمایۂ حیات تھا، خلقتاً بڑے لاغر اندام، نہایت دُبلے پتلے، لیکن سینہ میں دل مشکلات ومصائب کے تحمل کے لیے فولاد سے زیادہ مضبوط رکھتے تھے، ذہن درّاک اور اخّاذ، روشن اور تاب ناک، ایک عظیم الشان کام کی بنیاد ایک بنجر زمین میں ڈالی، اور خدمتِ دین کا پودا لگایا اور جب نخلِ اسلام کا ٹھنڈا اور گھنا سایہ دُور دراز ملکوں پر بھی پڑنے لگا تب لوگوں نے سمجھا کہ فراستِ مومن کا جوہر اس مردِ مومن میں پوری طرح موجود ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب نے تعلیم دین کے کام کا آغاز ایک ایسی قوم سے کیا جو اس مہذب دنیا میں بھی تہذیب وتمدن، اخلاق وشرافت، دین ودیانت کی کوئی ہلکی سی کرن بھی ان کی آبادیوں پر نہیں پڑی تھی، اس قوم کو میو یا میواتی کہا جاتا ہے، جو دہلی سے جانبِ جنوب ایک وسیع سرزمین میں آباد ہے تقریباً تیس لاکھ کی آبادی ہے وہ اپنے کو مسلمان کہتے تھے لیکن کسی رُخ سے بھی وہ مسلمان کہلائے جانے کے مستحق نظر نہیں آتے تھے، ان کے نام ماتا سنگھ، پرہلاد سنگھ، بھیم سنگھ جیسے ہوتے تھے، پوجا پاٹ پر اُتر آتے تھے تو دیوی دیوتاؤں اور بھوانی تک کی پرستش کر ڈالتے تھے، حد تو یہ ہے

کہ گوبر تک کی پوجا کرتے تھے، ان کے مراکز عقیدت اور عبادت گاہوں کے نام بھی ہندوانہ تھے مثلاً پانچ پیرا، بھیسا، چاہنڈ، کھیڑا دیو، مہادیوی، وہ ان پر قربانیاں چڑھاتے تھے، شب برات بھی مناتے تھے، سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا بھی اُٹھاتے تھے اور پوجتے تھے مرد دھوتیاں پہنتے اور عورتیں گھگھریا باندھتی تھیں، ان کی بود و باش، طور طریق موجودہ دور میں خانہ بدوش نٹوں جیسا تھا، عورت مرد کسی کو بھی دیکھ کر کوئی شخص ان کو مسلمان نہیں کہہ سکتا تھا بالکل یہی حال میو یا میواتیوں کا تھا۔

میو قوم کی اصلاح :- ایسی ہی بنجر زمین میں تبلیغ کا پودا لگایا گیا جس کی نشو و نما کا ظاہری اسباب کے تحت کوئی موقعہ نہیں تھا لیکن خدا جب اپنے کسی مخصوص بندے سے کام لینا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ میں لوہے کو بھی موم بنا دیتا ہے، پتھر کو بھی پگھلا دیتا ہے، سنگلاخ زمین کو سرسبز و شاداب رنگین و خوش نما پھولوں کا چمنستان بنا دیتا ہے، میو قوم کی اصلاح بھی اسی طرح کا ایک معجزہ تھا، لیکن یہ معجزہ اسباب و علل کی اسی دنیا سے وابستہ تھا اس کے لیے شب و روز کی جد و جہد، دلوں کا اضطراب، جسمانی مشقت و محنت، رات کے پچھلے پہر کی دعائیں سب نے مل کر ایک ساتھ کام کیا تب یہ معجزہ ظہور میں آیا،

آغاز کار میں میو قوم کے چند مزدوروں کو مسجد میں روک لیا گیا، روزانہ ان کی مزدوری دی جاتی رہی اور ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا، اُن کو صرف دین سکھایا جاتا رہا اور خاموشی کے ساتھ ان کے ذہن میں خدا و رسول کی عظمت و اہمیت، اسلام و ایمان کی حقیقت بٹھائی جاتی رہی، پھر کچھ دنوں کے بعد بتدریج از خود دلچسپی پیدا ہونے لگی، مزید تعلیم کے لیے ان کو مدرسوں میں بھیج کر ان کی تعلیم کو مکمل کرایا گیا۔

میو قوم کے دو تین با اثر افراد آپ کے والد محترم مولانا اسمٰعیل صاحب کاندھلوی کے زمانہ میں اصلاح پا چکے تھے، انھوں نے اپنے علاقوں اور اپنی قوم میں اصلاح کا کام شروع کر رکھا تھا مولانا محمد الیاس صاحب کو انھیں لوگوں میں سے چند مخلص میواتی اپنے علاقے میں لے گئے، اس سفر میں آپ نے ان علاقوں میں کئی دینی مکاتب قائم

کیے اور بچوں کو اس میں داخل کرنے کی میواتیوں کو ترغیب دی، مسلسل جدوجہد اور برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد میوات کے علاقے میں ایک سو کے قریب دینی مکاتب کھل گئے، لیکن جو اصلاح مدِّنظر تھی وہ حسب خواہ نہیں ہو رہی تھی، آپ اس قوم میں جو انقلاب لانا چاہتے تھے ابھی اس کا دُور دُور پتہ نہیں تھا، چونکہ یہ قوم اکھڑ، جفاکش، جَری اور بہادر ہے اگر وہ دین کی راہ پر لگ جائے گی تو جوہر قابل ثابت ہوگی، اس لیے آپ میوات میں عوامی انقلاب لانا چاہتے تھے، عام مذہبی و دینی بیداری ان میں پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان سے عالمی پیمانے پر مستقبل میں اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے جبکہ عام علماء اس کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اتفاق سے اس کا بھی موقعہ ۱۹۲۴ء میں آگیا۔

مولانا محمد الیاس صاحب کے ہاتھوں پر بہت سے لوگ بیعت کر چکے تھے اور مولانا کے والد کے زمانہ سے لوگ بستی نظام الدین میں بنگلہ والی مسجد میں دینی تربیت حاصل کرنے کے لیے آنے لگے تھے، اس لیے وہ لوگ مولانا کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ نے اس پہلو کو مدِّنظر رکھ کر پوری قوتِ ارادی کے ساتھ اس کام کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کر لیا کہ اس مہم کو عالمی پیمانے پر چلانا ہے اور دین کو پھیلانا ہے چاہے اس راہ میں زندگی کی آخری سانس بھی صَرف ہو جائے۔

- مورخہ ۲ راگست ۱۹۲۴ء کو قصبہ نوح ضلع گوڑگانوہ میں میو برادری کی ایک زبردست اور بہت بڑی پنچائت ہوئی جس کی صدارت مولانا محمد الیاس صاحب نے فرمائی، اس پنچائت میں پوری میو قوم کے تمام چودھریان اور سربرآوردہ افراد شریک ہوئے کہ اگر یہ پنچائت کسی بات پر متفق ہو جائے تو پوری قوم کو اس پر عمل کرنا ضروری ہو جائیگا اور اس کا پابند بنانا آسان ہو جائے گا، آپ نے اس پنچائت میں جو بنیادی باتیں منظور کرائیں اور شرکاء پنچائت سے فرداً فرداً دستخط لیے وہ نمبروار درج ذیل ہیں، ان میں سے ہر ایک سے ان پر عمل کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا اور حلف برداری ہوئی۔

(۱) کلمہ (۲) نماز (۳) تعلیم حاصل کرنا اور اس کی اشاعت کرنا (۴) اسلامی شکل و صورت (۵) اسلامی رسوم اختیار کرنا اور رسومِ شرکیہ کو مٹانا (۶) عورتوں کا پردہ (۷) اسلامی طریقہ

پر نکاح کرنا (۸) عورتوں کو اسلامی لباس پہنانا (۹) اسلامی عقیدے سے نہ ہٹنا اور کسی غیر مذہب کو نہ قبول کرنا (۱۰) ہر اجتماع اور جلسہ میں ذمہ داروں کا شریک ہونا (۱۱) دین کی تبلیغ کے لیے محنت اور کوشش کرنا وغیرہ وغیرہ پنچائت میں یہ بھی طے کیا گیا کہ تبلیغ صرف علماء کا کام نہیں بلکہ ہم سب کا فریضہ ہے، ہم اس کو انجام دیں گے۔

میو برادری کی یہ پنچایت ان کے دینی سفر کے لیے سنگ میل بن گئی، انہوں نے پنچایت میں طے شدہ امور کی پوری پابندی کی اور عملدرآمد شروع کر دیا جس کی وجہ سے پورے علاقہ میوات میں دینی انقلاب کی ایک تیز لہر آگئی، ہر چیز میں تبدیلی واضح طور پر نظر آنے لگی، معاشرہ میں انقلاب آفریں تبدیلی ہونے لگی، ذہن و مزاج، لباس، شکل و صورت، عورتوں کا رہن سہن، ہر چیز تیزی سے بدلنے لگی، دین کی تڑپ، مذہب سے وابستگی ان میں فداکارانہ حد تک پیدا ہوگئی۔

دوسرے سال جب ۱۹۲۵ء میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری میوات گئے تو اجتماع میں شریک ہونے والوں کا بیان ہے کہ فیروز پور میں مولانا موصوف کا جہاں قیام تھا، حدِ نگاہ تک انسانوں کا جنگل نظر آتا تھا،

جب علاقہ میوات کی اصلاح کا کام قابلِ اطمینان حد تک پہونچ گیا تو آپ نے اس قوم سے اس بڑے کام کے لینے کا تہیہ کیا جو آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا یعنی یہ لوگ اپنے گھروں سے اپنے اپنے خرچ پر نکلیں اور گھوم پھر کر تبلیغ کریں، اس کے لیے آپ نے سادہ سے صرف چھ اصول مرتب فرمائیے، اس کی پابندی ہر شخص کے لیے ضروری ہے جو بھی دین کی اس مہم میں شریک ہو۔

(۱) کلمہ کی تصحیح (۲) نماز کی تصحیح (۳) علم اور ذکر کی تحصیل (۴) اکرامِ مسلم (۵) تصحیح نیت (۶) تفریغِ وقت، ان چھ اصولوں کو حرزِ جان بنا کر دین کے لیے عملی جد و جہد، نقل و حرکت کرنا، دین کے لیے عارضی ترکِ وطن کرنا لازمی قرار دیا، یہی وہ نقشۂ عمل ہے جس پر تبلیغی جماعت آج عالمی پیمانے پر دینی انقلاب برپا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

....اوروں کے ہادی بن گئے:- سنہ ۱۳۴۵ھ مطابق سنہ ۱۹۲۶ء میں آپ نے میواتیوں کو تبلیغ کے کام میں لگایا، ان کی جماعتیں بنائیں، دس دس، پندرہ پندرہ کی تعداد میں پورے علاقہ میوات میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جماعتیں جاتی اور آتی رہیں، چونکہ اب ان میں کچھ لوگ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور سے پڑھ کر اور سندِ فضیلت لے کر میوات میں آچکے تھے اس لیے ان کی رہ نمائی میں یہ جماعتیں دوسرے لوگوں کو دین سکھانے کے لیے نکلنے لگیں اور سنہ ۱۳۵۱ھ (سنہ ۱۹۳۲ء) میں آپ نے میوات میں تبلیغ کرنے والی جماعتوں کو پابند بنایا کہ ہر گاؤں کے ہر گھر سے آدمی نکلیں اور پانچ کوس کے علاقے میں گشت کریں اور سب کو دین سکھائیں۔

اس شبانہ روز کی جدوجہد سے میوات کا ہر گاؤں تبلیغ کا مرکز بن گیا اور تیس لاکھ آبادی والا یہ علاقہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے نقشِ قدم پر چل کر شب و روز دین کی جدوجہد میں لگ گیا، اور پورے میوات میں دینی انقلاب پیدا ہوگیا، کہاں وہ مشرکانہ رسم و رواج کہ مسلم و غیر مسلم میں تمیز دشوار تھی اور آج یہ عالم کہ ہر مسلمان دوسروں سے ممتاز، دین کا مبلغ، دوسروں کو دین سکھانے کے لائق ہوگیا ؎

خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی؟ جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا

سنہ ۱۳۵۶ھ (سنہ ۱۹۳۷ء) میں مولانا محمد الیاس صاحب نے میواتی مبلغوں کو میوات سے باہر مختلف شہروں اور مختلف صوبوں میں بھیجنا شروع کیا، سنہ ۱۳۵۹ھ (سنہ ۱۹۴۰ء) میں مولانا محمد الیاس صاحب کے اس کام نے اہلِ علم کو اس کی طرف متوجہ کیا اور اس کی قدر و قیمت کو جانا اور پہچانا اور کام کی اہمیت کو محسوس کیا اس لیے مظاہر علوم سہارن پور، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علماء و اساتذہ نے مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خدمات پیش کیں اور آپ سے ہدایات لے کر اپنے اپنے مقام پر تبلیغ کا کام شروع کیا، اس طرح میوات کے باہر کے لوگ اس دینی جدوجہد

میں لگ گئے۔ سنہ ۱۳۶۰ھ (سنہ ۱۹۴۱ء) میں علاقہ میوات کے مشہور قصبہ نوح ضلع گوڑگانوہ جہاں سے تبلیغ کی مہم کا آغاز ہوا تھا، ایک بڑا تبلیغی اجتماع ہوا، یہ میوات کی سرزمین کا پہلا سب سے بڑا اجتماع تھا، اس اجتماع میں مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند بھی تشریف لے گئے تھے، انہوں نے فرمایا کہ میں ۳۵ سال سے ہر طرح کے اجتماعات میں شرکت کرتا رہا ہوں لیکن میں نے اس شان کا ایسا بابرکت اجتماع کبھی نہیں دیکھا پچیس ہزار انسانوں کا جمّ غفیر، ایک جلسہ بھی تھا، ایک خانقاہ بھی، اور ایک مدرسہ بھی، اس اجتماع کے بعد میواتیوں کے ساتھ بڑے بڑے علماء، مدرسوں اور کالجوں کے طلباء بھی جماعت میں شریک ہو کر نکلے اور قصبہ نوح سے جو جماعتیں بن کر نکلیں انھوں نے سہارنپور خورجہ، علی گڈھ، آگرہ، بلند شہر، میرٹھ، پانی پت، کرنال اور رہتک تک کے دورے کیے بلکہ کراچی اور پشاور تک بعض جماعتیں گئیں، سنہ ۱۳۶۲ھ (سنہ ۱۹۴۳ء) تک یہ دینی جدوجہد ایک منظم تحریک بن چکی تھی، اسی سال مولانا محمد الیاس صاحب جماعت لے کر لکھنؤ گئے اور شہر میں جماعت نے گشت کیا اور لوگوں کو دین سکھایا،

پھر اس کے بعد حیاتِ مستعار کے بہت کم دن آپ کے رہ گئے تھے۔ اور ۲۱ رجب سنہ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۳ رجولائی سنہ ۱۹۴۴ء کو یہ سیماب صفت مردِ حق ہمیشہ کے لیے سکون پا گیا مگر اپنے بعد ایک مثالی تحریک کی بنیاد ڈال گیا کہ قرونِ اُولیٰ کے بعد پوری اسلامی تاریخ میں اتنے بڑے پیمانے پر دین کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کا اس طرز پر نظم نہیں کیا گیا۔

ذہنی و فکری انقلاب کی تحریک:- تبلیغی جماعت انسان کو دین کے سانچے میں ڈھالتی ہے اس کے ظاہر و باطن دونوں میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے، اس کا ظاہر اگر ایک مؤمن کامل اور دین دار مسلمان کا ہو جاتا ہے تو اس کا باطن ظاہر سے زیادہ سنور جاتا ہے اور سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ وہ انسان میں ذہنی و فکری انقلاب پیدا کر کے اس کو ایک سیماب صفت انسان بنا دیتی ہے۔ انسان اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس کی روح دوسروں کی اصلاح کے لیے بھی بے چین ہو جاتی ہے دو چار چلّوں میں جانے کے بعد اس

کی روح کا اضطراب اور اس کے دل کی بے چینیاں اس درجہ کو پہونچ جاتی ہیں کہ وہ رات دن اس جذبے سے سرشار رہتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے مسلمانوں کو اس مقدس جماعت سے جوڑ دے اور ان کے اندر بھی وہی دین کی تڑپ اور بے چینی پیدا کر دے جس کی آماجگاہ خود اس کا دل بنا ہوا ہے، آدمی خود اصلاح ہی نہیں پاتا بلکہ ایک سیماب صفت مصلح بن جاتا ہے، یہ انقلاب ایک حیرت ناک انقلاب ہے، دین سیکھنا اور سکھانا کسی کا محبوب ترین مشغلہ بن جائے، اس سے بڑھ کر کسی انسان کی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے، تبلیغی جماعت سے یہی سعادت بہت تھوڑی ہی مدت میں حاصل ہو جاتی ہے،

مثالی قوم:- مولانا محمد الیاس صاحب نے اپنی زندگی میں ایک مثالی قوم بنا کر دنیا کے سامنے اس کو پیش کر دیا، میوات کے علاقے میں جانے والے بتاتے ہیں کہ وہاں پہونچ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں جاں نثاری و فداکاری کا پیکر بن کر جس طرح مسلمان ساری دنیا کو اسلام کا پیغام پہونچانے کے لیے وقف ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے شب و روز کا مشغلہ سوائے دین کے اور کچھ نہیں تھا، اُنھیں مثالی انسانوں کے نمونے میوات کی سرزمین میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، گاؤں میں میدانوں میں، کھیتوں میں، کھلیانوں میں، چراگاہوں میں، مزدوروں میں، کسانوں میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے، اس علاقے میں جانے والوں نے اپنے مشاہدات بتائے کہ چرواہے اپنے جانور چرا رہے ہیں، نماز کا وقت آگیا، آس پاس کے سارے چرواہے فوراً جمع ہو گئے، وضو کیا، اذان دی اور جماعت سے نماز ادا کرنے لگے سفید لنگی، کرتا اور دیہاتیوں جیسا عمامہ باندھے ہوئے یہ نوخیز لڑکے خدا کے حضور میں سر بسجود ہو جاتے ہیں اور فارغ ہو کر پھر اپنے اپنے جانوروں میں چلے جاتے ہیں، یہی حال کسانوں اور مزدوروں کا ہے، جیسے وہ بڑی بے چینی سے نماز کے وقت کا انتظار کر رہے ہوں، ہر شخص کو وقت معلوم ہے، از خود ایک جگہ جمع ہو جانا اور وقت پر خدا کے سامنے سر بسجود ہونا جیسے ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے، یہ حال، یہ کیفیت، یہ نظارہ ایک دو جگہ کا نہیں بلکہ باون گاؤں میں پھیلے ہوئے میواتیوں کی روزمرہ کی زندگی

میں عام ہے۔

تبلیغی جماعت کا دوسرا دور:۔ مولانا محمد الیاس صاحب جب اس دنیا سے رختِ سفر باندھتے ہیں تو اپنے پیچھے ان سرفروش میواتیوں کی جماعت کے علاوہ اس تحریک سے وابستہ علماء و مشائخ کا ایک عظیم المرتبت گروہ بھی چھوڑ جاتے ہیں، دعوت و تبلیغ کے اجتماعات میں شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان"، مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب جیسے اکابر بھی شریک ہونے لگے تھے اور جماعتوں کو لے کر اطرافِ ملک میں پھرنے لگے تھے، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی بھی اس سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ان کام کرنے والوں کے دُکھ سُکھ میں شریک تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو بعد میں صدر جمہوریہ ہند ہوئے ان کو بھی ہم میوات کے قصبہ نُوح کے اجتماع میں پاتے ہیں، دہلی اور کلکتہ اور کراچی کے بڑے بڑے رؤسا اور تاجروں کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ تبلیغی جماعت میں شریک ہو کر گاؤں گاؤں گشت کر رہے ہیں، خود بھی دین سیکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں۔

بستی حضرت نظام الدین دہلی کی بنگلہ والی چھوٹی سی مسجد دین کے فداکاروں کا مرکز بن چکی ہے، چند دنوں کے لیے ہندوستان بھر سے جماعتیں یہاں آتی ہیں، دین سیکھتی ہیں، طریقۂ کار سمجھتی ہیں اور پھر مزید دینی تربیت حاصل کرنے کے لیے ان کو میوات بھیج دیا جاتا ہے تاکہ اس پاکیزہ فضا میں رہ کر دین کا اضطراب ان کو حاصل ہو جائے، دین کے لیے ان کی چلت پھرت دیکھ کر صحابہ کرام کی زندگیوں کا نقشہ ان کی نگاہوں میں آجائے اور وہ نئے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے کو دین کی اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔

اب مولانا محمد الیاس صاحب کی جگہ ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب اس نظام کو چلانے کے لیے ذمہ دار بنائے گئے ہیں، ان کی قائم مقامی ان

کی سعادت وصلاحیت کی بنیاد پر تھی کیونکہ باپ کے بجائے ان کو اس منصب پر لانے والے قطب الاقطاب مولانا عبدالقادر رائے پوری، شیخ العالم مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث جیسے کئی بزرگ تھے،

مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد اسّی نفر کی جماعت لے کر ضلع سہارن پور میں کام کے لیے نکلے تو مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ایک بڑی جماعت لے کر پشاور اور سرحد تک گئے، دوسرے اکابر بھی اسی طرح اس نظام کو آگے بڑھانے اور اس کام کو پھیلانے میں خاموشی کے ساتھ لگ گئے۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے جب سے جماعت کے نظام کو سنبھالا تو انہوں نے دعوت وتبلیغ کے نظام کو ہندوستان گیر پیمانے پر بنانے کے لیے انتھک جدوجہد کی، سب سے پہلے مرادآباد کو مرکز بنا کر اتر پردیش کے تمام اضلاع میں اس نظام کو پھیلایا گیا اور خدا کے فضل سے ہر جگہ کام کرنے والے پیدا ہوتے چلے گئے اور اتر پردیش سے جب نکلے تو باری باری جماعتیں لدھیانہ، امرت سر، لاہور، پشاور، کوہاٹ، پنڈی، گجرات، گوجرانوالہ میں گئیں اور ایک ایک چلّہ کام کر کے واپس ہوئیں، مگر اتر پردیش بہت بڑا صوبہ ہے اس میں مسلم آبادی بھی بہت پھیلی ہوئی ہے اس لیے تبلیغی اجتماعات تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کسی ضلع یا شہر میں منعقد کیے جاتے رہے پہلا بڑا اجتماع خود مرادآباد میں ہوا جس میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا عبدالحق مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب وغیرہ شریک ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۵ء) میں جوالا پور ضلع سہارن پور میں بڑا اجتماع ہوا جہاں سے ہر طرف جماعتیں کام کرنے کے لیے نکلیں، اسی سال دوسرا بڑا اجتماع بڑوت ضلع میرٹھ میں ہوا جس میں حضرت شیخ الحدیث بھی شریک ہوئے تیسرا اجتماع اجراڑہ ضلع میرٹھ میں ہوا، ان اجتماعات کے بعد ضلع سہارن پور، مظفر نگر اور میرٹھ وغیرہ مغربی اضلاع میں کام کرنے کی راہیں کھلیں اور ان اضلاع میں پوری طرح دعوت وتبلیغ کا نظام اور کام پھیل گیا۔

سرگرمیاں بڑھتی رہیں، کام پھیلتا رہا، اصلاح ہوتی رہی، دین کی راہوں میں وقت اور پیسہ خرچ کرکے دین پھیلانے والے میدان میں آتے رہے اور یہ دینی کارواں چلتا رہا اور کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ رحیم آباد ضلع لکھنؤ اور کلکتہ کے بڑے اجتماعات کے بعد دور دراز علاقوں میں اصلاحی و تبلیغی پروگرام بنا، پورا پنجاب، پشاور اور سرحد تو تبلیغی جماعت کی پہلے ہی سے جولانگاہ تھی۔ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا عبیداللہ بلیاوی وغیرہ اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ عرصہ تک کام کرچکے تھے۔ اب بلوچستان کی ریاست قلات میں اصلاح کا کام شروع ہوا، وہاں کی جماعت دہلی مرکز میں آئی اور میوات گئی، پھر مرکز کی طرف سے ایک بڑی جماعت ریاست قلات گئی اور پوری ریاست میں کام کیا، اسی سلسلہ سفر میں کراچی میں ایک بڑا تبلیغی اجتماع ہوا، وہاں سے ایک سو آدمیوں پر مشتمل جماعت ریاست قلات گئی، اس نے شکارپور، کوئٹہ اور قلات تک کام کیا پھر وہاں سے پٹن، سراواں اور جھالاوال میں اصلاح و تبلیغ کا کام ہوا، مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے خطابات کیے۔

تقسیم ملک کے بعد:- تقسیم ملک کے بعد اصلاح و تبلیغ کی یہ تحریک بڑے صبر آزما حالات سے گذری بالخصوص مشرقی پنجاب اور دوسرے علاقوں میں کام کرنے کے سلسلہ میں بعض بعض موقعوں پر جان کی بازی آگئی، مگر اللہ کے ان بندوں کے خلوص نے محیر العقول کام کیے اور دشمن ہی رہنما اور معاون بن گئے ع

"عدو شود سبب خیر، گر خدا خواہد"

مرتد ہونے والوں میں اسلام کی تبلیغ از سر نو ان کو مسلمان بنانا، ان کی تعلیم کا نظم کرنا، اور ان کو اسلام پر قائم رکھنے کے لیے جد وجہد کرنا جان جوکھم کا کام تھا مگر جب خدا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے اسباب بھی مہیا کردیتا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد تین چار سالوں تک اندرون ملک تمام صوبوں میں تبلیغ کے اس نظام کو پھیلایا جاچکا تھا اور بلا مبالغہ کئی ہزار کی تعداد میں لوگ دین کا کام کرنے کے

سلسلہ میں لگے ہوئے تھے اور پورے ملک میں گشت جاری تھا، ہر طرف جماعتیں جارہی تھیں اور آرہی تھیں، بنگال، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، مدراس حیدرآباد وغیرہ میں بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے رہے اور لاکھوں لاکھ مسلمانوں کی بھیڑ خالص دین کے نام پر جمع ہوتی رہی اور ہر اجتماع سے ایک ہزار اور ڈیڑھ ہزار اور دو ہزار اور بعض بعض اجتماع کے بعد تین تین ہزار افراد ایک چلہ اور دو چلہ لگانے کے لیے جماعتوں میں نکلنے لگے، اس طرح پورے ملک میں کوئی خطہ ایسا نہیں بچا جہاں تبلیغی جماعتوں کے قدم نہ پہونچے ہوں اور اس نے اچھے اثرات نہ ڈالے ہوں، ہر بڑے شہر میں جماعت سے وابستہ مسلمان متحرک ہوگئے، حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس جماعت کا نہ کوئی دفتر نہ کوئی صدر، سکریٹری، نہ کبھی پوسٹر شائع کیا گیا، نہ کبھی کوئی پمفلٹ نکالا گیا، نہ اجتماعات کے اشتہارات نکالے گئے، نہ اخباروں میں خبریں دی گئیں مگر اجتماعات دو دو لاکھ اور چار چار لاکھ افراد کے ہوتے رہے، ہر شہر میں کوئی ایک مسجد مرکز والی مسجد بن گئی اور چند اللہ والے تبلیغ کے اس نظام کو اپنے شہر میں ذاتی جذبے اور شوق سے چلانے لگے، باہر سے آئی ہوئی جماعت کے ساتھ شہر میں گشت کرانے لگے، لوگوں کو جوڑنے اور دین سکھانے میں لگے ہوئے ہیں۔

اس جماعت کی خصوصیت یہ ہے کہ دین کی اشاعت کی اس عظیم الشان تحریک کے چلانے میں چند اکابر علماء وقت دے رہے ہیں، باقی پورا نظام معمولی پڑھے لکھے لوگ چلا رہے ہیں اور دین کی راہوں اور تقاضوں سے سرمو بھی ہٹنا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ اس جماعت میں جو اصول اور بنیادی قاعدے مقرر ہیں اس کی خلاف ورزی کسی کے لیے جائز نہیں، وہی باتیں کہیئے جو جماعت نے سکھائی ہیں، اگر کوئی عالم ان کا ساتھ نہ دے تو ان کا کام رک جائے ایسا نہیں ہوسکتا، ان کا کام ہر حال میں جاری رہتا ہے اور اصلاح و تبلیغ کا کام خوش اسلوبی سے چلتا رہتا ہے، تبلیغی جماعت میں شرکت درحقیقت دین سیکھنے اور سکھانے کی بہترین ٹریننگ ہے، بعض ناخواندہ جماعتی کارکن اتنی مؤثر تقریریں کرتے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہ جاتا

ہے، چونکہ ہر بات ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اس لیے اثر رکھتی ہے، زبان سے الفاظ ضرور نکلتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل اور ان کی روح سے آواز آرہی ہے، ان کے مخلصانہ جذبات بول رہے ہیں، اس شخص کا سارا وجود بول رہا ہے اور دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، اس لیے ناخواندہ افراد جو تربیت پا چکے ہیں وہ دین کا بہترین کام کرتے ہیں، دل سے ان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔

بیرونِ مُلک جماعتوں کی رَوانگی :- جب ملک میں ہر طرف اصلاح و تبلیغ کی مہم چل پڑی ہر طرف کام کرنے والے میدان میں آگئے اور روز بروز کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ساری دنیا سے ہندوستان میں جماعتیں دین سیکھنے کے لیے آنے لگیں اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے لگیں تو اہلِ مشورہ نے اس تحریک کو دوسرے ممالک میں چلانے کا عزم و ارادہ کر لیا، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام پڑوسی ملک پاکستان کا آیا، مرکز کے لوگوں نے مغربی پاکستان میں تبلیغ کا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا، امیرِ جماعت نے بذاتِ خود چار پانچ بار پاکستان کے بڑے بڑے دورے کیے۔ آپ کے ساتھ بہت بڑی بڑی جماعتیں پاکستانی علاقوں میں گشت کرتی رہیں اور کراچی، لاہور اور پشاور وغیرہ میں بڑے بڑے اجتماعات ہوتے رہے امیرِ جماعت کے کئی بار کے دوروں اور جماعتوں کے گشت سے پورے پاکستان میں دعوت و تبلیغ کی یہ تحریک ایک جانی بوجھی تحریک بن گئی اور پاکستان کے اونچے طبقے نے بھی اس کی کامیابی میں بھرپور تعاون کیا، کراچی، راولپنڈی، لاہور، حیدرآباد سندھ، پشاور، کوئٹہ اور ملتان کو مرکز بنایا گیا تبلیغی جماعت سے وابستہ ہندوستانی جو پاکستان میں قیام پذیر تھے انہوں نے امن و امان قائم ہونے کے بعد تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا اور جماعتوں کے گشت کا سلسلہ جاری تھا جب پاکستان میں ہر طرف کام کی داغ بیل پڑ چکی تو "رائے ونڈ" میں ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں تقریباً پندرہ ہزار مسلمان شریک ہوئے جو پاکستان کے مختلف حصوں سے جماعتیں لے کر آئے تھے، اجتماع ختم ہونے پر جو

جماعتیں تشکیل کی گئیں ان میں چھ سو آدمیوں نے اپنے نام لکھوائے اور ایک چلّہ دو چلہ کے لیے پاکستان کے شہروں میں گشت کے لیے نکل پڑے، ان کے علاوہ ایسی جماعتیں بھی تشکیل کی گئیں جن میں سے ایک ترکی میں کام کرنے کے لیے گئی اور ایک دوسری جماعت کویت گئی تاکہ عربوں کو اس تحریک سے روشناس کرائے اور ان کو بھی اس دینی کام میں جوڑا جائے، پھر مسلسل کراچی اور لاہور میں اجتماعات ہوئے، راولپنڈی، پشاور اور سکھر جیسے دور دراز شہروں میں بھی کامیاب اجتماعات ہوتے رہے، بنگلہ دیش میں ڈھاکہ کو مرکز بنایا گیا، امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب کے دورے ہوئے اور مختلف شہر دعوت و تبلیغ کے کام کے مرکز بنائے گئے، چاٹگام میں بہت بڑے پیمانے پر ایک اجتماع ہوا، اس اجتماع سے بہت سی جماعتیں مختلف علاقوں میں گشت کے لیے نکلیں، ڈھاکہ کے علاوہ کگرائل، چاٹگام اور کھلنا کو تبلیغی جماعت کا مرکز بنایا گیا، ان مرکزوں کے ذریعہ پورے بنگلہ دیش میں جماعتوں کی روانگی ہوتی رہی اور ہر طرف دعوت و تبلیغ کا باقاعدہ کام شروع ہوگیا۔

عرب ممالک میں دعوت و تبلیغ:۔ حجاز میں عربوں کی کھوئی ہوئی دولت کی بازیافت کے لیے یہ طے کیا گیا کہ حجاز میں جماعتیں بھیجی جائیں، پہلے پہل ایک جماعت گئی اس نے کچھ کام کی داغ بیل ڈالی اس کے بعد مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی کی امارت میں دوسری جماعت گئی جو کئی چلّوں کا وقت لے کر گئی تھی، پھر مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی جماعتوں کے ساتھ حجاز اور دوسرے عرب ممالک میں اس تحریک کو پھیلانے کے لیے گئے اور ان کے دورے ان کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے، اور بہت سے عرب اس تحریک سے جڑے اور ہندوستان آئے، ہندوستان کی کئی جماعتیں حجاز میں برسوں ٹھہر کر کام کرتی رہیں، دوسرے سال خصوصیت کے ساتھ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی امارت میں ایک جماعت بھیجی گئی تاکہ دین کی بات عربوں کو ان کے لب و لہجہ میں پہونچائیں، مولانا ندوی نے اس فرض کو بحسن و خوبی انجام دیا، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا

خاندان مدینہ میں آباد ہے اس خاندان نے جماعتوں کے قیام کے لیے ایک مرکزا ور مکان دیا ، وہیں سے جماعتیں گشت کے لیے نکلتی تھیں۔

۱۹۴۹ء میں دوبارہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی سفر حج کے لیے گئے کئی اجتماعات میں ان حضرات نے شرکت فرمائی اوران حضرات کی وجہ سے حجاز یمن، شام، عراق، سوڈان، مراکش، مصر، تیونس کے علماء اجتماع میں شرکت کرتے رہے اوراس کام سے متاثر ہوئے، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بہت عمدہ پیرایہ میں تبلیغی جماعت کا تعارف علمی اسلوب میں کرایا، اور دعوت وتبلیغ کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی، تقریر سے متاثر ہوکر مختلف ملکوں کے علماء نے رابطہ کے لیے اپنے اپنے پتے لکھوائے، اسی سال مولانا معین اللہ ندوی اور مولانا عبدالرشید ندوی حجاز میں تبلیغ کا کام کرنے کے لیے گئے اور وہاں رُک کر بہت دنوں تک کام کیا ایک اجتماع میزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان پر ہوا، پھر بستان بخاری میں ہوا اور لوگ جماعتیں لے کر وادی فاطمہ اور طائف وغیرہ گئے اور لوگوں کو اس مقدس کام میں وقت لگانے پر آمادہ کیا گیا، اس طرح مکہ مکرمہ و مدینہ طیبہ کو مرکز بنا کر پورے حجاز میں کام کیا گیا، پھر ترکی، مصر، الجزائر، شام، الجیریا، لیبیا، تیونس تک ہندوستان وپاکستان کے مسلمانوں کی جماعتیں گئیں اور مسلسل جاتی رہیں، اور ہر جگہ کچھ مقامی اہل علم اور عوام اس تحریک سے وابستہ ہوئے، ان میں سے بہت سے ملکوں کے لوگ اپنے ملک کے لوگوں کی جماعتیں لے کر ہندوستان آئے، دہلی مرکز میں اور میوات اور دوسرے شہروں کے گشت میں گئے، شام حضرموت، فلسطین، مراکش کے لیے بھی حرمین شریفین سے جماعتیں بھیجی گئیں۔

افغانستان، ترکی، انڈونیشیا، ملایا، برما، سیلون، لنکا تک تبلیغی نظام کو پھیلایا گیا، ہر جگہ ہندوستان سے جماعتیں گئیں اور وہاں کے مسلمانوں تک اس خالص دینی تحریک کو پہونچاکر ان میں ایمانی زندگی پیدا کرنے کی جدوجہد کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور ہر جگہ اس کے اچھے ثمرات ظاہر ہوئے، اسلام زندہ ہوا، لوگوں میں بیداری آئی اور دین پر خلوص کے ساتھ

عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔

جہاں جہاں اور جن جن ملکوں میں تبلیغی جماعت نے کام کیا اس کی افادیت، اس کی اہمیت و عظمت کو محسوس کیا گیا اور اسی کا یہ ثبوت ہے کہ ان تمام ممالک سے اہل علم مقامی لوگوں کی جماعتیں لے کر مسلسل ہندوستان آرہے ہیں اور وہ بچشم خود ہندوستان میں دین کے دمکتے ہوئے سورج کی کرنوں کو دلوں کے سیاہ خانے میں پہونچانے کا معجزانہ کارنامہ ایک چھوٹی سی مسجد کے فرش پر بیٹھ کر انجام دیتے ہوئے دیکھتی ہیں اور اس کے صدقے میں دین کی کرنیں ان اسلامی ملکوں تک پہونچیں جو خود کبھی دین کی روشنی ساری دنیا کو تقسیم کر رہے تھے لیکن مرور ایام نے ان کے اُفق پر کالی گھٹائیں پھیلا دی ہیں اور ملجا سا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا ہے، خدا کا فضل ہے کہ ہندوستان کا وہ مسلمان جس کی مظلومیت ضرب المثل بن چکی تھی، وہ اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے کہ اسلامی حکومتیں بھی اس بوجھ کے اُٹھانے سے اپنے کو کمزور اور بے بس پا رہی ہیں۔

کچھ میلا کچھ اُجلا

ترقی یافتہ ملکوں میں تبلیغی جماعت :- یہ دین کا کارواں ہندوستان سے چل کر حجاز و عرب اور اسلامی ممالک کا سفر کرتے ہوئے ان ملکوں تک پہونچا جہاں تہذیب جدید کا سورج نصف النہار پر ہے اور پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے جس کی تیز روشنی کے سامنے ساری قوموں کی آنکھیں خیرہ ہوتی جا رہی ہیں لیکن ان ترقی یافتہ ممالک یورپ، امریکہ، جاپان وغیرہ میں اگرچہ جدید تہذیب، جدید علوم، جدید تمدن کا سورج ساری دنیا کو روشنی بانٹ رہا ہے لیکن اس کے پس منظر میں جو تاریکی ہے اس کا پتہ کم لوگوں کو ہے، بے لگام معیشت اور اخلاقی بندشوں سے آزادی نے ان کے دلوں سے سکون کی دولت اور طمانینت قلب کا سارا ذخیرہ چھین لیا ہے وہ اس سکون قلب اور طمانینت کی تلاش میں خود مارے مارے پھرتے ہیں، ان کی نوجوان نسل انسانیت کا جامہ اتار کر حیوانیت کے روپ میں آج دنیا کے سامنے ننگی کھڑی ہے کیونکہ ان کا اندرونی اضطراب اور روحانی بے چینی ان کو غیر انسانی مشغلوں کی طرف موڑ رہی ہے لیکن افسوس کہ وہ زندگی کے لق و دق ریگستان میں

چشمۂ آبِ زلال کی تلاش میں بے سود سرگرداں ہیں، اور جہاں زندگی کا چشمۂ صافی ہے اس کی طرف ان کی نگاہ نہیں جاتی، ہمارا ایمان ہے کہ ان کی تشنگی اگر بجھ سکتی ہے تو صرف اسلام و ایمان ہی کے کوثر و تسنیم سے بجھ سکتی ہے، رم اور وہسکی ان کے سینوں کو آگ کی بھٹی بنا سکتی ہے لیکن آبِ زلال نہیں بن سکتی، وہ چاہِ زمزم کا ایک ہی جرعہ ان کے دلوں کی سلگتی آگ ٹھنڈک میں تبدیل کر سکتا ہے، اگر ان کو اسلام کے چشمۂ صافی کا پتہ نہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اسلام کے موج مارتے ہوئے شیریں چشمہ تک ان کو پہونچا دیں اور وہ مسلمان جو ان ملکوں میں دولت و عزت کی تلاش میں گئے ہیں اور تہذیبِ جدید کی چکا چوند ھ میں اسلام کی ٹھنڈی اور سکون بخش روشنی سے دور ہو گئے ہیں تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں، ان کے آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلانے کے لیے منتیں کریں، خوشامدیں کریں اور ہاتھ جوڑ کر ان کو راضی کریں کہ وہ اپنے خالق و مالک اور ربِ حقیقی کو پہچانیں اور پھر ان کو بتائیں کہ جس چین اور سکون کو لندن کے ہائڈ پارک اور نیویارک کی چمکتی ہوئی شاہراہوں پر تلاش کر رہے ہو وہ تمہیں کبھی نہیں مل سکتا، اگر مل سکتا ہے تو گنبدِ خضریٰ اور نخلستانِ مدینہ کے گھنے سایوں میں، یہ پیغام پہونچانا ہمارا فرض ہے، تبلیغی جماعت نے اپنے فرض کا احساس کیا اور اسباب و وسائل سے بے نیاز ہو کر یورپ و امریکہ کی طرف کوچ کر دیا،

یورپ اور امریکہ میں تبلیغی مہم :-

دین کا کام ہندوستان، پاکستان یا اسلامی ملکوں میں جس نہج پر ہوتا ہے یورپ اور امریکہ میں اس نہج پر کام کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں، وہاں مسلمان ہی کتنے ہیں اور جو ہیں دو دو چار چار ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں، کسی کا کسی سے رابطہ نہیں، اور ان ممالک میں رہ کر خود بھی اسی ماحول میں ڈھل چکے ہیں، دین اور اس کے تقاضے، اس کے فرائض کا چوبیس گھنٹہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی ذکر نہیں آتا، ان ملکوں کی زندگی ایک تیز رَو دھارا ہے جس میں انسان غیر اختیاری طور پر بہا جا رہا ہے، وہ پاؤں جما کر ٹھہرنا بھی چاہے تو یہ اس کے اختیار سے باہر ہے، سارا وقت مصروف ہے، دین کے لیے ان کے پاس کوئی وقت

نہیں، ایسے لوگوں سے دین کی باتیں کرنا بذاتِ خود نازک ترین مسئلہ ہے، آزاد خیالی کا دلدادہ وشیدائی دقیانوسی باتوں کو سننے کا بھی روادار نہیں ہوسکتا، ایسے لوگوں کو سمجھانا اور ان کو دین کی راہ پر لگانا کیا آسان کام ہے؟ تعلیم کی اونچی سے اونچی ان کے پاس ڈگریاں ہیں عیش وعشرت کے سارے ساز وسامان ان کے گرد وپیش بکھرے ہوئے ہیں ان سے کہا جائے کہ وضو کرو، نماز پڑھو، وظیفوں کی پابندی کرو اور آؤ ہمارے ساتھ دوسروں کو بھی اس راہ پر لگائیں، وہ کہے گا کس دیوانہ سے سابقہ پڑگیا ہے، اس ماحول میں ایسا سوچنا بھی انتہائی حوصلہ شکن ہے، لیکن اللہ کے مخلص بندے کبھی حالات کے شکوہ و شکایت سے زبان کو آلودہ نہیں کرتے، وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے سارے خطرات انگیز کرسکتے ہیں، کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے یورپ اور امریکہ میں ہندوستانی وپاکستانی جانے والی تبلیغی جماعتوں کو سابقہ پڑا مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور انتہائی مایوس کُن حالات میں انہوں نے کام شروع کیا اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

برطانیہ میں تبلیغی جماعت :- برطانیہ کے مختلف شہروں میں ہندوستان وپاکستان سے جماعتیں گئیں، اور انہوں نے اس ملک کے حالات وماحول کو پیشِ نظر رکھ کر جو کام کیا وہ یقیناً پتھر پر دُوب جانا تھا یا ریگستان میں چشمہ حیوان پیدا کرنا تھا، مختلف جماعتیں جو کہیں گئیں تو انہوں نے اپنے کام کی مشکلات اور کامیابیوں کی اطلاع امیرِ جماعت مولانا محمد یوسف صاحب علیہ الرحمۃ کو دی کہ ان کی دُعائیں حاصل ہوں، اور مرکز میں آنے والی جماعتوں سے دعا کرائی جائے لندن میں کام کرنے والی جماعت نے امیر التبلیغ کو اطلاع بھیجی :-

"ہم اپنی استعداد کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں، دعوت، تعلیم، تسبیحات، شب بیداری، نوافل، تلاوت وغیرہ اعمال کی پابندی کی کوشش کی جاتی ہے، الحمدللہ اس مبارک کام کی برکت کی وجہ سے یہاں مختلف شہروں میں مساجد قائم ہوچکی ہیں، اذان اور جماعت کا بھی اہتمام ہونے لگا ہے، جہاں مساجد نہیں ہیں وہاں بہت سے احباب

اس کی فکر کر رہے ہیں، مقامی طور پر ہفتہ وار گشت، اجتماع تعلیم، اور شب بیداری بھی کئی جگہ شروع ہوگئی ہے، مگر ایسے مقامات چند ہیں، اطراف میں جماعتوں کا نکلنا بھی شروع ہوگیا ہے۔ [1]

پاکستان سے برطانیہ گئی ہوئی جماعت کے امیر مولانا محمد سعید احمد خاں مہاجر مکی نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ:۔

"اسٹیشنوں پر باجماعت نماز ادا کرنے اور اذان دینے کی اللہ نے توفیق دی، سلام پھیرنے کے بعد بے انتہا مرد اور عورتوں کا ہمارے گرد مجمع ہوجاتا ہے اور وہ حیرت سے ہم کو دیکھتے ہیں"۔ [2]

لندن سے ایک جدید تعلیم یافتہ بھائی نے لکھا کہ دو سال سے ہم نے ایک چھوٹا سا مکتب کھولا ہے اس میں چالیس بچے آنے لگے ہیں، ان کو کلمہ سکھایا جاتا ہے، جو ان کے کان میں پہلی بار پڑتا ہے، پھر ان کو وضو کا طریقہ اور نماز کی دعائیں سکھائی جارہی ہیں، ۱۹۶۱ء میں ایک جماعت لندن گئی، اس کے ایک رکن نے اپنے تاثرات بیان کیے کہ یہاں کے لوگ بالعموم رات کو کام کرتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں، سنیچر کی شام سے اتوار کی شام تک ایک چھوٹی سی نقل و حرکت کی قربانی کی برکت ہے کہ گذشتہ سال ۷۵ دوست یہاں سے حج کے لیے گئے، یہاں مسجدیں نہیں ہیں، قرآن پاک کی تعلیم دینے کی کوشش ہورہی ہے۔ جمعہ کے دن ایک جگہ آجاتے ہیں، نیوکاسل، گلاسکو اور لندن میں تین چار بھائیوں کو اللہ نے ہدایت دی، گلاسکو اور مانچسٹر میں بھی عورتوں میں دینی طلب کا رجحان ہونے لگا ہے۔

ایک عرصہ تک مسلسل کام کرنے کے بعد مختلف علاقوں اور شہروں میں جو ایک ایک دو دو کرکے مسلمان کام پر لگے اور ان کو دین سے کچھ وابستگی ہوئی تو خاص لندن میں تبلیغی جماعت کا ایک اجتماع ہوا جس میں مانچسٹر، برمنگھم، شفیلڈ کی جماعتوں نے

---

[1] و [2] سوانح مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت ص ۵۰۴

حصہ لیا، انگلینڈ کی تاریخ کا یہ پہلا اجتماع تھا کہ محض دین کے نام اور دین کی فکر میں اتنے لوگ جمع ہوئے، اس اجتماع کے ایک شاہد نے بتایا کہ اب برمنگھم میں کام شروع ہو رہا ہے، ایک نوجوان طالب علم جو عربی اچھی بول لیتے ہیں وہ یہاں پڑھنے آئے ہیں، دین کا جذبہ ان میں بہت ہے، اس لیے لندن کے بجائے ان کا داخلہ برمنگھم میں کرایا گیا تاکہ ہم لوگوں کو ان سے کام میں مدد ملے، پچھلے دنوں ایک اتوار کو لندن سے ایک جماعت برمنگھم آئی جس میں چار امریکن بھی تھے اور دو پاکستانی جو امریکہ میں چار ماہ گذار کر آئے ہیں، اور اپنے ساتھ دو نو مسلم امریکنوں کو بھی لائے ہیں جو پاکستان میں ایک سال رہ کر تبلیغی کام سیکھیں گے، یکم فروری کو برمنگھم کی جماعت لندن جا رہی ہے، لندن میں جمعرات کو اجتماع ہوتا ہے اور برمنگھم میں ہر اتوار کو مغرب سے عشاء تک اجتماع ہوتا ہے، برمنگھم کے دوستوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر ماہ برمنگھم سے ایک جماعت نکلا کرے، برمنگھم میں حیدرآباد کے لوگ زیادہ ہیں وہی اس کام میں پیش پیش ہیں، اسی طرح مانچسٹر میں اجتماعات ہوتے رہتے ہیں اور وہاں سے جماعتیں نکلتی ہیں اور دعوت و تبلیغ کا کام کرتی ہیں، اس طرح مختلف جگہوں پر مساجد قائم ہو چکی ہیں، اذان، نماز ہونے لگی ہے جہاں مسجدیں نہیں ہیں وہاں بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، لندن اور مانچسٹر سے ہندوستان میں جماعتیں آتی رہتی ہیں اور رابطہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔

امریکہ میں دعوت و تبلیغ :- امریکہ میں دعوت و تبلیغ کا کام بڑے صبر آزما حالات سے گذرا اور بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بڑی دشواری یہ تھی کہ امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں کہاں رہتے ہیں، ایک صاحب جو امریکہ میں دعوت و تبلیغ کے ارادے سے جماعت لے کر گئے، انہوں نے اپنے ایک خط میں یہ تفصیل بتائی کہ میں مینا پولس پہونچا جو نیویارک سے بارہ سو میل دور ہے، ٹیلیفون ڈائرکٹری سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مسلمانوں کے چند نام نکالے، اُن سے بات کی، کسی نے کوئی توجہ نہیں دی، اکیلے ہی نماز پڑھتا رہا، بعد میں مسلم طلبہ سے جمعہ کی نماز کے وقت ملاقات ہوتی ہے کوئی دس پندرہ

طلبہ آتے ہیں، اب مجھے ہندوستان کا ایک مسلمان مل گیا ہے، اس طرح ہم دو آدمی ایک ساتھ نماز پڑھنے لگے، گذشتہ جمعہ کی شام کو دو ایسے مسلمان طالب علموں سے ملاقات ہوئی، ان سے بات کی تو وہ دعوت و تبلیغ میں حصہ لینے پر تیار ہو گئے، ایک صاحب مصر کے ہیں اور دوسرے زنجبار کے، میں نے ان دونوں سے ہندوستان میں تبلیغ کی سرگرمیوں پر تھوڑی بات کی تو وہ بہت متاثر ہوئے، ہر اتوار کی شام کو دو گھنٹہ اور جمعہ کی شام کو ایک گھنٹہ وقت نکال کر مسلم نوجوانوں سے ملنے کا پروگرام بنایا گیا ہے جو یہاں تقریباً ستر، اسی کی تعداد میں ہیں۔ ایک تیسرا طالب علم ملا جس کا نام قطب شاہ ہے اس نے مہینہ میں ایک شام دینے کا وعدہ کیا ہے، مغرب کی نماز کے لیے مجھ کو ملا کر چار آدمی ہو گئے ہیں، بقیہ نمازوں میں بھی جماعت کرنے کی فکر کی جا رہی ہے۔

دائرہ بتدریج بڑھتا رہا:- دانہ دانہ چُن کر خرمن بنایا جاتا رہا، کئی برسوں کے بعد پاکستان سے ایک جماعت امریکہ گئی، انہوں نے برسوں کی لگاتار محنت کا جو ثمرہ دیکھا اس کے بارے میں وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ نیویارک میں مسلمانوں نے ایک چار منزلہ بلڈنگ خرید لی ہے، اس میں نہانے دھونے، کھانے پکانے، وضو کرنے اور نماز کے لیے سب بندوبست ہے، امریکہ سے جو تبلیغی جماعتیں نکلی ہیں اور ہندوستان و پاکستان ہو کر آئی ہیں ان میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ جماعتوں کے قیام اور کام کی سہولتوں کے لیے نیویارک میں انتظام کرنا ضروری ہے۔ بس اسی جذبے سے پانچ لاکھ ڈالر سے یہ عمارت خریدی گئی ہے اور یہی تبلیغی مرکز ہے، جمعرات کو اجتماع ہوتا ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ گشت ہوتا ہے، اتوار کو بھی کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں، نوجوان شام کو قرآن سیکھ رہے ہیں، ہماری جماعت بھی روزانہ پندرہ بیس میل کا سفر کرتی ہے اور دعوت و تبلیغ کا کام کرتی ہے، بعض عورتیں بھی اپنے طور پر دعوت و تبلیغ میں لگ گئی ہیں، ایک امریکی خاندان جو مسلمان ہوا ہے بڑا پرجوش ہے دین کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، اور کاموں میں دل چسپی لیتے ہیں۔

نیویارک کے علاوہ واشنگٹن، پیٹس برگ، بیفیلو، ڈیٹرائٹ، شکاگو، سکرینٹو

سان فرانسسکو میں تبلیغی مراکز قائم ہو چکے ہیں، مسلمانوں نے اپنی بلڈنگیں خرید کر ان کو تبلیغی مرکز بنا دیا ہے، ہر جگہ اجتماعات ہوتے ہیں اور وہاں سے جماعتیں نکلتی ہیں۔ جتنا بھی جو وقت دین کے لیے دے سکتا ہے، دیتا ہے اور پورے شوق اور لگن کے ساتھ کام کرتا ہے۔

جاپان میں دعوت و تبلیغ:- جاپان میں سب سے زیادہ غلبہ بدھ مذہب کا ہے اس مذہب کے بڑے بڑے مندر ہیں، جاپان میں کہیں کہیں اکا دکا مسلمان بھی ہیں، کچھ لوگ تعلیم کے لیے یا ملازمتوں کے سلسلہ میں جاپان میں مقیم ہیں، بعض علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کچھ قابلِ ذکر ہے۔

جاپان میں اب تک دعوت و تبلیغ کا جو کام ہوا ہے وہ پاکستان کے جناب ارشد صاحب کی محنتوں کا ثمرہ ہے، وہ انگریزی تعلیم یافتہ، پشاور کے رہنے والے، آزادی سے قبل محکمہ ٹیلی فون میں بڑے عہدوں پر کلکتہ اور بمبئی وغیرہ میں رہ چکے ہیں، تقسیم ملک کے بعد لاہور میں ڈویژنل انجینیر رہے، اسی زمانہ میں مولانا محمد الیاس صاحب کی تبلیغ و دعوت سے متاثر ہوئے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

وہ اپنے محکمہ کی طرف سے جاپان گئے اور وہاں دو ڈھائی سال مقیم رہے، اس عرصہ میں ان کے ہاتھ پر بڑی تعداد میں جاپانی مسلمان ہوئے، پھر انہوں نے امریکہ میں دعوت و تبلیغ کا کام کیا، آخر میں سعودیہ عربیہ میں دعوت و تبلیغ میں مصروف ہوئے اور یہیں ربِّ حقیقی سے جا ملے، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے قریب خواب گاہ میسر آئی۔

غرضیکہ حاجی ارشد صاحب کے بعد دعوت و تبلیغ کا کام جاپان میں جاری رہا، ٹوکیو کے بارے میں کہتے ہیں کہ خصوصی گشتوں کا سلسلہ جاری رہا اور مقصد یہ تھا کہ جاپانی دین کے لیے کچھ وقت فارغ کرائیں، جاپان میں نو مسلم جاپانیوں نے دعوت و تبلیغ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اس لیے غیر جاپانی جماعتوں میں وہ ترجمانی کا فرض بڑے مؤثر انداز میں ادا کرتے ہیں، ایلیچی شہر میں اجتماع ہوا، یہاں بودھوں کا بڑا عظیم الشان مندر ہے، پوری عمارت بڑی شاندار ہے، اس اجتماع میں ٹوکیو کی جماعت شریک ہوئی اور اطراف و جوانب کے

مسلم وغیر مسلم اتنی بڑی تعداد میں جمع ہوئے کہ دین کے نام پر کبھی بھی اتنا بڑا اجتماع نہیں ہوا، تقریر کرنے والوں نے توحید، رسالت، آخرت اور قرآن کے اعجازات، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو مؤثر انداز میں پیش کیا، لوگ متأثر ہوئے۔

جاپانی زبان میں "مسلم کی روزانہ زندگی" نامی کتابچہ لکھا گیا ہے، "تعلیم الاسلام" اور فضائل کی کتابوں کے جاپانی ترجمے ہو چکے ہیں، وہ اجتماع میں سنائے جاتے ہیں نو مسلموں کو وضو اور نماز کے طریقے سکھائے جاتے ہیں، ٹوکیو کی مسجد تبلیغی جماعت کا مرکز بنی ہوئی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر ہفتہ گشت ہو، اور دوسرے علاقوں میں جماعتیں بھیجی جائیں، یہ سلسلہ برابر جاری رہا، اور مسلمان بعض اہم تقریبات میں بلائے جاتے ہیں۔

جاپان میں امریکن کالج واحد بین الاقوامی کالج ہے، ہر سال تقسیم اسناد کے موقعہ پر ایک جلسہ ہوتا ہے اس میں بہت سے مذاہب کے سربراہ بلائے جاتے ہیں لیکن کبھی کوئی مسلمان ابھی تک اس میں شریک نہیں ہوا، جب تبلیغی جماعت نے مسلمانوں کو نمایاں کیا تو کالج کی صرف ایک مسلمان لڑکی کے احتجاج کرنے پر کہ سارے مذاہب کے سربراہ بلائے گئے ہیں کوئی مسلمان عالم کیوں نہیں بلایا گیا تو اس لڑکی سے نام پوچھ کر ان کو دعوت دی گئی، وہ تبلیغی جماعت کے امیر تھے، انھوں نے کانووکیشن میں شرکت کی اور اسلام کے بارے میں دل کے درد کے ساتھ جو بیان دیا تو جلسہ کے ختم ہونے کے بعد ان کے گرد ایک بھیڑ لگ گئی۔

اس طرح دھیرے دھیرے جاپان میں دینی زندگی کے آثار پیدا کیے جا رہے ہیں جگہ جگہ یہاں کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں، تبلیغی جماعت کی کوششوں اور توجہ دہانیوں سے مسجدیں بنتی جا رہی ہیں اور وہ مسلمانوں کا مرکز بن رہی ہیں اور پھر وہاں سے دعوت و تبلیغ کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔

یہ عظیم الشان تحریک :- میں نے آپ کو تاریخ اسلام کی ایک بے مثال تحریک اور دعوت و تبلیغ کی لاثانی سرگرمیوں کو قدرے تفصیل سے سنایا، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک کمزور اور مخنی سا اللہ کا بندہ جس کے پاس

نہ دولت و سرمایہ، نہ وسائل و ذرائع لیکن اس کے پاس خلوص کی زبردست طاقت ہو، دین کے لیے سینے میں بے پناہ تڑپ ہو تو اسباب قدرت خود پیدا کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کی اس پر عنایتوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ جس منزل تک پہونچنے کا آدمی کو تصور تک نہیں ہوتا، قدرت اس کو وہاں تک پہونچا دیتی ہے، مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جب بنگلہ والی مسجد بستی حضرت نظام الدین دہلی میں ساری دنیا سے قطع تعلق کر کے بیٹھ گئے، تو بسا اوقات فاقے ہو جاتے تھے، مفلسی کا عجیب عالم تھا، کام بھی بہت معمولی، چند میواتی مزدوروں کو بٹھا کر مختصر سی دینی تعلیم، اس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ اس کمزور اور نحیف الجثہ آدمی کے سینہ میں عزم و عمل کا ہمالیہ چھپا ہوا ہے۔

چند برسوں میں جب دعوت و تبلیغ کے ذریعہ پورا ایک علاقہ علم و عمل کے اسلحہ سے لیس ہو کر میدان میں نکلا تو فتح و کامرانی اس کے قدم چومنے کے لیے آگے بڑھی، ظفر مندی نے اس کے خیر مقدم کے لیے آنکھیں فرش راہ کر دیں، مگر یہ ملکوں اور شہروں کی فتح نہیں تھی، دلوں کی فتح تھی، جذبات و خیالات کی فتح تھی، غور و فکر کی قوتوں کی فتح تھی، یہ میواتی ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب بن کر اس کے مطلع پر طلوع ہوئے اور ان کی روشنی دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچ گئی۔

بنگلہ والی ایک بوسیدہ سی مسجد دعوت و تبلیغ کے سورج کا مطلع ثابت ہوئی اور آج ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش ہی نہیں تمام اسلامی ممالک، اور یورپ و امریکہ اور جاپان تک اس کی تیز شعاعیں پہونچ گئیں، بقدر صلاحیت و استعداد ہر ایک نے اس سے اکتساب نور کیا، یہ سب کرشمہ ہے خلوص و للہیت کا، خدا کے نزدیک ان بزرگوں کی مقبولیت کا، خدا جس سے اپنے دین کا کام لینا چاہتا ہے، اس کے دل میں اپنی محبت بھر دیتا ہے، اس پر الطاف و عنایات کی بارش کرتا رہتا ہے، اس کے سینہ میں دین کی تڑپ اور اسلام کی سربلندی کا ایک ایسا شعلہ جوالہ پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کو کبھی کہیں سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا، قدرت کا مخفی ہاتھ اس کی رہنمائی کرتا ہے، راستہ کی مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتا ہے، آج تبلیغی جماعت اللہ والوں کی ایک مقدس ترین جماعت ہے

جو ہر طرح کی دنیاوی آلائشوں سے پاک وصاف ہے، نہ تنخواہوں کا لالچ ہے، نہ عہدوں کی حرص، نہ اعزاز واکرام کا مطالبہ، نہ استقبال اور خیر مقدم کرنے والوں کے ہجوم سے فخر و غرور اور نمود ونمائش کا کوئی موقعہ، اپنا اسباب سفر اپنے ساتھ رکھو، اپنی جیب سے کھانے پینے کا انتظام کرو، اپنی پاک کمائی سے اللہ کی راہ میں سفر کرتے ہوئے خرچ کرو، اور عارضی ہجرت اختیار کرو، اللہ کے گھروں میں قیام کرو، حکومت اور اس کے عہدہ داروں سے کوئی رابطہ کوئی تعلق کوئی امداد وتعاون ہرگز نہ لو، نفسانیت مرجاتی ہے نفس امّارہ کو خود اپنے پاؤں سے روند کر جو آگے بڑھے گا خدا کے یہاں اس کا خلوص کھرے سونے کی طرح پیش ہوگا، اس کی قدر وقیمت وہی جانتا ہے جس نے اس بندے کو اپنے کام میں لگایا ہے، دبستانِ دیوبند کا ایسا کارنامہ ہے جسے ہماری تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، ہمارا سر بارگاہِ خداوندی میں جھکا ہوا ہے کہ خداوندا! اگر تو نے اسے قبول کرلیا تو سب کچھ ہے ورنہ ہماری یہ ساری جدوجہد رائیگاں ہے۔

آخری بات:- میں نے بات شروع کی تھی کہ ہندوستان میں اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنا ہی وقت کا سب سے اہم فریضہ ہے اور اس سلسلہ میں بات دراز ہوگئی میں نے راہ کی مشکلات اور دشواریوں کا ذکر کیا مگر علماء حق مسلسل دین کے چشمۂ صافی کو بدعات وخرافات کی آلائشوں سے پاک وصاف کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک بہت بڑا طبقہ اصلاح پذیر ہوچکا ہے مگر کام اب بھی باقی ہے، بات یہ ہے کہ ہندوستان سے مشرکانہ عقیدوں کا خاتمہ موجودہ صورت میں کچھ آسان کام نہیں۔ آج بھی بزرگانِ دین کی قبروں پر عرسوں کے نام پر میلے ٹھیلے دھوم دھام سے لگتے ہیں اور لاکھوں افراد ان میں شریک ہوتے ہیں۔ صاحب مزار کو حاجت روا مشکل کشا ہونے کا عقیدہ دلوں میں پیوست ہے اور عملاً خدا کی خالقیت ومالکیت اور ربوبیت سے انکار کا سلسلہ برابر جاری ہے، بزرگوں کی قبریں مرجع خلائق بنی ہوئی ہیں، ہزاروں خاندانوں کی روٹی روزی اس سے وابستہ ہے۔ ان تمام مشرکانہ جذبات واعمال کو دین وشریعت

کی سند دینے والے بھی موجود ہیں اس لیے دبستانِ دیوبند نے توحید و رسالت کی تعلیم کے لیے ہر امکانی جد و جہد کے بعد دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ہر ہر فرد کو دین کی صحیح راہوں پر لگانے کا محنت طلب کام شروع کر دیا، میں جانتا ہوں کہ ان بے داغ اور بے لوث کام کرنے والوں کو بھی وہی لوگ مطعون کرتے ہیں جو آج سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلام سے خارج کر کے چپ چاپ بیٹھ گئے ہیں۔

مجھے اپنے بہکے ہوئے ان بھائیوں سے دل کے پورے درد کے ساتھ صرف ایک بات کہنی ہے کہ تمہارے پہلوں نے لاکھوں اور کروڑوں اللہ کے مخلص بندوں کو، دین کے لیے آخری قطرۂ خون تک بہا دینے والوں کو کافر اور خارج از دین کہہ کر ان کا کچھ نہیں بگاڑا خود اپنا بگاڑا ہے۔ خدا تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کرے گا کہ خدا اور رسول کے احکام کی تم نے کتنی پابندی کی، تم سے دوسروں کے ایمان و کفر کے بارے میں سوال نہیں ہوگا، تمہارے بزرگوں نے اپنی زندگی صرف دوسروں کو اسلام سے خارج کرنے میں صرف کر دی، اب دونوں خدا کے حضور میں پہونچ چکے ہیں اور اس جبار و قہار کی عدالت میں حاضر ہو چکے ہیں مظلوم و ظالم انصاف کی سب سے بڑی عدالت میں حاضر ہیں، اس کا فیصلہ وہی کرے گا کیونکہ اسی کو اس کا فیصلہ کرنے کا حق ہے تم اپنے پہلوں کی غلطی کو کیوں دُہراتے ہو؟ دین کے لیے کچھ کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکمل شریعت لے کر آئے ہیں، اس میں کمی بیشی کرنے کا ہم کو اور نہ تم کو کوئی اختیار نہیں ہے اس لیے اس شریعت پر خود بھی عمل کرو اور امکانی جد و جہد کرو کہ ساری دنیا خدا کی خدائی اور رسولؐ کی رسالت پر ایمان لائے، لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں۔

اسیر ادرروی

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس

۵ جنوری ۱۹۸۹ء

کتابیات

۱	خطبات گارسان دتاسی	تصحیح ونظرثانی ڈاکٹر حمید اللہ پیرس
۲	حیاتِ جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی
۳	تاریخ سلطنتِ خداداد	محمود خاں محمود بنگلوری
۴	غدر ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رُخ۔	ترجمہ شیخ حسام الدین
۵	ندائے حرم کراچی شمارہ اپریل و مئی ۱۹۵۱ء	
۶	رسالہ الرشید ساہیوال دارالعلوم دیوبند نمبر	
۷	مآثر شیخ الاسلام	اسیر ادروی
۸	تاریخ جمعیۃ علماء ہند	اسیر ادروی
۹	فائل ریکارڈ روم مرکزی دفتر جمعیۃ علماء ہند نئی دہلی	
۱۰	ارواح ثلثہ	امیر خان صاحب
۱۱	تفسیر حقانی	مولانا عبدالحق صاحب حقانی
۱۲	فتاویٰ رشیدیہ کامل	کتاب گھر دیوبند
۱۳	امداد الفتاویٰ	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی
۱۴	تتمہ فیصلہ آسمانی	مولانا سید ابو احمد رحمانی (۱۳۳۳ھ)
۱۵	فتاویٰ تکفیر قادیان (نظامی)	ناشر مکتبہ نظامیہ دیوبند ۱۳۸۲ھ
۱۶	المتبنی القادیانی	مفتی محمود صاحب (پاکستان شیخ الحدیث قاسم العلوم ملتان
۱۷	سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری	سید محمد الحسنی ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۸	رئیس الاحرار	مصنفہ مولانا عزیز الرحمٰن جامعی
۱۹	اکفار الملحدین	علامہ انور شاہ کشمیری
۲۰	حیاتِ خلیل	محمد ثانی حسنی مکتبۂ اسلام لکھنؤ
۲۱	انوارِ انوری	مولانا محمد انوری لائل پور
۲۲	محمد قادیانی	مولانا ثناء اللہ امرتسری اشاعت ۱۹۲۸ء
۲۳	فیصلہ نکاح مرزائیان	〃 〃 〃 ۱۹۲۵ء
۲۴	عقائدِ مرزا	〃 〃 〃 ۱۹۲۸ء
۲۵	تعلیماتِ مرزا	〃 〃 〃 ۱۹۳۲ء
۲۶	شہاداتِ مرزا	〃 〃 〃 ۱۹۲۳ء
۲۷	مراقِ مرزا	حبیب اللہ کلرک امرتسری
۲۸	مرزا کی سیرت وسوانح	شائع کردہ مرکز قادیان
۲۹	عقائدِ احمدیت	〃 〃
۳۰	قادیانیت کا مطالعہ وجائزہ	مولانا ابوالحسن علی ندوی
۳۱	الانور	عبدالرحمٰن کوندو، ندوۃ المصنفین دہلی
۳۲	تناقضاتِ مرزا	مولانا نور محمد ٹانڈوی
۳۳	اسلام اور قادیانیت کا تقابلی مطالعہ	مولانا عبدالغنی پٹیالوی
۳۴	نزولِ عیسیٰ وظہورِ مہدی	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۳۵	ختمِ نبوت	〃 〃 〃
۳۶	اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف	〃 〃 〃
۳۷	مسیحِ موعود کی پہچان	مفتی محمد شفیع صاحب (پاکستان)
۳۸	ختمِ نبوت	〃 〃 〃 〃
۳۹	دعاوئ مرزا	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۴۰	تحقیق الکفر والایمان	مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری

۴۱	اخبار الجمعیۃ دہلی دارالعلوم دیوبند نمبر مارچ ۱۹۸۰ء	
۴۲	رسالہ البینات کراچی جنوری و فروری ۱۹۷۸ء بنوری نمبر	
۴۳	مغلطات مرزا	مولانا نور محمد ٹانڈوی
۴۴	نفحۃ العنبر	مولانا محمد یوسف بنوری
۴۵	چیستان مرزا	مولانا مطیع الحق دیوبندی
۴۶	قبلہ نما	حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی
۴۷	مباحثہ شاہ جہاں پور	مرتبہ مولانا فخر الحسن گنگوہی
۴۸	جواب ترکی بہ ترکی	حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی
۴۹	سوانح قاسمی	مولانا مناظر احسن گیلانی
۵۰	تاریخ دارالعلوم دیوبند	سید محبوب رضوی
۵۱	انتصار الاسلام	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی
۵۲	فیوض قاسمیہ	مکتوبات مولانا محمد قاسم نانوتوی
۵۳	سیرت سید احمد شہیدؒ	مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ
۵۴	حسام الحرمین	مرتبہ مولوی احمد رضا خان بریلوی
۵۵	تجانب اہل السنۃ	مولوی ابوالطاہر محمد طیب داناپوری
۵۶	الشہاب الثاقب	مولانا سید حسین احمد مدنی
۵۷	تذکرۃ الخلیل	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
۵۸	تزکیۃ الخواطر	مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری
۵۹	توضیح البیان	〃 〃 〃
۶۰	احدی التسعۃ والتسعین	〃 〃 〃
۶۱	انتصاف البری	〃 〃 〃
۶۲	الخصم علی لسان الخصم	〃 〃 〃
۶۳	الکوکب الیمانی	〃 〃 〃

۶۴	اسکات المعتدی	مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری
۶۵	شکوۃ الحاد	〃 〃
۶۶	تحقیق مذاہب	مولانا مطیع الحق دیوبندی
۶۷	تحذیر الناس	مولانا محمد قاسم نانوتوی
۶۸	انوار ساطعہ	مولوی عبدالسمیع رام پوری
۶۹	براہین قاطعہ	مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی
۷۰	تقویۃ الایمان	مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی
۷۱	حفظ الایمان	مولانا اشرف علی تھانوی
۷۲	فیصلہ کن مناظرہ	مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان"
۷۳	حضرت شاہ اسمٰعیل شہید	〃 〃 〃 〃
۷۴	حضرت تھانوی اور اعلیٰ حضرت	مولانا مطیع الحق دیوبندی
۷۵	فتح بریلی کا دل کش نظارہ	مولانا رفاقت حسین بریلی
۷۶	بدعت کیا ہے؟	مقالات ماہر القادری وغیرہ
۷۷	دیوبند سے بریلی تک	مولانا ابوالاوصاف رومی
۷۸	تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی و بریلوی حضرات	مولانا محمد منظور نعمانی
۷۹	فیصلہ کن مباحثہ	مولانا امام علی دانش
۸۰	بریلوی فتنہ کا نیا روپ	مولانا محمد عارف سنبھلی
۸۱	زلزلہ	مولانا ارشد القادری
۸۲	اغلاط العوام	مولانا اشرف علی تھانوی
۸۳	اصلاح الرسوم	〃 〃 〃 〃
۸۴	سوانح مولانا محمد یوسف صاحب	محمد ثانی حسنی لکھنؤ
۸۵	تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات	مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث

۸۶	مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت	مولانا ابوالحسن علی ندوی
۸۷	مطرقۃ الکرامۃ	مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی
۸۸	ہدایات الرشید	〃 〃 〃
۸۹	قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی	مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی
۹۰	تفسیر آیاتِ خلافت	〃 〃 〃 〃
۹۱	نزہۃ الخواطر	مولانا سید عبدالحیؒ 〃 رائے بریلوی
۹۲	تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل	مرتبہ مولانا فضل الرحمٰن اعظمی
۹۳	اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں	مولانا سید عبدالحی صاحب رائے بریلوی
۹۴	تحفۂ اثنا عشریہ	حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی
۹۵	رسالہ القاسم دیوبند شمارہ فروری ۱۹۱۹ء	
۹۶	تاریخ اَوَدھ	مولانا حکیم نجم الغنی رام پوری
۹۷	تذکرۃ الرشید	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
۹۸	مزاروں کی جھلکیاں	مولانا عبدالمالک آروی
۹۹	فتاویٰ دارالعلوم۔ مطبوعہ کراچی	
۱۰۰	مناظرہ تحصیل دیوریا	مرتبہ مولوی نورالحق مچھلی شہری (۱۹۰۳ء)
۱۰۱	علماء ہند کا شاندار ماضی	مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی
۱۰۲	تتمۃ البیان	مصنفہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ

دارالاشاعت دہلی کی انمول پیش کش

احسن الفتاویٰ (اردو)

عصرِ حاضر کے نامور اور ممتاز عالم دین، باکمال فتویٰ نویس اور محقق حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کے فقہی رسائل اور فتاویٰ کا قیمتی مجموعہ دارالاشاعت دہلی کے زیر اہتمام آٹھ ضخیم اور خوبصورت جلدوں میں شائع ہوگیا ہے۔ اس مجموعہ میں زندگی کے تمام ضروری موضوعات بالخصوص دورِ حاضر کے نئے اور پے چیدہ مسائل سے متعلق تحقیقی اور مفصل فتاویٰ کو اس انداز میں مرتب کیا گیا ہے کہ اس سے عام وخاص مسلمان یکساں استفادہ کرکے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں مکمل شرعی رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کا شاید ہی کوئی فقہی مسئلہ ایسا ہو جس کا تفصیلی، تحقیقی اور تشفی بخش جواب اس مجموعہ فتاویٰ میں موجود نہ ہو۔

احسن الفتاویٰ کے منصف حضرت مولانا رشید احمد لدھیانوی نے تقریباً نصف صدی کا طویل عرصہ فتویٰ نویسی میں گزارا ہے۔ مسائل حاضرہ پر گہری نظر، بے پناہ قوتِ استنباط جامع اور مدلل تحریر اور اختصار الفاظ کے ساتھ ٹھوس دلائل کی کثرت ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ احسن الفتاویٰ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ شاید کسی دینی ادارہ کا دارالمطالعہ اس سے خالی نہ ہوگا۔ اکابر علماء بھی اس سے استفادہ بلکہ استناد کرتے ہیں۔ نت نئے مسائل کے اس دور میں اپنے روزمرہ کے معمولات کو شریعت کے سانچہ میں ڈھالنے کی خواہش رکھنے والے ہر مسلمان کے گھر میں اس کتاب کا وجود ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

کتابت وطباعت عمدہ اور معیاری، صفحات تقریباً چار ہزار،

سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ قیمت مع ڈاک خرچ صرف =/۹۷۵ روپے۔

دارالمولفین دیوبند 247554 یوپی

سیرۃ خاتم النبیینؐ

﴿للبنات و البنین﴾

تالیف: سمیح عاطف الزین

پیش نظر کتاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر عربی زبان میں عالم عربی کے ایک فاضل کی تصنیف ہے۔ اس میں نہایت آسان، شستہ، شیریں فصیح و بلیغ اور سحر طراز عربی زبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو از اوّل تا آخر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی گئی ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اعلیٰ وارفع زبان کے ساتھ ساتھ، سطر سطر بلکہ لفظ لفظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ محبت وعقیدت اور بے پناہ شیفتگی کے جذبات کی روشنی پھوٹی پڑتی ہے اور قاری کو کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کی بادِ بہاری، ایمان ویقین کی حرارت اور ایک عطر بیز، شفاف اور روحانی فضا نے اس کے سارے وجود کا احاطہ کرلیا ہے۔

یہ کتاب، اپنی بے ساختہ، سلیس اور دامن دل کو چھو لینے والی زبان کی بناء پر، عربی زبان کے ایک کامیاب اور مطلوبہ ریڈر کی حیثیت رکھتی ہے۔

عرصے سے ہماری یہ تمنا تھی کہ سیرت نبویؐ پر کوئی ایسی کتاب ہم دست ہو جو ایمان ویقین کو صیقل کرنے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت ومحبت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک قاری کو بہترین عربی زبان کا تحفہ دیتی ہو۔

لہٰذا عربی زبان کے دل دادوں اور شائقین کی خدمت میں اس خوبصورت کتاب کو نذر کرتے ہوئے ہماری زبان خدائے پاک کی حمد وثناء سے لبریز ہے کہ اس نے ہمیں ایک ایسی کتاب کے شائع کرنے کی توفیق بخشی جو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو آپ کی زبان سکھانے کی صلاحیت سے بھرپور اسلوب میں پیش کرتی ہے۔

قیمت صرف =/۵۴ روپے

ناشر:

دار المولفین دیوبند 247554 یوپی

جدید عربی ایسے بولیے

تالیف: مولانا اسلام الحق قاسمی

اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

مختصر وقت میں عربی بول چال سکھانے والی آسان اور جامع عربی کتاب۔

بے شمار نئے عنوانات، اصطلاحات، تعبیرات اور جدید الفاظ کے عربی تلفظ کے ساتھ ترمیم اور اضافہ شدہ تیسرا ایڈیشن منظر عام پر آگیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ عربی بول چال پر مکمل عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۷ عنوانات پر مشتمل عربی میں سوال و جواب اور گفتگو سے متعلق جدید تعبیرات

عرب ممالک جانے والوں کے لیے مکمل رہنما کتاب۔

صفحات: ۲۵۶ قیمت صرف ۱۵۰/- روپے

خطوط نویسی

عربی انگلش اور اردو میں

تالیف: مولانا اسلام الحق قاسمی

عربی، انگلش اور اردو میں خط و کتابت سکھانے والی اپنی نوعیت کی منفرد اور بے مثال کتاب جس میں سو سے زیادہ مختلف مواقع پر لکھے جانے والے اخبار اور ملازمت کے لیے دی جانے والی درخواستوں نیز دفتری اور تعلیمی خط و کتابت کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اس کے علاوہ خط و کتابت سے متعلق تمام ضروری اصطلاحات اور تعبیرات کا ایک بڑا ذخیرہ مذکورہ تینوں زبانوں میں جمع کر دیا گیا ہے۔

صفحات: ۳۳۸ قیمت ۱۷۰/- روپے

ملنے کا پتہ

کتب خانہ حسینیہ دیوبند 247554 یوپی

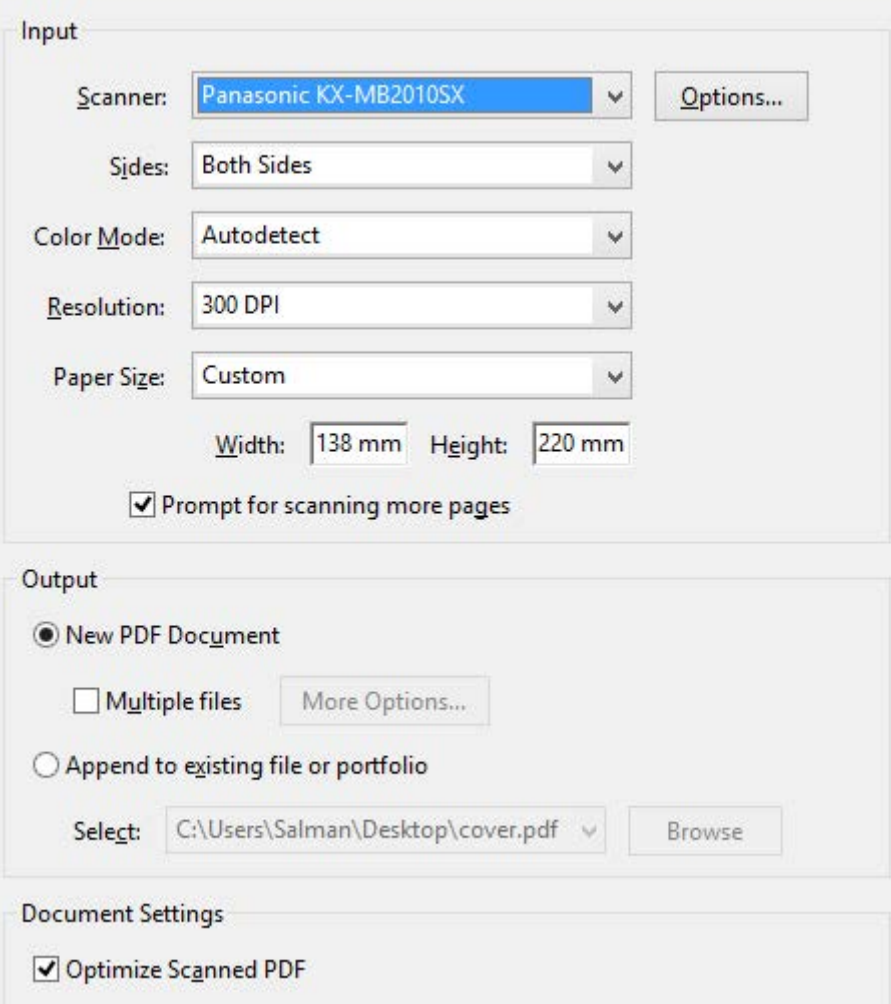
Input
Scanner:
Panasonic KX-MB2010SX
Options...
Sides:
Both Sides
Color Mode:
Autodetect
Resolution:
300 DPI
Paper Size:
Custom
Width:
138 mm
Height:
220 mm
Prompt for scanning more pages
Output
New PDF Document
Multiple files
More Options...
Append to existing file or portfolio
Select:
C:\Users\Salman\Desktop\cover.pdf
Browse
Document Settings
Optimize Scanned PDF